بِسمِ اَللهِ اَلرَّحمٰنِ اَلرَّحِیم

منظر ایلیاء Shia Books PDF

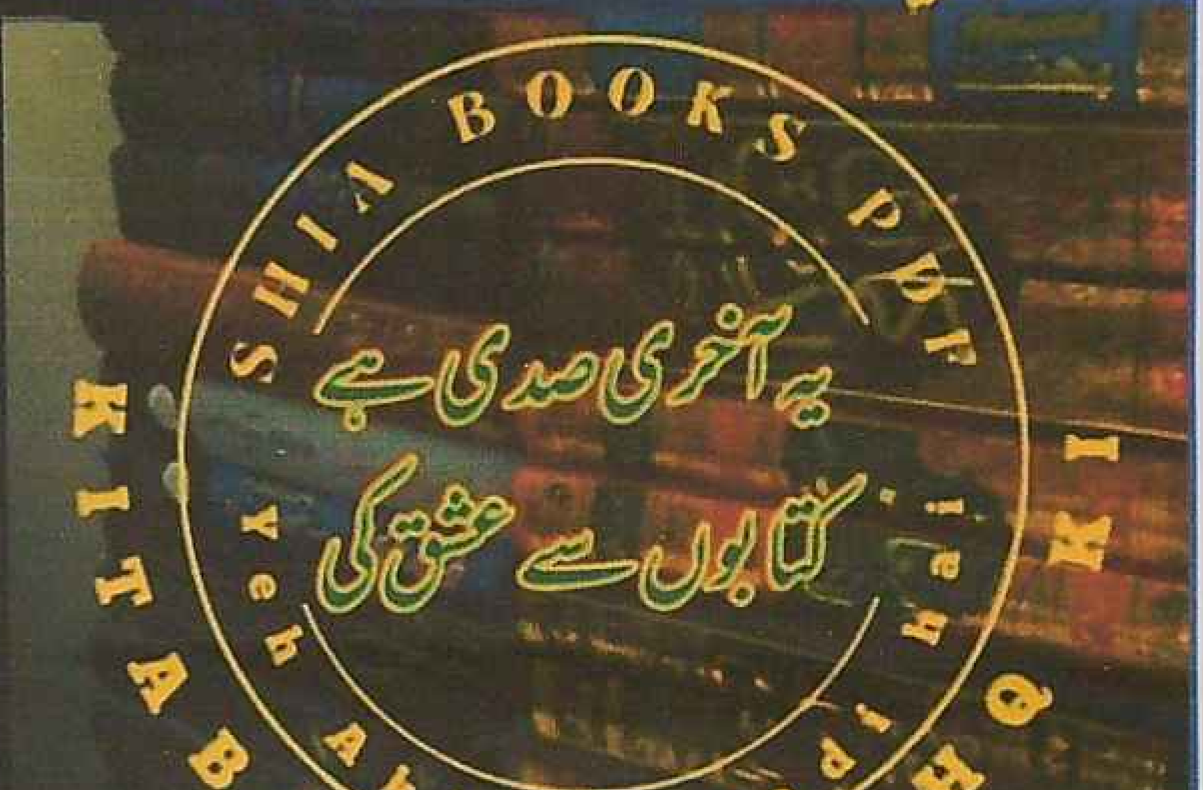

MANZAR AELIYA
9391287881
HYDERABAD INDIA

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تالیف: آیت اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی اور دیگر علماء ودانشور

کلامِ

امیر المومنین علی علیہ السلام

نہج البلاغہ کی جدید، جامع شرح اور تفسیر

(جلد دوّم)

ترجمہ زیر نگرانی

حجۃ الاسلام مولانا سیّد شہنشاہ حسین نقوی

پیشکش

باب العلم دار التحقیق، مسجد باب العلم

فروغ ایمان ٹرسٹ، شمالی ناظم آباد، بلاک ڈی، کراچی، پاکستان

ناشر

مصباح القرآن ٹرسٹ

SHIA BOOKS PDF
MANZAR ALEIYA
WWW.SHIABOOKSPDF.COM
www.shiabookspdf.com

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں۔

نام کتاب .... کلام امیر المومنین علی علیہ السلام
جلد .... جلد دوم
مؤلف .... حضرت آیۃ اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی دام ظلہ
معاونین .... حجۃ الاسلام محمد جعفر امامی، حجۃ الاسلام محمد رضا آشتیانی
.... حجۃ الاسلام ابراہیم بہادری، حجۃ الاسلام محمد جواد ارسطا
حجۃ الاسلام سعید داؤدی، حجۃ الاسلام احمد قدسی
ترجمہ زیر نگرانی .... حجۃ الاسلام مولانا سیّد شہنشاہ حسین نقوی
تعداد ۱۰۰۰
طبع .... اوّل
ناشر .... مصباح القرآن ٹرسٹ
تاریخ اشاعت .... ستمبر ۲۰۱۶ء بمطابق روز عید غدیر ۱۸ ذی الحجہ ۱۴۳[illegible] ہجری
مطبع ....
ہدیہ ....

MANZAR AELIYA

ملنے کا پتہ

معراج کمپنی
LG-3 بیسمنٹ میاں مارکیٹ غزنی سٹریٹ اُردو بازار لاہور۔
فون: 0321-4971214/0423-7361214

باب العلم دار التحقیق
مسجد باب العلم بلاک ڈی، شمالی ناظم آباد، کراچی، پاکستان

www.shiabookspdf.com

انتساب

بہ روحِ پُرفتوح

محسنِ علم و ادب و ثقافتِ اسلامی،

شریفِ اجل

ذوالمنقبتین

رضی ذوالحسبین

سیّد محمد الشریف الرضی

اعلی اللہ مقامہ الشریف

WWW.SHIABOOKSPDF.COM
SHIA BOOKS PDF
MANZAR AELIYA
WWW.SHIABOOKSPDF.COM
www.shiabookspdf.com

WWW.SHIABOOKSPDF.COM
SHIA BOOKS PDF
MANZAR AELIYA
WWW.SHIABOOKSPDF.COM
www.shiabookspdf.com

فہرست مطالب

عرض ناشر ۲۳

عرض مترجم ۲۵

پیش لفظ ۳۰

اکیسواں خطبہ

شرح و تفسیر ۳۴

ہلکے پھلکے ہو جاؤ تا کہ منزل تک پہنچ جاؤ ۳۴

نکتہ ۳۷

بھاری بوجھ والوں کی حالتِ زار ۳۷

بائیسواں خطبہ

خطبہ، ایک نظر میں ۴۲

دلچسپ بات ۴۲

شرح و تفسیر ۴۳

جنگ جمل کی آگ بھڑکانے والے ۴۳

نکتہ ۴۵

الٰہی گروہ اور شیطانی گروہ ۴۵

شرح و تفسیر ۴۸

حیلہ و بہانہ کرنے والے ذلیل لوگ ۴۸

www.shiabookspdf.com

شرح وتفسیر ۵۳
کیا تم لوگ مجھے ڈراتے اور دھمکاتے ہو؟ ۵۳
نکتہ ۵۷
ناقابل شکست لوگ ۵۷

تیئسواں خطبہ

خطبے پر ایک نظر ۶۰
شرح وتفسیر ۶۱
مصلحت الٰہی کے آگے سرِ تسلیم خم ۶۱
اہم نکتہ ۶۴
نکتہ ۶۵
کوشش کے ساتھ راضی بہ رضا رہنا ۶۶
صالحین کے مقام تک پہنچنے کا راستہ ۶۹
شرح وتفسیر ۶۹
نکتہ ۷۲
عمل کی اہم ترین شرط خلوصِ نیت ہے ۷۲
ریا ۷۲
سمعہ ۷۳
تفسیر اوّل ۷۳
تفسیر دوّم ۷۳
۱۔اہم ترین مفاسد میں سے پہلا ۷۳
۲۔اہم ترین مفاسد میں سے دوسرا ۷۴
شرح وتفسیر ۷۵
لوگوں کا اصل سرمایہ ۷۵
قابل توجہ نکتہ ۷۶

www.shiabookspdf.com

نکتہ ۷۸
نیک نامی کی قدر و قیمت (لسانِ صدق) ۷۸
شرح وتفسیر ۸۰
خاندان کے تمام افراد ایک دوسرے کے محافظ ہیں ۸۰
قابل توجہ امر ۸۲
نکتہ ۸۲
رشتے داروں کے ساتھ مضبوط بندھن کی برکات ۸۲

چوبیسواں خطبہ

خطبے پر ایک نظر ۸۷
شرح وتفسیر ۸۸
سازش کرنے والوں میں سے نہیں، بلکہ میں زمانہ شناس ہوں ۸۸
ایک عمدہ نکتہ ۹۰
نکتہ ۹۳
نہ سازش کرو اور نہ سستی کرو ۹۳

پچیسواں خطبہ

خطبہ ایک نظر میں ۹۶
شرح وتفسیر ۹۸
تم لوگوں کی منافقت نے مجھے بے بس کر دیا ۹۸
نکات ۹۹
۱۔ شہر کوفہ کی دورُخی ۹۹
۲۔ حضرت امام علیؑ اور اہلِ کوفہ کے مزاج کا تجزیہ ۱۰۰
شرح وتفسیر ۱۰۳
کہاں خرابی ہے؟ ۱۰۳
نکات ۱۰۶

www.shiabookspdf.com

۱۔بُسر، امیر شام کا خونخوار نمائندہ........۱۰۶
۲۔ملتوں (قوموں) کی فتح وشکست کا راز........۱۰۷
شرح وتفسیر........۱۰۹
میں تم لوگوں سے اکتا گیا ہوں........۱۰۹
کلام سید رضی........۱۱۳
نکتہ........۱۱۳
بنو فراس بن غنم کون تھے؟........۱۱۳

چھبیسواں خطبہ

خطبہ، ایک نظر میں........۱۱۵
شرح وتفسیر........۱۱۶
زمانہ جاہلیت میں عرب کی حالت........۱۱۶
نکات........۱۲۱
زمانہ جاہلیت پر ایک طائرانہ نظر........۱۲۱
بدترین اور بہترین گھر........۱۲۳
شرح وتفسیر........۱۲۴
دردناک صبر........۱۲۴
نکات........۱۲۵
۱۔رحلت پیغمبرؐ کے بعد کے طوفانوں کا رُخ........۱۲۵
۲: کیا امام علی علیہ السلام نے خلیفہ اوّل کی بیعت کی؟........۱۲۷
شرح وتفسیر........۱۲۸
سیاسی رسوائی کا معاملہ........۱۲۸
نکات........۱۳۲
۱۔دنیاوی سیاست میں اخلاقی اصولوں کی کوئی حیثیت نہیں........۱۳۲
۲۔دین کو دنیا کے عوض فروخت کرنے والے........۱۳۳

www.shiabookspdf.com

۳۔استقامت اور کامیابی کا رابطہ ۱۳۴

ستائیسواں خطبہ

خطبے کی سند اور زمان و مقام صدور ۱۳۷
خطبہ،ایک نظر میں ۱۳۹
شرح وتفسیر ۱۴۰
جہاد جنت کے دروازوں میں سے ایک دروازہ ۱۴۰
نکات ۱۴۶
ا۔جہاد ملتوں کی عظمت وسربلندی کا راز ۱۴۶
۲۔کیا اسلامی جہاد صرف دفاعی ہے؟ ۱۴۷
شرح وتفسیر ۱۵۰
اگر کوئی اس غم میں مر جائے تو وہ اسی کا سزاوار ہے ۱۵۰
نکات ۱۵۴
ا۔شکست وکامیابی بغیر دلیل کے نہیں ۱۵۴
۲۔مذہبی اقلیتوں کی حمایت ۱۵۵
۳۔دینی غیرت ۱۵۵
شرح وتفسیر ۱۵۷
وہ اپنے باطل پر متحد ہیں اور آپ اپنے حق پر منتشر ہیں ۱۵۷
نکات ۱۶۰
ا۔یہ تمام سرزنش اور ملامت کس لیے؟ ۱۶۰
شرح وتفسیر ۱۶۲
مجھے رنجیدہ خاطر کردیا ۱۶۲
نکات ۱۶۵
ا۔نالائق پیروکار پیشواؤں کو ذمے دار ٹھہراتے ہیں ۱۶۵
۲۔ایک سوال کا جواب ۱۶۷

www.shiabookspdf.com

۳۔ایک اور سوال ۱۶۸
۴۔ماجرا کا اندوہناک انجام ۱۶۹

اٹھائیسواں خطبہ

خطبہ، ایک نظر میں [1] ۱۷۱
شرح و تفسیر ۱۷۲
دنیا و آخرت امام علیؑ کی نظر میں ۱۷۲
نکات ۱۷۷
۱۔دنیا و آخرت کی زندگی احادیث اسلامی کی رُو سے ۱۷۷
۲۔ناقابل تلافی نقصان ۱۷۹
کوچ کی صدا دی جا چکی ہے ۱۸۰
شرح و تفسیر ۱۸۰
نکات ۱۸۷
۱۔اِس دُنیا سے کون سا زادِ راہ تیار کریں ۱۸۷
۲۔ہوا پرستی اور لمبی امیدیں سعادتِ انسانی کے دو سخت دشمن ہیں ۱۸۸

انتیسواں خطبہ

خطبہ، ایک نظر میں ۱۹۵
شرح و تفسیر ۱۹۷
نکتہ ۲۰۱
کوفیوں کی سُستی کے عوامل ۲۰۱
شرح و تفسیر ۲۰۳
چند نکات ۲۰۶
۱۔حق کو لینا چاہیے ۲۰۶

[1] یہ خطبہ شیعہ سنّی کتابوں میں نقل ہے۔البیان والتبیین، ج ۱،ص ۱۸۱، اعجاز القرآن، ص ۲۲۲، تحف العقول، عقد الفرید، ج ۲،ص ۳۶، مروج الذہب، ج ۳،ص ۴۱۳، علامہ مجلسی نے بحار الانوار میں ارشاد مفید سے تھوڑے سے فرق کے ساتھ نقل کیا ہے۔

www.shiabookspdf.com

۲۔وطن کا دفاع ۲۰۸
شرح وتفسیر ۲۱۲
تم نے ایسا کام کیا ہے کہ میں تم سے مایوس ہوں ۲۱۲
نکتہ ۲۱۴
ناکامیوں کی اصل وجوہات ۲۱۴

تیسواں خطبہ

خطبہ ایک نگاہ میں ۲۱۷
شرح وتفسیر ۲۱۹
خلیفۂ ثالث کے قتل کی وجوہات ۲۱۹
ایک نکتہ ۲۲۴
خلیفۂ ثالث کا پرآشوب دور ۲۲۴

اکتیسواں خطبہ

شرح وتفسیر ۲۳۰
خطاکاروں کی نجات کے لیے کوشش ۲۳۰
چند نکات ۲۳۳
ا۔مولاؑ کے پیغام پر زبیر کا ردِّعمل ۲۳۳
۲۔طلحہ وزبیر کی زندگی کا خلاصہ ۲۳۴
لیکن زبیر ۲۳۷
۳۔امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لیے لازم شرائط ۲۳۸

بتیسواں خطبہ

خطبہ، ایک نگاہ میں ۲۴۱
شرح وتفسیر ۲۴۳
ہم اُس دور میں ہیں کہ جس میں اہمیتوں کا معیار دگرگوں ہے ۲۴۳
چند نکات ۲۴۶

www.shiabookspdf.com

۱۔ زمانے کے فاسد ہو جانے سے کیا مراد ہے؟............ ۲۴۶
۲۔ اہمیتوں کا معیار دگرگوں ہونے کا نتیجہ............ ۲۴۷
شرح و تفسیر............ ۲۵۰
لوگوں کے چار گروہ ہیں............ ۲۵۰
نکتہ............ ۲۵۶
یہ چاروں خطرناک گروہ ہر معاشرے میں پائے جاتے ہیں............ ۲۵۶
شرح و تفسیر............ ۲۵۸
پانچواں گروہ: الٰہی بندے............ ۲۵۸
شرح و تفسیر............ ۲۶۴
اپنے سے پہلے لوگوں سے عبرت لو............ ۲۶۴
کلام سیّد رضیؒ............ ۲۶۶
نکتہ............ ۲۶۷
دنیا اولیاء اللہ کی نگاہ میں............ ۲۶۷

تینتیسواں خطبہ

خطبہ، ایک نگاہ میں............ ۲۷۲
شرح و تفسیر............ ۲۷۴
میں باطل کو چیر دوں گا............ ۲۷۴
چند نکات............ ۲۷۹
۱۔ ذی قار کہاں ہے؟............ ۲۷۹
۲۔ عرب کی جہالت............ ۲۸۰
۳۔ حدیث خَاصِفُ النَّعل............ ۲۸۱
شرح و تفسیر............ ۲۸۳
قریش والے مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟............ ۲۸۳
ایک نکتہ............ ۲۸۸

www.shiabookspdf.com

حسد، معاشرتی فسادات کی جڑ ۲۸۸

چونتیسواں خطبہ

خطبے کی شان ورود ۲۹۱
خطبہ، ایک نظر میں ۲۹۲
شرح وتفسیر ۲۹۴
وائے ہو تم لوگوں پر!۔۔۔شہادت سے کیوں ڈرتے ہو؟ ۲۹۴
ایک اہم نکتہ ۲۹۷
اس قدر سرزنش آخر کس لیے ہے؟ ۲۹۷
شرح وتفسیر ۲۹۹
دشمن بیدار ہے اور تم خوابِ غفلت میں ہو ۲۹۹
ایک نکتہ ۳۰۳
پھر وہی ضعف وشکست کی وجوہات ۳۰۳
شرح وتفسیر ۳۰۵
میں تن تنہا دشمن کے سامنے کھڑا ہوں ۳۰۵
ایک نکتہ ۳۰۹
ایک شجاع رہبر کا آخری فیصلہ ۳۰۹
شرح وتفسیر ۳۱۲
میرے اور تمہارے ایک دوسرے پر حقوق ۳۱۲
چند نکات ۳۱۸
۱۔امام اور اُمت کے باہمی حقوق ۳۱۸
۲۔حق اور مصلحت پر کھینچا تانی ۳۲۱

پینتیسواں خطبہ

خطبہ، ایک نگاہ میں ۳۲۴
شرح وتفسیر ۳۲۵

www.shiabookspdf.com

نافرمانی کا نتیجہ یہ ہے ۳۲۵
نکات ۳۳۱
داستانِ حکمیت ۳۳۱
اہل نظر کی آراء سے فائدہ اٹھانا ۳۳۵

چھتیسواں خطبہ

خطبہ، ایک نگاہ میں ۳۳۸
شرح و تفسیر ۳۳۸
نہروان کے خوارج پر اتمام حجت ۳۳۸
نکتہ ۳۴۲
خوارج کی عبرت انگیز داستان ۳۴۲

سینتیسواں خطبہ

خطبہ، ایک نگاہ میں ۳۴۷
شرح و تفسیر ۳۴۸
طوفانوں کے مقابلے میں اپنی جگہ قائم رہنا ۳۴۸
شرح و تفسیر ۳۵۳
طاقتور ظالم میرے نزدیک ضعیف ہیں ۳۵۳
نکتہ ۳۵۵
مظلوم کی حمایت اور ظالم سے جنگ ۳۵۵
شرح و تفسیر ۳۵۸
میں پہلا مسلمان ہوں ۳۵۸
نکتہ ۳۶۱
وہ پیمان جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا علی علیہ السلام سے تھا ۳۶۱

اڑتیسواں خطبہ

خطبہ، ایک نگاہ میں ۳۶۳

www.shiabookspdf.com

شرح وتفسیر ۳۶۴
شبہات میں کیا کرنا چاہیے؟ ۳۶۴
نکتہ ۳۶۸
حقائق کی تحریف میں شبہے کا کردار ۳۶۸
شرح وتفسیر ۳۷۰
موت سے ڈرنا بے فائدہ ہے ۳۷۰
نکتہ ۳۷۱

انتالیسواں خطبہ

خطبہ ایک نگاہ میں ۳۷۳
شرح وتفسیر ۳۷۵
میں نے کیوں ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا؟ ۳۷۵
شرح وتفسیر ۳۷۸
کمزوروں کے ساتھ دشمن کے مقابلے میں کھڑے نہیں ہو سکتے ۳۷۸
نکتہ ۳۸۰
دشمن کے مقابلے میں سستی کا نتیجہ ۳۸۰

چالیسواں خطبہ

خطبہ، ایک نگاہ میں ۳۸۳
شرح وتفسیر ۳۸۵
نکات ۳۹۱
۱۔ تحریف کی آفت ۳۹۱
۲۔ تشکیل حکومت کی ضرورت ۳۹۲
ابن ابی الحدید کی غلطی ۳۹۳

اکتالیسواں خطبہ

خطبہ، ایک نگاہ میں ۳۹۷

www.shiabookspdf.com

شرح وتفسیر ۳۹۸
نکتہ ۴۰۵
سیاست الٰہی اور شیطانی سیاست ۴۰۵

بیالیسواں خطبہ

خطبہ، ایک نگاہ میں ۴۱۱
شرح وتفسیر ۴۱۲
شرح وتفسیر ۴۱۵
نکتہ ۴۲۱
جی ہاں نامۂ اعمال موت کے ساتھ بند ہو جاتا ہے ۴۲۱

تینتالیسواں خطبہ

خطبہ، ایک نگاہ میں ۴۲۵
شرح وتفسیر ۴۲۷
صلح و جنگ ۴۲۷
نکتہ ۴۳۰
اصل ہدف صلح و بیعت کی دعوت دینا تھا ۴۳۰
شرح وتفسیر ۴۳۴
اعلان جنگ ۴۳۴
نکتہ ۴۳۶
خلیفۂ ثالث کے وہ کام جو لوگوں کی عمومی ناراضی کا سبب بنے ۴۳۶

چوالیسواں خطبہ

شانِ ورود ۴۳۹
شرح وتفسیر ۴۴۱
فراری بزرگوار ۴۴۱
نکتہ ۴۴۳

www.shiabookspdf.com

۱۔تاریخ اسیرانِ بنی ناجیہ ۴۴۳
۲۔اتنی سخت گیری کیوں؟ ۴۴۵

پینتالیسواں خطبہ

خطبہ،ایک نگاہ میں ۴۴۷
شرح وتفسیر ۴۴۸
خدا کی بے پایاں رحمت ۴۴۸
شرح وتفسیر ۴۵۲
دنیا آرزوؤں کی آماجگاہ ۴۵۲
نکتہ ۴۵۵
کفاف اور عفاف ہر چیز سے افضل ہے ۴۵۵

چھیالیسواں خطبہ

خطبہ،ایک نگاہ میں ۴۵۹
شرح وتفسیر ۴۶۰
خداوند! میں سفر کی تکالیف سے تیری پناہ مانگتا ہوں ۴۶۰
نکتہ ۴۶۲
فلسفۂ دعا ۴۶۲

سینتالیسواں خطبہ

خطبہ،ایک نگاہ میں ۴۶۹
شرح وتفسیر ۴۷۰
کوفے کے مستقبل کی پیش گوئی ۴۷۰
کوفے کے بارے میں دو مختلف نظریات ۴۷۴

اڑتالیسواں خطبہ

خطبہ،ایک نگاہ میں ۴۷۷

www.shiabookspdf.com

شرح و تفسیر ۴۷۸
صرف خدا ہی ستائش کا سزاوار ہے ۴۷۸
شرح و تفسیر ۴۸۳
جنگ کے لیے فوج کو روانہ کرنا ۴۸۳
چند دلچسپ تاریخی نکات ۴۸۵
۱۔ کسریٰ کے محل میں ۴۸۵
۲۔ کربلا کی زمین پر امامؑ کا ورود ۴۸۵
۳۔ امامؑ سرزمین انبار پر ۴۸۶
۴۔ امامؑ، راہب کے گرجا گھر کے قریب ۴۸۷
۵۔ امامؑ شہر رقّہ میں ۴۸۸

انچاسواں خطبہ

خطبہ، ایک نگاہ میں ۴۸۹
شرح و تفسیر ۴۹۰
اے خیال و قیاس و وہم و گمان سے برتر ذات ۴۹۰
نکتہ ۴۹۷
اس کا وجود آشکار اور حقیقتِ ذات پنہاں ہے ۴۹۷

پچاسواں خطبہ

خطبہ، ایک نگاہ میں ۵۰۱
شرح و تفسیر ۵۰۲
ہوا و ہوس کی پیروی فتنوں کی ابتدا ہے ۵۰۲
نکات ۵۰۷
فتنوں کی جڑ ۵۰۷
شیطانی سیاستیں ۵۰۸

اکیاونواں خطبہ

www.shiabookspdf.com

خطبہ ایک نگاہ میں ۵۱۱
پہلا حصہ ۵۱۲
شرح وتفسیر ۵۱۳
اس بزدلانہ عمل کا قرار واقعی جواب دو ۵۱۳
نکات ۵۱۸
۱۔زندگی عزت اور سربلندی کے ساتھ بسر کرنی چاہیے ۵۱۸
۲۔سادہ لوح افراد کو ذہنی فریب دینا (Brain washing) ۵۲۰
۳۔دریادل لوگوں کا وتیرہ ۵۲۱

باونواں خطبہ

خطبہ ایک نگاہ میں ۵۲۵
شرح وتفسیر ۵۲۷
نکتہ ۵۳۲
دنیا کی ناپائیداری ۵۳۲
دوسرا حصہ ۵۳۵
شرح وتفسیر ۵۳۶
جتنی اس راہ میں کوشش کروگے وہ کم ہے ۵۳۶
شرح وتفسیر ۵۳۹
اللہ کی نعمتوں کی عظمت و وسعت: ۵۳۹

ترپنواں خطبہ

شرح وتفسیر ۵۴۳
قربانی کامل ہونی چاہیے ۵۴۳
نکتہ ۵۴۵
قربانی بے عیب کیوں ہونی چاہیے؟ ۵۴۵

چونواں خطبہ

www.shiabookspdf.com

خطبہ، ایک نگاہ میں ۵۴۷
شرح و تفسیر ۵۴۹
اس ظالم گروہ کے ساتھ جنگ کے سوا کوئی چارہ نہیں ۵۴۹
نکات ۵۵۲
۱۔امامؑ کے لیے مشتاقانہ ہجوم ۵۵۲
۲۔جنگ و صلح اور ایمان و کفر کے دوراہے پر ۵۵۳

پچپنواں خطبہ

خطبہ، ایک نگاہ میں ۵۵۵
شرح و تفسیر ۵۵۶
امامؑ کا خود کو جنگ سے روکنا ۵۵۶

چھپنواں خطبہ

خطبہ، ایک نگاہ میں ۵۶۳
شرح و تفسیر ۵۶۵
ہم رسول خدا کے ہم رکاب ہو کر مخلصانہ جنگ کرتے تھے ۵۶۵
نکات ۵۷۰
۱۔دوسرا فتنہ بصرے میں ۵۷۰
۲۔لشکر میں نظم و ضبط اور مخلصانہ جہاد ۵۷۱
۳۔صدر اسلام کے مسلمانوں کی خصوصیت ۵۷۲

ستاونواں خطبہ

خطبہ، ایک نگاہ میں ۵۷۳
شرح و تفسیر ۵۷۵
خطرناک دشمن سے ہوشیار رہیں ۵۷۵
نکات ۵۸۲
۱۔امامؑ نے اپنے منظور نظر شخص کا نام کیوں نہیں لیا؟ ۵۸۲

www.shiabookspdf.com

۲۔امیر شام مہدورالدم کیوں تھا؟..................... ۵۸۲
۳۔امامؑ پر سب وشتم کا افسوسناک تاریخچہ..................... ۵۸۶
۴۔دشمن کے مقابلے میں تقیہ ایک دفاعی ڈھال..................... ۵۸۸

اٹھاونواں خطبہ

خطبہ، ایک نگاہ میں..................... ۵۹۳
شرح وتفسیر..................... ۵۹۴
امامؑ کی مظلومیت کی انتہا..................... ۵۹۴

انسٹھواں خطبہ

شرح وتفسیر..................... ۵۹۹
ایک عجیب پیش گوئی..................... ۵۹۹
نکات..................... ۶۰۲
آیا غیب سے آگاہی ممکن ہے؟..................... ۶۰۲

ساٹھواں خطبہ

شرح وتفسیر..................... ۶۰۵
خوارج کی عاقبت..................... ۶۰۵
نکات..................... ۶۰۷
۱۔خوارج ایک طرز فکر کا نام ہے، نہ کہ ایک گروہ کا نام!..................... ۶۰۷
۲۔آخر خوارج چوروں اور لٹیروں کی صورت میں ظاہر ہو گئے..................... ۶۱۱

www.shiabookspdf.com

www.shiabookspdf.com

عرض ناشر

مصباح القرآن ٹرسٹ محسن ملت علامہ سیّد صفدر حسین نجفی اعلی اللہ مقامہ کے ان صدقات جاریہ میں سے ہے، جن سے لوگ تا قیامت استفادہ کرتے رہیں گے اور موصوف کے درجات عالیہ میں اضافہ ہوتا رہے گا۔ مصباح القرآن ٹرسٹ نے تراجم وتفاسیر قرآن سے کام شروع کیا اور پھر ہر وہ کتاب جس کی ملت کو ضرورت تھی، شائع کی اور انشاء اللہ العزیز شائع کی جاتی رہے گی۔

قرآن و اہل بیت علیہم السلام کی تعلیمات کو عام کرنا اور انہیں گھر گھر پہنچانا ہمارے ادارے ''مصباح القرآن ٹرسٹ'' لاہور کا پہلے روز سے ہدف رہا ہے۔ اس سلسلے میں دسیوں علمی کام جو علمائے کرام کی تالیف وتصنیف اور ترجمے کی صورت میں منظر و مشہود ہیں۔ ان میں حضرت آیۃ اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی دام ظلہ کی تالیف شدہ ''تفسیر نمونہ، تفسیر پیامِ قرآن'' سر فہرست ہیں۔ ادارہ ہٰذا نے چاہا کہ حضرت آیۃ اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی دام ظلہ کی شرح نہج البلاغہ ''پیام امام امیر المومنین علیہ السلام'' کا ترجمہ پیش کیا جائے۔ اگرچہ خود حضرت آیۃ اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی دام ظلہ نے مجھے اجازت دی تھی، یہاں ممنونِ احسان ہیں حجۃ الاسلام والمسلمین الحاج السیّد ذوالقدر رضوی دامت برکاتہ (وکیل ونمائندہ آقائی مکارم شیرازی برائے لندن) کے جن سے تحریری اجازت حاصل کر کے ترجمہ کیا گیا ہے۔ امید ہے بہت جلد تمام جلدوں کو پیش کیا جائے گا۔

یاد رہے کہ مصباح القرآن ایک خود مختار ادارہ ہے۔ اس کے بانی مرحوم حجۃ الاسلام والمسلمین علامہ سیّد صفدر حسین نجفیؒ تھے۔ انہوں نے اس ادارے کا ایک الگ ٹرسٹ تشکیل دیا جو اوّل دن سے اخراجات کا خود انتظام کرتا ہے۔ ادارہ مصباح القرآن ٹرسٹ حجۃ الاسلام مولانا سید شہنشاہ حسین نقوی کا تہہ دل سے مشکور ہے کہ اُنہوں نے شرح نہج البلاغہ کے ترجمہ کی نگرانی کے فرائض از خود انجام دیئے، نیز ادارہ ''باب العلم دار التحقیق'' کا بھی ممنون ہے کہ اُنہوں نے کتاب ہٰذا کی اشاعت کی اجازت دی۔

مصباح القرآن کی تمام کتابیں آپ کے استفادے کے لیے انٹرنیٹ پر موجود ہیں، جن کا مطالعہ آپ ان ویب سائٹس پر کر سکتے ہیں:

www.shiabookspdf.com

www.misbahulqurantrust.com

قارئین کرام سے التماس ہے کہ اگر وہ اس کتاب میں کہیں خامی، کمی یا غلطی محسوس کریں تو ہمیں مطلع فرمائیں، ہم آپ کے شکرگزار ہیں۔ ادارے کی ترقی اور اس کے بانی محسنِ ملت علامہ سیّد صفدر حسین نجفی اعلی اللہ مقامہٗ کے درجات کی بلندی کے لیے دعا کا طالب

مسئول
مصباح القرآن ٹرسٹ، لاہور، پاکستان

www.shiabookspdf.com

عرض مترجم

قرآن مجید اللہ کا وہ کلام ہے جو تمام گزشتہ آسمانی صحیفوں کے بعد اپنی تمام تر جامعیت اور ضرورت کے مطابق پیکرِ علم الٰہی سرورِ کائنات رحمۃ للعالمین آنحضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل کیا گیا جو قیامت تک رہنمائی عطا کرتا رہے گا اور اس کی تفسیر و تفہیم کی ذمے داری بعد از پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عترت واہل بیت علیہم السلام کو دی گئی۔ چنانچہ ان پاک اور عظیم ہستیوں نے اپنی احادیث، فرامین اور عملی اقدامات کے ذریعے اسے تصویرِ تجسّم عطا کی اور عملی جامہ پہنایا، یعنی اہل بیت علیہم السلام کی روش، ان کے فیصلے اور طرزِ زندگی قرآن کی عملی تفسیر ہے، البتہ اس عظیم سرمائے کو جمع کر کے کتابی شکل دینا ایک اساسی خدمت ہے جسے علامہ سیّد شریف رضی علیہ الرحمہ نے اپنے ذوقِ ادبی و علمی کے مطابق جمع کر کے "نہج البلاغہ" نام دیا جو ایک ہزار سال سے عقلوں کی بیداری و ہدایت، ضمیروں کی سالمیت، فطرت کی اصالت، سماج کی قیادت اور ان سب کے محور اللہ کی عبادت کو فروغ دے رہی ہے۔ مولا علی علیہ السلام کے کلام کا معیار اس درجے کا ہے کہ ادبائے کرام نے متفقہ طور پر تسلیم کیا ہے کہ یہ اللہ کے کلام سے نیچے اور بندوں کے کلام سے اوپر ہے۔

تَحۡتَ کَلَامِ الۡخَالِقِ وَفَوۡقَ کَلَامِ الۡمَخۡلُوۡقِ

مسلم و غیر مسلم علمائے کرام اور اہل ادب نے اسے سمجھنے اور سمجھانے کے لیے سیکڑوں مفصل و موضوعاتی شرحیں، مقالے اور مضامین لکھے، ایسی ہی شروح میں سے ایک مرجع عالی قدر حضرت آیۃ اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی (مدظلہ العالی) اور دیگر علما و دانشوروں کی مرتب کردہ بہترین، سلیس اور نئی شرح "پیامِ امام امیر المومنین علیہ السلام" ہے۔ نہج البلاغہ اور مولا علی علیہ السلام کی خدمت و نوکری کا کسے شوق نہیں ہوگا۔ چنانچہ مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور کے مسئول محترم جناب سیٹھ محمد امین ساعتی کی فرمائش پر دفتر حضرت آیۃ اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی لندن کے مسئول و نمائندہ محترم عالم بزرگوار حضرت

www.shiabookspdf.com

حجۃ الاسلام والمسلمین سیّد ذوالقدر رضوی دامت برکاتہ کی تحریری اجازت اور حضرت آیۃ اللہ علاّمہ سیّد عقیل الغروی دامت برکاتہ سے مفید مشوروں اور رہنمائی کے بعد باب العلم دارالتحقیق، کراچی، پاکستان کے اراکین، مولانا محمد حسین کریمی، مولانا غلام علی عارفی، مولانا فدا حسین انقلابی، مولانا محمد یعقوب شاہد آخوندی، مولانا منظور حسین ابوالحسنی، جناب مظہر حسنین نقوی (مرحوم)، محترم آغا نادر رضوی، محترم سیّد ذوالفقار حسین نقوی سمیت محترم مرزا محمد علی، محترم محمد مرسلین، محترم ذاکر اسدی، محترم سیّد شہزاد عالم زیدی، محترم ضمیر الحسن جعفری، محترم سیّد سجاد رضا رضوی اور محترم سیّد اسد علی زیدی کی باہمی تعاون سے ترجمے کا کام شروع ہوا جس کی تیسری جلد اب الحمدللہ آپ کے سامنے ہے۔

اس کتاب کے مکمل دورے کے بعد چند جلدوں کا ضمیمہ ترتیب دیا گیا ہے، جس میں روات کا ذکر، جو کہ منہاج البراعہ (خوئی) سے استفادہ ہے اور حوالہ جات بھی مزید بڑھائے جائیں گے۔ اسی طرح قائد ملت جعفریہ علامہ مفتی جعفر حسین اور برصغیر کے بلند مرتبہ علامہ سید ذیشان حیدر جوادی کی شرح کے علاوہ باب العلم دارالتحقیق کی جانب سے معلومات کا اضافہ ہے۔

قابل ذکر ہے کہ پیام امیر المؤمنین علی علیہ السلام میں اردو ترجمہ علامہ مفتی جعفر حسین مرحوم اور علامہ سید ذیشان حیدر جوادی سے لیا گیا ہے۔

نہج البلاغہ کا اگر پوری ملّت مطالعہ کرلے تو یقیناً ترقی وعظمت مسلمین وتشیع میں کئی گنا اضافہ ہوگا اور انشاء اللہ یہ کاوش اس راہ میں مددگار ثابت ہوگی۔ شہید پروفیسر سیّد سبط جعفر زیدی سے اس کتاب کے بارے میں مشورے رہے کہ نہج البلاغہ کا منظوم ترجمہ کیا جائے، چنانچہ اس پر کام شروع کر دیا گیا ہے۔

والسلام
سیّد شہنشاہ حسین نقوی
مدیر: باب العلم دارالتحقیق، کراچی، پاکستان

www.shiabookspdf.com

www.shiabookspdf.com

www.shiabookspdf.com

مجوز کا عکس

دفتر حضرت آیت اللہ العظمیٰ
مکارم شیرازی مدظلہ
سڈبری ویمبلی، لندن
انگلستان

باسمہ سبحانہ وتعالیٰ

جناب حجۃ الاسلام والمسلمین سید شہنشاہ حسین نقوی دامت معالیکم
ڈائرکٹر ـــــــ باب العلم دارالتحقیق،
فروغ ایمان ٹرسٹ،
ناظم آباد، کراچی، پاکستان۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ
انشاء اللہ العزیز آپ ہر طرح سے بخیر وعافیت ہوں گے۔

یہ جان کر مجھے بے انتہا مسرت ہو رہی ہے کہ حضرت آیۃ اللہ العظمیٰ شیخ ناصر مکارم شیرازی کی زیر نگرانی تالیف ہونے والی نہج البلاغہ کی سلیس و نفیس شرح ـــ پیام امامؑ ـــ کا اردو ترجمہ باب العلم دارالتحقیق میں آپ کی زیر نگرانی انجام پا رہا ہے۔

حضرت آیۃ اللہ العظمیٰ شیخ ناصر مکارم شیرازی مدظلہ العالی کے نمائندہ اور ان کے لندن کے آفس کے مسئول کی حیثیت سے میں آپ کی خدمت میں صمیم قلب سے مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ اور دعا گو ہوں کہ ربّ کریم آپ کے توفیقات میں اضافہ فرمائے اور آپ کے مساعی جمیلہ وجلیلہ کو شرف قبول سے سرفراز فرمائے۔

تبلیغ دین اور خدمت مکتب ومذہب اہل بیت عصمت وطہارت کی غرض سے حضرت آیۃ اللہ العظمیٰ مکارم شیرازی مدظلہ العالی کی جانب سے آپ کو ان کی تمام کتابوں کے ترجمہ اور اشاعت کی اجازت حاصل ہے۔ بشرطیکہ ان کے مضامین اور محتوٰی میں کسی قسم کی تبدیلی واقع نہ ہو۔

میں اس عظیم الشان کتاب کی تکمیل اور اشاعت کے لیے بھی دست بہ دعا ہوں۔ ربّ اکبر ـــ سبحانہ وتعالیٰ ـــ آپ کے دست وبازو کو قوت وطاقت عطا فرمائے اور اس جیسے کارناموں کے لیے زیادہ سے زیادہ امکانات فراہم فرمائے ـــ آمین بحق محمد وآل الطاہرین!

دعا گو
سید ذوالفقدر رضوی
مرکز باب المراد
لندن یو۔کے۔

Babul Murad Centre
856-858 Harrow Road, Sudbury Town, Wembley, Middlesex, London HA0 2PX .U.K
Tel: 0208 908 1525 • Fax: 0208 537 1232 • Answer Phone: 0208 908 0055

www.makarem.ir

www.shiabookspdf.com

پیش لفظ

نہج البلاغہ آج کی دنیا میں تصور سے کہیں زیادہ بہتر طریقے سے روشنی پھیلا رہی ہے، کیوں کہ بہت ساری اجتماعی اور انفرادی مشکلات اور دشواریوں کا حل اس میں موجود ہے اور بشریت کی جان لیوا بیماریوں کے لیے دوا اس میں پوشیدہ ہے۔ نہج البلاغہ کی روشن شعاعیں دنیائے اسلام کی سرحدوں کو پار کر کے اب غیر مسلموں کے دلوں کو بھی منور کرنے لگی ہیں، وہ ایسے فیضیاب ہو رہے ہیں کہ کبھی ان کے بیانات نہج البلاغہ کے بارے میں آتے ہیں تو دوستوں کے جان و دل کو جھنجوڑ کے رکھ دیتے ہیں اور شوق کے آنسو جاری ہو جاتے ہیں۔

ایک عرب عیسائی مفکر میخائیل نعیمہ "نہج البلاغہ اور اس کے صاحب" کے عنوان سے رقم طراز ہے:

"علیؑ صرف اسلام کے لیے ہیں، اگر ایسا ہے تو ۱۹۵۶ء میں ایک عیسائی ان کی گزشتہ زندگی کے بارے میں تحقیق و جستجو اور دقت کیوں کرتے؟ (یہ جارج جرداق ایک لبنانی عیسائی مصنف ہیں جنہوں نے کتاب "الامام علی صوت العدالۃ الانسانیۃ" لکھی ہے، یہاں کی طرف اشارہ ہے) اور ایسے دل رُبا شاعر، دل فریب واقعات، نرم اور لطیف حکایات اور حیرت انگیز جنگی واقعات کو شاعرانہ انداز سے بیان کرنے والے، ایک ایسے مردِ میدان، جو نہ صرف جنگ کے میدان میں، بلکہ دور اندیشی اور پاک دلی میں، فصاحت و بلاغت اور سحر انگیز بیانی میں، بہترین اخلاق اور جوشِ ایمانی میں، بلند ہمتی میں، مظلوموں اور ناامیدوں کی مدد کرنے میں، حق اور سچ کی پیروی کرنے میں، من جملہ تمام صفات حسنہ میں ایسے مردِ میدان تھے کہ تاریخ میں آپؑ کی کوئی نظیر نہیں۔"

نہج البلاغہ کی کشش اس حد تک ہے کہ سخت پیاسی ارواح کو اپنی شفاف حقیقت سے ایسا سیراب اور مست کر دیتی ہے کہ اس کی شراب طہور کا نشہ انسان کے وجود کے تمام ذرات سے ظاہر ہونے لگتا ہے، گویا حوضِ کوثر ہے اور مولا علی علیہ السلام ساقی کوثر کنارے پر بیٹھے ہر کسی کو اس کی قابلیت کے مطابق فائدہ پہنچاتے ہیں۔ مگر افسوس کہ نہج البلاغہ کی تفسیر و تشریح اور معانی کی وضاحت کے بارے میں مسلمان دانشوروں نے اجتماعی شکل میں اگر چہ بہت کوششیں کی ہیں، مگر اب بھی گہری اور بیشتر تشریحات کی ضرورت ہے۔ پہلے زمانے میں بزرگانِ دین نے اپنے حساب سے عمدہ شرحیں لکھی ہیں، لیکن نہج البلاغہ پر بہت کم ان کی نگاہ تھی، مگر آج کی دنیا کو تازہ اور تفصیلات کے ساتھ شرحیں درکار ہیں، اسی بنا پر "تفسیرِ نمونہ" کا کام ختم کرنے کے بعد، مولا امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام کی عنایات اور مدد سے مالی مشکلات کے باوجود ہم نے نہج البلاغہ کی مکمل شرح و تفسیر کا

www.shiabookspdf.com

ارادہ کیا۔ اس امید کے ساتھ کہ دانشوروں، علماء وفضلا، محققین اور عام لوگ بھی اس کتاب سے استفادہ کر سکیں۔

اس شرح وتفسیر کے لیے درج ذیل نکات پر خصوصیت کے ساتھ کام کیا گیا ہے۔

۱۔ تمام جملوں کا ترجمہ وتفسیر سلاست اور روانی کے ساتھ۔

۲۔ تمام لغات اصلی وغیر لغات کی تفسیر۔

۳۔ خطبوں اور خطوط سے مربوط تاریخی مسائل کے بیان کی اہمیت۔

۴۔ مختلف عقیدتی، اخلاقی، اجتماعی اور سیاسی.... بحثوں پر ضروری تجزیہ وتحلیل۔

۵۔ اضافی نکات جن پر مکمل بحث کی گئی ہے، جو شاید محترم پڑھنے والوں کو دوسری کتابوں کی طرف رجوع کرنے سے بے نیاز کردے۔

بحمد اللہ اس کام میں ہمارے ساتھ کچھ نئے ساتھیوں نے مدد اور "تفسیر نمونہ" میں کام کرنے والے ساتھیوں نے ابحاث مزید توضیحات اور تشریحات کے ساتھ بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان عزیزوں کے تشکر کے ساتھ امید ہے عنایاتِ پروردگار سے اس شرح وتفسیر کا مناسب اثر تمام اسلام و مسلمین میں پیدا ہوگا اور یومِ آخرت کا ذخیرہ قرار پائے گا۔

ناصر مکارم شیرازی

۱۳ رجب، ۱۴۲۰ھ

حوزۂ علمیہ، قم

www.shiabookspdf.com

www.shiabookspdf.com

اکیسواں خطبہ

"وهي كلمة جامعة للعظة والحكمة" [1]

ایک ایسا کلمہ ہے جو تمام موعظہ و حکمت کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے (میدانِ حشر و قیامت و بہشت و جہنم)۔

فَإِنَّ الْغَايَةَ أَمَامَكُمْ وَإِنَّ وَرَاءَكُمُ السَّاعَةَ تَحْدُوكُمْ تَخَفَّفُوا تَلْحَقُوا فَإِنَّمَا يُنْتَظَرُ بِأَوَّلِكُمْ آخِرُكُمْ.

"تمہارا انجام (میدانِ حشر، بہشت و دوزخ) تمہارے سامنے ہے۔ موت کی ساعت تمہارے تعاقب میں ہے۔ ہلکے پھلکے رہو تا کہ آگے بڑھنے والوں کو پا سکو۔ تمہارے اگلوں کو پچھلوں کا انتظار کرایا جا رہا ہے۔" (تم سب ایک ہی وقت میں محشور کیے جاؤ گے)

قَالَ السَّيِّدُ الشَّرِيفُ أَقُولُ إِنَّ هٰذَا الْكَلَامَ لَوْ وُزِنَ بَعْدَ كَلَامِ اللهِ سُبْحَانَهُ وَبَعْدَ كَلَامِ رَسُولِ اللهِ (صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ وَسَلَّمَ) بِكُلِّ كَلَامٍ لَمَالَ بِهِ رَاجِحاً، وَ بَرَّزَ عَلَيْهِ سَابِقاً فَأَمَّا قَوْلُهُ (عَلَيْهِ السَّلَامُ): تَخَفَّفُوا تَلْحَقُوا فَمَا سُمِعَ كَلَامٌ أَقَلُّ مِنْهُ مَسْمُوعاً وَلَا أَكْثَرُ مِنْهُ مَحْصُولاً وَ مَا أَبْعَدُ غَوْرَهَا مِنْ كَلِمَةٍ، وَأَنْقَعُ نُطْفَتَهَا مِنْ حِكْمَةٍ وَ قَدْ نَبَّهْنَا فِي كِتَابِ الْخَصَائِصِ عَلَى عِظَمِ قَدْرِهَا وَشَرَفِ جَوْهَرِهَا"

[1] اس خطبے کو سید رضیؒ نے کتاب مصادر نہج البلاغہ میں، خصائص، ص ۸۷ پر نقل کیا ہے۔ اور خطبہ نمبر ۱۶۷ کے ذیل میں اس خطبے میں سے کچھ حصے کا اضافہ ہوا ہے۔ "طبری" نے اسے اپنی تاریخ کی کتاب میں ۳۵ھ ق میں نقل کیا، مصادر نہج البلاغہ، جلد ۱، ص ۳۷۱، و جلد ۲، ص ۳۰۳، تاریخ طبری کی طرف رجوع کریں تو واضح ہو گا کہ لوگوں نے جمعہ کے دن ۲۵ ذی الحجہ امیر المومنینؑ کی بیعت کی اور جب سب سے پہلا خطبہ جو آپؑ نے دیا وہ ۱۶۷ واں خطبہ ہے، یہ ۲۱ واں خطبہ اسی خطبے کا ایک حصہ ہے۔ تاریخ طبری، جلد ۳، ص ۴۵۷

www.shiabookspdf.com

"سیّد رضیؒ فرماتے ہیں کہ اس کلام کا خدا اور رسولؐ کے کلام کے بعد جس کلام سے بھی موازنہ کیا جائے تو حُسن وخوبی میں ان کا پلہ بھاری رہے گا اور ہر حیثیت سے بلند رہے گا اور آپؑ کا یہ ارشاد کہ ۔ تَخَفَّفُوْا تَلْحَقُوْا اس سے بڑھ کر تو کوئی جملہ سننے ہی میں نہیں آیا، جس کے الفاظ کم ہوں اور معنی بہت ہوں۔ اللہُ اکبر! اس کلمے کے معنی کتنے بلند اور اس حکمت کا سرچشمہ کتنا صاف وشفاف ہے کہ تشنگانِ علم وحکمت کو سیراب کرتا ہے۔ ہم نے اپنی کتاب "خصائص" میں اس فقرے کی عظمت اوراس کے معنی کی بلندی پر روشنی ڈالی ہے۔"

شرح وتفسیر

ہلکے پھلکے ہوجاؤ تاکہ منزل تک پہنچ جاؤ

نہج البلاغہ کے ۱۶۷ ویں خطبے کا یہ جملہ جو کچھ فرق کے ساتھ اس خطبے کے ضمن میں بیان ہوا ہے۔ سیّد رضی مرحوم کے اس کلام سے استفادہ ہوتا ہے کہ امامؑ نے اس کو اپنی خلافت کے آغاز میں بیان فرمایا ہے۔ مگر کتاب "مطالب السئول" کے مطالعے سے استفادہ ہوتا ہے کہ یہ خطبہ بیسویں خطبے اور اُن ہی مطالب کا تسلسل ہے۔[1] اور یہ احتمال بھی موجود ہے کہ ان تینوں خطبوں کو امیر المومنینؑ نے ایک ساتھ بیان فرمایا ہے، پھر بعد میں تین حصوں میں تقسیم کردیا گیا ہے۔ بہر حال خطبے کا یہ حصہ چند جملوں سے زیادہ نہیں ہے۔ سیّد رضیؒ کی گفتگو میں یہ خدا اور رسولؐ کے کلام کے علاوہ، ہر کلام سے کس قدر گہرا، پُرمعنی اور شفاف ہے اور سب پر سبقت لے جائے گا، سچ بات بھی یہی ہے۔ یہ کیسی فصاحت وبلاغت ہے کہ چھوٹے چھوٹے جملوں میں اس قدر بلند حقائق بیان ہوتے ہیں۔

حضرت امیر المومنینؑ لوگوں کو پہلے ہی خطبے میں قیامت کے مسئلے کی طرف اور عدالتِ الٰہی کے کٹہرے کی طرف اور اس طریقے سے ان کو اپنی خلافت کے دوران پیش آنے والے حالات میں بڑی ذمے داریوں کی طرف متوجّہ فرماتے ہیں اور ہر قسم کی منافقت سے دوری اور تخریب کاری اور اختلافات سے بچانے کی کوشش کرتے ہیں اور فرماتے ہیں:

فَإِنَّ الْغَايَةَ أَمَامَكُمْ، وَإِنَّ وَرَاءَكُمُ السَّاعَةَ تَحْدُوكُمْ۔[2]

---

[1] منہاج البراعۃ، جلد ۳، ص ۳۰۱

[2] تحدوکم کا مادّہ حدو اور حدیٰ ہے، اس کے معنی مخصوص آواز کے ساتھ اونٹ چلانے کے ہیں، اور عام طور پر جو بھی چیز آواز کے ساتھ چلائی جائے اس پر اطلاق ہوتا ہے۔

www.shiabookspdf.com

"یقیناً منزل (قیامت کے برپا ہونے، بہشت اور دوزخ) تمہارے سامنے ہے اور موت کی گھڑی تمہاری پیچھے ہے اور وہ تمہیں لے کر ساتھ چل رہی ہے۔"

"الغایۃ" سے مراد انجام کار، قیامت کے برپا ہونے اور بہشت وجہنم ہے، یہ جملہ اس لیے ہے کہ اس دنیا کی زندگی ہمیشہ رہنے والی دوسری دنیا کی زندگی کے لیے دیباچہ ہے۔ اور یہ جوفرمایا ہے: "وہ تمہارے سامنے ہے" سے مقصود یہ کہ قیامت کے برپا ہونے میں شک وتردد نہیں ہے۔ "الساعۃ" کی تعبیر کے بارے نہج البلاغہ کے بعض شارحین نے کہا ہے کہ اس سے مراد قیامت صغریٰ یعنی موت ہے۔

یہ جو کہا ہے کہ "قیامت تمہارے پیچھے ہے" یہ اس وجہ سے ہے کہ موت کے اسباب انسان کے تعاقب میں ہیں۔ موت اس کا بچپنے سے جوانی اور جوانی سے بڑھاپے اور بڑھاپے سے زندگی ختم ہونے تک پیچھا نہیں چھوڑتی۔ بعض نے کہا ہے کہ "الساعۃ" سے مراد شب وروز کے اوقات ہیں، جیسے اس کی ذمے داریاں یکے بعد دیگرے قطار میں کھڑی ہیں اور زندگی کے اختتام تک انسان ان ہی ذمے داریوں کو نبھانے میں مصروف رہے گا۔ ان دو تفاسیر میں کوئی خاص فرق نہیں دونوں کا ماحصل اور نتیجہ ایک ہی ہے۔

کلمہ "تَحْدُوْکُمْ" جو کہ حدو کے مادّے سے ہے (اونٹ کو مخصوص آواز کے ساتھ چلانے کے معنی میں آتا ہے)۔ اس سے یہ نکتہ سمجھ میں آتا ہے کہ شب وروز اور ماہ وسال کی گردش اگرچہ انسان کو زندگی کے خاتمے کے نزدیک کر دیتی ہے، مگر دنیا کے زرق برق، پیسے روپے اور اس کی سرگرمیاں انسان کو اصل ہدف سے غافل کر دیتی ہیں۔

درحقیقت یہ مختصر جملہ جو اس خطبے کے شروع میں آیا ہے، قیامت کبریٰ اور قیامت صغریٰ دونوں کی طرف اشارہ ہو سکتا ہے اور سننے والوں کو بعد میں آنے والی گفتگو کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ حضرت امام علیؑ پھر اس مختصر جملے کو ارشاد فرماتے ہیں جو انتہائی صاف وشفاف معنی بیان کرتا ہے "تَخَفَّفُوْا تَلْحَقُوْا" ہلکے پھلکے ہو جاؤ تاکہ منزل تک پہنچ جاؤ۔

جب بھی کوئی کارواں راستہ چلتا ہے اور جو گروہ اس میں شامل ہیں اور سامان سے لدے ہوئے ہیں وہ کارواں کے ساتھ راستے کے پیچ وخم اور کھائیاں عبور کرنے سے پیچھے رہ جاتے ہیں اور قافلہ ایک نفر یا چند نفر کے انتظار میں اس جگہ زیادہ ٹھہر بھی نہیں سکتا، پس ان کو چھوڑ کر چل دیتے ہیں اور ایسے ہی لوگ چوروں، صحرائی ڈاکوؤں اور بھیڑیوں کے لیے بہترین لقمہ اور شکار ہیں۔ اور جو ہلکے پھلکے سامان کے ساتھ ہیں وہ قافلے کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور وہ دوسروں سے پہلے اپنی منزل تک پہنچ جاتے ہیں۔

انسان اس دنیا کی زندگی میں ایک ایسے مسافر کی طرح ہے کہ جس نے سامان سفر باندھا ہو اور اپنی اصل منزل

www.shiabookspdf.com

(قیامت کی زندگی) کی طرف بڑھ رہا ہو اور جنہوں نے اپنے سامان کو دنیاوی چیزوں سے بھاری کر لیا ہے، وہ قیامت کی زندگی کے نشیب و فراز میں پیچھے رہ جاتے ہیں اور شیطان کا شکار بن جاتے ہیں، لیکن پرہیز گار اور زہد و تقویٰ والے لوگ جنہوں نے اپنی زندگی کو دنیاوی چیزوں سے میلا نہیں ہونے دیا، وہ قیامت کے پیچ و خم، راستوں اور کھائیوں کو جلدی سے طے کر لیتے ہیں اور ہمیشہ کی سعادت پا لیتے ہیں۔

خطبہ نمبر ۲۰۴، یہ وہی خطبہ ہے جسے حضرت امام علی علیہ السلام نے اپنے اصحاب کو مخاطب کرتے ہوئے کئی بار ارشاد فرمایا۔ ہم یہاں پھر نقل کرتے ہیں:

"تَجَهَّزُوا رَحِمَكُمُ اللهُ، فَقَدْ نُودِيَ فِيكُمْ بِالرَّحِيلِ وَ أَقِلُّوا الْعُرْجَةَ عَلَى الدُّنْيَا ... فَإِنَّ أَمَامَكُمْ عَقَبَةً كَؤُوداً وَمَنَازِلَ مَخُوفَةً مَهُولَةً"

"خدا تم لوگوں پر رحم کرے، ایک انتہائی سخت اور مشکل پیش قدمی کے لیے تمہارے درمیان اعلان کیا جا چکا ہے۔ دنیا میں مزید زندگی گزارنے کا ارادہ ترک کر دیں کہ آگے سخت اور دشوار گزار راہیں اور خوفناک منازل راستے میں آئیں گی اور انہیں انسان کو تنِ تنہا طے کرنا ہے۔"

نہج البلاغہ کے بعض شارحین نے انسانوں کو مسافروں سے تشبیہ دی ہے کہ جو سمندری طوفانوں اور لہروں میں سفر کرتے ہیں۔ اگر کشتی ہلکی نہ ہو تو اس کا غرق ہونا حتمی ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ "گرداب" سے مراد اس دنیاوی زندگی کی موجیں ہیں اور "کشتی" سے مراد انسانوں کے دل ہیں جنہیں حُبِ دنیا بھاری کر دیتی ہے۔ غرق کرنے کے لیے بھنور کے گرداب میں پھینک دیتی ہے۔[1]

امیر المومنینؑ مذکورہ دستور کی اس جملے کے ذریعے سے تکمیل فرماتے ہیں:

"فَإِنَّمَا يُنْتَظَرُ بِأَوَّلِكُمْ آخِرُكُمْ"

"اگلوں کو پیچھے آنے والوں کے انتظار میں روکا گیا ہے۔"

یہ جملہ اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ تمام بشریت ایک قافلے کے حکم میں ہے، ان میں سے کچھ گروہ سب سے پہلے اس راستے پر سفر کے لیے نکل چکے ہیں اور کچھ گروہ درمیان میں سفر جاری رکھے ہوئے ہیں اور آخر میں کچھ گروہ سفر پر نکلے ہوئے ہیں۔ یہ تمام گروہ ایک ہی راستے پر چل رہے ہیں۔ اور قیامت کے برپا ہونے کے بعد محشر کے میدان میں یہ لوگ ایک دوسرے سے ملیں گے۔

[1] معارج نہج البلاغہ، محقق بیھقی، ص ۱۰۹

www.shiabookspdf.com

اس مثال کو یوں بھی پیش کیا جاسکتا ہے کہ موت کے قانون سے کسی کو بھی استثنٰی نہیں اور یہ بھی یقین ہے کہ تمام انسانوں کی گفتار و کردار و رفتار، حرکات و سکنات کو لکھا جاچکا ہے۔ اس بنا پر اگلوں کے اعمال آنے والوں اور پیچھے رہ جانے والوں کے لیے ہوشیار کرنے اور سب کے لیے روشنی کا پیغام دیتے ہیں۔

نکتہ

بھاری بوجھ والوں کی حالتِ زار

انسانی گروہ کی بدبختی اور شکست کے اہم ترین عوامل میں وہی چیزیں ہیں، جن کی طرف چند مختصر جملوں میں اشارہ ہوا، یعنی انسان اپنی دنیاوی سادہ زندگی کو ایسے کاموں سے جن کی ہرگز کوئی ضرورت نہیں تھی ان کے ذریعے آخرت کے سامان کو بھاری کردے۔ فرض کریں ایک مسافر ایک دن کے سفر کے لیے اپنے ساتھ کچھ روٹیاں، کچھ مقدار نمکو، پھل، اپنے حساب سے لیتا ہے اور ایک رومال میں باندھ کر سفر کے سامان میں رکھ دیتا ہے۔ اس کے برعکس ایک اور مسافر کو فرض کریں کہ وہ اپنے ساتھ سالن، کھانے پینے کے کئی تھیلیاں اور مٹھائیوں کے کئی ڈبے اور میوہ جات کی ٹوکریاں اسی ایک دن کے سفر کے لیے لے کر چلتا ہے۔

یہاں دیکھنا یہ ہے کہ پہلا مسافر آرام و راحت سے سفر کی منزلیں طے کرتا ہے یا دوسرا مسافر؟ یہاں ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ پہلا مسافر آرام و راحت کے علاوہ عزّت و وقار اور ہلکا پھلکا ہو کر بغیر کسی تھکن کے منزلِ مقصود کی طرف تیزی کے ساتھ بڑھ رہا ہے اور دوسرا مسافر ہر لمحے سامان کو سنبھالتے، ہانپتے کانپتے، جھکتے اٹھتے، پسینے میں شرابور ذلّت و خواری، تھکن سے چُور ہو کر اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہے۔

یہ احوال اُن لوگوں کا ہے جو مالِ دنیا کی فراوانی اور اس کی چمک دمک میں مگن رہتے ہیں اور رات دن انسان مال کے حساب کتاب اور اس کی حفاظت کی فکر میں دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو کر غرق رہتا ہے، جس کی وجہ سے نہ اسے خدا یاد آتا ہے اور نہ قیامت کی فکر رہتی ہے، بلکہ اس کے ساتھ دنیا کا آرام و راحت بھی اس سے چھن جاتا ہے۔ یہاں پر نہج البلاغہ کے بعض شارحین نے حضرت سلمان فارسیؓ کا ایک قصّہ نقل کیا ہے کہ جو مذکورہ گفتگو کے لیے بہترین دلیل ہے۔ وہ قصّہ کچھ اس طرح ہے:

"جب حضرت سلمان فارسیؓ مدائن کے گورنر کی حیثیت سے منتخب ہوئے تو سواری کے لیے جو جانور آپؓ کے پاس تھا اس پر آپؓ سوار ہوئے اور اکیلے سفر شروع کیا۔ اور مدائن کے شہروں میں آپؓ کی آمد کی خبر پھیل گئی۔ لوگوں نے گروہوں کی

www.shiabookspdf.com

شکل میں اپنے آپ کو حضرت سلمان فارسیؓ کے استقبال کے لیے تیار کیا۔[1] لوگ شہر کے بڑے دروازے پر نئے گورنر کے استقبال کے لیے انتظار میں تھے کہ ایک بوڑھے آدمی کو دیکھا جو ایک حیوان پر سوار ہے اور اکیلے شہر کی طرف بڑھا چلا آرہا ہے۔ جب آپؓ شہر کے دروازے پہنچے تو لوگوں نے آپؓ سے سوال کیا:

"اے آنے والے بزرگ! کیا تم نے راستے میں ہمارے امیر کو تو نہیں دیکھا؟"

آپؓ نے ان سے سوال کیا:

"تمہارا آنے والا امیر کون ہے؟"

لوگوں نے کہا:

"ہمارے نئے امیر سلمان فارسیؓ ہیں جو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابی ہیں۔"

آپؓ نے کہا:

"میں کسی امیر کو تو نہیں جانتا، مگر سلمان میں ہوں جو تمہارے سامنے کھڑا ہوں۔"

سب ان کے احترام میں اپنی اپنی سواریوں سے اتر پڑے اور ان کے ہاتھوں اور پیشانی کو بوسے دینے لگے، اس کے بعد بہترین سواریاں پیش کی گئیں اور التماس گذار ہوئے:

"ان سواریوں میں سے کسی سواری پر سوار ہو جائیں۔"

آپؓ نے کہا:

"میرے لیے اپنی سواری ان تمام سواریوں سے بہتر ہے۔"

یوں شان و شوکت کے ساتھ شہر میں داخل ہوئے۔

جب شہر میں داخل ہوئے تو انہوں نے مشورہ دیا:

"یہاں سے سیدھے گورنر ہاؤس چلیں۔"

حضرت سلمان فارسیؓ نے کہا:

"میں نے تم لوگوں سے کہا ہے کہ میں تمہارا امیر نہیں ہوں، تو میں دار الامارہ (گورنر ہاؤس) کیا کرنے جاؤں۔"

---

[1] یہ بات یاد رہے کہ اُس وقت مدائن کی پوری حکومت میں یا مدائن کے بعض بڑے حصوں میں ایرانیوں کی آبادی تھی اور مدائن کی گورنری کے لیے حضرت سلمان فارسیؓ کا انتخاب نہایت مناسب اور صحیح تھا، کیوں کہ اس سے وہاں کے ایرانیوں کو ایک ایرانی کے وسیلے سے اسلام واقعی کی طرف بلانے اور قبول کرنے میں بہت مدد ملی۔

www.shiabookspdf.com

انہوں نے بازار میں ایک دکان کرائے پر لے کر اُسے مرکزِ حکومت اور عدالت گاہ بنا دیا۔ ان کے پاس جو چیزیں تھیں اس میں رکھ دیں۔ ان کے پاس بچھا کے بیٹھنے کے لیے ایک چھوٹی سی دری (ٹاٹ) وضو کرنے کے لیے ایک لوٹا اور راستے میں کام میں لانے کی ایک چھڑی تھی۔

حضرت سلمان فارسیؓ کی حکومت کے دنوں میں مدائن میں زبردست سیلاب آیا اور شہر کے بڑے حصے میں پانی بھر گیا۔ ہر طرف سے لوگوں کے شور وغل سنائی دینے لگے، ایک گروہ چیخ رہا ہے کہ ہمارے بچے کیا ہوئے؟ ہمارے خاندان والے کس عذاب میں گرفتار ہو گئے؟ ہمارے مال و متاع پر کیا آفت آ گئی۔ سلمان فارسیؓ نے بچھانے کی وہی دری (ٹاٹ) کندھے پر رکھا، پانی کا لوٹا اور چھڑی سنبھالی اور ایک بلندی پر جا کے بیٹھ گئے۔ اس کے بعد کہا:

"هٰكَذَا يَنْجُو الْمُخَفَّفُونَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ"

"اس طرح جو زندگی کا سامان مختصر رکھے گا وہ قیامت کے دن نجات پانے والوں میں سے ہوگا۔"[1]

حضرت سلمان فارسیؓ وہ ہستی ہیں جنہوں نے جنگِ احزاب میں لشکرِ اسلام کی نجات کے لیے ایک بہترین اور خصوصی تدبیر کا مشورہ دیا۔ ایسا نہ تھا کہ ان مخصوص حالات میں لوگوں کے مسائل سے غافل رہیں، ان کا مقصد یہ تھا کہ مدائن کے پائے تخت میں رہنے والے اُس وقت کے ایرانی لوگ دولت و ثروت اور جاہ وحشمت پرستی کو چھوڑ کر باہر نکل آئیں۔ انہیں مال و دولت کی چمک دمک میں غرق زندگی کے انجام سے خبردار کرنا چاہتے تھے کہ اس قسم کی گھناؤنی زندگی گزارنے سے کسی بڑی مصیبت میں گرفتار ہونے اور اس کے بُرے انجام سے آگاہ کریں۔ یہ وہی باتیں ہیں جو حضرت امام علی علیہ السلام نے مذکورہ خطبے میں دو نہایت مختصر جملوں میں بیان فرمائیں، مگر معنی کے اعتبار سے سمندر کو کوزے میں سمویا ہوا ہے۔ فرمایا:

"تَخَفَّفُوا تَلْحَقُوا"

"ہلکے پھلکے ہو جاؤ تا کہ منزل تک آسانی سے پہنچ سکو۔"

یہاں سے ہم کلامِ سیّد رضیؒ کی طرف چلتے ہیں، جو انہوں نے اس خطبے کے بعد ذکر کیا ہے، فرماتے ہیں:

"امامؑ کی یہ گفتگو خدا اور رسولؐ کے کلام کے بعد سب سے بہتر و برتر گفتگو میں شمار ہوتی ہے اور اس سے رہنمائی ملتی ہے، خصوصاً جملہ "تَخَفَّفُوا تَلْحَقُوا" ایسا کلام ہے کہ اس سے مختصر اور معنی و مفاہیم سے پُر جملہ نہ سنا گیا اور نہ دیکھا گیا ہے۔ کیا گہرا اور عمیق جملہ ہے! اور کیا معنی و مفاہیم سے پُر اور حکمت آمیز جملہ ہے! اس کلام سے حکمت والوں کی تشنہ روحوں کو سیراب کیا جا سکتا ہے۔ اس کلام کی اہمیت و عظمت کے بارے میں کتاب "خصائص" میں بھی بحث کی گئی ہے۔"

[1] منہاج البراعۃ، جلد ۳، ص ۳۰۴

www.shiabookspdf.com

www.shiabookspdf.com

بائیسواں خطبہ

ومن خطبة عليه السلام [1]

"حِيْنَ بَلَغَهُ خَبَرُ النَّاكِثِيْنَ بِبَيْعَتِهٖ وَ فِيْهَا يَذُمُّ عَمَلَهُمْ وَ يَلْزَمُهُمْ دَمَ عُثْمَانَ وَ يَتَهَدَّدُهُمْ بِالْحَرْبِ"

جب آپؑ کو خبر دی گئی کہ کچھ لوگوں نے آپؑ کی بیعت توڑ دی ہے اور آپؑ پر خلیفہ ثالث کے قتل کا الزام لگا کر جنگ کرنا چاہتے ہیں۔ تو فرمایا:

پہلا حصّہ

"اَلَا وَ اِنَّ الشَّيْطَانَ قَدْ ذَمَّرَ حِزْبَهٗ وَ اسْتَجْلَبَ جَلَبَهٗ لِيَعُوْدَ الْجَوْرُ اِلٰى اَوْطَانِهٖ وَ يَرْجِعَ الْبَاطِلُ اِلٰى نِصَابِهٖ وَ اللّٰهِ مَا اَنْكَرُوْا عَلَيَّ مُنْكَرًا وَ لَا جَعَلُوْا بَيْنِيْ وَ بَيْنَهُمْ نَصِفًا."

"معلوم ہونا چاہیے کہ شیطان نے اپنے گروہ کو بھڑکانا شروع کر دیا اور اپنی فوجیں فراہم کر لی ہیں تاکہ ظلم اپنی انتہا کی حد تک اور باطل اپنے مقام پر پلٹ آئے۔ خدا کی قسم! انہوں نے مجھ پر کوئی سچا الزام نہیں لگایا اور نہ انہوں نے میرے

---

[1] اس خطبے کو مرحوم شیخ مفید نے ارشاد میں، ۲۲ ویں فصل میں کلمات امیر المؤمنینؑ کے ذیل میں۔ اور کلینیؒ نے کتاب کافی میں جلد ۵، ص ۵۳۔ کتاب جہاد میں دیگر خطبوں کے ساتھ بطور ضمیمہ لکھا ہے۔ مرحوم علامہ مجلسیؒ نے کتاب "بحار الانوار" میں جلد ۳۲، ص ۱۹۳، شرح کی صورت میں نقل کیا ہے۔ ابن اثیر نے "نہایہ" میں چند جگہوں پر اس خطبے کو لغات کے اعتبار سے ذکر کیا ہے۔ مصادر نہج البلاغہ کے مصنف اس میں اضافہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ خطبہ امامؑ کے دیگر خطبوں سے لیا گیا ہے۔ وہ اسے ۲۶ ویں خطبے سے ربط دیتے ہیں اور اس خطبے کے ذیل میں اسے ۱۷۲ ویں خطبے کا حصہ مانتے ہیں۔ مصادر نہج البلاغہ، جلد ۱، ص ۳۷۳۔

www.shiabookspdf.com

اور اپنے درمیان کوئی انصاف برتا۔"

خطبہ، ایک نظر میں

یہ خطبہ جس طرح اس کے موضوعات سے پتا چلتا ہے کہ یہ طلحہ و زبیر کی طرف سے بیعت توڑنے اور پھر خلیفۂ ثالث کے قتل کو جنگِ جمل اور اُس کے بعد شام میں جنگ کی آگ بھڑکانے کے لیے بہانے کے طور پر استعمال کرنے کی طرف اشارہ فرماتے ہیں۔ یہاں پر امامؑ واضح طور پر ان لوگوں کی مذمت اور انہیں تنبیہ کرتے ہیں۔ خطبے کے آخر میں دشمنوں کی طرف سے خود کو دی گئی دھمکیوں کا ذکر کرتے ہیں، جن کا آپؑ نے ان کو دندان شکن جواب دیا ہے۔

یہ خطبہ اور ۱۰ ویں، ۲۶ ویں اور ۲۷ ویں خطبے کی آپس میں نسبتیں اور شباہتیں رکھنے کی وجہ سے قابل ملاحظہ ہے، اسی بنا پر احتمال ہے کہ ان خطبوں میں سے ہر خطبہ کسی ایک خطبے کا حصہ ہے، جسے سیّد رضیؒ نے تحقیق و تفحص کے بعد ہر کسی کو اس کی مناسبت کے حساب سے الگ الگ نقل کیا ہے۔

دلچسپ بات

عمرو عاص کی ایک روایت کے مطابق اس نے ایک روز حضرت عائشہ سے کہا:

"لَوَدَدْتُ أَنَّكِ قُتِلْتِ يَوْمَ الْجَمَلِ!"

"مجھے خوشی ہوتی کہ اگر تم جنگ جمل کے دن ماری جاتیں!"

حضرت عائشہ نے تعجب کے ساتھ پوچھا:

"وَلِمَ؟ لَا أَبَا لَكَ"

"اے بدذات، منحوس کس بنا پر؟"

عمرو عاص نے ان کے جواب میں کہا:

"كُنْتِ تَمُوتِينَ بِأَجَلِكِ وَتَدْخُلِينَ الْجَنَّةَ وَنَجْعَلُكِ أَكْبَرَ التَّشْنِيعِ عَلَى عَلِيٍّ"

"کیونکہ تم تو اپنی موت اس دنیا سے چلی جاتیں اور جنت میں داخل ہو جاتیں اور ہم تمہارے قتل کو علیؑ پر سبّ و شتم کے لیے جواز بنا دیتے۔"[1]

[1] علامہ مجلسیؒ نے اس حدیث کو "احتجاج طبری" سے نقل کیا ہے۔ بحار الانوار، جلد ۳۲، ص ۲۶۷، حدیث ۲۰۶

www.shiabookspdf.com

حضرت علی وآل علی علیہم السلام کے دشمن ایسی ہوشیاری سے حربے استعمال کرتے ہیں، مولا علی علیہ السلام کے ماننے والوں کو آنکھیں کھول کے بیٹھنا چاہیے۔ (مترجم)

نہج البلاغہ کے بعض شارحین اس خطبے کو جنگ صفین کے موقع پر بیان کردہ خطبوں میں سے شمار کرتے ہیں۔ اور اس میں اس جنگ کی نسبت کچھ اشارے ملتے ہیں جو امیر شام کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔[۱] لیکن سیّد رضیؒ نے جو مضامین ان کے لیے انتخاب کیے ہیں اور ابن ابی الحدید[۲] کی گفتگو سے بھی یہ استفادہ ہوتا ہے کہ اس خطبے کے مضامین ہر لحاظ سے دونوں گروہوں (ناکثین یعنی دھوکے بازوں، مارقین یعنی ظلم وستم کرنے والوں) سے بھی نسبت رکھتے ہیں اور صرف جنگ جمل کے عہد وپیمان توڑنے والوں سے بھی نسبت رکھتے ہیں۔

شرح وتفسیر

جنگ جمل کی آگ بھڑکانے والے

جس طرح پہلے اشارہ ہوا کہ یہ خطبہ جنگ جمل کی آگ بھڑکانے والے طلحہ وزبیر اور ان کے دوستوں کی خیانت کاری پر مشتمل ہے، یہ دونوں حکومت کی ہوس میں دیوانے ہوئے جارہے تھے۔ اور امیر المومنینؑ سے حکومتی اہم مناصب کے حصول میں ناکامی کے بعد نفسِ امارہ کی ہوس اور وسوسۂ شیطانی کی بنا پر امام علیؑ سے اپنی جھوٹی بیعت توڑ دی اور لوگوں کے کچھ گروہوں کو اپنے گرد جمع کرلیا اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہمسر حضرت عائشہ کو مذموم مقاصد کی تکمیل کے لیے اپنے ساتھ ہم

[۱] شرح قطب الدین راوندی، جلد ۱، ص ۱۸۸

[۲] شرح نہج البلاغہ، ابن ابی الحدید، جلد ۱، ص ۳۰۵

www.shiabookspdf.com

راز وہم عقیدہ بنالیا اور خلیفۂ ثالث کے خون کے انتقام کے عنوان سے ولیِ خدا کے خلاف قیام کیا۔[1]

اور بصرہ کو کئی سمتوں سے اپنے فاسد کاموں کے لیے پروپیگنڈے کا مرکز بنالیا۔ امامؑ اس خطبے کی ابتدا میں ہی اس سازش کی طرف اشارہ فرماتے ہیں:

أَلَا وَإِنَّ الشَّيْطَانَ قَدْ ذَمَّرَ[2] حِزْبَهُ وَاسْتَجْلَبَ جَلَبَهُ[3] لِيَعُودَ الْجَوْرُ إِلَى أَوْطَانِهِ، وَيَرْجِعَ الْبَاطِلُ إِلَى نِصَابِهِ[4]۔

"ہوشیار ہو جاؤ! شیطان نے اپنے گروہوں اور سپاہیوں کو اپنے گرد جمع کر لیا ہے، تا کہ ظلم اپنی منزل کی طرف پلٹ آئے اور باطل اپنے مرکز کی طرف واپس آجائے۔"

یہ گفتگو فتنہ وفساد پھیلانے والوں کی سرگرمیوں کی طرف اشارہ ہے، جو خلیفۂ ثالث کے قتل اور لوگوں کی حضرت علی علیہ السلام کی بیعت کے بعد سامنے آئیں۔ یہاں شیطانی گروہ سے مراد وہ لوگ ہیں جو خلیفۂ ثالث کے زمانے میں بیت المال کا غلط استعمال اور اسلامی مملکت کی کھال اُدھیڑ رہے تھے اور خلیفۂ ثالث کے بعد خود خلافت وحکومت کو حاصل کرنے کے لیے دنوں کی گنتی کر رہے تھے۔

امامؑ نے اس معنی خیز گفتگو میں خبردار کیا ہے کہ آگاہ ہو جاؤ! شیطان صفت لوگ پروپیگنڈے کے ذریعے پھر جمع ہو گئے ہیں، تا کہ تمہیں پھر سے ظلم وستم کی جہالت اور باطل کی طرف پلٹا دیں، اور ان کا ہدف یہ ہے کہ اسلامی سرزمین میں

---

[1] امیر شام کی جانب سے صرف خلیفۂ ثالث کے خون کا انتقام نہیں تھا، بلکہ بیعت شکن طلحہ وزبیر اور عائشہ کے ذریعے جنگ جمل میں قتل وغارت گری اس لیے کی گئی، تا کہ امیر شام اپنی آگ بھڑکانے کے لیے ثبوت پیش کر سکے۔ مشہور مؤرخ ابن اثیر کتاب "کامل ابن اثیر" میں لکھتے ہیں کہ حضرت عائشہ جب مکہ و مدینہ کے درمیان سے آرہی تھیں، راستے میں خلیفۂ ثالث کے قتل کی خبر اور لوگوں کی امیر المؤمنینؑ کے ہاتھ پر بیعت کی خبر جب سنی تو بہت افسوس ہوا اور کہا: اے کاش! آسمان زمین پر گر پڑتا اگر ایسے کام ہونے لگے اور پھر حکم دیا کہ مکے واپس چلو۔ وہ کہتی تھیں کہ خدا کی قسم خلیفۂ ثالث مظلومانہ طریقے سے مارے گئے! خدا کی قسم! میں ان کا انتقام لینے والوں میں سے ہوں گی یعنی میں ان کے خون کا انتقام ضرور لوں گی۔ حاضرین میں سے کسی نے ان سے کہا: تم تو سب سے پہلے خلیفۂ ثالث کے خلاف بولنے والی بھی تو تھیں اور آج سب سے پہلے ان کی حمایت میں بولنے والی بھی ہو۔ تم وہی تو ہو کہ جس نے خلیفۂ ثالث کو نعثل کہہ کے پکارا تھا (نعثل، لمبی داڑھی والا ایک یہودی تھا)۔ لسان العرب میں آیا ہے کہ یہ کلمہ بوڑھے احمق شخص کے لیے کہا جاتا ہے۔ اور تم ہی نے کہا تھا کہ اس نعثل (خلیفۂ ثالث) کو قتل کر دو یہ کافر ہو گیا ہے۔ (کامل ابن اثیر، جلد ۳، ص ۲۰۶۔ تاریخ طبری، جلد ۳، ص ۴۷۷)

[2] ذمّر، ذمر کے مادّے سے ہے اور جوش دلانے اور ہمت دلانے کے معنی میں آتا ہے۔ اور کبھی یہ کلمہ ملامت اور سرزنش کے معنی آتا ہے، اس بنا پر بروزن ذہن اس کے معنی مرد شجاع اور متحرک کے ہیں۔

[3] جلب، جگہ بدلنا، ایک جگہ سے دوسری جگہ رکھنے کے معنی میں آتا ہے۔ ایسے افراد جو آسانی سے ایک دوسرے کے گرد جمع ہو جاتے ہیں اسے جلب کہتے ہیں۔ "استجلب" بھی جمع کرنے کے معنی میں آتا ہے۔

[4] انصاب، نصب کے مادّے سے ہے، اس کا معنی کسی چیز یا کسی جگہ کی مقدار، میزان، حد، تعداد ہے۔ یعنی ہر چیز کی بنیاد اور اصل کو نصاب کہتے ہیں۔

www.shiabookspdf.com

ظاہر و آشکار ظلم و فساد اور بیت المال میں لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم کریں اور امامِ وقتؑ کو اسلامی معاشرے کی اصلاح اور خلیفۂ ثالث کے دور میں اسلام و مسلمین کے پیکر پر لگائے گئے زخموں پر مرہم پٹی رکھنے سے باز رکھیں۔

آپؑ اپنی گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے اس حقیقت کو واضح فرماتے ہیں کہ ان شر پھیلانے والے شیاطین کے پاس اس مخالفت کے لیے جو وہ لوگ کر رہے ہیں کوئی دلیل نہیں ہے اور تابع کرنے کے لیے ہر روشن و واضح منطق اور دلیل ان کے لیے بے سود ہے۔

اس کے بعد فرماتے ہیں:

"وَاللهِ! مَا أَنْكَرُوا عَلَيَّ مُنْكَرًا، وَلَا جَعَلُوا بَيْنِي وَبَيْنَهُمْ نَصِفًا [1]

"خدا کی قسم! میرے خلاف ان کے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے اس کے برعکس انہوں نے میرے اور خود کے درمیان انصاف کو حاکم ماننے سے انکار کر دیا ہے۔"

اس جملے میں، امامؑ بیعت توڑنے والے دھوکے باز دو بڑے شیطانوں طلحہ و زبیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کنایتاً ان کے بے بنیاد اور کمزور بہانوں کی طرف اشارہ فرماتے ہیں کہ ان لوگوں کا بہانہ خلیفۂ ثالث کے خون کا بدلہ تھا کہ جس کی بنیاد پر جنگِ جمل کی آگ بھڑکائی گئی۔ اس کے بعد کے جملوں میں تفصیل کے ساتھ گفتگو فرمائی جس سے ان لوگوں پر کاری ضرب پڑتی ہے۔

جی ہاں! تمام تاریخی کتابیں گواہی دیتی ہیں کہ خلیفۂ ثالث کے قتل کی امامؑ کی جانب جو نسبت دی گئی ہے ایسی کوئی چیز نہیں تھی، بلکہ مسلمانوں کے درمیان سے فتنہ و فساد کو ختم کرنے کے لیے جس نے کوششیں کیں وہ صرف امام علی علیہ السلام تھے۔ عہد و پیمان توڑنے والوں نے اس سلسلے میں کیے گئے اپنے فیصلوں میں انصاف سے کام نہیں لیا اور واضح تہمتوں کا سہارا لیا، البتہ یہ روش غیر متوقع نہیں جب کسی کا کوئی غیر مشروع مفاد مدِّ نظر ہو۔ ہمارے دور میں بھی ایسے نمونے مشاہدے میں آتے ہیں کہ ظلم و جور کے سرکردہ افراد غیر مشروع مفاد لینے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرتے ہیں۔

نکتہ

الٰہی گروہ اور شیطانی گروہ

[1] نصف، بروزن الف اور نَصَف، بروزن جسم دونوں کے معنی انصاف، عدالت اور حدِ اعتدال ہیں۔

www.shiabookspdf.com

جس طرح اوپر کے جملوں میں حضرت امام علی علیہ السلام نے جن چیزوں سے متعلق ایک لطیف اشارہ فرمایا ہے، وہی چیزیں قرآن مجید میں سورہ مجادلہ کے آخر میں بیان ہوئی ہیں۔ وہاں پر تمام انسانوں کو دو گروہوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ان میں سے ایک رحمانی گروہ (حزب اللہ) دوسرا شیطانی گروہ (حزب شیطان) اور حزب اللہ کی اصل نشانی یہ ہے کہ اللہ سے دوستی رکھے گا اور "بغض فی اللہ" حزبِ شیطان کی نشانی اللہ سے دشمنی رکھنا ہے۔ اس حقیقت کے بیان کے ضمن میں سچے مومنین دشمنانِ خدا سے ہرگز دوستی اور محبت کے لیے رابطہ برقرار نہیں رکھیں گے، اگرچہ اپنے نزدیک ترین افراد جیسے ماں باپ، بیٹا اور بھائیوں کی صورت میں ہی کیوں نہ ہوں۔ آگے فرماتے ہیں:

"أُولَٰئِكَ حِزْبُ اللَّهِ ۚ أَلَا إِنَّ حِزْبَ اللَّهِ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿٢٢﴾"[1]

"یہ لوگ، اللہ کا گروہ ہیں، آگاہ ہو جاؤ! اللہ ہی کا گروہ کامیاب ہے۔"

ان کے مقابل ایسے گروہ ہیں جو اپنے منافع کی حفاظت کے لیے دشمنانِ خدا سے دوستی کے لیے رابطہ برقرار رکھتے ہیں اور منافقت اور دوغلے پن کے ذریعے اپنے مال ومتاع کے گھمنڈ میں آگے بڑھتے ہیں اور بندگانِ خدا کے درمیان ظلم و فساد کا بیج بوتے ہیں۔ قرآن مجید ان کے بارے میں فرماتا ہے:

"اِسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطَانُ فَأَنْسَاهُمْ ذِكْرَ اللَّهِ ۚ أُولَٰئِكَ حِزْبُ الشَّيْطَانِ ۚ أَلَا إِنَّ حِزْبَ الشَّيْطَانِ هُمُ الْخَاسِرُونَ ﴿١٩﴾"[2]

"شیطان ان پر غالب آ گیا ہے اور یادِ خدا سے انہیں غافل کر دیا ہے، آگاہ ہو جاؤ! یہ شیطانی گروہ ہیں اور شیطانی گروہ نقصان میں ہیں۔"

ان دونوں گروہوں کا وجود نزول قرآن مجید اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں ہی نہیں تھا، بلکہ ہر زمانے میں ایک نئی شکل کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے۔ اس بارے میں ایک شاعر نے کہا ہے: میٹھا اور کھارا پانی اسرافیلؑ کے صور پھونکنے تک باقی رہے گا۔ اگر آج ہم اس جہاں کا نظارہ کریں تو روزِ روشن کی طرح نظر آتا ہے کہ یہ دو گروہ ایک دوسرے کے مدمقابل صف آرا ہیں۔

شیطانی گروہ ہر وقت طاقت و دولت کے بل بوتے پر ظلم و بربریت اور فساد کے بیج بونے میں مشغول ہے جب کہ الٰہی گروہ اللہ کے دستورات پر کاربند رہ کر اگر ظاہراً ہاتھ خالی ہوں تو بھی اس ظالم گروہ کے مقابل استقامت دکھاتے نظر آتے

---

[1] سورۂ مجادلہ، آیت ۲۲

[2] سورۂ مجادلہ، آیت ۱۹

www.shiabookspdf.com

ہیں۔ شیطانی گروہ ہمیشہ کسی مناسب موقع کے انتظار میں رہتا ہے اور یہ موقع حکومتوں کی تبدیلی اور زمانے کی دگرگونی کے وقت ملتا ہے۔ اس کا روشن نمونہ حضرت علی علیہ السلام کی حکومت کے ابتدائی دنوں میں نظر آیا۔ خلیفۂ ثالث کے دور میں اپنی جانوں سے ہاتھ دھونے والے جاہل لشکروں کی اولادوں نے پروردگار کے خالص بندے کے مقابلے میں قیام کرنے کے لیے ایک دوسرے کا ساتھ دیا تاکہ وہ ظلم وستم جو حکومتِ مولا علی علیہ السلام میں ختم ہوا تھا، پھر سے زندہ کریں۔ مولاؑ کے فرمان کے مطابق ظلم اپنے وطن کی طرف چل پڑا اور باطل کی جڑیں انجام کو پہنچ چکیں۔

حضرت امیر المومنینؑ اپنی حکومت کے ان حساس لمحات میں اہلِ ایمان کو خبردار کرتے ہیں کہ ہوشیار رہو تاکہ لشکرِ شیطان کے جال میں مت پھنس جاؤ اور ان کی سازشوں کے شکار مت ہو جاؤ۔

ضمناً مذکورہ تعبیر سے یہ بات روشن ہو جاتی ہے کہ ظلم وجور کا وطن وہی جگہ ہے جہاں لشکرِ شیطان زندگی بسر کرتا ہے اور باطل کی بنیاد وہی اصول ہیں جن پر شیطانی گروہ کاربند ہے۔

دوسرا حصّہ

وَاِنَّهُمْ لَيَطْلُبُوْنَ حَقًّا هُمْ تَرَكُوْهُ وَدَمًا هُمْ سَفَكُوْهُ فَلَئِنْ كُنْتُ شَرِيْكَهُمْ فِيْهِ فَاِنَّ لَهُمْ لَنَصِيْبَهُمْ مِنْهُ وَلَئِنْ كَانُوْا وَلُوْهُ دُوْنِيْ فَمَا التَّبِعَةُ اِلَّا عِنْدَهُمْ وَاِنَّ اَعْظَمَ حُجَّتِهِمْ لَعَلٰى اَنْفُسِهِمْ يَرْتَضِعُوْنَ اُمًّا قَدْ فَطَمَتْ وَيُحْيُوْنَ بِدْعَةً قَدْ اُمِيْتَتْ يَا خَيْبَةَ الدَّاعِيْ مَنْ دَعَا وَاِلَامَ اُجِيْبَ وَاِنِّيْ لَرَاضٍ بِحُجَّةِ اللّٰهِ عَلَيْهِمْ وَعِلْمِهٖ فِيْهِمْ.

”وہ مجھ سے اس حق کا مطالبہ کرتے ہیں، جو خود ہی انہوں نے چھوڑ دیا ہے اور اس خون کا عوض چاہتے ہیں، جسے خود انہوں نے بہایا ہے۔ اب اگر اس میں، میں ان کا شریک تھا تو پھر اس میں ان کا بھی تو حصہ نکلتا ہے اور اگر وہی اس کے مرتکب ہوئے ہیں، میں نہیں تو پھر اس کی سزا بھی صرف انہی کو بھگتنا چاہیے۔ جو سب سے بڑی دلیل وہ میرے خلاف پیش کریں گے وہ انہی کے خلاف پڑے گی۔ وہ اس ماں کا دودھ پینا چاہتے ہیں، جس کا دودھ منقطع ہو چکا ہے۔ اور مری ہوئی بدعت کو پھر سے زندہ کرنا چاہتے ہیں۔ اُف کتنا نامراد، یہ جنگ کے لیے پکارنے والا ہے۔ یہ کون ہے جو للکارنے والا ہے، اور کس مقصد کے لیے اس کی بات سنی جا رہی ہے اور میں اس سے خوش ہوں کہ ان پر اللہ کی حجت تمام ہو چکی ہے اور ہر چیز اُس کے علم میں ہے۔“

www.shiabookspdf.com

شرح و تفسیر

حیلہ و بہانہ کرنے والے ذلیل لوگ

امامؑ اپنے اس وسیع خطبے میں اور اس سے پہلے بھی انتہائی مختصر انداز میں مگر وسیع معنی کے ساتھ شرح بیان فرماتے ہیں۔ اس میں عہد و پیمان توڑنے والوں اور مسلمانوں کے درمیان جنگ کی آگ بھڑکانے والوں کے دلائل سے ان پر کاری ضرب لگا کر محکوم کیا ہے۔ اس حصے میں آپؑ کی گفتگو سے خلیفۂ ثالث کے خون کا بدلہ لینے والے طلحہ و زبیر اور ان کے ساتھیوں کے اصلی مقاصد کی طرف اشارہ ہوتا ہے:

"وَإِنَّهُمْ لَيَطْلُبُونَ حَقًّا هُمْ تَرَكُوهُ وَدَمًا هُمْ سَفَكُوهُ"

"یہ لوگ ایسے حق کا مطالبہ کرتے ہیں کہ جسے انہوں نے خود ترک کیا ہے، اور ایسے خون کا انتقام مجھ سے چاہتے ہیں جسے انہوں نے خود بہایا ہے۔"

مشہور مؤرخ طبری اپنی تاریخ میں خلیفۂ ثالث کے کسی دوست سے نقل کرتے ہیں کہ جب لوگوں نے بلوہ کر کے خلیفۂ ثالث کو گھیرے میں لے لیا تو امام علی علیہ السلام خیبر میں تھے، جس وقت آپؑ واپس پہنچے تو خلیفۂ ثالث نے آپؑ کے پاس آدمی بھیج کر اپنے گھر بلایا۔ جب آپؑ وہاں پہنچے تو خلیفۂ ثالث نے خدا کی حمد و ثناء کی اور یوں آپؑ سے اظہار خیال کیا:

"میرے آپؑ پر کچھ حقوق ہیں، اسلام کا حق، اخوت و برادری کا حق اور خاندانی حق، اگر یہ حقوق بھی نہ ہوں تو اسلام سے قبل ہمارے درمیان عہد و پیمان اور کچھ رابطے ضرور تھے جن کی رُو سے ہم ایک دوسرے کے کام آسکتے ہیں۔"

امامؑ نے ان کی باتوں کی تصدیق فرمائی اور وہاں سے باہر نکل آئے اور طلحہ کو ڈھونڈتے ہوئے اس کے گھر پہنچے، وہاں لوگوں کا بہت بڑا مجمع تھا، آپؑ نے طلحہ سے فرمایا:

"اے طلحہ! یہ تو نے کیا شور شرابہ برپا کیا ہوا ہے؟"

طلحہ نے کہا:

"اب یہ باتیں کرنے کا وقت ہے، کام حد سے زیادہ آگے جا پہنچا ہے اور فتنہ و فساد بڑھ چکا ہے۔"

امیر المومنینؑ نے اس پر اپنی باتوں کا کوئی اثر نہیں دیکھا تو وہاں سے چلے گئے، خلیفۂ ثالث کے پاس واپس آئے اور بیت المال (خزانے) کی طرف تشریف لے گئے اور فرمایا:

www.shiabookspdf.com

"اس کا دروازہ کھول دو!"

مگر چابی نہیں ملی، تو آپؑ نے خزانے کا دروازہ توڑنے کا حکم دیا، جب دروازے کو توڑا گیا تو آپؑ نے فرمایا:

"بیت المال کے اندر سے تمام سامان باہر نکال کر لے آؤ۔"

باہر لا کر ڈھیر کر دیا گیا تو آپؑ نے بیت المال کو لوگوں میں تقسیم کرنا شروع کیا۔ یہ بات شہر میں پھیل گئی اور جو لوگ طلحہ کے گھر میں جمع تھے ان تک بھی یہ بات پہنچ گئی۔ تقسیم بیت المال کی بات سنتے ہی لوگ آہستہ آہستہ وہاں سے نکلتے چلے گئے اور صرف طلحہ وہاں باقی رہ گیا۔

یہ خبر جب خلیفۂ ثالث تک پہنچی تو وہ خوش ہوگیا، کیوں کہ طلحہ کا ان کے خلاف پروپیگنڈا ناکام ہوگیا تھا۔ جب طلحہ نے اپنے آپ کو تنہا پایا تو خلیفۂ ثالث سے ملاقات کے لیے چلا آیا اور اجازت لے کر بیٹھ گیا اور خلیفۂ ثالث سے کہا:

"یا امیر المؤمنین! أستغفر الله و أتوب الیه!" میں ایک کام کرنا چاہتا تھا، خداوند متعال اس میں مانع ہوگیا اور اب میں اپنے اس کام سے توبہ کرنے آیا ہوں۔"

خلیفۂ ثالث نے اس سے کہا: "خدا کی قسم! تُو توبہ کرنے نہیں آیا، بُری طرح شکست کھا کر آیا ہے اور خدا کے انتقام سے بچنے کے لیے یہاں بھاگ کر آیا ہے۔"[1]

طبری، کسی دوسری جگہ اپنی اسی تاریخ میں لکھتے ہیں: جس وقت خلیفۂ ثالث کو اس کے گھر میں قتل کیا گیا تو، سودان بن حمران نامی ایک شخص باہر نکلا اور کہا کہ طلحہ کہاں ہے؟ ہم نے خلیفۂ ثالث کو قتل کر دیا ہے۔[2]

ان ثبوتوں اور دیگر تاریخی شواہد سے بہ خوبی استفادہ ہوتا ہے کہ طلحہ خلیفۂ ثالث کو قتل کرنے والے اصل محرک میں سے ضرور تھا۔ حضرت عائشہ کا یہ معروف جملہ کہ انہوں نے صراحت کے ساتھ لوگوں کو خلیفۂ ثالث کے قتل کا حکم دیا اور کہا:

"أُقْتُلُوْا نَعْثَلًا! قَتَلَ اللّٰهُ نَعْثَلًا"

"نعثل (خلیفۂ ثالث) کو قتل کر دو! خدا نعثل کو قتل کردے۔"

ابن ابی الحدید، نہج البلاغہ کے کسی ایک خطبے میں جنگ جمل کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے صراحت کے ساتھ کہتے ہیں کہ تمام تاریخِ اسلام لکھنے والے یہ اعتراف کرتے ہیں کہ حضرت عائشہ، خلیفۂ ثالث کے سخت ترین دشمنوں میں سے تھیں۔ یہاں تک کہ اپنے گھر پر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا لباس آویزاں کر دیا تھا اور جو لوگ بھی اس کے قریب آ کر اسے دیکھتے

---

[1] تاریخ طبری، جلد ۳، ص ۴۵۳

[2] تاریخ طبری، جلد ۳، ص ۴۱۱

www.shiabookspdf.com

تھے ان سے کہتی تھیں، دیکھتے ہو کہ یہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کُرتا ہے جو ابھی میلا بھی نہیں ہوا ہے، لیکن خلیفۂ ثالث نے سنّتِ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرسودہ کر دیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ سب سے پہلے جس نے خلیفۂ ثالث کو نعثل کہا وہ حضرت عائشہ تھیں، وہ کہتی تھیں کہ نعثل کو قتل کر دو، خدا نعثل کو قتل کرے۔ [1]

یہاں تعجب کی بات یہ ہے کہ جو لوگ خلیفۂ ثالث کے خون کے انتقام کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں، بے ایمان و بے تقویٰ سیاست دان خود پارٹی کے لوگوں کے ذریعے سیاست چمکانے کے لیے پروپیگنڈا کرتے ہیں اور بعد میں دفاعی پوزیشن اختیار کرتے ہوئے اس پروپیگنڈے کے خلاف لڑتے بھی خود ہیں۔

امامؑ گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے فرماتے ہیں:

"فَلَئِنْ كُنْتُ شَرِيكَهُمْ فِيهِ فَإِنَّ لَهُمْ لَنَصِيبَهُمْ مِنْهُ وَلَئِنْ كَانُوا وَلُوهُ دُونِي فَمَا التَّبِعَةُ إِلَّا عِنْدَهُمْ."

"فرض کریں کہ میں خلیفۂ ثالث کے خون بہانے میں ان کے ساتھ شریک ہوتا تو اس صورت میں بھی وہ لوگ اس جرم میں شریک ہیں۔ لیکن اگر تنہا خود یہ لوگ اس قتل کے مرتکب ہوئے ہیں تو اس کے حساب کتاب اور سزا کے خود ذمے دار ہیں۔"

سب جانتے ہیں کہ یہ لوگ خلیفۂ ثالث کے قتل میں شریک تھے اور اگر فرض کی بنیاد پر مجھے بھی اس کام میں شریک سمجھتے ہیں (جب کہ اس قتل میں، میں شریک ہی نہیں تھا بلکہ اس فتنہ وفساد کی آگ کو بجھانے کے لیے میں نے بہت کوششیں کی ہیں) تو ان کے اس قتل میں شریک ہونے میں کبھی کسی کو کوئی انکار نہیں ہو سکتا اور اگر اصلی قاتل یہ لوگ ہیں تو انہیں جواب دہ ہونا چاہیے اور خلیفۂ ثالث کا خون ان کی گردن پر ہے۔ یہ کس قدر بے شرمی کی بات ہے کہ خلیفۂ ثالث کے قتل کا بدلہ یہ لوگ مجھ سے لینا چاہتے ہیں۔ آپؑ فرماتے ہیں کیوں کہ

"وَإِنَّ أَعْظَمَ حُجَّتِهِمْ لَعَلَى أَنْفُسِهِمْ."

"ثبوت کے طور پر پیش کی جانے والی اہم ترین دلیل خود ان کے خلاف ہے۔"

اور جو کچھ یہ کہتے ہیں اس کا وہ خود اصل مصداق ہیں۔ اب تک رازداری میں اور پس پردہ سب کچھ ہو رہا تھا، یہاں پر امامؑ ان کے راز کو فاش اور ظلم کے پردے چاک کرتے ہوئے فرماتے ہیں: یہ لوگ جو شور شرابہ کر رہے ہیں اس کا مقصد کچھ اور ہے، یہ لوگ مجھ سے خلیفۂ ثالث کے خون کے انتقام کی آڑ میں ان کی طرح کی حکومت اور بیت المال میں امتیازات ومراعات اور ہر طرح کی چھوٹ چاہتے ہیں، لیکن انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ وہ سیاہ دور گزر گیا اور واپس نہیں آئے گا۔ فرماتے ہیں:

---

[1] شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید، جلد ۶، ص ۲۱۵

www.shiabookspdf.com

"يَرْتَضِعُونَ أُمًّا قَدْ فَطَمَتْ وَيُحْيُونَ بِدْعَةً قَدْ أُمِيتَتْ."

"یہ لوگ ایک ایسی ماں سے دودھ پینے کے خواہش مند ہیں کہ جس کی چھاتیوں کو کاٹ دیا گیا ہو اور ایک ایسی بدعت پیدا کرنا چاہتے ہیں کہ جس کو مرے ہوئے کافی مدت گزر چکی ہے۔"

اس جملے کی تفسیر میں دوسرے احتمالات بھی آئے ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے "وہ ماں جس نے اپنی چھاتیوں کو کاٹ دیا ہو۔" یہ وہی دورِ جاہلیت کی سنتیں، بدعتیں اور تعصبات ہیں، جو نورِ اسلام کے پھیلنے سے پہلے ان کے درمیان رائج تھیں، یہ لوگ حکومت پر پہنچنے یا کسی خاص گروہ کی حمایت کے لیے تمام غیر اخلاقی وسائل سے استفادہ کرتے تھے۔ امیرالمومنینؑ اس جملے میں فرماتے ہیں کہ "وہ دور گزر گیا اور اس ماں کے چھاتیوں کو کاٹ دیا گیا، اب کوئی غلط وسائل اور جھوٹے بہانوں کے ذریعے اپنے نامشروع خواہشات کی تکمیل نہیں کرسکتا۔"[۱]

یہ تفسیر دوسرے جملے کے لیے مناسب تر ہے، جس میں کہا گیا ہے کہ "وہ لوگ مردہ بدعت کو دوبارہ زندہ کرنا چاہتے ہیں۔" دونوں جملوں کے لیے بھی یہ تفسیر مناسب نہیں، کیوں کہ ان دونوں جملوں کو ایک معنی میں لینا ظاہر لفظ کے خلاف ہے۔ بعض مفسرین کہتے ہیں "یہ لوگ خلیفۂ ثالث کے خون کے بدلے کے ساتھ درحقیقت ان کے طرزِ حکومت کو چاہتے ہیں"۔ جب کہ شورش برپا کرنے والے اُن لوگوں میں سے تھے، جنہوں نے خلیفۂ ثالث کے خلاف بغاوت کی اور ان کو قتل کر ڈالا۔ اس طرح وہ اس ماں سے جس کی چھاتیاں کاٹ دی گئی ہوں، دودھ پینا چاہتے ہیں۔ البتہ ممکن ہے تمام جملوں میں یہ معنی استعمال ہوں، مگر مناسب وہی ہے کہ جس جملے کے لیے ہم نے استعمال کیا ہے۔

حضرتؑ گفتگو کو آگے بڑھاتے ہیں اور اس گروہ کے کاموں کا نتیجہ نکالتے ہوئے بہترین تعبیر کی طرف اشارہ فرماتے ہیں:

"يَا خَيْبَةَ الدَّاعِي! مَنْ دَعَا وَإِلَامَ أُجِيبَ؟"[۲]

"اے نا اُمیدو! ان دعوت کرنے والوں کے پاس آؤ! آ کے دیکھو یہ کس کو دعوت دے رہے ہیں اور یہ نادان لوگ کس کی دعوت قبول کر رہے ہیں؟"

حقیقت میں امامؑ کی یہ تعبیر جمل کی ہولناک جنگ کے انجام کی طرف اشارہ ہے۔ آپؑ ان کی عاقبت کو نا امیدی اور شکست سے تعبیر کرتے ہیں، ان موقع پرستوں کی عاقبت خراب ہے، جو خود خلیفۂ ثالث کے قتل میں براہ راست ملوث

---

[۱] منہاج البراعۃ، جلد ۳، ص ۳۱۰

[۲] "خیبۃ" نا امیدی کے معنیٰ میں آتا ہے اور "داعی" سے مراد یہاں طلحہ یا زبیر ہے جو لوگوں کو امام علیہ السلام کے خلاف شورش کی دعوت دے رہے تھے۔ "مَنْ دَعَا" ان دونوں کی ذلت و خواری کی طرف اشارہ ہے۔ اور جملہ "اِلامَ اُجیب" اندھے اور بہرے نما گروہ کی ذلت و خواری کی طرف اشارہ ہے جو آنکھیں بند کر کے ان دونوں کے پیچھے چلتے رہا۔

www.shiabookspdf.com

ہیں، اُن کو قتل کرنے کے بعد اپنی سیاست چمکانے کی خاطر بدلہ لینے اٹھ کھڑے ہوئے اور مسلمانوں کے درمیان فتنہ وفساد برپا کیا، اور کچھ گروہ بہرے اور اندھے ہو کر ان کے پیچھے چل پڑے اور دنیا وآخرت میں ذلیل ورسوا ہوئے۔

امامؑ گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے فرماتے ہیں:

"وإنّي لَرَاضٍ بِحُجَّةِ اللهِ عَلَيْهِمْ وعِلْمِهِ فِيْهِمْ"

"میں ان پر اللہ کی حجت اور اُس کا علم ہونے کے سبب ان لوگوں سے پھر بھی راضی ہوں۔"

میرے اور اس گروہ کے درمیان اللہ تعالیٰ حاکم ہے۔ ممکن ہے حجتِ الٰہی ہونے کا مقصد باغیوں اور سرکشوں کے بارے میں آیا ہوا وہ حکم قرآنی ہو، جس میں فرمایا گیا ہے:

"وَإِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَأَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا ۚ فَإِنْ بَغَتْ إِحْدَاهُمَا عَلَى الْأُخْرَىٰ فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْءَ إِلَىٰ أَمْرِ اللهِ"[1]

"جب بھی مؤمنین کے کسی دو گروہوں میں نزاع ہو جائے تو ان کے درمیان صلح کرادو، اگر ان دونوں میں سے ایک دوسرے پر تجاوز کرے تو تجاوز کرنے والے گروہ سے لڑو تا کہ حکمِ الٰہی کی طرف پلٹ آئے"۔

"عِلْمِهِ فِيْهِمْ" کا جملہ ممکن ہے اس مشہور حدیث کی طرف اشارہ ہو جسے پیغمبر اکرمؐ نے امیرالمومنینؑ کے بارے فرمایا ہے "قَاتَلَ النَّاكِثِيْنَ وَ الْقَاسِطِيْنَ وَ الْمَارِقِيْنَ" "وہ ناکثین وقاسطین اور مارقین سے جنگ کرے گا۔ اُس وقت حضرت اُمّ سلمہؓ نے ان تین گروہوں کے بارے میں سوال کیا تو پیغمبر اکرمؐ نے اس کی تفسیر میں فرمایا: ناکثین سے مراد جمل کے عہد و پیمان توڑنے والے لوگ ہیں، اور قاسطین سے مراد امیرِ شام کی فوج ہے اور مارقین سے مراد نہروان کے ناصبی ہیں۔[2] ظاہر ہے جو شخص خدا کی مصلحت پر راضی اور آئندہ آنے والے زمانوں کے پُر درد حوادثات اور دشمنوں کی شکست ونا امیدی سے آگاہ ہو، اُس کی روح خوشنودیِ رضائے الٰہی سے سرشار اور مکمل اطمینان سے ہوگی۔

حصہ سوّم

"فَإِنْ أَبَوْا أَعْطَيْتُهُمْ حَدَّ السَّيْفِ وَ كَفَىٰ بِهِ شَافِيًا مِنَ الْبَاطِلِ وَ نَاصِرًا لِلْحَقِّ وَ مِنَ الْعَجَبِ بَعْثُهُمْ إِلَيَّ أَنْ أَبْرُزَ لِلطِّعَانِ وَ أَنْ أَصْبِرَ لِلْجِلَادِ هَبِلَتْهُمُ الْهَبُوْلُ لَقَدْ كُنْتُ وَ مَا أُهَدَّدُ بِالْحَرْبِ وَ لَا

[1] سورۂ حجرات، آیت ۹

[2] احقاق الحق، جلد ۴، ص ۹۹، ینابیع المودۃ سے نقل کیا گیا۔

www.shiabookspdf.com

أُرْهَبُ بِالضَّرْبِ وَإِنِّي لَعَلَى يَقِينٍ مِنْ رَبِّي وَغَيْرِ شُبْهَةٍ مِنْ دِينِي.

"اگر ان لوگوں نے اطاعت سے انکار کیا، تو میں تلوار کی باڑ ان کے سامنے رکھ دوں گا جو باطل سے شفا دینے اور حق کی نصرت کے لیے کافی ہے۔ حیرت ہے! کہ وہ مجھے یہ پیغام بھیجتے ہیں کہ میں نیزہ زنی کے لیے میدان میں اتر آؤں، اور تلواروں کی جنگ کے لیے جمنے پر تیار رہوں۔ رونے والیاں ان کے غم میں روئیں۔ میں تو ہمیشہ ایسا رہا ہوں کہ جنگ سے مجھے دھمکایا نہیں جاسکا اور شمشیر زنی سے خوفزدہ نہیں کیا جاسکا اور میں اپنے پروردگار کی طرف سے یقین کے درجے پر فائز ہوں اور اپنے دین کی حقانیت میں مجھے کوئی شک نہیں ہے۔"

شرح وتفسیر

کیا تم لوگ مجھے ڈراتے اور دھمکاتے ہو؟

خطبے کے گزشتہ حصے میں امامؑ نے منطقی استدلال پر اکتفا فرمایا ہے، اور انہیں اپنی شیریں بیانی کے ساتھ فیصلہ کن اور واضح نصیحت کرتے ہیں تاکہ وہ لوگ اپنی غلطیوں کو دیکھ کر ہوشیار ہو جائیں اور شیطانی راستے سے واپس پلٹ جائیں اور امامؑ سے جو بیعت کی ہے، اس سے وفادار رہیں اور جنگ کی آگ بھڑکانے سے اپنے ہاتھ روک دیں۔

خطبے کے اس آخری حصے میں خبردار کرتے ہیں: اگر درست بات کو نہیں سنیں گے تو ان کے ساتھ تلوار کی زبان میں بات کی جائے گی، وہ تلوار جو ہٹ دھرموں، سینہ زوروں اور ہوا پرستوں کا جواب دینا خوب جانتی ہے۔ فرماتے ہیں:

"فَإِنْ أَبَوْا أَعْطَيْتُهُمْ حَدَّ السَّيْفِ"

اگر انہوں نے کلمۂ حق قبول کرنے سے انکار کیا تو تیز دھار والی تلوار ان کو سبق سکھانے کے لیے کافی ہوگی۔

"وَ كَفَى بِهِ شَافِيًا مِنَ الْبَاطِلِ وَنَاصِرًا لِلْحَقِّ"

"ناسمجھ لوگ اور بے مقصد شور شرابہ کرنے والوں کی دشمنی اور حق وصداقت کی مدد کرنے والوں کی حمایت کے لیے یہ تلوار کافی ہے۔"

اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے ایک ہاتھ میں تلوار اور ایک ہاتھ میں قرآن مجید کو اٹھا کر رکھتے تھے، یہ حکومتِ الٰہی کے دو رکن ایک حقیقی پہلو کو بیان کرتے ہیں۔ ان کو ہر چیز سے پہلے تمام مسائل کا منطقی جائزہ لینا چاہیے۔ اور معاشرے کی اصلاح میں نصیحت اور واضح عاقلانہ دلائل سے جہاں تک ہو سکے کوشش کرنی چاہیے۔ اور خطا کاروں کو

www.shiabookspdf.com

غلطیوں سے باہر لائیں۔ (لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہر دور میں ایک ایسا گروہ موجود ہوتا ہے جو اپنے فاسد مقاصد کے لیے اس عمل کی مخالفت کرتا ہے یہ لوگ سوائے تلوار کی زبان کے کوئی اور زبان نہیں سمجھتے) حکومتِ الٰہی کے نمائندے ایسے لوگوں کے ساتھ خدا کی قدرت پر یقین رکھتے ہوئے سختی سے پیش آتے ہیں اور حتمی طور پر انہیں کاملاً منتشر کر دیتے ہیں یہ ان فکری اور اخلاقی بیمار افراد کا آخری علاج ہوتا ہے:

"إِنَّ آخِرَ الدَّوَاءِ الْكَيُّ"۔[1]

"ناقابلِ علاج بیماریوں اور زخموں کا آخری علاج داغ دینا اور جلانا ہے۔"

جملہ "شَافِيًا مِّنَ الْبَاطِلِ" اور جملہ "ناصر الحق" دونوں لازم وملزوم ہیں، کیوں کہ باطل کی سرکشی کا علاج حق کی مدد سے ہی ممکن ہے اور حق کی مدد سے ہی باطل کو سرنگوں کیا جاسکتا ہے۔

حضرتؑ اس گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے فرماتے ہیں:

"وَمِنَ الْعَجَبِ بَعْثُهُمْ إِلَيَّ أَنْ أَبْرُزَ لِلطِّعَانِ[2] وَأَنْ أَصْبِرَ لِلْجِلَادِ[3]"۔

عجیب بات یہ ہے کہ انہوں نے مجھ سے اعلانِ جنگ کیا ہے اور مجھے اپنے نیزوں اور تلواروں کا مقابلہ کرنے یا ان کے مطالبات تسلیم کرنے کا پیغام بھیجا ہے، جب کہ اسلامی جنگوں میں بہادری اور شجاعت اور میری تلوار کی کاٹ کی صفائی کا وہ مشاہدہ کر چکے ہیں کہ کس طرح میں نے دشمنوں کے نامی گرامی پہلوانوں کو میدانِ جنگ میں پچھاڑ کر جہنم واصل کیا ہے اور کفار کو شکست سے دوچار کیا ہے۔ اس مثال سے بخوبی واضح ہوجاتا ہے کہ جن لوگوں نے جنگ جمل میں عہد و پیمان کو توڑا وہی جنگ کی آگ بھڑکانے والے لوگ تھے، کیوں کہ امامؑ سے انہوں نے جنگ کا اعلان کیا تھا اور بے شرمی سے تیر و تلوار اور نیزے دکھا کر آپؑ کو ڈرانے کی کوشش کر رہے تھے۔

ابن ابی الحدید، مشہور مؤرخ ابو مخنف سے نقل کرتا ہے کہ جب امیرالمومنینؑ کے بھیجے ہوئے ایلچی عائشہ وطلحہ اور زبیر کے پاس سے واپس ہوئے تو ان کی طرف سے آپؑ کے لیے جنگ کا پیغام لائے۔[4]

بہر حال حضرت علی علیہ السلام کو جس طرح ڈرایا جارہا تھا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جنگِ جمل کی آگ بھڑکانے والے

---

[1] یہ جملہ عربوں میں ایک مشہور ضرب المثل ہے، اس کے متعلق اسلامی روایات اور نہج البلاغہ کے خطبہ ۱۶۸ میں بھی اشارہ ہوا ہے۔

[2] طعان، کسی چیز پر مارنے کے معنی میں ہے کہ اس پر مارنے کا نشان ظاہر ہوجائے۔ عموماً تلوار یا نیزے وغیرہ کے لگائے ہوئے زخم کے بارے میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اور کبھی زبان کے زخم (طعن) کے بارے میں بھی آیا ہے۔ یہاں پر جنگ کے لیے تیار ہونے کی طرف کنایہ ہے۔

[3] جلاد، کا مادّہ جلد سے ہے اور بدن پر کوڑے یا چھڑی یا تلوار سے مارنے کے معنی میں آیا ہے۔ یہاں پر بھی جنگ کی طرف اشارہ ہے۔

[4] شرح نہج البلاغہ، ابن ابی الحدید، جلد ۱، ص ۳۰۶

www.shiabookspdf.com

افراد کس حد تک حقیقت سے بیگانہ ہو گئے تھے اور کس طرح ان کی آنکھیں اور کان بند ہو گئے تھے کہ انہوں نے امیر المومنینؑ کی شجاعت اور اسلامی جنگوں میں ان کے جنگ کرنے کے انداز، جن کا انہوں نے بار بار مشاہدہ کیا تھا، سب بھلا دیے تھے۔

آپؑ اپنی اس جاری گفتگو میں اسی مطلب کو واضح دلیل کے ساتھ جستجو کرتے ہوئے فرما رہے ہیں:

"هَبِلَتْهُمُ الْهَبُوْلُ! لَقَدْ كُنْتُ وَ مَا أُهَدَّدُ بِالْحَرْبِ وَ لَا أُرْهَبُ بِالضَّرْبِ! وَ إِنِّيْ لَعَلٰى يَقِيْنٍ مِنْ رَبِّيْ وَ غَيْرِ شُبْهَةٍ مِنْ دِيْنِيْ"

"اُن کی مائیں اُن کے ماتم میں بیٹھیں، میں ایسا نہیں ہوں کہ جو مقابلے کی دھمکی سے ڈر جاؤں اور نہ کسی تلوار اور نیزے سے مجھے ڈر ہے، کیوں کہ میں اپنے پروردگار پر ایمان اور دین کے اصولوں پر اس حد تک یقین رکھتا ہوں کہ جہاں معمولی شک کا بھی گزر نہیں۔"

جملہ "هَبَلَتْهُمُ الْهَبُوْلُ"۔[1] ھبل کے معنی بیٹے کے غم میں بیٹھنا ہے، یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ تم زندہ رہنے کے قابل نہیں ہو، مر جاؤ تاکہ تمہاری مائیں تمہاری عزا میں بیٹھیں اور تم پر گریہ وزاری کریں، کیوں کہ تم لوگ اپنی گھٹیا سوچ وفکر اور فیصلے کی وجہ سے معاشی کے قابل نہیں ہو، "ثَكِلَتْهُمُ الثَّوَاكِلُ" ادبیات عرب میں اس جملے جیسی عبارت بھی ہے وہ بھی اسی معنی میں آتی ہے۔ بہر حال امامؑ ان چیدہ چیدہ اور معنی سے پُر جملوں میں سب سے پہلے اپنی گزری ہوئی زندگی کی طرف اشارہ فرماتے ہیں اور متوجہ کراتے ہیں۔

پہلا اشارہ

تم تو کیا عرب کے مشرکین کا بچہ بچہ مجھے اچھی طرح پہچانتا ہے اور ان میں سے کسی کو اُس وقت مجھے جنگ کی دھمکی دینے کی جرأت نہیں ہوئی، تم میرے ساتھ اتنے سال رہے اور اپنے آپ کو مسلمان کہتے رہے۔ اب تمہاری طرف سے اس احمقانہ دھمکی کی کیا وجہ ہے؟

دوسرا اشارہ

حضرتؑ یہ فرمانا چاہتے ہیں کہ جنگ سے وہ ڈرتا ہے جو شہادت کی موت سے خوف کھاتا ہے اور جو شہادت کی موت سے ڈرتا ہے اس کا یقینا خدا نہیں ہے اور جس راستے کو بھی وہ اپنائے گا، شک وشبہے میں مبتلا ہوگا، کیوں کہ جس کسی کا ایمان مضبوط ہو اس کا یقین اور عقیدہ درست ہے، وہ یہ اچھی طرح جانتا ہے کہ اہلِ حق اور اہلِ باطل کے درمیان جنگ میں حق

[1] ایک ایسی عورت جس نے اپنے بچے کو کھو دیا ہو اور اس کے غم میں بیٹھی ہو۔

www.shiabookspdf.com

اور اہلِ حق کو کبھی شکست نہیں ہوسکتی، بلکہ اہلِ حق دشمنوں پر غالب آ کر فتح پائیں گے، یا اپنی ذمے داری پر عمل کرتے ہوئے شہادت کے درجے پر فائز ہوکر پروردگارِ عالم کے حضور ابدی اور ہمیشہ رہنے والی زندگی کی لذات سے بہرہ مند ہوں گے۔

"احدی الحسنیین" یہ وہی دونیکیوں میں ایک نیکی ہے جس کی طرف آیۂ کریمہ میں اشارہ کیا گیا ہے:

"قُلْ هَلْ تَرَبَّصُوْنَ بِنَاۤ اِلَّاۤ اِحْدَی الْحُسْنَیَیْنِ"۔[1]

"کہہ دیجیے، کیا ہم سے دونیکیوں میں سے ایک (کامیابی یا شہادت) کے علاوہ کسی اور چیز کی بھی توقع رکھتے ہو؟"

مفسرین نہج البلاغہ کے کچھ گروہوں کا خیال ہے کہ جملہ "فَاِنِّیْ لَعَلٰی یَقِیْنٍ مِّنْ رَبِّیْ" اور جملہ "وَ غَیْرِ شُبْهَةٍ مِنْ دِیْنِیْ" بھی تاکید کے ساتھ اسی مفہوم کو بیان کرتا ہے، لیکن سچ تو یہ ہے کہ، یہ دونوں جملے خاص گفتگو کے بعد عام گفتگو کے بیان کے لیے آتے ہیں اور اس کے دو مفہوم ہوتے ہیں۔

پہلا مفہوم:

اس جملے میں امامؑ اپنی یقین کی منزل کی طرف اشارہ فرماتے ہیں اور جو حدیث آپ کی طرف منسوب ہے اس میں بھی آپؑ کے یقین کا مقام و منزلت بیان ہوئی ہے، فرماتے ہیں:

"لَوْ کُشِفَ الْغِطَاءُ مَا ازْدَدْتُ یَقِیْنًا"۔[2]

"اگر میرے "اگر میرے سامنے سے مشیتِ الٰہی کے پردے ہٹا دیے جائیں تب بھی میرے یقین میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔" یہ اللہ کی نشانیوں کے مشاہدات کا عروج ہے۔"

دوسرا مفہوم:

دوسرے جملے میں پورے دین اور وظائفِ الٰہی کی طرف اشارہ ہے، فرماتے ہیں:

"زندگی کی راہ گزران کے لیے واضح اور روشن ہے اور اس پر پیش قدمی میں انہیں کسی شک و تردّد کا سامنا نہیں کرنا پڑتا، بالخصوص اس وجہ سے کہ امامؑ نے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا ہوا تھا کہ تمہیں ناکثین، قاسطین اور مارقین (جمل صفین اور نہروان کی جنگ بھڑکانے والوں) سے جنگ کرنا پڑے گی۔"[3]

---

[1] سورۂ توبہ، آیت ۵۲

[2] شرح ابن میثم، جاحظ کے انتخابی کلمہ ا، کی ضد میں بیان ہوا۔

[3] سابقہ حوالہ

www.shiabookspdf.com

نکتہ

نا قابل شکست لوگ

حق و باطل کی جنگوں کی طویل تاریخوں میں کچھ افراد اور گروہ جنگ کے موقع پر موجود پائے جاتے ہیں اور وسائل کے ظاہری فرق کے باوجود ان دونوں گروہوں کی ایک دوسرے پر برتری اور دشمنی میں عجیب کیفیات پیدا ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر ساسانیوں کی عظیم فوج کے ساتھ لشکرِ اسلام کی جنگ کے موقع پر ان کی فوج کے عشرِ عشیر کے برابر بھی لشکرِ اسلام نہیں تھا اور جنگی ساز و سامان و اسلحے میں بھی ان کے ساتھ کوئی مقابلہ نہیں تھا اس کے باوجود یکتا پرستی کے جوش و جذبے نے بظاہر مٹھی بھر افراد، ننگے پاؤں، جنگی مشقیں اور وسائل نہ ہونے کے برابر ہونے کے باوجود تعلیماتِ اسلام و قرآن کریم کے نور سے قوت کے توازن کے افسانے کو میدانِ جنگ میں درہم برہم کر کے رکھ دیا۔

"قُلْ هَلْ تَرَبَّصُوْنَ بِنَآ اِلَّآ اِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ"

یہ خود کو میدانِ جنگ میں ہر صورت کامیابی سے ہم کنار دیکھنے کے فلسفے کی طرف اشارہ ہے کہ یا تو دشمن کی صفوں کو توڑ کر انہیں شکست دیں یا شہادت کی موت کو خوشی سے گلے لگانے کے لیے تیار ہو جائیں۔ فتح اور شہادت دونوں صورتوں میں سعادت اور بہت بڑی کامیابی تھی۔

ہمارے زمانے میں ایک بار پھر عراق کی طرف سے ایران پر مسلط کردہ جنگ میں بھی یہی فلسفہ اور طریقہ دوہرایا گیا۔ اس جنگ میں ایران نے تمام تر وسائل جنگی، جدید اسلحوں سے لیس، دنیا کی سپر طاقتوں کی پشت پناہی میں لڑنے والی عراقی افواج کا نہتے ہو کر مقابلہ کیا اور کامیابی سے ہم کنار ہو کر دشمن کو شکستِ فاش دی اور عراقی حکومت کے تمام امکانات ظاہر اور خفیہ طور پر اور دشمنانِ اسلام کی طرف سے ملنے والی تقویت کے باوجود مؤمن سپاہیوں اور مکتبِ قرآن کے تربیت یافتہ فوجیوں نے ان کے تمام جنگی ساز و سامان اور جدید اسلحوں کو درہم برہم کر دیا۔

یہی چیز ہے جس کی طرف امامؑ مندرجہ بالا خطبے میں اشارہ کرتے ہیں اور دنیا پرست دشمنوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "مجھے جنگ سے نہ ڈراؤ! خدا کی راہ میں جنگ کرنے سے میں نہیں ڈرتا، کیوں کہ میرا قلب یقین کے نور سے سرشار ہے۔ دین و آئین اور جس منصب کے لیے مجھے منتخب کیا گیا ہے اس میں مجھے کوئی شک و شبہ نہیں، ہاں میں ہر حال میں فتح مند رہوں گا اور جو فاتح ہو اسے کس قسم کا ڈر ہو سکتا ہے۔ جی ہاں! میں ہر حال میں کامیاب ہوں اور جو کامیاب

www.shiabookspdf.com

ہوتا ہے۔ وہ ڈر، وحشت اور خوف کیوں کر کھائے؟

یہ وہ حقیقت ہے کہ جس سے مسلمانانِ عالم کو سختی کے ساتھ وفاداری کا ثبوت دینا چاہیے اور اس روش کو تمام فرزندانِ اسلام کے درمیان رائج کرنا چاہیے۔ اس طریقے کے ایجاد ہوتے ہی زمانے کے پیچیدہ فنون اور جنگی طور طریقوں کے اعتبار سے دشمنانِ اسلام پر برتری حاصل ہو جائے گی۔ کسی خوف و خطر اور وحشت کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔

www.shiabookspdf.com

تیئسواں خطبہ

وَتَشْتَمِلُ عَلٰی تَهْذِيْبِ الْفُقَرَاءِ بِالزُّهْدِ وَتَأْدِيْبِ الْأَغْنِيَاءِ بِالشَّفَقَةِ [1]

جس میں فقراء کو زہد اور سرمایہ داروں کو شفقت کی ہدایت دی گئی ہے۔

پہلا حصہ

اَمَّا بَعْدُ فَاِنَّ الْاَمْرَ يَنْزِلُ مِنَ السَّمَاءِ اِلَى الْاَرْضِ كَقَطَرَاتِ الْمَطَرِ اِلٰى كُلِّ نَفْسٍ بِمَا قُسِمَ لَهَا مِنْ زِيَادَةٍ اَوْ نُقْصَانٍ فَاِنْ رَاٰى اَحَدُكُمْ لِاَخِيْهِ غَفِيْرَةً فِيْ اَهْلٍ اَوْ مَالٍ اَوْ نَفْسٍ فَلَا تَكُوْنَنَّ لَهُ فِتْنَةً فَاِنَّ الْمَرْءَ الْمُسْلِمَ مَا لَمْ يَغْشَ دَنَاءَةً تَظْهَرُ فَيَخْشَعُ لَهَا اِذَا ذُكِرَتْ وَيُغْرٰى بِهَا لِئَامُ النَّاسِ كَانَ كَالْفَالِجِ الْيَاسِرِ الَّذِيْ يَنْتَظِرُ اَوَّلَ فَوْزَةٍ مِنْ قِدَاحِهِ تُوْجِبُ لَهُ الْمَغْنَمَ وَيُرْفَعُ بِهَا عَنْهُ الْمَغْرَمُ وَ كَذٰلِكَ الْمَرْءُ الْمُسْلِمُ الْبَرِيْءُ مِنَ الْخِيَانَةِ يَنْتَظِرُ مِنَ اللّٰهِ اِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ اِمَّا دَاعِيَ اللّٰهِ فَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ لَهُ وَاِمَّا رِزْقَ اللّٰهِ فَاِذَا هُوَ ذُوْ اَهْلٍ وَمَالٍ وَمَعَهُ دِيْنُهُ وَحَسَبُهُ وَاِنَّ الْمَالَ وَالْبَنِيْنَ حَرْثُ الدُّنْيَا وَالْعَمَلَ الصَّالِحَ حَرْثُ الْاٰخِرَةِ وَقَدْ يَجْمَعُهُمَا اللّٰهُ تَعَالٰى لِاَقْوَامٍ۔

"ہر شخص کے مقسوم میں جو کم یا زیادہ ہوتا ہے، اسے لے کر فرمانِ قضا آسمان سے زمین پر اس طرح اترتا ہے، جس طرح بارش کے قطرات، لہٰذا اگر کوئی شخص اپنے کسی بھائی کے اہل و مال و نفس میں فراوانی و وسعت پائے تو یہ چیز اس کے لیے کبیدگیِ خاطر کا سبب نہ بنے۔ جب تک کوئی مرد مسلمان کسی ایسی ذلیل حرکت کا مرتکب نہیں ہوتا کہ جو ظاہر ہو جائے، تو اس

---

[1] خطبے کی سند: اس خطبے کے بعض حصوں کو مرحوم کلینیؒ نے کتاب کافی، جلد ۵، ص ۵۶ پر امام حسن مجتبیٰؑ سے نقل کیا ہے اور اس کے بعض حصوں کو مصادر نہج البلاغہ کے مطابق نصر بن مزاحم نے (صفین) میں اور ابن عبد ربہ نے عقد الفرید میں اور زمخشری نے ربیع الابرار میں شامل کیا ہے۔

www.shiabookspdf.com

کے تذکرے سے اسے آنکھیں نیچی کرنا پڑیں اور جس سے ذلیل آدمیوں کی جرأت بڑھے۔ وہ اس کامیاب جواری کی مانند ہے جو جوئے کے تیروں کا پانسہ پھینک کر پہلے مرحلے پر ہی ایسی جیت کا متوقع ہوتا ہے، جس سے اسے فائدہ حاصل ہو اور پہلے نقصان ہو بھی چکا ہے، تو وہ دور ہو جائے۔ اسی طرح وہ مسلمان جو بد دیانتی سے پاک دامن ہو، دو اچھائیوں میں سے ایک کا منتظر رہتا ہے۔ یا اللہ کی طرف سے بلاوا آئے تو اس شکل میں اللہ کے یہاں کی نعمتیں ہی اس کے لیے بہتر ہیں اور یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے (دنیا کی) نعمتیں حاصل ہوں تو اس صورت میں اس کے پاس مال، اولاد، اس کا دین اور عزت نفس بھی برقرار ہے۔ بے شک مال و اولاد دنیا کی کھیتی اور عملِ صالح آخرت کی کشت زار ہے اور بعض لوگوں کے لیے اللہ ان دونوں چیزوں کو یکجا کر دیتا ہے۔"

خطبے پر ایک نظر

اس خطبے کے پہلے حصے میں امامؑ نے لوگوں کے درمیان رزق اور روزی کی تقسیم کی طرف جو اشارہ کیا ہے، وہ تدبیر الٰہی کی ایک بنیاد ہے۔ اور پھر آگاہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اگر تم میں سے کسی کو دوسرے پر برتری حاصل ہو جائے تو اس سے کینہ و حسد نہیں کرنا چاہیے (اور جب کوئی صاحبِ مال و ثروت ہو جائے تو اسے مغرور نہیں ہونا چاہیے اور اپنے دین و ایمان کو مال و زر پر قربان نہیں کرنا چاہیے) اُس وقت لوگوں کو خلوصِ نیت اور شفاف عمل کے ساتھ تمام ریاکاری اور بڑا پن دکھانے سے پرہیز اور تقویٰ الٰہی کی طرف دعوت دینی چاہیے۔

خطبے کے تیسرے حصے میں کچھ اجتماعی مسائل کی طرف اشارہ فرماتے ہیں۔ ان میں سے من جملہ خاندان کے افراد کے درمیان رابطوں کا سلسلہ اور ایک ہی قبلے کی طرف رخ کرنے والے اپنے درمیان ایک دوسرے کے ساتھ تعاون بڑھانے اور مشکلات سے مقابلہ کرنے کی طرف اشارہ بھی فرماتے ہیں اور اس مسئلے کی تاکید کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ انسان کو اپنے رشتے داروں اور خاندان اور قریبی لوگوں سے میل جول میں بخل اور کنجوسی نہیں کرنی چاہیے، کیوں کہ اگر ایسا کرے گا تو وہ مشکلات کے وقت تنہا رہ جائے گا اور ناقابلِ تلافی نقصان اٹھانا پڑے گا۔

www.shiabookspdf.com

شرح وتفسیر

مصلحت الٰہی کے آگے سرِ تسلیم خم

اس خطبے میں امامؑ ایک اہم مسئلے کی طرف اشارہ فرماتے ہیں جو انسانی معاشرے کو مہذب بنانے اور آرام وسکون پہنچانے میں بہت مؤثر ہے اور وہ یہ ہے کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ بشر کی اجتماعی زندگی خود بہت بڑی برکتوں کا سبب ہے۔ اس بنا پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ مسائل علمی وصنعتی اور اجتماعی اعتبار سے بعض عمدہ اور اہم کامیابیاں انسانوں کو نصیب ہوئی ہیں اور اسی کی روشنی میں وہ اپنی زندگی گزارتے ہیں۔ دوسری طرف ان تمام برکات کے ساتھ اہم مشکلات بھی وجود رکھتی ہیں، جن کے حل نہ ہونے کی صورت میں ممکن ہے کہ تمام مثبت آثار نابود ہوجائیں۔

من جملہ ان میں سے ایک انسانوں کے درمیان استعداد اور شرائط جسمی، روحی، فردی اور اجتماعی اعتبار سے ہر جگہ فرق موجود ہے اور یہی چیزیں ماڈی ومالی امکانات میں زیادہ فرق ڈالنے کے اسباب میں سے بھی ہیں۔ یہاں پر جو افراد پیچھے رہ جاتے ہیں وہ مختلف وسوسوں میں گرفتار اور منفی اثرات میں مبتلا ہوجاتے ہیں، اس صورت میں یا وہ پانی میں کود کر یا خودسوزی کے ذریعے خودکشی کی کوشش کرتے ہیں، حلال وحرام کے حوالے سے ان کی آنکھیں اندھی ہوجاتی ہیں اور ماڈی اعتبار سے خود سے آگے نکل جانے والوں کے ساتھ شریک ہونے کی کوشش کرتے ہیں، یہ ایسی آزمائش وامتحان ہے کہ جس کے اختتام کا کوئی پتا نہیں، یا وہ کلّی طور پر مایوس ہوکر کام چھوڑ کر گوشہ نشینی اختیار کرلیتے ہیں، اور ان کے دل میں حسد کی آگ کے شعلے بھڑک اٹھتے ہیں اور جس گروہ کی وجہ سے وہ مصیبت میں گرفتار ہوئے ہیں ان سے انتقام لینے کی کوشش کرتے ہیں۔

دوسری طرف جس گروہ کو زیادہ فائدہ پہنچا ہے، ممکن ہے وہ لوگ بھی غرور وتکبر، سرکشی جیسے مفاسد میں جو آدمی کو بہت جلد ذلیل ورسوا کرتے ہیں، مبتلا ہوجائیں۔

ان تمام مفاسد کی روک تھام کے لیے آیات وروایات میں اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے اور وہ یہ کہ یہ کمی وزیادتی ایک ایسے حکیمانہ پروگرام کے ساتھ ہے جو خداوند متعال کی طرف سے اپنے بندوں کے لیے ترتیب دی گئی ہے اور یہ چیز بغیر وجہ اور حساب وکتاب کے نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ اس تقسیم بندی کا راز ہم بندگانِ الٰہی کے لیے بہت سے امور میں پوشیدہ ہو، لیکن ہمیں جاننا چاہیے کہ جس چیز کو خداوند حکیم ورحمٰن ورحیم نے ہمارے لیے ترتیب دیا ہے، اس سے راضی ہوجائیں۔ اگر ایسا ہوجائے تو مسائل کا چہرہ مکمل طور پر بدل جاتا ہے اور ہمارے جسم وروح کو ایک گہرا سکون، آرام اور اطمینان اپنے

www.shiabookspdf.com

دائرے میں لے لیتا ہے اور تمام منفی اور غیر مہذب اثرات خود بخود ختم ہو جاتے ہیں۔ اسی دلیل کی بنا پر مسئلۂ تسلیم و رضا بالخصوص رزق کی تقسیم کے حوالے سے روایات اسلامی میں مفصل اور تاکیداً بحث کی گئی ہے۔

اس مقدمے کے خلاصے کے لیے خطبے کی تفسیر کی طرف پلٹتے ہیں اور کہیں گے کہ امامؑ بھی خصوصی طور پر خطبے کے اس حصے میں نفوس کی تربیت اور اجتماعی مفاسد میں سے اہم خرابیوں کے خاتمے کے لیے دقّت کے ساتھ اسی معنی و مفہوم کی طرف توجّہ دلاتے ہوئے فرماتے ہیں:

"أَمَّا بَعْدُ: فَإِنَّ الْأَمْرَ يَنْزِلُ مِنَ السَّمَاءِ إِلَى الْأَرْضِ كَقَطَرَاتِ الْمَطَرِ إِلَى كُلِّ نَفْسٍ بِمَا قُسِمَ لَهَا، مِنْ زِيَادَةٍ أَوْ نُقْصَانٍ"

"بعد خداوند متعال کی حمد و ثنا کے، جان لو! پروردگار کی بخششیں بارش کے قطرات کی مانند آسمان سے زمین پر نازل ہوتی ہیں اور ہر کسی کو اس کے مقدر کے مطابق کم یا زیادہ حصہ ملتا ہے۔"

یہاں بارش کے قطرات کی جو تشبیہ دی گئی ہے یہ بہت عمدہ تشبیہ ہے، کیوں کہ بارش کے چھوٹے چھوٹے نرم قطرات حکم الٰہی سے زمین کے مختلف حصوں میں نازل ہوتے ہیں۔ اور اسی طرح رزقِ الٰہی بھی پروردگار عالم کی رحمت و برکت سے انسانی حیات کو جلا بخشنے کے لیے نازل ہوتا ہے۔ دونوں میں مکمل فرق ہے۔

بارش زمین کے بعض حصوں میں اس قدر برستی ہے کہ ندی نالوں سے زیادہ مقدار میں پانی بہنے لگتا ہے اور بعض مناطق میں پورے سال میں بہت کم بارشیں ہوتی ہیں۔

اس کے بعد حضرت امام علی علیہ السلام اس گفتگو کے نتیجے کے طور پر فرماتے ہیں:

"فَإِذَا رَأَى أَحَدُكُمْ لِأَخِيهِ غَفِيرَةً [1] فِي أَهْلٍ أَوْ مَالٍ أَوْ نَفْسٍ، فَلَا تَكُونَنَّ لَهُ فِتْنَةً"

بنابرایں جب بھی تم میں سے کوئی اپنے بھائی کو مال و متاع و اولاد اور جسمانی لحاظ سے قوی اور برتر دیکھے، اس وقت تمہیں ان سے لڑائی جھگڑا نہیں کرنا چاہیے، کہیں حسد و کینہ و دشمنی کی وجہ سے رحمت پروردگار سے یاس و ناامیدی اور مصلحتِ الٰہی کی نسبت بُری سوچ پیدا ہونے کا سبب نہ بن جائے۔

غفیرۃ، غفر ہ کے مادّے سے کسی چیز کو چھپانے کے معنی میں لیا گیا ہے۔ اس وجہ سے سر کے بالوں جو کندھوں اور کانوں کو چھپا دیتے ہیں، غفیرہ کہتے ہیں اور پروردگار کا عفو و درگزر جو گناہوں کو چھپا دیتا ہے، غُفران کہا جاتا ہے۔ ممکن ہے

---

[1] غفیرۃ، غفر کے مادّے سے ہے اس کے معنی ستر پوشی ہیں، اسی لیے گناہوں کی بخشش اور چھپائے جانے اور عفو و درگزر پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ اور مال کی زیادتی بھی انسانی زندگی کے بیشتر حصوں کو اور کبھی عیوب بھی اپنے دامن میں چھپا لیتی ہے۔ اس لیے اسے "غفیرہ" کہتے ہیں۔

www.shiabookspdf.com

یہاں اس نکتے کو بیان کرنا مقصود ہو کہ دنیا کا مال و ثروت معمولاً انسان کو غافل کرنے والا ہے، یہاں تک کہ انسان کو اپنے عیوب نظر نہیں آتے۔ اور کلمہ ٔغفیرہ کے جو معنیٰ یہاں لیے گئے ہیں، وہ مال و ثروت کی کثرت ہے۔

ضمناً! یہاں کلمہ ٔفتنہ امتحان کے معنیٰ میں نہیں ہے، جب کہ بہت سارے موارد میں اسی معنیٰ میں آیا ہے، بلکہ یہاں اس سے مراد ایک ایسی چیز ہے جو دھوکا و فتنہ و فساد کا سبب بنے اور وہ ایسے بُرے اثرات اور منفی صفات ہیں، جو تہی دست افراد میں مال دار لوگوں کے مقابلے میں پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً بغض و حسد اور نفرت و دشمنی وغیرہ۔ اس کے بعد امامِ عالی مقامؑ تہی دست، صابر اور شاکر افراد کی دلجوئی کے لیے ایک مدلل مطلب کو بیان فرماتے ہیں:

«فَإِنَّ الْمَرْءَ الْمُسْلِمَ مَا لَمْ يَغْشَ دَنَاءَةً تَظْهَرُ فَيَخْشَعُ لَهَا إِذَا ذُكِرَتْ وَ يُغْرَى بِهَا لِئَامُ النَّاسِ، كَانَ كَالْفَالِجِ [1] الْيَاسِرِ [2] الَّذِي يَنْتَظِرُ أَوَّلَ فَوْزَةٍ مِنْ قِدَاحِهِ [3] تُوجِبُ لَهُ الْمَغْنَمَ، وَ يُرْفَعُ بِهَا عَنْهُ الْمَغْرَمُ»

"پس جب تک کوئی مرد مسلمان ذلیل حرکت کا مرتکب نہیں ہوتا جو ظاہر ہو جائے تو اس کے تذکرہ سے اسے آنکھیں نیچی کرنی پڑیں اور جس سے ذلیل آدمیوں کی جرأت بڑھے۔ وہ اس کامیاب جواری کی مانند ہے جو جوئے کے تیروں کا پانسہ پھینک کر پہلے مرحلے پر ہی ایسی جیت کی توقع کرتا ہے جس سے اسے فائدہ حاصل ہو اور پہلے نقصان ہو بھی چکا ہو تو وہ دور ہو جائے۔"

«وَ كَذٰلِكَ الْمَرْءُ الْمُسْلِمُ الْبَرِيءُ مِنَ الْخِيَانَةِ يَنْتَظِرُ مِنَ اللهِ إِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ: إِمَّا دَاعِيَ اللهِ فَمَا عِنْدَ اللهِ خَيْرٌ لَهُ، وَ إِمَّا رِزْقَ اللهِ فَإِذَا هُوَ ذُو أَهْلٍ وَ مَالٍ، وَ مَعَهُ دِينُهُ وَ حَسَبُهُ»

"اور جو مسلمان امانتِ الٰہی میں خیانت نہیں کرتا، وہ خداوند متعال کی جانب سے دو خوبیوں میں سے ایک کا منتظر رہتا ہے، یا تو وہ دعوتِ الٰہی کے قبول کرنے والوں میں سے ہے کہ اس کی عمر نیکیوں میں گزرتی ہے اور اس کا انجام بھی اچھا ہوتا ہے ایسی صورت میں ایسے اللہ جزائے خیر عطا فرماتا ہے جو اُسے سب سے بہتر ہے یا اس کے نتیجے میں خدا وسیع رزق اور اولاد سے مالا مال کر لیتا ہے اور اسی میں اس کا دین اور شخصیت محفوظ ہے۔"

---

[1] "فالج" مادۂ فلج سے ہے اور "مقاییس اللغۃ" میں اس کے دو معانی ہیں، ایک غلبہ اور کامیابی کے معنیٰ میں ہے، دوسرے دو چیزوں کے درمیان فاصلے کے معنیٰ میں آیا ہے۔ "صحاح اللغۃ" میں بھی فتح و کامیابی ہی بیان ہوا ہے اور خطبے میں بھی اسی معنیٰ میں آیا ہے۔

[2] "یاسر" یسر کے مادّے سے ہے، اور آسانی و سہولت کے معنیٰ میں آیا ہے "میسرہ و یسار" راغب نے مفردات میں کہا ہے کہ بے نیازی اور دولت و ثروت کے معنیٰ میں ہے۔ اور جہاں لوگ قسمت آزمانے اور جوا کھیلنے کے لیے پیسے دیتے ہیں یا لیتے ہیں "میسر" کا اس پر اطلاق ہوتا ہے۔ خطبے میں "یاسر" جو خصوصی طور پر آیا ہے اور مورد بحث ہے، قسمت آزمائی، جیت کے معنیٰ میں ہے۔

[3] قداح، قدح کا جمع ہے اور اس کا معنیٰ بغیر پھل کا تیر ہے کہ اسے تراشنے سے پہلے پھل تیر میں جوڑ دیا جائے، اس کے اصل معنیٰ کسی کو شکست یا کسی چیز کو عیب دار کرتا ہے اور بغیر پھل کا تیر عموماً اسی قسم کا ہوتا ہے اس لیے اسے قدح کہتے ہیں۔

www.shiabookspdf.com

لیکن ان دونوں باتوں میں بڑا فرق ہے۔

"وَإِنَّ الْمَالَ وَالْبَنِيْنَ حَرْثُ الدُّنْيَا، وَالْعَمَلَ الصَّالِحَ حَرْثُ

"مال وثروت واولاد اس دنیا کی کھیتی ہے۔اور تقویٰ و پرہیزگاری عمل صالح اور نیک کام آخرت کی کھیتی ہے۔"

"وَقَدْ يَجْمَعُهُمَا اللهُ تَعَالَى لِأَقْوَامٍ"

"خداوند متعال کبھی کسی گروہ یا جماعت کو نعمت ہائے دنیوی اور اُخروی دونوں سے بہرہ مند کرتا ہے۔"

امامؑ دراصل اپنے اس پسندیدہ اور دل پذیر تجزیے میں اس حقیقت کو بیان فرماتے ہیں کہ انسان کی زندگی اور تقدیر میں اہم مسئلہ یہ ہے کہ وہ برائیوں اور ذلت وخواری کے کاموں میں کہیں مبتلا نہ ہو، جو اس کی شرمندگی اور عاجزی کا سبب بنتے ہیں۔ وہ بُرائی کے لیے مثال بن کر اپنی شخصیت لوگوں کی نظر میں بالکل گرا دیتا ہے۔

بنابرایں جب انسان پاک رہے اور صاف ستھری زندگی گزارے تو بلند و بالا تقدیروں میں سے ایک اس کے انتظار میں ہے۔ یا تو اپنی عمر کو نیک نامی کے ساتھ تمام کرتا ہے اور رحمت الٰہی کی طرف بے مثال انعام واکرام کے لیے دوڑ پڑتا ہے، یا اس جہاں میں اپنی عمر کے کسی حصے میں مادّی انعام واکرام سے بہرہ مند ہوتا ہے اور دنیا وآخرت دونوں کی نعماتِ الٰہی سے مستفید ہوتا ہے۔

اہم نکتہ

نہج البلاغہ کے بہت سے مفسرین کو ایک اہم نکتے نے اپنی طرف متوجہ کیا ہے۔ وہ یہ کہ امام علیہ السلام نے فرمایا: ایک مؤمن چاہتا ہے کہ ہر حال میں کامیاب وخوشحال اور لطف ورحمت پروردگار اُس کے شاملِ حال رہے، اسے "فالج یاسر" سے تشبیہ دی ہے۔ بعض مفسرین نے اس تعبیر کو یوں سمجھا ہے کہ اس کے معنی ماہر جواری کے ہیں، جو پہلے مرحلے میں ہی جیت جاتا ہے، اس وقت یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کس طرح امامؑ خداوند متعال کے سامنے راضی بہ رضا اور تسلیم رہنے والے مومنین کو اس قسم کے لوگوں سے تشبیہ دیتے ہیں، جو بڑے بڑے گناہوں میں مبتلا ہیں؟

امامؑ نے مثالوں میں جن کلمات "قداح، فوزۃ، مغنم اور مغوم" سے استفادہ فرمایا ہے، ان پر غور وفکر کرنے سے یہ بات واضح وروشن ہو جاتی ہے کہ یہاں کلمہ "یاسر" سے مراد جواری نہیں ہے، بلکہ کسی خاص قسمت آزمائی کی طرف اشارہ ہے، عربوں میں اس قسم کی قسمت آزمائی سے فقراء کو فائدہ ہوتا تھا۔

نہج البلاغہ کے بعض شارحین کشاف میں زمخشری سے اس طرح نقل کرتے ہیں:

www.shiabookspdf.com

”عرب والے جب اس مقابلے کے لیے نکلتے تھے تو لکڑی کے دس تیر لیتے تھے، ان میں سے ہر ایک کا مخصوص نام تھا۔ اس کے بعد ایک اونٹ خرید کر نحر کر کے اس کے دس حصے کرتے تھے، پھر ان تیروں کو ایک تھیلی میں ڈال کر آپس میں خوب ملا دیتے تھے، پھر ان میں سے ایک با اعتماد آدمی تھیلی میں ہاتھ ڈال کر صرف سات تیروں کو (جن کے مختلف نام تھے) باہر نکالتا تھا، ان کی ترتیب یہ تھی ایک حصہ، دو حصہ، یہاں تک کہ ساتویں حصے کا نام لیتے تھے۔ سب سے بڑے حصے والے تیر کا نام ”معلیٰ“ تھا اور دوسری لکڑی کا کوئی حصہ نہیں ہوتا تھا۔ جن کے تیر نکلتے تھے وہ ایک طرف کھڑے ہو جاتے تھے اور قیمت ادا کر کے گوشت کا حصہ وصول کرتے تھے، اس کے بعد جیتنے والے اپنے حصے کے تمام گوشت فقراء و مساکین کو دے دیتے تھے اور ذرہ برابر بھی وہ اپنے گھروں میں نہیں لے جاتے تھے۔ یہ ان کے لیے بڑے فخر کی بات تھی۔“ [۱]

یہ بالکل درست ہے یہ کام شرعی نقطۂ نظر سے جائز ہے، مگر کبھی جوئے کو تشبیہ کے طور پر پیش نہیں کیا ہے، بلکہ امام علیہ السلام درحقیقت یہ فرمانا چاہتے ہیں کہ جو مومنین راضی بہ رضائے الٰہی ہیں، ان کی مثال ان لوگوں کی طرح ہے جو اپنی قسمت آزمائی کے پہلے ہی مرحلے میں سب سے بڑا انعام جیت جاتے ہیں، جس سے انہیں بڑا فائدہ ہوتا ہے اور اس مقابلے میں انہیں نہ سرمایہ لگانے کی ضرورت ہے اور نہ کوئی نقصان ہے۔

”قداح“ کی مثال جس کے معنی بغیر پھل کے تیر ہیں، اور ”اول فوزة“ کی مثال کہ جس کے معنی بھی کسی نقصان کے بغیر زیادہ مال غنیمت کا ملنا، یہی معنی مناسب تر ہیں۔ جوئے کے کھیل میں ایسا نہیں ہوتا کہ کوئی جواری پہلے ہی مرحلے پر جیت جائے اور کھیل فوراً ختم کر دیا جائے بلکہ جوئے میں طویل بازیوں کے نتیجے میں ہار جیت کا فیصلہ ہوتا ہے اور اس ابتدا کا انجام کسی کو معلوم نہیں ہوتا۔ ہم اس بات سے انکار نہیں کرتے کہ ممکن ہے کلمہ ”میسر“ وسیع مفہوم رکھتا ہو کہ جس میں یہ قسمت آزمائی کی اقسام شامل ہوں، لیکن ایک بات یاد رکھنا ضروری ہے کہ جوئے کے معنیٰ اور کلمہ میسر کے معنیٰ حقیقی اور اس قسم کے قسمت آزمائی کے مقابلے کے معنیٰ میں بہت فرق ہے، قرآن مجید میں خصوصیت کے ساتھ اس قسم کے قسمت آزمائی کو ”ازلام“ کہا گیا ہے ”میسر“ نہیں۔ بہر حال ایسے تمام کلمات اس قسم کے عمل کی مذمت کے لیے آئے ہیں۔ [۲]

نکتہ

---

[۱] شرح نہج البلاغہ، محقق خوئی، جلد ۳، ص ۳۱۹، (مختصر خلاصے کے ساتھ) جو قدیم ترین شرح نہج البلاغہ میں سے ہے، معارج نہج البلاغہ، صفحہ ۱۱۰، میں اس مطلب کی طرف اشارہ ہوا ہے۔

[۲] سورۂ مائدہ، آیت ۹۰، تفسیر نمونہ، جلد ۵، ص ۶۸

www.shiabookspdf.com

کوشش کے ساتھ راضی بہ رضا رہنا

اللہ کے فیصلے پر راضی بہ رضا ہونا خصوصاً مادّی فائدے کے لحاظ سے انسان کو آرام و راحت نصیب کرتا ہے اور یہ اسے مال و دولت کے لالچ اور حرام طریقے سے کمانے والے مقابلوں میں شرکت اور گناہوں میں مبتلا ہونے، بغض و حسد سے اور کینہ پروری سے روکتا ہے، لیکن ممکن ہے کہ یہ کہا جائے کہ یہ اعتقاد اور یقین کہ رزق خدا کی طرف سے معین ہے اور اس میں کمی زیادتی نہیں ہوسکتی اور انسان کو اس تقسیم پر راضی رہنا چاہیے، انسان کو بے عملی کی طرف لے جاتا ہے اور اس کی جدوجہد کی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے۔ وہ یہ بہانہ بنا لیتا ہے کہ روزی تو پہلے ہی تقسیم ہو چکی لہٰذا محنت اور جدوجہد کا کوئی فائدہ نہیں۔ یہ اقتصادی امور، مادّی پیشرفت اور فقر و فاقہ سے مقابلہ کرنے میں اس کو پیچھے رکھنے کا سبب بنتا ہے۔ لیکن ان دو نکتوں کی طرف توجہ دینے سے یہ اعتراض بھی برطرف ہو جاتا ہے:

پہلا: اس قسم کی اسلامی تعلیمات اور اخلاقی نصیحتیں در حقیقت رکاوٹ (Speed Bracker) ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ لوگ اپنے اندر مادّیات کی طرف جانے کے لیے طرح طرح کی سوچ رکھتے ہیں اور اقتصادی طور پر سرمایہ گزاری کے ذریعے زندگی کو بہتر بنانے کا بہت شوق رکھتے ہیں۔ اگر ان کے مادّیات کی طرف بڑھنے کے عوامل کو قابو میں نہ رکھا جائے تو ان میں اتنی تیزی آ جائے گی کہ لوگ لالچ، سرمائے کی بہتات اور اسے جمع کرنے کی دوڑ میں تمام اخلاقی حدود کو توڑتے ہوئے آگے بڑھ جائیں گے۔ اسی چیز کو حضرت امام زین العابدین علیہ السلام نے اپنے پاکیزہ کلمات میں باریک بینی سے بیان فرمایا ہے۔ آپؑ فرماتے ہیں:

"مَعَاشِرَ أَصْحَابِيْ! أُوْصِيكُمْ بِالْآخِرَةِ وَ لَسْتُ أُوْصِيكُمْ بِالدُّنْيَا! فَإِنَّكُمْ بِهَا مُسْتَوْصُوْنَ وَ عَلَيْهَا حَرِيْصُوْنَ وَ بِهَا مُتَمَسِّكُوْنَ"

"اے میرے دوستو! میں تمہیں ابدی زندگی کی سفارش کرتا ہوں اور دنیا کے بارے میں سفارش نہیں کروں گا، کیوں کہ تم اس کی نسبت بہت زیادہ آگاہی رکھتے ہو، اس کی طرف طمع سے لپکتے ہو اور اس پر جھپٹ پڑتے ہو۔"[1]

دوسرا: تعلیماتِ اسلامی کے موارد میں مختلف آیات و روایات کو ایک ساتھ رکھ کر مکمل نتیجہ لینا چاہیے، کیوں کہ بنیادی مسائل میں ایک آیت یا ایک حدیث سے آخری فیصلہ نہیں دے سکتے۔ ایک طرف تو کسب رزق اور محنت مزدوری کے ذریعے رزقِ حلال حاصل کرنے پر بے حد زور دیا گیا ہے اور اس پر بہت سی روایات ہیں، جب کہ دوسری طرف مقدراتِ الٰہی پر راضی

---

[1] بحار الانوار، جلد ۷۵، ص ۱۴۷

www.shiabookspdf.com

بہ رضا رہنے اور مشیتِ الٰہی کے آگے سرِ تسلیم خم کرنے کے لیے بھی بہت سی روایات اور احادیث موجود ہیں۔ ان تمام روایات اور احادیث کا بغور مطالعہ اور ان پر غور و فکر سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ نہ تو زندگی میں بے عملی اور جدو جہد ترک کردینا ہی صحیح ہے اور نہ مقدراتِ الٰہی اور اُس ذات پاک پر توکل سے مکمل چشم پوشی کرکے حرص و گناہ میں آلودہ زندگی گزارنا ہی صحیح راہ ہے۔

دوسرے لفظوں میں یہ بات درست ہے کہ روزی اللہ تعالیٰ کی جانب سے تقسیم شدہ ہے، لیکن یہ محنت و کوشش و متانت اور اخلاقی پاسداری اور تقویٰ کے ساتھ مشروط ہے۔ اس سلسلے میں ایک شاعر نے کہا ہے:

رزق ہر چند بے گمان ، برسد　　　شرط عقل است جستن از درھا
گرچہ کس بے اجل نخواہد مرد　　　تو نرو در دھان اژدرھا

"یعنی روزی کہیں سے بھی وہم و گمان کے بغیر پہنچ جائے گی، مگر روزی تقسیم ہونے والے دروازوں کو عقل مندی سے ڈھونڈنا تمہارا کام ہے، اگرچہ بغیر موت کے کوئی مخلوق نہیں مرتی تو تمہیں چاہیے کہ اپنے آپ کو اس دنیا کے اژدھوں کے لیے لقمہ مت بناؤ۔"[1]

اس گفتگو کو راضی بہ رضائے الٰہی اور تسلیم کی اہمیت کے بارے میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک جامع حدیث سے اختتام پزیر کرتے ہیں، جس میں آنحضرتؐ نے فرمایا:

"قیامت کے روز خداوند متعال میری امت میں سے ایک گروہ کو بال و پر عطا کردے گا تاکہ اپنی قبروں سے بہشت کی طرف پرواز کریں اور بہشت کی فضا میں آزادی سے گھومیں پھریں اور بہشت کے ناز و نعمت سے استفادہ کریں۔ اُس وقت فرشتگانِ الٰہی ان سے پوچھیں گے:

"کیا تم لوگوں نے عدالت گاہِ الٰہی کو دیکھا ہے؟"

وہ کہیں گے:

"نہیں!"

دوبارہ پوچھیں گے:

"کیا تم لوگ صراط پر سے گزرے ہو؟"

وہ جواب دیں گے:

"ہم نے کوئی صراط نہیں دیکھی۔"

[1] گلستان سعدی، باب سوم، فضیلت قناعت

www.shiabookspdf.com

فرشتے پھر سوال کریں گے:

"کیا تم لوگوں نے جہنم کو دیکھا ہے؟"

وہ جواب دیں گے:

"ہم نے کسی چیز کو نہیں دیکھا۔"

اس وقت فرشتے حیرت سے سوال کریں گے:

"تم لوگ کس کی امّت میں سے ہو؟"

وہ لوگ جواب دیں گے:

"آنحضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت میں سے ہیں۔"

فرشتے کہیں گے:

"تمہیں خداوند متعال کی قسم ہے، بتاؤ! دنیا میں تمہارے اعمال کیا تھے جو اتنا بڑا مقام و مرتبہ حاصل ہوا ہے؟"

وہ لوگ جواب دیں گے:

"ہم میں دو خصلتیں اور عادتیں تھیں کہ جن کی وجہ سے خداوند متعال نے اپنے فضل و رحمت سے ہمیں یہ مقام عطا کیا۔"

سوال کیا جائے گا:

"وہ دو عادتیں کیا تھیں؟"

وہ کہیں گے:

"كُنَّا إِذَا خَلَوْنَا نَسْتَحِيْ أَنْ نَعْصِيَهُ وَنَرْضىٰ بِالْيَسِيْرِ مِمَّا قُسِمَ لَنَا۔"

"ہم نے تنہائی میں بھی خدا کے سامنے گناہ کرنے سے شرم و حیا کی تھی اور جتنی مقدار دنیا سے ہماری قسمت میں تھی اُس پر ہم راضی بہ رضائے الٰہی تھے اور اس پر قناعت کی تھی۔"

فرشتے کہیں گے:

"حَقٌّ لَكُمْ هٰذَا۔"

"یہ بلند و بالا مقام تمہارا ہی حق ہے۔"[1]

[1] مسکن الفوائد، بنقل بحار الانوار، جلد ۱۰۰، ص ۲۵

www.shiabookspdf.com

دوسرا حصہ

فَاحْذَرُوْا مِنَ اللّٰهِ مَا حَذَّرَكُمْ مِنْ نَفْسِهٖ وَاخْشَوْهُ خَشْيَةً لَيْسَتْ بِتَعْذِيرٍ وَاعْمَلُوْا فِي غَيْرِ رِيَاءٍ وَلَا سُمْعَةٍ فَاِنَّهٗ مَنْ يَعْمَلْ لِغَيْرِ اللّٰهِ يَكِلْهُ اللّٰهُ لِمَنْ عَمِلَ لَهٗ نَسْاَلُ اللّٰهَ مَنَازِلَ الشُّهَدَاءِ وَمُعَايَشَةَ السُّعَدَاءِ وَمُرَافَقَةَ الْاَنْبِيَاءِ.

"جتنا اللہ نے ڈرایا ہے اُتنا اُس سے ڈرتے رہو اور اُتنا اُس سے خوف کھاؤ کہ تمہیں عذر نہ کرنا پڑے۔ عمل بے ریا کرو اس لیے کہ جو شخص کسی اور کے لیے عمل کرتا ہے، اللہ اس کو اسی کے حوالے کر دیتا ہے۔ ہم اللہ سے شہیدوں کی منزلت، نیکوکاروں کی ہمدمی اور انبیاءؑ کی رفاقت کا سوال کرتے ہیں۔"

صالحین کے مقام تک پہنچنے کا راستہ

خدا سے اس طرح ڈرو کہ جس طرح تمہیں ڈرنے کا حکم دیا ہے اور سچ مچ اُس ذات سے اس انداز میں خوف رکھنا چاہیے کہ کسی غیر معقول عذر خواہی کی ضرورت نہ پڑے۔ اپنے اعمال کو دکھاوے اور مکر وفریب سے پاک رکھو، کیوں کہ جو کوئی خدا کے علاوہ کسی اور کے لیے کام انجام دیتا ہے، خداوند متعال اسے اسی کے پیچھے لگا دیتا ہے، تا کہ اس سے کام کی مزدوری وصول کرے۔

ہم خداوند متعال سے دست بہ دعا ہیں کہ شہیدانِ راہِ حق، سعادت مندانِ اسلام اور پیغمبرانِ الٰہی کے ساتھ بیٹھنے والوں ساتھ ہمیں محشور فرمائے۔ آمین

شرح وتفسیر

حضرت امام علی علیہ السلام اس خطبے کو جاری رکھتے ہوئے چند اخلاقی ہدایات فرماتے ہیں جو گزشتہ بحث کی تکمیل ہے۔

۱۔ "فَاحْذَرُوْا مِنَ اللّٰهِ مَا حَذَّرَكُمْ مِنْ نَفْسِهٖ"

"خدا سے تم اس طرح ڈرو! جس طرح تمہیں ڈرنے کا حکم دیا ہے۔"

یہ مثال ممکن ہے اس آیہ شریفہ کی طرف اشارہ ہو، جس میں فرماتا ہے:

"فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖٓ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۶۳﴾" [1]

---

[1] سورۂ نور، آیت ۶۳

www.shiabookspdf.com

"جو لوگ اللہ کے حکم کی مخالفت کرتے ہیں، انہیں کسی بلا و مصیبت میں مبتلا ہونے یا کسی دردناک عذاب میں گرفتار ہونے سے قبل اللہ تعالیٰ کی ذات سے خوف کھانا چاہیے۔"

یا شاید اس آیۂ شریفہ کی طرف اشارہ ہو، جس میں ارشاد ہوتا ہے:

"وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ" [۱]

"اللہ تمہیں اپنی نافرمانی سے ڈراتا ہے۔ اور سب کی بازگشت اُسی ذات کی طرف ہے۔"

۲۔ حضرت امام علی علیہ السلام ایک دوسری ہدایت میں فرماتے ہیں:

"وَاخْشَوْهُ خَشْيَةً لَيْسَتْ بِتَعْذِيرٍ" [۲]

"عظمتِ خداوند متعال سے سچے دل سے ڈرنا چاہیے اور کوئی ایسا کام انجام نہ دے جس کی معذرت کرنا پڑے۔"

کیوں کہ وہ ذات ہر کسی کے باطن سے آگاہ ہے۔ بیہودہ اور جھوٹی معذرت اور سچی عذر خواہی کو اچھی طرح جانتا ہے۔ یہاں یہ نکتہ قابلِ ذکر ہے کہ پہلے جملے میں کلمہ "حذر" مقابل پروردگار کے معنی میں ہے۔ اس جملے میں "حذر" سے مراد اللہ سے ڈرنا ہے۔ اہل لغت کہتے ہیں کہ "خشیت" سے مراد معرفت کے ساتھ رکھنے والا خوف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم قرآن مجید میں پڑھتے ہیں:

"اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا" [۳]

"بندگانِ الٰہی میں صرف علمائے اعلام اور دانشور اللہ سے ڈرتے ہیں"۔

مگر "حذر" کا لفظ اس وقت استعمال کیا جاتا ہے جب انسان کوئی قطعی یا احتمالی خطرہ محسوس کرے اور اس کی روک تھام کرے اور اس سے بچنے کی کوشش کرے۔

۳۔ حضرت امام علی علیہ السلام نے تیسری ہدایت میں فرمایا:

"وَاعْمَلُوْا فِيْ غَيْرِ رِيَاءٍ وَلَا سُمْعَةٍ فَاِنَّهٗ مَنْ يَعْمَلْ لِغَيْرِ اللّٰهِ يَكِلْهُ اللّٰهُ لِمَنْ عَمِلَ لَهٗ"

"اپنے اعمال میں خلوص پیدا کرو اور دکھاوے، اور مکر و فریب سے پاک کرو، کیوں کہ جو کوئی بھی غیر خدا کے لیے کام کرے گا، اللہ تعالیٰ اس آدمی کو اسی کے پیچھے لگا دیتا ہے۔"

---

[۱] سورۂ آلِ عمران، آیت ۲۸

[۲] تعذیر، عذر کے مادّے سے ہے، یہاں پر عذر کے نہ ہونے کے معنی کے لیے مناسب ہے۔

[۳] سورۂ فاطر، آیت ۲۸

www.shiabookspdf.com

جی ہاں! خداوند متعال کا خوف اور صرف گناہوں سے ڈرنا کافی نہیں ہے، بلکہ ایسے اعمال بھی ہونے چاہئیں جو ہر قسم کی ریا اور فریب کاری سے خالی ہوں۔

ریا:

یعنی اپنے نیک اعمال کو دوسروں کو دکھانا اور دوسروں کو اپنی طرف متوجہ کرانے کے لیے کوئی ایسا کام انجام دینا جس میں دکھاوا ہو۔

سمعہ:

وہ ہے کہ ایسا عمل جو خدا کے لیے انجام دیتا ہو، لیکن کوشش یہ ہو کہ دوسرے بھی دیکھیں اور سنیں، اس طرح دوسروں کی توجہ کا مرکز بن جائے۔ اگر خود یہ کام نہ کرے تو دوسروں سے سننے کی وجہ سے وہ خوش ہوتا ہے کہ یہ لوگ میری تعریف و توصیف کر رہے ہیں۔

دانشوروں کے درمیان یہ مشہور ہے کہ "سمعہ" سے عمل باطل نہیں ہوتا، لیکن اخلاقی لحاظ سے انسانی روح کی تذلیل ہوتی ہے اور ثواب اکارت اور عمل کی جزا خراب ہوتی ہے۔

حضرت امام علی علیہ السلام اس عبارت میں ریا اور سمعہ کی نفی میں اور اس سے روکنے کے لیے ایک لطیف دلیل کا سہارا لیتے ہیں۔ فرماتے ہیں: "خداوند متعال صرف ایسے عمل کو پسند فرماتا ہے جو خالص ہو اور فقط اُسی کی ذات کے لیے ہو، لیکن اگر کسی غیر خدا کو اس میں شریک کرے تو اللہ تعالیٰ عمل کے ثواب و جزا کے لیے اسی شریک کے پاس بھیج دیتا ہے اور یقیناً شریک ثواب و جزا دینے کی قدرت نہیں رکھتا ہے۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے حدیثِ قدسی کا یہ مشہور مضمون نقل ہوا ہے جس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"أَنَا خَيْرُ شَرِيْكٍ وَ مَنْ أَشْرَكَ مَعِيَ شَرِيْكًا فِيْ عَمَلِهِ فَهُوَ لِشَرِيْكِيْ دُوْنِيْ: لِأَنِّيْ لَا أَقْبَلُ إِلَّا مَا خَلَصَ لِيْ" [1]

"میں بہترین شریک ہوں، لیکن اگر کسی نے اپنے عمل میں دوسروں کو میرا شریک قرار دے دیا تو میں اس عمل کو شریک کے لیے واگزار کر دیتا ہوں، کیوں کہ میں خالص عمل کے علاوہ کسی اور عمل کو قبول نہیں کرتا۔"

اس خطبے کے آخر میں امامؑ فرماتے ہیں:

"نَسْأَلُ اللهَ مَنَازِلَ الشُّهَدَاءِ وَ مُعَايَشَةَ السُّعَدَاءِ وَ مُرَافَقَةَ الْأَنْبِيَاءِ"

[1] منہاج البراعۃ، جلد ۳، ص ۳۲۴ پر یہی مضمون امام صادقؑ سے اور بحار الانوار، جلد ۶۷، ص ۲۴۳ پر نقل ہوا ہے۔

www.shiabookspdf.com

"خداوندمتعال سے دعا گو ہوں کہ شہیدوں، سعادت مندزندگی گزارنے والوں اور پیغمبرانِ الٰہی کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے والوں میں سے ہمیں قرار دے۔"

اس گفتگو میں امامؑ حقیقتاً اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہترین حسب ونسب کی قدروقیمت اوراس کی پہچان کرانا چاہتے ہیں تاکہ دوسرے بھی اس کی پیروی کریں، وہ قیمتی چیز، اللہ کی راہ میں شہادت ہے اوروہ گوہر، سعادت مندزندگی اور پیغمبروںؑ کے ساتھ ہم نشینی کرنا ہے۔ اور یقیناً اللہ ان میں سے کوئی ایک بھی کسی کو بغیر حساب وکتاب نہیں دیتا۔ قرآن کریم فرماتا ہے:

"وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ۝ ذٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ عَلِيْمًا ۝"[1]

"جوخدااوررسولؐ کی اطاعت کرتے ہیں، وہ قیامت کے دن انہی کے ساتھ ہوں گے کہ جن پر خداوندمتعال نے اپنی تمام نعمتوں کونازل کیا ہے، اور سچے لوگ، شہداء وصالحین ان کے اچھے ساتھی ہوں گے، یہ خداوندمتعال کی جانب سے ایسے اطاعت گزار بندوں کے لیے بہترین تحفے ہیں۔ اوراُسی کی ذات کے لیے ہی سزاوار ہیں کہ جواپنے بندوں کی حالت سے اور ان کے اعمال کی نیتوں سے آگاہ ہے"۔

کلامِ امیرالمومنینؑ میں یہ تین مرحلے آئے ہیں: ۱۔شہادت ۲۔سعادت ۳۔پیغمبروںؑ کی ہم نشینی۔

یہ ایک دوسرے کا علّت ومعلول بھی ہوسکتا ہے، کیوں کہ شہادت، سعادت کا سبب ہے اورسعادت پیغمبروںؑ کے ساتھ ہم نشینی کا سبب بنتی ہے۔ اس کے علاوہ ممکن ہے کہ یہ آئندہ آنے والے حوادث اورآپؑ کی شہادت کی طرف بھی اشارہ ہو۔

نکتہ

عمل کی اہم ترین شرط خلوصِ نیت ہے

شرک وبت پرستی کی بھی شاخیں ہوتی ہیں۔ ان اہم ترین شاخوں میں سے چند" ریا، دھوکا اورسمعہ، فریب کاری ہیں:

ریا

رؤیت سے ہے، اس کے ظاہری معنی دکھاوا، بڑا پن اور دوسروں کو اپنا کام دکھانا ہے۔ یعنی ریاکار کا مقصد یہ

[1] سورۂ نساء، آیات ۶۹، ۷۰

www.shiabookspdf.com

ہوتا ہے کہ دکھاوے کی عبادات اور نیکیاں انجام دے، تا کہ لوگ اس کی تعریف کریں ۔اس قسم کے لوگ درحقیقت مشرک ہیں، کیوں کہ وہ خدا کی خوشنودی کے لیے کچھ نہیں کرتے، بلکہ اپنی عزّت وآبرو اور عظمت ووقار کو لوگوں کے ہاتھوں داغدار کرنے کے لیے دے دیتے ہیں۔فقط لوگوں کو دکھانے کے لیے اعمال بجالاتے ہیں۔

سمعہ

اس کی دو تفسیریں ہوئی ہیں:

تفسیر اوّل

یہ کہ انسان خدا کی خوشنودی کے لیے کوئی کام انجام دے، لیکن اس عمل کو دوسروں تک پہنچانے کی فکر بھی کرتا ہے اور وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس طرح وہ لوگوں میں قابلِ اعتبار ہو جائے۔یہ وہی عمل ہے جو فقہا کے اعتقاد میں باطل نہیں ہوتا، کیوں کہ اعمال کے انجام دینے کے بعد حاصل ہوا ہے، لیکن اس عمل کا ثواب یا کم ہو جاتا ہے یا بالکل ثواب ہی نہیں ملتا۔

تفسیر دوّم

یہ کہ انسان عمل شروع کرنے کے ساتھ ہی یہ چاہے کہ لوگ اس کے عمل کے متعلق سنیں اور اس کی تعریف کریں۔ اس عمل میں اور ریا اور دھوکے، میں کوئی فرق نہیں ہے، سوا اس کے کہ ریا کا عمل وہاں انجام دیا جاتا ہے، جہاں لوگ اسے دیکھیں اور سمعہ میں عمل وہاں انجام دیا جاتا ہے جہاں لوگ اس کے عمل کے متعلق سنیں۔پس ان دونوں اعمال میں سے کوئی بھی پروردگارِ عالم کی خوشنودی کے لیے انجام نہیں پاتا۔اس صورت میں ممکن ہے سمعہ عمل کے باطل ہونے کا سبب بن جائے، کیوں کہ یہ خلوصِ نیت سے بالکل خالی ہے۔

نہج البلاغہ کی مذکورہ بالا تفاسیر سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ ریا اور سمعہ دونوں ایک معنی میں بھی آسکتے ہیں۔بہر حال، ریا وسمعہ دونوں عبادات واعمال الٰہی کے لیے بہت بڑی آفت ہیں۔کسی انسان کے عمل میں ریا وسمعہ بہت پیچیدہ طریقے سے داخل ہوتے ہیں۔قرآن مجید کی آیات اور احادیث میں اس کی نسبت کئی مقامات پر تنبیہ کی گئی ہے۔

۱۔اہم ترین مفاسد میں سے پہلا

اس عمل کا اہم ترین مفسدہ یہ ہے کہ اس سے توحید الٰہی کی روح ختم ہو جاتی ہے اور انسان کو شرک کے دوراہے پر کھڑا

www.shiabookspdf.com

کر دیتا ہے، کیوں کہ خدا کی توحید افعالی بتاتی ہے کہ ثواب و جزا، انعام و اکرام، عزت و آبرو، وقار و توقیر و شخصیت اور روزی و رزق تمام چیزیں اللہ کے ہاتھ میں ہیں اور اس کے ارادے سے انجام پاتی ہیں، لیکن ریا اور دکھاوے کے ساتھ عبادت کرنے والے ان تمام چیزوں کو اللہ سے نہیں کسی اور سے طلب کرتے ہیں اور یہ کھلم کھلا شرک ہے۔

روایات میں آیا ہے کہ قیامت کے دن ہر کسی کا باطنی اسرار آشکار کیا جائے گا اور ریا کاروں سے مخاطب ہو کر کہا جائے گا:

"يَا كَافِرُ، يَا فَاجِرُ، يَا غَادِرُ، يَا خَاسِرُ، حَبِطَ عَمَلُكَ وَبَطَلَ أَجْرُكَ، فَلَا خَلَاصَ لَكَ الْيَوْمَ."

"اے کافر!، اے فاسق!، اے عہد و پیمان توڑنے والے!، اے خسارے میں رہنے والے! تیرا عمل باطل ہو گیا اور اجر و ثواب برباد ہو گئے اور آج تیرے لیے نجات کا کوئی راستہ نہیں۔"[1]

۲۔ اہم ترین مفاسد میں سے دوسرا

ریا کاری اور سمعہ کی تباہ کاریوں کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ یہ انسانی معاشرے کے اجتماع میں اقسام مفاسد کے جنم لینے کا منبع و سرچشمہ ہے۔ ریا کار افراد ظاہری طور پر دکھاوے کے اعمال بجالاتے ہیں۔ باطن میں خضوع و خشوع اور خلوصِ نیت کی طرف کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ وہ اعمال ظاہری طور پر بالکل خضوع و خشوع کے ساتھ انجام دیے جاتے ہیں، مگر درحقیقت مفاسد سے بھرے ہوتے ہیں۔ اجتماعات اور معاشرۂ انسانی میں صرف ظاہری دکھاوا ہوتا ہے۔ حقیقت میں معاشرے کے لیے خیر و برکت کا جس طرح سرچشمہ ہونا چاہیے، اس کا دور دور تک پتا نہیں ہوتا۔ ان کے افکار اور کام صرف اوپری سطح پر ہوتے ہیں، گہرائی اور مضبوطی سے خالی۔ ان کا ہدف مثلاً نمازوں کی تعداد، رکعات کی تعداد، روزے کی تعداد، نیکیوں کی تعداد پر زیادہ توجہ دینا ہے اور ان اعمال میں کیفیت کی اہمیت کی کوئی فکر نہیں کرتے۔ اس کا لازمہ یہ ہے اس قسم کا معاشرہ اور اجتماع بہت جلد منتشر ہوتا ہے اور اس معاشرے کے لوگوں کی کہانی بہت ہی عبرت آمیز داستان بن کر رہ جاتی ہے۔

آج کی اس مادّی دنیا میں، وہ ممالک جو اپنی صنعت و حرفت، مسائل کا سلجھاؤ اور اقتصادی پروگراموں کو اہمیت دیتے ہیں اور خلوص کے ساتھ اپنے اجتماع اور معاشرے کے لیے کام کرتے ہیں تو ان کے تمام محصولات ظاہری اور باطنی دونوں اعتبار سے صحیح و سالم رہتے ہیں اور ادارے خوب ترقی کی راہ پر گامزن رہ کر ہر کسی کو اپنے اعتماد میں لیتے ہیں۔ لیکن ریا کاری کے اداروں پر کسی کو کوئی اعتبار نہیں ہوتا۔ ریا اور سمعہ کے بارے میں مطالب بہت زیادہ ہیں، اللہ نے توفیق دی تو آئندہ بحثوں میں بیان کریں گے۔

---

[1] وسائل الشیعۃ، جلد ا، ص ۵۰

www.shiabookspdf.com

حصۂ سوّم

اَيُّهَا النَّاسُ اِنَّهُ لَا يَسْتَغْنِي الرَّجُلُ وَ اِنْ كَانَ ذَا مَالٍ عَنْ عِتْرَتِهِ وَ دِفَاعِهِمْ عَنْهُ بِاَيْدِيهِمْ وَ اَلْسِنَتِهِمْ وَ هُمْ اَعْظَمُ النَّاسِ حَيْطَةً مِنْ وَرَائِهِ وَ اَلَمُّهُمْ لِشَعَثِهِ وَ اَعْطَفُهُمْ عَلَيْهِ عِنْدَ نَازِلَةٍ اِذَا نَزَلَتْ بِهِ وَلِسَانُ الصِّدْقِ يَجْعَلُهُ اللهُ لِلْمَرْءِ فِي النَّاسِ خَيْرٌ لَهُ مِنَ الْمَالِ يَرِثُهُ غَيْرُهُ.

”اے لوگو! کوئی شخص بھی اگر چہ وہ مال دار ہو اپنے قبیلے والوں اور اس امر سے کہ وہ اپنے قول و فعل سے اس کی حمایت کریں، بے نیاز نہیں ہو سکتا ہے اور وہی لوگ سب سے زیادہ اس کے پشت پناہ اور اس کی پریشانیوں کو دور کرنے والے اور مصیبت پڑنے کی صورت میں اس پر شفیق و مہربان ہوتے ہیں۔ اللہ جس شخص کا سچا ذکر خیر لوگوں میں برقرار رکھتا ہے۔ تو یہ اس مال سے کہیں بہتر ہے، جس کا وہ دوسروں کو وارث بنا جاتا ہے۔“

شرح و تفسیر

لوگوں کا اصل سرمایہ

اِس خطبے کے پہلے مباحث میں حضرت امام علی علیہ السلام نے تنگ دست اور نادار افراد کے لیے جو ہدایات فرمائی تھیں، ان کا ذکر ہوا کہ ان کی زندگی گزارنے کے طور طریقے کہیں اطاعت خداوندی اور اخلاقی اقدار سے انحراف کا سبب نہ بن جائیں۔ خطبے کے اس حصے میں دولت مندوں اور پیسہ کمانے والوں کے بارے میں ہے اور امامؑ ان کے لیے ضروری دستورات دیتے ہیں تاکہ معاشرے میں اعتدال برقرار رہے۔ سب سے پہلے انہیں اس بات کا شوق دلاتے ہیں کہ وہ اپنے عزیز و اقارب، ساتھ رہنے والوں اور ضرورت مندوں کی مدد کریں اور واضح دلیل کے ذریعے ان لوگوں کو اپنے مال و دولت سے ضرورت مندوں کی مدد کی ترغیب دلاتے ہیں۔ آپؑ فرماتے ہیں:

”اَيُّهَا النَّاسُ اِنَّهُ لَا يَسْتَغْنِي الرَّجُلُ وَاِنْ كَانَ ذَا مَالٍ عَنْ عِتْرَتِهِ[1] وَدِفَاعِهِمْ عَنْهُ بِاَيْدِيهِمْ

[1] عترت، اہل لغت نے اسے کسی چیز کی بنیاد اور اصل کہا ہے، اور کبھی کاٹنے والے خوشبودار پتے والے پودوں کو کہا جاتا ہے۔ کبھی عترت، صرف اولاد کو کہا جاتا ہے۔ لہٰذا عترتِ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کی اولاد ہیں۔ معروف حدیث ”اِنِّي تَارِكٌ فِيكُمُ الثَّقَلَيْنِ كِتَابَ اللّٰهِ وَعِتْرَتِي وَاَهْلَ بَيْتِي“ میں اسی مطلب کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ (لسان العرب، صحاح، و مقائیس اللغۃ)

www.shiabookspdf.com

وَ أَلْسِنَتِهِمْ۔"

"اے لوگو! انسان کتنا ہی ثروت مند کیوں نہ ہو جائے وہ اپنی قوم، عزیز و اقارب اور ساتھ رہنے والوں سے الگ ہو کر نہیں رہ سکتا۔ یہ لوگ قول و فعل سے ان کا دفاع کرتے ہیں۔"

"وَ هُمْ أَعْظَمُ النَّاسِ حَيْطَةً [1] مِنْ وَرَائِهِ وَ أَلَمُّهُمْ [2] لِشَعَثِهِ [3] وَ أَعْطَفُهُمْ عَلَيْهِ عِنْدَ نَازِلَةٍ إِذَا نَزَلَتْ بِهِ۔"

"یہ لوگ اصل میں پیٹھ پیچھے ایک مضبوط گروہ ہے جو ان کی پشت پناہی کرتا ہے۔ پریشانی اور مشکلات میں ان کی مدد کرتا ہے اور سخت ترین حالات کے دنوں میں سب سے زیادہ مہربان رہتا ہے۔"

جی ہاں! انسان اپنی زندگی میں کبھی نشیب و فراز، کبھی تلخ اور ناگوار حادثات اور کبھی سخت طوفانوں سے روبرو ہوتا ہے۔ کسی انسان میں اکیلے ان کے سامنے کھڑے ہو کر مقابلہ کرنے کی ہمت نہیں ہے۔ عقل و روایت اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ آرام کے دنوں میں انسان انہی دنوں کی فکر کرتا ہے۔ ان حالات میں اپنے عزیز و اقارب اور ساتھ رہنے والوں سے مدد ملے تو کتنا بہتر ہے؟ جو ان برے حالات میں بھی ان کی حمایت اور مدد کرتے ہیں، لیکن کیا اُن سے نیکی، ان کی مالی و معنوی مدد اور ان کے مراتب کے لحاظ سے محبت و دوستی کیے بغیر برے وقتوں میں ان کی حمایت حاصل کی جا سکتی ہے؟ یہاں پر یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ ہرگز نہیں۔ پس ہر انسان کو اپنی مادّی حیثیت سے استفادہ کرتے ہوئے بخشش و عنایات سے اپنے عزیز و اقارب اور ساتھیوں کی محبت و دوستی کو مزید محکم کرنے سے بہتر کوئی چیز نہیں، تا کہ حادثات اور معنوی و ظاہری سخت طوفانوں کے وقت وہ اکیلا نہ رہے۔ یہ درست ہے کہ دوسروں کے ساتھ نیکی کے اور بھی فائدے موجود ہیں "اَلْإِنْسَانُ عَبِيْدُ الْإِحْسَانِ"، انسان احسان کے غلام ہیں، لیکن اس کام کے لیے انسان کے ساتھ رہنے والے افراد سب سے زیادہ مقدم ہیں۔ اس کے علاوہ یہ لوگ محبت و دوستی کے لیے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔

قابل توجّہ نکتہ

---

[1] حیطہ، اسم مصدر ہے اور اس کا مادّہ حوط ہے اور کسی چیز کے احاطہ کرنے کے معنی میں آتا ہے۔ یہاں حیطہ، حفظ و نگہداری کے معنی میں آیا ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ حیطہ کی "ح" فتح کے ساتھ مراقبت کے معنی میں ہے، "روح" کو کسرہ کے ساتھ حفظ کرنے کے معنی میں ہے۔

[2] الم، کا مادّہ لم ہے، اور جمع کرنے کے اور اصلاح کرنے کے معنی میں آتا ہے۔

[3] شعث، پراگندگی اور پریشانی کے معنی میں آتا ہے۔

www.shiabookspdf.com

یہ نکتہ قابلِ توجہ ہے کہ اگر حقیقت میں تمام معاشرے میں یہ دستور جاری ہو جائے تو مایوسی اور محرومیوں کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے، کیوں کہ ہر خاندان اور قوموں کے درمیان سنجیدہ اور سلجھے ہوئے لوگ موجود ہوتے ہیں۔ اگر یہ لوگ اپنے خاندان والوں کے درمیان محبت و دوستی کو پھیلا دیں تو عمومی طور پر مشکلات خود بخود دُور ہو جائیں گی۔ انسان عام محروم افراد کی شناخت کی بہ نسبت اپنے خاندان والوں کو بہتر جانتے ہیں اور ان کی ہدایات و تبلیغ کو قبول کرنے کے لیے لوگ آسانی سے تیار ہو جاتے ہیں۔ حضرت امام علی علیہ السلام ایک خط میں حضرت امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام سے اس بارے میں ایک جامع گفتگو میں فرماتے ہیں اور قوموں اور عزیزوں کے ساتھ رہنے کے فائدے کی طرف توجہ دلاتے ہوئے اس طرح شرح فرماتے ہیں:

"وَ أَکْرِمْ عَشِیْرَتَکَ؛ فَإِنَّهُمْ جَنَاحُکَ الَّذِیْ بِهٖ تَطِیْرُ وَ أَصْلُکَ الَّذِیْ إِلَیْهِ تَصِیْرُ وَ یَدُکَ الَّتِیْ بِهَا تَصُوْلُ-"[1]

"اپنی قوم و قبیلے اور ساتھ رہنے والوں کا احترام کرو، کیوں کہ یہ لوگ تمہارے پر و بال ہیں، جن کے ذریعے پرواز کرو گے، جو تمہاری ترقی کے ضامن ہیں اور یہی تمہارے اپنے ہیں، جن میں تم پلٹ جاؤ گے، دائیں اور بائیں بازو ہیں، جن کے ساتھ تم دشمنوں پر حملے کرو گے۔"

حضرتؑ اس کے بعد ایک لطیف دلیل کی طرف جاتے ہیں اور با اعتماد افراد کو دیگر تمام افراد کی نسبت مالی مدد کرنے کی طرف ترغیب دیتے ہوئے فرماتے ہیں۔ خداوند متعال انسان کو دوسروں سے محبت اور نیکوکاری کی وجہ سے اچھے نام سے یاد فرماتا ہے:

"وَلِسَانُ الصِّدْقِ یَجْعَلُهُ اللّٰهُ لِلْمَرْءِ فِی النَّاسِ خَیْرٌ لَّهٗ مِنَ الْمَالِ یَرِثُهٗ غَیْرُهٗ-"

"وہ نیک نامی جو خداوند متعال کسی انسان کو لوگوں کے درمیان عطا کرتا ہے، اُس دولت مندی سے کہیں بہتر ہے جو وہ ہر حال میں دوسروں کے لیے چھوڑ جائے گا۔" دوسرے لفظوں میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ

نام نیکی گر بماند ز آدمی به کزو ماند سرای زرنگار

یہ مال و ثروت کی طرف اشارہ ہے، اس میں سے کوئی چیز بھی انسان کے ساتھ قبر اور قیامت میں ساتھ جانے والی نہیں ہے۔ اسے چھوڑ کر جانا پڑے گا۔ اور جب یہ مال و ثروت اس کے مرنے کے بعد وارثوں کے ہاتھ لگ جاتا ہے تو صاحب مال کو سرے سے بھلا دیتا ہے، لیکن ایک ایسی چیز ہے جو انسان کے مرنے کے بعد اس کے ساتھ رہتی ہے اور وہ ہے اُس کا ذکرِ خیر اور نیک نامی جو لوگوں کی زبان پر ہر وقت رہتی ہے۔ جب بھی اس کا نام سنتا ہے خداوند متعال سے اس کی بخشش کی اور اس کے لیے طلب رحمت کی دعا کرتا ہے۔ یہ ایسا ہمیشہ رہنے والا مادّی و معنوی سرمایہ ہے، جس کے کمانے کے طریقوں

[1] پایان نامہ، ۳۱۔

www.shiabookspdf.com

میں سے ایک اہم طریقہ پروردگار کی دی ہوئی روزی اور نعمتوں میں سے اسی کے راہ میں خرچ اور بندگان خدا کے حق میں عطاو بخشش، رشتے داروں پر احسان اور حسنِ سلوک سے پیش آنا ہے۔ان تمام باتوں میں دراصل دولت مندوں کو معاشرے کے غریب وغربا، یتامیٰ ومساکین کی مدد کرنے کے دو طریقوں سے تشویق دی گئی ہے:

۱۔ایسے دوستوں اور مددگاروں کا پیدا کرنا کہ پوری زندگی ناگہانی حادثات اور دردناک واقعات میں دوڑ کر اس کی مدد کے لیے پہنچ جائیں۔

۲۔ایسے دوستوں کو جمع کرنا جو اس کے مرنے کے بعد خداوند متعال سے اس کی بخشش اور روح کی خوشی کے لیے دعا کریں۔خوش نصیب ہے وہ انسان جو اس فانی دنیا سے یہ دو چیزیں (سرمائے) حاصل کر لے۔

نکتہ

نیک نامی کی قدر وقیمت (لسانِ صدق)

خطبے کے اس حصے میں امامؑ انسان کی نیک نامی کی ہمیشہ رہنے والے سرمائے کے عنوان سے توصیف فرماتے ہیں اور ورثے میں رہ جانے والے مال پر اس کی اہمیت و برتری کو واضح فرماتے ہیں۔قرآن مجید بھی اس مسئلے کو بہت اہمیت دیتا ہے،حضرت ابراہیمؑ اپنی دعاؤں میں سب کی بخشش کے لیے پروردگار کے حضور یوں عرض کرتے ہیں:

"وَاجْعَلْ لِّيْ لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْاٰخِرِيْنَ"

"پروردگارا! آئندہ آنے والی امتوں میں میرے نام کو ذکر خیر قرار فرما۔"[1]

خداوندِ عالم انبیاءؑ کے کسی دوسرے گروہ کی طرف اشارہ کرنے کے بعد فرماتا ہے:

"وَجَعَلْنَا لَهُمْ لِسَانَ صِدْقٍ عَلِيًّا"

"ہم نے ان کے لیے آنے والی اُمتوں کے درمیان نیک نامی اور بلند مقام عطا کیا ہے۔"[2]

لسان

[1] سورۂ شعراء، آیت ۸۴

[2] سورۂ مریم، آیت ۵۰

www.shiabookspdf.com

ان موارد میں انسان کو یاد کرنے کے معنی میں ہے اور جب اس پر صدق اضافہ ہوجاتا ہے تو خوبی کی وجہ سے لوگوں کے درمیان ان کی نیک نامی اور ذکر خیر کے معنی ہوتے ہیں۔ یقیناً یہ مسئلہ کسی رسم ورواج کا مسئلہ اور آسان نہیں ہے، اس میں معاشرے کے لوگوں کے لیے زیادہ فوائد موجود ہیں، جو درج ذیل ہیں:

ا۔ پہلا یہ کہ ہمیشہ رہنے والا باعثِ فخرِ عمل ہے، جب کہ مادی مال ودولت مرنے والے کے بعد اس کی پہلی نسل میں تقسیم ہوکر ختم ہوجاتا ہے۔

۲۔ دوسرا یہ کہ ذکرِ خیر اور اچھائی سے یاد کرنا، انبیاءؑ واولیاء اللہ کی نسبت دورود وسلام بھیجنے کا سبب بنتا ہے اور عام آدمی کی نسبت بندگانِ خدا کی طرف سے طلبِ مغفرت کا موجب بنتا ہے۔ بے شک یہ سب معنوی اعتبار سے گہرا اثر رکھتے ہیں۔

۳۔ یہ ممکن ہے کہ ان اچھے کاموں کی وجہ سے لوگوں میں بھی اچھائی کی عادت پیدا ہوجائے اور اس کی پیروی کرنے لگیں، اور معاشرے میں اس کی قدر و قیمت کی پہچان اور اہمیت بڑھ جائے اور اچھائی کے خلاف چیزیں معاشرے سے نابود ہوجائیں اور مشہور روایت کی بنا پر مَنْ سَنَّ سُنَّةً حَسَنَةً كَانَ لَهُ مِثْلُ أَجْرِ مَنْ عَمِلَ بِهَا۔[1] جوکوئی اپنے پیچھے اچھی رسم ورواج، سنّت چھوڑ جائے تو اُس کا شمار اجر وثواب پانے والے ان افراد میں ہوتا ہے جو اچھے اعمال بجالاتے ہیں۔

۴۔ نسل در نسل ہمیشہ باقی رہنے والی عزت وآبرو، حیثیت اور شخصیت کا سرمایہ ہے۔ معاشرے میں ایسے بہت سے عام آدمی دیکھنے میں آتے ہیں کہ جن کا کسی ایسی ہستی کے ساتھ رابطہ ہو، جن کا ذکر خیر لوگوں کی زبان پر رہتا ہو ان کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کی وجہ سے وہ عام آدمی بھی عزت واحترام اور مقام پالیتے ہیں۔

یہ لسانِ صدق یعنی ذکرِ خیر کے اجتماعی اور انفرادی اثراتِ معنوی میں سے کچھ حصے ہیں اور یقیناً انسان معنوی آثار کے حصول کے لیے قصدِ قربت کے ساتھ ایسے کام انجام دے سکتے ہیں جو اُن کے لیے ذکرِ خیر کا سبب بنیں۔

چوتھا حصّہ

و منها اَلَا لَا يَعْدِلَنَّ اَحَدُكُمْ عَنِ الْقَرَابَةِ يَرَى بِهَا الْخَصَاصَةَ اَنْ يَسُدَّهَا بِالَّذِي لَا يَزِيدُهُ اِنْ اَمْسَكَهُ وَلَا يَنْقُصُهُ اِنْ اَهْلَكَهُ وَمَنْ يَقْبِضْ يَدَهُ عَنْ عَشِيرَتِهِ فَاِنَّمَا تُقْبَضُ مِنْهُ عَنْهُمْ يَدٌ وَاحِدَةٌ وَ تُقْبَضُ مِنْهُمْ عَنْهُ اَيْدٍ كَثِيرَةٌ وَمَنْ تَلِنْ حَاشِيَتُهُ يَسْتَدِمْ مِنْ قَوْمِهِ الْمَوَدَّةَ.

یہ حصہ اسی خطبے کا ایک جزء ہے:

[1] وسائل الشیعہ، جلد ۱۱، باب ۱۶، امر بہ معروف ونہی از منکر، یہ مضمون ان روایات میں بہت زیادہ نقل ہوا ہے۔

www.shiabookspdf.com

”دیکھو! تم میں سے اگر کوئی شخص اپنے اقربا کو فقر و فاقہ میں پائے تو ان کی احتیاج کو اس امداد سے دور کرنے میں پہلو تہی نہ کرے، جس کے روکنے سے یہ کچھ بڑھ نہ جائے گا اور صرف کرنے سے اس میں کچھ کمی نہ ہوگی، جو شخص اپنے قبیلے کی اعانت سے ہاتھ روک لیتا ہے۔ تو اس کا تو ایک ہاتھ رکتا ہے۔ لیکن وقت پڑنے پر بہت سے ہاتھ اس کی مدد سے رک جاتے ہیں۔ جو شخص نرم خو ہو وہ اپنی قوم کی محبت ہمیشہ باقی رکھ سکتا ہے۔“

شرح وتفسیر

خاندان کے تمام افراد ایک دوسرے کے محافظ ہیں

خطبے کے اس آخری حصے میں حضرت امام علی علیہ السلام نے ایک بار پھر لوگوں بالخصوص مومنین کو ایک دوسرے کے ساتھ اور اپنے رشتے داروں کی مدد کرنے کی طرف ترغیب اور شوق دلایا ہے اور تین طریقوں سے اس مسئلے کو تاکید کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔

بیانِ اوّل

”ومنھا: أَلَا لَا يَعْدِلَنَّ أَحَدُكُمْ عَنِ الْقَرَابَةِ يَرَى بِهَا الْخَصَاصَةَ أَنْ يَسُدَّهَا بِالَّذِي لَا يَزِيدُهُ إِنْ أَمْسَكَهُ وَلَا يَنْقُصُهُ إِنْ أَهْلَكَهُ“

آگاہ ہو جاؤ! تم میں سے کوئی بھی اپنے رشتے داروں اور ملنے والوں کا محتاج نہیں ہونا چاہیے، جس چیز کو تم دینے سے دریغ کرتے ہو اس کی حفاظت سے اس میں اضافہ نہیں ہوتا اور تمہاری کنجوسی اور بخل سے وہ نابود ہونے سے نہیں بچے گا۔ [1]

۱۔ ممکن ہے اس کا اشارہ ان دو معنوں میں سے کسی ایک کی طرف ہو یا تو اس کے جنبہ معنوی کی طرف اشارہ ہے کہ جو کوئی صاحبِ دولت ہو اور رشتہ داران سے محروم رہے تو اس کے مال میں اضافے کا سبب نہیں بنتا، بلکہ انسان کے مال واسباب اور زندگی سے برکت اٹھالی جاتی ہے۔ اس کے برعکس، نادار و مفلس لوگوں کی مدد کرنے اور ان کی محتاجی کو دور کرنے سے پروردگار ان کے مال واسباب میں برکت عطا کرتا ہے اور ان کے ظاہری نقصان کو بہت جلد اپنے لطف کرم سے پورا فرماتا ہے۔

[1] خصاصہ، مقاییس اللغۃ میں پھاڑنے اور شگاف کے معنی میں آیا ہے، اور اسی مناسبت سے فقر و فاقہ و ناداری اور محتاجی و مفلوک الحال کے معنی میں بھی آتا ہے، کیوں کہ یہ امور انسان کی زندگی میں شگاف پیدا کرتے ہیں۔

www.shiabookspdf.com

۲۔ یا اس کام کے ظاہری اور مادی معنی کی طرف اشارہ ہے، کیوں کہ عزیز و اقارب اور دوسرے غریب و مساکین کی مشکلات بہرحال کسی نہ کسی طرح انسان کی طرف منتقل ہوتی ہیں اور اس کی روح اور اس کی فکر کو اپنی گرفت میں لے کر اسے ذہنی طور پر اذیّت دیتی ہیں۔ ان کی حیثیت اور عزّت و آبرو کو خطرے میں ڈال دیتی ہیں اور ان کی بقایا زندگی کو مشکلات سے دوچار کر دیتی ہیں۔ پس ان کی مدد کے لیے انسان کو جلدی کرنا چاہیے، اس لیے کہ اس سے آخرت میں ثواب اور دنیاوی کاموں میں خیر و برکت اور عزت آبرو کے ساتھ زندگی جاری رکھ سکتے ہیں۔ حدیث مبارکہ میں آیا ہے کہ حضرت علیؑ فرماتے ہیں:

"اَلْبَرَکَةُ فِیْ مَالِ مَنْ آتَی الزَّکَاةَ وَوَاسَی الْمُؤْمِنِیْنَ وَوَصَلَ الْاَقْرَبِیْنَ"

"اُس کے مال میں برکت ہوتی ہے جو زکوٰۃ دے اور مومنین کی مدد کرے اور رشتے داروں سے صلہ رحمی برقرار رکھے۔"[1]

بیان دوّم

امامؑ فرماتے ہیں: انسان اپنے رشتے داروں اور خاندان والوں کی مدد کرنے سے کیوں آنکھ چراتا ہے، اگر یہ کام کرے تو کیا اُسے بہت بڑے خسارے اور نقصان کا سامنا کرنا پڑے گا!!!

"وَ مَنْ یَقْبِضْ یَدَهُ عَنْ عَشِیْرَتِهٖ، فَاِنَّمَا تُقْبَضُ مِنْهُ عَنْهُمْ یَدٌ وَاحِدَةٌ وَ تُقْبَضُ مِنْهُمْ عَنْهُ اَیْدٍ کَثِیْرَةٌ"

جو شخص اپنے عزیزوں کی مدد سے ہاتھ روکتا ہے، وہ ان سے صرف ایک ہاتھ روکتا ہے، جب کہ اس کی وجہ سے بہت سے ہاتھ اس کی مدد سے رک جاتے ہیں۔ کوئی عاقل انسان ایسا کام نہیں کرتا اور اس بات کے لیے تیار نہیں ہوگا کہ ایک معمولی فائدے کی خاطر بہت بڑے فائدے کو ہاتھ سے جانے دے۔

بیانِ سوّم

امامؑ ایک اور نکتے کی طرف اشارہ فرماتے ہیں

"وَ مَنْ تَلِنْ حَاشِیَتُهٗ یَسْتَدِمْ مِنْ قَوْمِهِ الْمَوَدَّةَ"

جس نے اپنے رشتے داروں کے ساتھ پُر محبت اور نرم رویہ اپنایا، اس نے ان کی دوستی اور محبت کو اپنے ہمیشہ کے لیے خرید لیا۔"

بہت سے افراد کو دیکھا گیا ہے کہ کوئی خاندان یا قبیلہ ان افراد کے درمیان موجود ہوتا ہے، مگر وہ اپنے تکبّر اور بخل کی وجہ سے ان تمام لوگوں سے دور رہتے ہیں۔ جس کی وجہ سے کل تک جو دوست تھے وہ آج دشمن بن گئے ہیں۔ اگر نعمت

[1] بحارالانوار، جلد ۷۴، ص ۴۱۳

www.shiabookspdf.com

خداوندی کی نسبت شکر ادا کرتے اور عجز وانکساری اور سخاوت کو اپنے لیے اپناتے تو ان کی مہر ومحبت سے دور ہونے کی بجائے ان میں اضافہ ہوتا۔

قابلِ توجّہ امر

یہ موضوع قابلِ توجہ ہے کہ مذکورہ بالا جملے میں کلمہ "حَاشِيَتُهُ" دو معنی لیے ہوئے ہے:

اوّل: جس طرح اوپر کی تفسیر میں آیا ہے اس کے مطابق شاید یہ انسان کی اپنی صفات اور روحی کیفیات کی طرف اشارہ ہو۔

دوّم: یا اس کے اطراف میں رہنے والوں اور کام کرنے والوں کی طرف اشارہ ہے۔ بنابرایں، جملے کا تفسیری مفہوم اس طرح ہوگا کہ انسان کے طرفدار اور خدمت گار لوگوں سے محبت، نرم مزاجی اور انکساری سے پیش آتے ہیں اور دور ونزدیک کے لوگوں کی مہر ومحبت حاصل کرنے کی راہ ہموار کرتے ہیں۔

بہت سے ایسے لوگوں کو دیکھنے کا موقع ملا ہے کہ خود تو بہت اچھے ہیں مگر ان کے طرفدار غم وغصے والے اور لوگوں کے ساتھ بدتمیزی سے پیش آتے ہیں جس کی وجہ سے لوگ اس نیک انسان کے نزدیک بھی نہیں آتے اور دور بھاگتے ہیں۔

نکتہ

رشتے داروں کے ساتھ مضبوط بندھن کی برکات

اگرچہ آیات وروایات میں صلۂ رحمی اور رشتے داروں کے ساتھ صحیح رابطہ برقرار رکھنے کو ایک وظیفۂ الٰہی اور انسانی ذمے داریوں میں سے ایک ذمے داری بتایا گیا ہے، اس کے بارے میں بتایا جا چکا ہے کہ خداوند متعال کے بتائے ہوئے طریقے سے اسے پورا کیا جانا واجب ہے، لیکن بے شک اس الٰہی اور انسانی وظیفے کی انجام دہی کے ظاہری طور پر بھی بہت عظیم برکات ہیں کہ جن کی طرف خطبے کے آخری حصے میں بہت خوبصورت تعبیرات کے ذریعے اشارہ ہوا ہے۔

اہم ترین کام یہ ہے کہ انسان کو چاہیے کہ وہ اس رشتے کو مضبوط کرے اور غلطیوں کے ذریعے اس سے تعلق نہ توڑے۔ نعمتوں کی فراوانی اور آرام وراحت کے وقت انسان کو چاہیے کہ رشتے داروں کے ساتھ نیکی کرے تاکہ جب وہ کسی مصیبت، بحران اور طوفان میں گرفتار ہو تو یہ لوگ اٹھ کر اس کی مدد کریں۔ حقیقت یہ ہے کہ زندگی کی تمام مشکلات سے لڑنا اور کامیاب ہونا ایک شخص کا کام نہیں ہے۔ جب کبھی ایسے حالات پیدا ہو جائیں تو گروہی شکل میں لوگوں کو مدد کے لیے بلایا

www.shiabookspdf.com

جاتا ہے۔ اب ایسے وقت میں تو اپنی قوم اور رشتے داروں سے بہتر کون ہوسکتا ہے؟ کہ جو ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے بھی ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ مضبوط خونی رشتے کے بندھن میں بندھے ہوئے ہیں۔

مگر افسوس! بہت سے افراد اور خاندانوں میں تیسری نسل تک پہنچتے پہنچتے رشتے داری کے سارے بندھن ٹوٹ کر بکھر جاتے ہیں اور خاندانی اہمیت وضرورت کو بھلا کر ایک دوسرے سے دوری اختیار کر لیتے ہیں اور بعد کے کڑے وقتوں میں آنے والے سخت حادثات اور بلاؤں کے مقابلے میں دفاعی ہمت وجرأت ختم ہو جاتی ہے۔ اس سلسلے میں جو مثالیں روایات میں آئی ہیں، وہ یقیناً ایسے ہی مواقع کے لیے بیان کی گئی ہیں۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے ایک حدیث نقل ہوئی ہے، فرماتے ہیں:

"صِلَةُ الرَّحِمِ وَحُسْنُ الْجِوَارِ يَعْمُرَانِ الدِّيَارَ وَيَزِيْدَانِ فِي الْاَعْمَارِ۔"[۱]

"صلۂ رحمی اور اپنے رشتے داروں کے ساتھ تعلق رکھنے اور پڑوسیوں کے ساتھ اچھائی اور حُسنِ سلوک سے پیش آنے سے گھروں اور شہروں کو نئی زندگی ملتی ہے اور لوگوں کی عمریں طویل ہو جاتی ہیں۔"

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے ایک روایت نقل ہوئی ہے، فرماتے ہیں:

"صِلَةُ الْاَرْحَامِ وَحُسْنُ الْجِوَارِ زِيَادَةٌ فِي الْاَمْوَالِ۔"

"صلۂ رحم اور اپنے ہمسایوں سے حسن سلوک کاروبار میں برکت اور رزق میں اضافے کا سبب بنتی ہے۔"[۲]

ایک اور حدیث میں امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا:

"صِلَةُ الْاَرْحَامِ تُزَكِّي الْاَعْمَالَ وَتُنْمِي الْاَمْوَالَ وَتَدْفَعُ الْبَلْوٰى وَتُيَسِّرُ الْحِسَابَ وَتُنْسِئُ فِي الْاَجَلِ۔"

"صلۂ رحم انسان کے اعمال کو ثمر آور کر دیتی ہے اور مال و دولت میں اضافہ، بلاؤں کو ان سے دور اور قیامت میں حساب وکتاب آسان اور موت کو ان سے ٹال دیتی ہے۔"

اس کے برعکس رشتے داروں سے قطع رحم اور رشتے ناتے توڑنے کی وجہ سے دنیا میں انسان کی زندگی ایک دردناک عذاب سے گزرتی ہے اور آخرت میں سخت عذاب کا مستحق قرار پاتا ہے۔ اس بحث کو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث مبارکہ کے ساتھ ختم کرتے ہیں، آپؐ نے فرمایا:

---

[۱] بحارالانوار، جلد ۷۱، ص ۹۷

[۲] بحارالانوار، جلد ۷۱، ص ۱۱۱

www.shiabookspdf.com

"أَخْبَرَنِي جِبْرَئِيلُ إِنَّ رِيحَ الْجَنَّةِ تُوجَدُ مِنْ مَسِيرَةِ أَلْفِ عَامٍ مَا يَجِدُهَا عَاقٌّ وَ لَا قَاطِعُ رَحِمٍ وَلَا شَيْخٌ زَانٍ"[1]

"جبرائیلؑ نے مجھے خبر دی ہے کہ بہشت کی خوشبو ایک ہزار سال کے فاصلے سے آتی ہے، لیکن تین گروہ ایسے ہیں جو اسے کبھی محسوس نہیں کر سکتے

۱۔وہ شخص جو ماں باپ کی طرف سے عاق ہو گیا ہو۔

۲۔وہ شخص جو اپنے رشتے داروں سے قطع تعلق کرے اور صلۂ رحم توڑے۔

۳۔وہ بوڑھا شخص جو زنا جیسی بدکاری میں مبتلا ہو۔"

مذکورہ بالا مثال بہت اہم معانی کی حامل ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ یہ تین گروہ نہ صرف بہشت میں داخل نہیں ہوں گے، بلکہ ہرگز اس کے نزدیک بھی نہیں ہو سکیں گے۔

ممکن ہے یہاں یہ پوچھا جائے کہ یہ صلۂ رحم کیا چیز ہے؟ اس سے مراد یہ ہے کہ آپس میں پیار و محبت برقرار رکھو اور مشکلات کے وقت ایک دوسرے کی مدد کرو۔ اور ایک دوسرے کے حالات سے باخبر رہو، انسان جس قسم کے حالات سے دوچار ہو، اسی کے مطابق اس کی مدد کرنے کی کوشش کرو۔ مثال کے طور پر بعض مرتبہ کوئی مسئلہ ایک سلام کرتے یا ٹیلیفون کرنے سے حل ہوتا ہے تو اس مسئلے کو اسی طرح سے حل کریں۔

امیر المومنینؑ سے ایک حدیث میں آیا ہے، آپؑ نے فرمایا:

"صِلُوا أَرْحَامَكُمْ وَلَوْ بِالتَّسْلِيمِ"[2]

"اپنے رشتے داروں سے صلۂ رحم برقرار رکھو، اگرچہ ایک سلام کے ذریعے سے ہی کیوں نہ ہو۔"

صلۂ رحم کی اہمیت اور مادّی اور معنوی لحاظ سے اثرات کے بارے میں خدا نے چاہا تو مناسب موقع پر کچھ اور مطالب بھی بیان کریں گے ان شاء اللہ۔

اس خطبے کے آخر میں علّامہ سیّد رضیؒ مزید توضیح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"الغفيرة هاهنا: الزيادة و الكثرة؛ من قولهم للجمع الكثير: الجم الغفير، و الجماء الغفير. و يروى عفوة من أهل أو مال و العفوة: الخيار من الشيء. يقال: أكلت عفوة الطعام. أي: خياره.

---

[1] معانی الاخبار، نقل از بحار الانوار، جلد ۷۱، ص ۹۵، حدیث ۲۶

[2] اصول کافی، نقل از بحار الانوار، جلد ۷۱، ص ۱۳۶

www.shiabookspdf.com

و ما أحسن المعنى الّذى أراده(عليه السلام) بقوله: و من يقبض يده عن عشيرته.... الى تمام الكلام: فان الممسك خيره عن عشيرته انما يمسك نفع يد واحدة، فاذا احتاج الى نصرتهم، و اضطر الى مرافدتهم، قعدوا عن نصره، و تثاقلوا عن صوته، فمنع ترافد الايدى الكثيرة، و تناهض الاقدام الجمة۔

سیّد رضیؒ فرماتے ہیں:

یہاں پر "الغفيرة" اہل اور مال کے معنی میں ہے۔ اور عفوہ کسی شے کے عمدہ اور منتخب حصے کو کہتے ہیں۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے "أَكَلْتُ عَفْوَةَ الطَّعَامِ" یعنی میں نے عمدہ اور لذیذ کھانا کھایا۔ امامؑ اس جملے میں "وَمَنْ يَقْبِضْ يَدَهُ عَنْ عَشِيرَتِهِ" سے لے کر آخری جملے تک بہترین مطالب کی طرف اشارہ فرماتے ہیں، کہ جو شخص اپنے قبیلے سے حُسنِ سلوک نہیں کرتا تو اس نے ایک ہی ہاتھ کی منفعت کو روکا۔ لیکن جب ان کی امداد کی ضرورت پڑے گی اور ان کی ہمدردی و اعانت کے لیے لاچار و مضطر ہوگا تو وہ ان کے بہت سے بڑھنے والے ہاتھوں اور اٹھنے والے قدموں کی ہمدردیوں اور چارہ سازیوں سے محروم ہو جائے گا۔

www.shiabookspdf.com

www.shiabookspdf.com

چوبیسواں خطبہ

"وَهِيَ كَلِمَةٌ جَامِعَةٌ لَهُ. فِيهَا تَسْوِيغُ قِتَالِ الْمُخَالِفِ، وَ الدَّعْوَةُ إِلَى طَاعَةِ اللهِ، وَ التَّرَقِّي فِيهَا لِضَمَانِ الْفَوْزِ"

یہ ایک ایسی جامع گفتگو ہے کہ جسے امامؑ نے لوگوں کو اللہ کی اطاعت اور اس کی راہ پر چلنے والوں کی نجات و کامیابی کے سلسلے میں ارشاد فرمایا ہے۔

وَ لَعَمْرِيْ مَا عَلَيَّ مِنْ قِتَالِ مَنْ خَالَفَ الْحَقَّ وَ خَابَطَ الْغَيَّ مِنْ إِدْهَانٍ وَ لَا إِيهَانٍ فَاتَّقُوا اللهَ عِبَادَ اللهِ وَ فِرُّوْا إِلَى اللهِ مِنَ اللهِ وَ امْضُوْا فِي الَّذِيْ نَهَجَهُ لَكُمْ وَ قُوْمُوْا بِمَا عَصَبَهُ بِكُمْ فَعَلِيٌّ ضَامِنٌ لِفَلْجِكُمْ آجِلًا إِنْ لَمْ تُمْنَحُوْهُ عَاجِلًا.

"مجھے اپنی جان کی قسم! میں حق کے خلاف چلنے والوں اور گمراہی میں بھٹکنے والوں سے جنگ میں کسی قسم کی رعایت اور سستی نہیں برتوں گا۔ پس اے اللہ کے بندو! اللہ سے ڈرو اور تقویٰ اختیار کرو! اور اُس کے غضب سے بھاگ کر اس کے دامن رحمت میں پناہ لو! اللہ کی دکھائی ہوئی راہ پر چلو اور اُس کے عائد کردہ احکام کو بجالاؤ۔ اگر ایسا کرو گے تو علی تمہاری نجات اور کامیابی کا ضامن ہے۔ اگرچہ آج تم اس تک نہیں پہنچے ہو تو وہ وقت جلد آنے والا ہے۔"

خطبے پر ایک نظر

امامؑ اس خطبے میں حق کے مخالفین پر شدید غم و غصے کا اظہار فرماتے ہوئے اپنے مضبوط ارادے کے سبب ان کے ظلم و ستم اور جنگ میں منافقوں کے مکر و فریب کا پردہ چاک کرتے ہیں اور سیاسی اور حق و عدالت کے خلاف ان کی سازشوں پر سخت سرزنش

www.shiabookspdf.com

کرتے ہیں۔اس کے بعد آپؑ نے اپنے پیروکاروں کو سمجھا کر اپنے ساتھ چلنے پر آمادہ کیا۔ بعض اس چیز کے معتقد ہیں کہ یہ ان لوگوں کی باتیں ہیں جنہیں حضرتؑ سے یہ گلہ تھا کہ آپؑ اپنے مخالفین کے خلاف کوئی اقدام کیوں نہیں کرتے اور کچھ لوا اور کچھ دو کی بنیاد پر ان کو کیوں نہیں منواتے؟ امامؑ یہاں پر واضح فرماتے ہیں کہ میں اس قسم کے معاملات نمٹانے والوں میں سے نہیں ہوں۔[1]

شرح وتفسیر

سازش کرنے والوں میں سے نہیں، بلکہ میں زمانہ شناس ہوں

امامؑ اس خطبے کے پہلے جملوں میں حق وصداقت کی مخالفت کرنے والوں کے ساتھ جنگ کا عزم، پختہ ارادے کو واضح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

وَلَعَمْرِی![2] مَا عَلَیَّ مِنْ قِتَالِ مَنْ خَالَفَ الْحَقَّ وَخَابَطَ الْغَیَّ، مِنْ إِدْهَانٍ[3] وَلَا إِیهَانٍ[4]۔

مجھے اپنی جان کی قسم! میں حق کے خلاف چلنے والوں اور گمراہی میں بھٹکنے والوں سے جنگ میں کسی قسم کی رعایت اور سستی نہیں برتوں گا۔ان دونوں مثالوں میں فرق جو ظاہر ہے، جیسے فرماتے ہیں "خالف الحق" و "خابط الغی"

پہلا جملہ: خصوصی طور پر جان بوجھ کر حق کے خلاف چلنے والوں کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

دوسرا جملہ: نادانی وجہالت اور غلطی وگمراہی کی بنا پر حق کی مخالفت کرتا ہے۔

"ادھان" کی مثال چمچہ گیری وغلط بیانی اور "ایھان" سست کرنا، یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ جنگ نہ کرنے کے اسباب میں ہیں۔ یا دشمن کے ساتھ سازش کرنا یا اپنی بزدلی اور کمزوری کا اظہار کرنا اور کیوں کہ ان دونوں عوامل کا ذاتِ امامؑ سے کوئی واسطہ نہیں، لہٰذا حق کی مخالفت کرنے والوں سے ان کی جنگ قطعی اور دشمنانِ اسلام کے ساتھ دوستی ممکن نہیں ہے۔

---

[1] ماخوذ از مفتاح السعادۃ فی شرح نہج البلاغہ

[2] لعمری، عمرو، زندگی کی مدت، کے معنی میں آتا ہے۔جب عمر عین کو فتح کے ساتھ کہے گا یہاں پر العمری کا مبتداء وخبر دونوں محذوف ہوگا۔اصل میں لعمری، عین ضمہ کہے تو اس کا معنی ہوگا مجھے اپنی جان کی قسم، مجمع البحرین میں اس کے بارے میں سوال اٹھا ہے کہ کس طرح قرآن مجید میں غیر خدا کی قسم کھائی گئی ہے؟ جب کہ قسم صرف اور صرف خدائے واحد ویکتا کی کھائی جاتی ہے۔اس کا جواب یہ ہے: کہ یہ قسم حقیقی نہیں ہے، بلکہ قسم کی شکل ہے یا اس کے اندر یہ پوشیدہ ہے (بواھب عمری وعمرک) اُس ذات کی قسم جس نے مجھے اور تمہیں زندگی عطا فرمائی ہے۔

[3] ادھان کا مادّہ دھن ہے، جو کسی بات میں روغن لگانے یعنی چاپلوسی کرنے کے معنی میں آتا ہے۔

[4] ایھان کا مادّہ وھن ہے، یہ ضعف وسستی کے معنی میں آتا ہے۔

www.shiabookspdf.com

یہی معنی امامؑ کی کسی دوسری گفتگو میں بھی آئے ہیں، ایک جگہ مسلمان رہنماؤں کی کلّی روش سے متعلق فرماتے ہیں:

"لَا يُقِيمُ أَمْرَ اللّٰهِ سُبْحَانَهُ إِلَّا مَنْ لَا يُصَانِعُ وَلَا يُضَارِعُ وَلَا يَتَّبِعُ الْمَطَامِعَ"

"خداوندمتعال کے حکم کو صرف وہ لوگ جاری کر سکتے ہیں جو سازش کار نہ ہوں اور اہلِ باطل کے پیروکار نہ ہوں اور لالچ وطمع کے غلام نہ ہوں۔"[1]

ایک اور جگہ اپنی ذات کے بارے میں فرماتے ہیں:

وَ أَيْمُ اللّٰهِ! لَقَدْ كُنْتُ مِنْ سَاقَتِهَا حَتّٰى تَوَلَّتْ بِحَذَافِيرِهَا وَ اسْتَوْسَقَتْ فِي قِيَادِهَا. مَا ضَعُفْتُ وَلَا جَبُنْتُ وَلَا خُنْتُ وَلَا وَهَنْتُ۔[2]

"خدا کی قسم! میں لشکر پیغمبر اکرمؐ کے ساتھ تھا اور ان کو آگے بڑھنے کی طرف شوق دلا رہا تھا یہاں تک کہ دشمن کو مکمل طور پر پیچھے کی طرف دھکیل دیا اور تمام لوگ اسلام کے زیر سایہ جمع ہو گئے اور اس راہ میں کبھی کسی قسم کی کمزوری اور ڈر میں نے محسوس نہیں کیا، میں نے کبھی خیانت نہیں کی اور سستی کو اس راہ میں کبھی آنے نہیں دیا۔"

حضرت امام علی علیہ السلام اس گفتگو کے بعد لوگوں سے چند اہم باتوں کی سفارش کرتے ہیں:

پہلی نصیحت: تقویٰ و پرہیزگاری کے بارے میں فرماتے ہیں:

"فَاتَّقُوا اللّٰهَ عِبَادَ اللّٰهِ!"

"اے اللہ کے بندو! اللہ سے ڈرنے کو اپنا پیشہ بناؤ۔"

تقویٰ: انسان کی باطنی اور معنوی کیفیت کا نام ہے جو خوف الٰہی سے پیدا ہوتا ہے اور انسان کے باطنی گناہوں کی مخالفت اور خدا کی اطاعت کی طرف توجہ کا نام ہے۔ تمام نیکیوں کا اصلی سرچشمہ اچھائیاں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر جگہ تمام اخلاقی واجتماعی اور دینی ہدایت اور اطلاعات کے موضوعات کے مقدمات کی تاکید کرتا ہے۔

دوسری نصیحت: امامؑ اپنی دوسری سفارش میں فرماتے ہیں:

"وَفِرُّوْا إِلَى اللّٰهِ مِنَ اللّٰهِ"

"اللہ سے اللہ کی طرف فرار کرو۔" (اللہ کے غیظ وغضب سے اُس کی بے پایاں رحمت کی طرف، اللہ کے غم وغصے سے اس کی اطاعت وپیروی کی طرف، اللہ کے عذاب وسزا سے اس کے ثواب وعطا کی طرف اور اللہ کے عتاب وانتقام سے

---

[1] کلمات قصار، ۱۱۰

[2] خطبہ ۱۰۴، پیام امامؑ

www.shiabookspdf.com

اس کی نعمت کی طرف چلے آؤ۔

یہ مثال توحیدِ افعالی کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے، کیونکہ انسان اس دنیا میں جن مشکلات کا سامنا کرتا ہے، وہ اس کے اپنے اعمال و آثار کا نتیجہ ہوتی ہیں جو خداوند متعال نے اُس کے لیے قرار دی ہیں۔ پس گھبرانے کی ضرورت نہیں، کیوں کہ مشکلات بھی اسی کی طرف سے ہیں تو دوسری طرف سے مجازات بھی اسی کی طرف سے ہیں۔ لہٰذا ان مشکلات کے حل کے لیے انسان کے پاس سوائے اُسی ذات کی طرف بھاگنے کے کوئی اور راہ نہیں ہے، کیوں کہ "لَا مُؤَثِّرَ فِی الْوُجُوْدِ اِلَّا اللّٰهُ" ہر خیر و برکت اور نجات اُسی کی طرف سے ہے۔ قرآن مجید بھی گنہگاروں کے ان گروہوں جو اللہ کے غیظ و غضب کے شکار ہوئے ہیں، کے بارے میں فرماتا ہے: "وَظَنُّوْٓا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّآ اِلَيْهِ" [۱] جاننا چاہیے کہ کوئی پناہ گاہ خدا کی بارگاہ کے علاوہ نہیں۔

ایک عمدہ نکتہ

انسان کی مختصر زندگی میں یہ عمدہ بات ہے کہ جب وہ کسی شخص یا چیز سے خوف وحشت کرتا ہے تو وہ کسی دوسرے شخص یا چیز کی پناہ ڈھونڈتا ہے، لیکن خداوند متعال کے بارے میں ایسا نہیں کہ اس کے عذاب سے بچنے کے لیے کسی دوسرے کے پاس پناہ ڈھونڈے اور وہ اسے پناہ دے، بلکہ حکمِ پروردگار یہ ہے کہ جب کوئی اپنے گناہوں کی وجہ سے عذاب سے ڈرے تو اسی ذات کی پناہ میں آئے۔ کیا خدائے رحیم و مہربان کی طرح کوئی ایسا ہے جو مجرم کو پناہ دے؟ یہ ایک ایسا درس ہے جسے توحیدِ افعالی نے ہمیں دیا ہے اور خداوند متعال کی جانب سے برکت و حرکت کی اہمیت سے روشناس کرایا۔

اللہ تعالیٰ ہر طریقے سے ناموں اور صفات کے ذریعے ہمیں دعوت دیتا ہے کہ اس کی پناہ میں آئیں۔ اگر کوئی اللہ کے غیظ و غضب سے ڈرتا ہے تو اُس کی رحمت و عفو میں پناہ لے، اگر عدلِ الٰہی سے خوف زدہ ہے تو اُس کے فضل و کرم میں پناہ لے۔ بہر حال! معلوم ہوتا ہے کہ یہ جملہ سورۂ ذاریات سے لیا گیا ہے اور پیغمبر اکرمؐ کی زبان مبارک سے کلام فرمایا ہے:

"فَفِرُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۭ اِنِّىْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ" [۲]

"تو خدا ہی کی طرف بھاگو میں تم کو یقیناً اس کی طرف سے کھلم کھلا ڈرانے والا ہوں۔"

تیسری نصیحت: تیسری ہدایت میں آپؑ نے فرمایا:

---

[۱] سورۂ توبہ، آیت ۱۱۸

[۲] سورۂ ذاریات، آیت ۱۵۱

www.shiabookspdf.com

"وَ امْضُوْا فِی الَّذِیْ نَهَجَهُ لَكُمْ "

"جس راستے کو خداوند متعال نے تمہارے لیے معین کیا ہے، اسی پر چلو۔"

چوتھی نصیحت: چوتھی اور آخری نصیحت میں فرماتے ہیں:

"وَ قُوْمُوْا بِمَا عَصَبَهُ بِكُمْ "۔[1]

"اُس کے عائد کردہ احکام بجالاؤ۔"

حقیقت میں امامؑ یہاں پر اپنے ماننے والوں کو سعادت و نجات پر مبنی چار نکاتی پروگرام دیتے ہیں:

مرحلۂ اوّل: سب سے پہلے مرحلے میں خدا کا خوف اور روحِ تقویٰ کو ان دلوں میں پیدا کرنا ہے۔

مرحلۂ دوّم: یہ کام خدا کی طرف قدم بڑھانے کے اسباب میں سے شمار ہوتا ہے اس سے خدا سے بھاگ کر خدا کی پناہ میں آنے والا مسئلہ بھی واضح ہو جاتا ہے۔

مرحلۂ سوّم: جب بھی حرکت شروع کرے تو اس راہ میں ایمان اور پختہ عقیدے کے ساتھ قدم بڑھائے کہ جسے خدا نے اس کے لیے معین کیا ہے۔

مرحلۂ چہارم: اس عملی مرحلے میں تکلیفوں اور وضائف کے ساتھ جو اس کے لیے مقرر کیے گئے ہیں، قیام کرنا چاہیے۔

سوال: ممکن ہے یہاں یہ پوچھا جائے کہ یہ چاروں نصیحتیں جو "فاءِ تفریع" سے شروع ہوتی ہیں، خطبے کے اصل متن سے ان کا کیا تعلق ہے کہ جس کی وجہ سے حق کی مخالفت کرنے والوں کے ساتھ محکم ارادے کے ساتھ جنگ کرنے کی بات کی گئی ہے؟

جواب: اس کا جواب واضح ہے، کیوں کہ اس منحرف اور ستمگر گروہ کے ساتھ لڑائی میں شجاع اور باایمان ساتھیوں کے لیے محکم ارادہ لازم ہے۔ گویا امامؑ چاہتے ہیں کہ اس گفتگو کے ذریعے اپنے باوفا ساتھیوں کو ذہنی اور عملی طور پر تیار کریں۔

ایک عمدہ مطلب:

امامؑ نے اوپر کے مذکورہ جملے کو "ما عصبه بکم" (اللہ کے عائد کردہ احکام کو بجالاؤ) سے تعبیر فرمایا ہے، اس گفتگو کا مطلب یہ ہے کہ خدا کی طرف سے وظائف واجب ہونا ایسا نہیں کہ انسان اس کی طرف سے بے اعتنا ہو جائے، بلکہ انسان کے دوش پر ایک ایسی ذمے داری اور گردن میں ایسا طوق ہے جو دینِ اسلام نے اس کے ذمے لگایا ہے۔

قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ مختلف آیات و روایات میں یہ مثالیں آچکی ہیں اور سب ہی میں یہ چیز بیان ہوئی ہے کہ

[1] عصب کا مادّہ عصب ہے، یہ وہی چیز ہے جو جسم کی تمام ہڈیوں اور حصوں کو آپس میں جوڑے رکھتی ہے۔

www.shiabookspdf.com

جب انسان آزاد ہو تو ان وظائف پر عمل کرے۔

حضرت امام علی علیہ السلام خطبے کے آخر میں اپنے اصحاب اور باوفا ساتھیوں کی ہمت بڑھاتے ہوئے جنگ میں حتمی فتح کی خوش خبری سناتے ہیں۔ وہ ناقابل شکست اور قطعی فتح ہے کہ جسے اگر اس دنیا میں تم نہ پاسکو تو دوسری دنیا میں اسے اپنی آغوش میں لے لو گے۔ فرماتے ہیں:

"فَعَلِيٌّ ضَامِنٌ لِفَلْجِكُمْ [1] آجِلًا، إِنْ لَمْ تُمْنَحُوهُ عَاجِلًا"

"علی تمہاری کامیابی کا ذمہ لیتا ہے، اگر آج تم اس سعادت کو نہ پاسکے تو آئندہ اسے ضرور حاصل کرو گے۔"

یہ قرآن مجید کی طاقتور منطق ہے جو اپنے ماننے والوں کو اس حقیقت سے آگاہ کرتی ہے کہ دشمنان اسلام کے خلاف جہاد میں ہمیشہ تم کامیاب رہو گے۔ اگر دشمنوں کو زیر وزبر کر دو تو فاتح ہو اور اگر خدا کی راہ میں شہادت کے درجے پر فائز ہو جاؤ تب بھی تم کامیاب ہو۔

"قُلْ هَلْ تَرَبَّصُونَ بِنَا إِلَّا إِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ وَنَحْنُ نَتَرَبَّصُ بِكُمْ أَنْ يُصِيبَكُمُ اللهُ بِعَذَابٍ مِنْ عِنْدِهِ أَوْ بِأَيْدِينَا فَتَرَبَّصُوا إِنَّا مَعَكُمْ مُتَرَبِّصُونَ" [2]

"کہو! کیا ہم سے دو نیکیوں میں سے ایک (جنگ میں کامیابی یا شہادت) کے سوا کسی اور چیز کی امید رکھتے ہو؟ لیکن ہم تمہارے لیے دو میں سے ایک شکست کی امید رکھتے ہیں:

۱۔ خداوند متعال کی جانب سے دوسرے جہاں میں تم پر عذاب ہو جائے۔

۲۔ یا اس دنیا میں تم ہمارے ہاتھوں ذلت و رسوائی کے ساتھ اسیر ہو جاؤ۔"

اب جب کہ یہ حال ہے تو تم بھی اس وقت کا انتظار کرو! ہم بھی انتظار کرتے ہیں۔ واضح رہے کہ جو سرفروش کسی بھی حالت میں اپنی کامیابی اور دشمن کو شکست سے دوچار دیکھنا چاہتے ہیں، اس قدر بلند ہمت ہوتے ہیں کہ کسی قسم کے خطرے اور خوف کو دل میں جگہ نہیں دیتے اور مشکلات کے آگے گھٹنے ٹیک کر عاجزی کا اظہار نہیں کرتے۔

بعض دوسرے دانشوروں نے کہا ہے کہ جنگ کے میدان میں مسلمانوں کی اصل کامیابی کا راز، اگرچہ وہ دشمن کے جاہ و حشم اور جنگی قوت طاقت کی برابری نہیں کر سکتے تھے، مگر وہ لوگ ایمان کی قوت و طاقت سے مالا مال تھے، یہی ان کی کامیابی کا اصل راز ہے۔ آج کی دنیا میں بھی اسلامی اصل و اصول روایات زندہ ہونی چاہئیں، تاکہ مسلمانانِ عالم دشمنوں کی

---

[1] تفسیر فلج، خطبہ ۳۳ کے ذیل میں۔

[2] سورۂ توبہ، آیت ۵۲

www.shiabookspdf.com

کثیر فوج کے مقابلے میں گھٹنے نہ ٹیک سکیں اور ہر میدان میں بلند ہمتی کے ساتھ کامیابی ان کا مقدر ہو جائے۔ یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ یہ جوش و جذبہ ایمان کی مضبوطی، تقویٰ کی قوت اور خوفِ خدا کے بغیر یہ مقام و منزلت حاصل نہیں ہو سکتی۔

نکتہ

نہ سازش کرو اور نہ سستی کرو

سیاستِ الٰہی اور دنیا پرستوں کی سیاست کے درمیان جو عمدہ فرق ہے، وہ یہی ہے کہ دنیا پرست سیاستدان اپنے شخصی مقاصد کی تکمیل کے لیے کسی قسم کی بے ایمانی سے گریز نہیں کرتا اور بہت دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسانی اصولوں اور معاشرے کے فوائد کو بھی شخصی مفاد پر قربان کر دیتا ہے اور عدل و انصاف کی دھجیاں اُڑاتے ہوئے سیاسی اور اجتماعی لحاظ سے اپنے مفادات کی حفاظت کرتا ہے۔

اور خدا کی طرف سے بھیجے گئے انبیاء و اوصیاء علیہم السلام اس قسم کے معاملات ہرگز انجام نہیں دیتے تھے۔ جب کبھی وہ خود کو خطرے میں محسوس کرتے تو ان کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ دین اسلام کے اصول محفوظ رہیں اور عدل و انصاف ضائع نہ ہو۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور امیر المومنین علیہ السلام کی مبارک زندگی میں عدل و انصاف اور دین پیغمبرؐ کے اصول کے تحفظ کا مسئلہ بھرپور طریقے سے آشکار اور واضح ہوا ہے۔

تاریخ کے حوالے سے بہت سے ایسے افراد ہیں جنہیں امیر المومنین علیہ السلام کی سیاست کا انداز کبھی پسند نہیں آیا اور ان حاسدوں کے حسد کی آگ بھی بجھی نہ رہی۔ ان کا کہنا تھا کہ امیر المومنین علیہ السلام بیت المال کو اپنے مخالفین کو اپنی طرف مائل کرنے کے لیے غیر منصفانہ طریقے سے تقسیم کریں یا شام کی حکومت کو امیر شام کے حوالے کریں، لیکن امیر شام نے لوگوں کے ساتھ کیا کیا ہے اور ان کی حکومت میں کن اصولوں کو قربان کیا جاتا تھا ان لوگوں کو معلوم نہیں تھا۔ یا یہ کہ عبدالرحمٰن بن عوف کی بات کو چھے (۶) رکنی کمیٹی کے حوالے سے تسلیم کیا جائے یا اسلامی حکومت کے اہم عہدوں کو طلحہ و زبیر کو دیا جائے۔

ان مفسدوں نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ بھی یہی رویہ رکھا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی صورت غریبوں اور مساکین کے ساتھ نہ بیٹھیں اور انہیں اپنے آپ سے دور کر دیں۔ ان کا کہنا تھا کہ اگرچہ ان غریبوں کا دل خدا کے ایمان سے مالا مال ہے، لیکن مصلحت اس میں ہے کہ انہیں دور رکھ کر دولت مندوں کو قریب کیا جائے اور ان کی مدد سے دشمنوں پر فوج کشی کی جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کے دل میں ایمان و تقویٰ الٰہی کا نام و نشان تک نہ تھا۔

www.shiabookspdf.com

سیاست الٰہیہ اور ہوس پرستوں کی سیاست، واقعیت اور مصلحت کے درمیان اختلاف اور جھگڑا دنیا کے ہوس پرستوں اور خدا کے بھیجے ہوئے انبیاء اور اولیاء علیہم السلام کے درمیان ہمیشہ موجود رہا ہے۔

امیر المومنین علیہ السلام اس مختصر خطبے میں اپنی سیاست کی وضاحت کے ساتھ تشریح فرماتے ہیں اور علی الاعلان فرماتے ہیں:

"میں اس سازشی فریبی اور دوغلے گروہ سے نہیں ہوں کہ ان کے حق وصداقت کے مخالفوں کی حمایت سے حکومت حاصل کروں اور اقتدار کو طول دوں بلکہ میری سیاست کا معیار تقویٰ، خداوند متعال کی طرف رجوع کرنا اور اس راہ پر چلنا ہے جو اس نے ہمارے لیے متعین کی ہے اور جو ذمے داریاں اس نے ہم پر عائد کی ہیں، انہیں پورا کرنا ہے۔"

www.shiabookspdf.com

پچیسواں خطبہ

"وَ قَدْ تَوَاتَرَتْ عَلَيْهِ الْأَخْبَارُ بِاسْتِيلَاءِ أَصْحَابِ مُعَاوِيَةَ عَلَى الْبِلَادِ، وَ قَدِمَ عَلَيْهِ عَامِلَاهُ عَلَى الْيَمَنِ- وَ هُمَا عُبَيْدُ اللهِ بْنُ عَبَّاسٍ وَ سَعِيدُ بْنُ نِمْرَانَ- لَمَّا غَلَبَ عَلَيْهِمَا بُسْرُ بْنُ أَبِي أَرْطَاةَ فَقَامَ (عليه السلام) عَلَى الْمِنْبَرِ ضَجِراً بِتَثَاقُلِ أَصْحَابِهِ عَنِ الْجِهَادِ، وَ مُخَالَفَتِهِمْ لَهُ فِي الرَّأْيِ، فَقَالَ." [1]

"جب امیرالمومنین علیہ السلام کو پے در پے یہ اطلاعات ملیں کہ امیر شام کے اصحاب آپؑ کے مقبوضہ شہروں پر تسلط جمارہے ہیں اور یمن کے عامل عبیداللہ ابن عباس اور سپہ سالار لشکر سعید ابن نمران بسر ابن ابی ارطاۃ سے مغلوب ہو کر حضرتؑ کے پاس پلٹ آئے تو آپ اپنے اصحاب کی جہاد میں سستی اور رائے کی خلاف ورزی سے دلبرداشتہ ہو کر منبر کی طرف بڑھے اور خطبہ ارشاد فرمایا۔"

حصہ اوّل

مَا هِيَ إِلَّا الْكُوفَةُ أَقْبِضُهَا وَ أَبْسُطُهَا، إِنْ لَمْ تَكُونِي إِلَّا أَنْتِ تَهُبُّ أَعَاصِيرُكِ فَقَبَّحَكِ اللهُ وَ تَمَثَّلَ بِقَوْلِ الشَّاعِرِ:

لَعَمْرُ أَبِيكَ الْخَيْرِ يَا عَمْرُو إِنَّنِي   عَلَى وَضَرٍ- مِنْ ذَا الْإِنَاءِ- قَلِيلِ

"یہ عالم ہے اس کوفے کا، جس کا بندوبست میرے ہاتھ میں ہے۔ اے شہر کوفہ! اگر تیرا یہی عالم رہا کہ تجھ میں آندھیاں چلتی رہیں، تو خدا تجھے غارت کرے۔ پھر آپؑ نے شاعر کا یہ شعر تمثیل کے طور پر پڑھا:

---

[1] مصادر نہج البلاغہ میں آیا ہے کہ مرحوم سید رضی سے پہلے مسعودی نے تھوڑے سے فرق کے ساتھ مروج الذہب میں بیان فرمایا ہے۔ پھر کہتے ہیں کہ عقد الفرید اور ابن عساکر نے تاریخ دمشق میں بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔

www.shiabookspdf.com

"اے عمرو! تیرے اچھے باپ کی قسم، مجھے تو اس برتن سے تھوڑی سی چکناہٹ نہیں ملی جو برتن کے خالی ہونے کے بعد اس میں لگی رہ جاتی ہے۔ مجھے یہ خبر دی گئی ہے کہ بُسر یمن پر چھا گیا ہے۔"

مرحوم سیّد رضیؒ اس خطبے کے آغاز میں فرماتے ہیں، شہر کے گوشہ وکنار سے مسلسل خبریں آتی رہیں کہ امیر شام کے ساتھیوں نے شہر پر قبضہ جمایا ہے اور عبید اللہ ابن عباس، سعید ابن نمران جو یمن میں آپؑ کی طرف سے عامل تھے، بشر ابن ارطاۃ کے مظالم سے پریشان ہوکر آپؑ کے پاس آئے۔ امام عالی مقامؑ نے اپنے اصحاب کو جہاد میں سستی اور آپؑ کے فرمان کی خلاف ورزی پر سرزنش کی اور منبر پر کھڑے ہوکر یہ خطبہ ارشاد فرمایا:

"اپنی حکومت کے لیے جو جمع کرتا ہوں سوائے کوفہ کے کچھ نہ رہا۔ اے کوفہ! اگر صرف تُو ہی (دشمن کے مقابلے میں) میرا سرمایہ ہے اور وہ بھی بُرے چہرے کی آندھیوں کے ساتھ، اے کاش تُو بھی نہ ہوتا۔ اس کے بعد امام عالی مقامؑ نے ایک شعر سے مثال دی۔" اے عمرو تیرے اچھے باپ کی قسم، مجھے اس برتن کی تہہ سے تھوڑا سا حصّہ ملا ہے۔"

(یہ کلام اس طرف اشارہ ہے کہ کوفہ وعراق کے لوگوں کی نافرمانی کے اثر کی وجہ سے دشمن سے مبارزہ ومقابلے میں میری حکومت کو نقصان اُٹھانا پڑا)

خطبہ ایک نظر میں

نہج البلاغہ کے ابن ابی الحدید جیسے بعض شارحین یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ امام عالی مقامؑ نے صفین، حکمین کا مسئلہ اور خوارج کے کاموں کو اختتام تک پہنچانے کے بعد اس خطبے کو ارشاد فرمایا اور یہ خطبہ آپؑ کی عمر مبارک کے آخری خطبوں میں سے ہے۔[1]

جو کچھ سیّد رضیؒ نے اس خطبے کے آغاز میں لکھا، اس سے بخوبی استفادہ کیا جاسکتا ہے کہ امامؑ نے یہ خطبہ اُس وقت ارشاد فرمایا کہ امیر شام کے ساتھیوں کے غلبے کی مسلسل خبریں آتی رہیں کہ انہوں نے اسلامی شہروں پر قبضہ جمایا ہے۔ اس دوران یمن میں جو آپؑ کے نمائندے تھے، آپؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بسر ابن ارطاۃ (لشکر امیر شام کا سردار) کے اس حساس مقام پر قبضے کے متعلق گفتگو فرمائی۔

مرحوم ابن میثم اس خطبے کے ارشاد فرمانے سے متعلق فرماتے ہیں:

"کچھ گروہ صنعاء شہر میں خلیفۂ ثالث کے پیروکاروں میں سے تھے، جو ان کے قتل کے مسئلے کو زیادہ نمایاں کرتے تھے۔ ان کی حضرت علی علیہ السلام کی بیعت کرنا صرف مکر وحیلے پر مبنی تھا اور اس وقت شہر صنعاء کے حاکم مولا علی علیہ السلام کی طرف

[1] شرح نہج البلاغہ، ابن ابی الحدید۔ خطبے کا آخری حصہ

www.shiabookspdf.com

سے عبیداللہ ابن عباس اور انتظامی سربراہ سعید ابن نمران تھے۔

جب محمد بن ابی بکرؓ (مصر میں آپؑ کے نمائندے) شہید ہو گئے۔ آپؑ کے زیر اثر شہروں پر شامیوں کی طرف سے زیادہ حملے ہوئے۔ یمن میں خلیفۂ ثالث کے حامی کافی تعداد میں تھے اور سرکردہ شخصیتوں میں تھے، انہوں نے خلیفۂ ثالث کے خون کا بدلہ لینے کی طرف لوگوں کو بلانا شروع کر دیا۔ عبیداللہ بن عباس نے ان کی مخالفت پر انہیں زندان میں بھجوا دیا۔ ان لوگوں نے زندان کے اندر سے لشکر میں موجود اپنے ساتھیوں کو خط لکھا کہ سعید بن نمران (لشکر کے سردار) کو معزول کر دیا جائے اور کھلم کھلا اس کی مخالفت کی جائے۔ ان لوگوں نے ایسا ہی کیا۔ یمن کے بہت سارے لوگ ان کے ساتھ مل گئے اور زکوٰۃ دینے سے گریز کرنے لگے۔

عبیداللہ اور سعید نے امام علی علیہ السلام کو خط لکھا اور صورتحال کو بیان کیا۔ امام عالی مقامؑ نے اہل یمن اور وہاں کے لشکر کو ایک خط لکھا اور انہیں تنبیہ کی اور ان کو اپنے پروردگار کی طرف سے فرائض کی طرف متوجہ کیا۔ انہوں نے جواب میں یہ کہا کہ ہم آپؑ کے فرمانبردار ہیں مگر شرط یہ ہے کہ ان دو افراد کو معزول کریں۔ (عبیداللہ و سعید) پھر ان منافقوں نے امیر شام کو خط لکھا اور حالات کے بارے میں وضاحت کی یا تفصیل سے حالات کے بارے میں بتایا۔

امیر شام نے بسر ابن ارطاۃ جو سنگدل اور خونخوار آدمی تھا، کو ان لوگوں کی طرف بھیجا اس نے راستے میں مکہ جاتے وقت عبیداللہ بن عباس کے فرزندوں (داؤد و سلیمان) کو قتل کیا اور طائف میں اس کے داماد عبداللہ کو بھی قتل کیا پھر صنعاء پہنچا تو اُس وقت عبیداللہ اور سعید وہاں سے نکل چکے تھے اور عبیداللہ بن عمر و ثقفی کو اپنا جانشین مقرر کیا تھا۔ بُسر نے اپنے لشکریوں کے ساتھ صنعاء پر حملہ کر دیا اور یمن کے مرکز صنعاء پر گرفت مضبوط کر لی اور عبداللہ کو شہید کر دیا۔

جب عبیداللہ ابن عباس و سعید کوفے میں امامؑ کے پاس آئے تو آپؑ نے انہیں اپنی جگہ چھوڑنے پر ملامت کی اس کے بعد منبر پر جا کر اس خطبے کو ارشاد فرمایا۔" [1]

مجموعی اعتبار سے یہ خطبہ اُس وقت ارشاد فرمایا کہ جب شام کے لشکر نے اپنے حملوں کو دنیائے اسلام کے مختلف حصوں تک پھیلایا اور لشکر امامؑ نے ان کے مقابلے میں سستی دکھائی۔ امامؑ اس مسئلے پر سخت ناراض ہوئے اور اس خطبے کو ارشاد فرمایا۔ اس خطبے کی ابتدا میں امامؑ نے فرمانبردار افراد کی کمی کا شکوہ کیا۔ اور ایک دوسری جگہ بُسر ابن ارطاۃ کے یمن پر حملوں میں پیش رفت، ان کے عوامل اور ان کی کامیابیوں کے دردناک واقعات تفصیل سے بیان کیے اور آخری حصے میں اس شکوے کو بارگاہِ ایزدی میں پیش کیا اور اپنے لشکر میں موجود سست، منافق افراد اور خطا کاروں پر نفرین کی۔

---

[1] شرح نہج البلاغہ ابن میثم البحرانی، ج ۲، ص ۱۸

www.shiabookspdf.com

شرح وتفسیر

تم لوگوں کی منافقت نے مجھے بے بس کر دیا

اس خطبے کے دیے جانے کی وجہ اور جو حالات اس سلسلے میں بیان کیے گئے، ان پر توجّہ دینے سے امامؑ کے ان جملوں کی تفسیر اور روشن ہو جاتی ہے جو شروع میں بیان ہوئے ہیں۔ آپؑ فرماتے ہیں:

"مَا هِيَ[1] إِلَّا الْكُوفَةُ، أَقْبِضُهَا وَ أَبْسُطُهَا"

"تمہاری سرکشی، منافقت اور سستی کی وجہ سے جو کچھ حکومت میرے پاس تھی، اس میں سے سوائے کوفے کے کچھ باقی نہیں رہا۔"

کیوں اور کس دلیل کی بنیاد پر عراق اور دوسری جگہوں پر امامؑ کے لشکریوں نے یہ دردناک حالات پیدا کیے؟ یہ وہ اسباب ہیں کہ کئی نکات پر ان کی وضاحت ہو سکتی ہے۔

اہم مسئلہ یہ ہے کہ حضرت امام علی علیہ السلام جیسی بزرگ شخصیت کو پوری شجاعت اور تدبیر کے باوجود دشمنانِ اسلام کے مقابلے میں وفادار، مخلص لشکر نہ ہونے کی وجہ سے یہ دن دیکھنا پڑا کہ قرآن وعدالت اور اسلام سے وابستہ افراد شدید مشکلات کا شکار ہو گئے۔ جملے کے یہ الفاظ "أَقْبِضُهَا وَ أَبْسُطُهَا" جو قبض اور بسط سے لیے گئے ہیں، حاکمیت وفرماں روائی کی طرف اشارہ ہے۔ اس لیے امام عالی مقامؑ فرماتے ہیں کہ دوسری جگہیں آپؑ کے قابو میں نہیں تھیں۔ ظاہری طور پر آپؑ کی حکومت میں شمار ہوتی تھیں۔

پھر امام عالی مقامؑ اس گفتگو کو تسلسل دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

"إِنْ لَمْ تَكُونِي إِلَّا أَنْتِ، تَهُبُّ أَعَاصِيرُكِ فَقَبَّحَكِ اللهُ!"

اے کوفہ! تو ہی اگر میری حکومت کا سرمایہ (دشمن کے مقابلے میں) ہے اور وہ بھی ان طوفانوں کے ساتھ جو تجھ میں اٹھ رہے ہیں تو تیرا چہرہ تباہ وبرباد ہو جائے۔ تو (اے کاش تو نہ ہوتا) اشارہ ہے کہ کوفہ بھی جو امامؑ کی حکومت کے زیر اثر تھا، اختلافات ونفاق کے طوفانوں سے خالی نہیں تھا۔ حضرت امام علی علیہ السلام لوگوں کا محاسبہ نہیں کر سکتے تھے۔ اُس شخص پر کیا گزرتی ہوگی جو علم وحکمت، تدبیر وایمان کا کوہِ گراں ہو لیکن اس کے پاس وفاداروں کی کمی نظر آئے۔ اس طرح فریاد کرتے ہیں۔ امام

[1] "ھی" کی ضمیر مملکت یا حکومت کی طرف پلٹتی ہے، اس طرح جملے کا مفہوم یہ ہوگا کہ "ما الحکومة والمملکة التی تحت سیطرتی الا الکوفة"

www.shiabookspdf.com

عالی مقام نے ایک مشہور شاعر کے قول کو مثال کے طور پر پیش کیا:

لَعَمْرُ أَبِيكَ الْخَيْرِ يَا عَمْرُو إِنَّنِي　　عَلَى وَضَرٍ- مِنْ ذَا الْإِنَاءِ- قَلِيلِ

"اے عمرو: تیرے نیک باپ کی قسم، مجھے اس برتن کی تہہ سے تھوڑا سا حصہ ملا ہے۔"

"وضر" خواہ برتن میں یا ہاتھ میں موجود چکنائی ہو خواہ برتن کے اطراف میں موجود پانی کے قطرے (خالی کرنے کے بعد) ہوں، خواہ کھانے کے بعد اس کی بو کے معنی میں ہو۔ اشارہ ہے کہ کوفہ اور یہاں کے بسنے والے دنیائے اسلام کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ ان جیسوں کی مدد سے کوئی رہنما اسلام کی عالمگیریت کی حفاظت اور آدم نما خونخواروں کے شہر سے اکیلا دفاع نہیں کر سکتا۔

نکات

ا۔ شہر کوفہ کی دو رُخی

یہ شہر تاریخ اسلام کے مشہور شہروں میں شمار کیا جاتا ہے جہاں بہت سارے واقعات رونما ہوئے۔ تاریخ اسلام نے کئی جہتوں سے اس شہر کا نام لیا ہے۔

بات یہ ہے کہ اس شہر کو کیوں کوفہ کے نام سے پکارتے ہیں؟ بعض کہتے ہیں کہ اس کا نقشہ دائرے کی طرح ہے اور عرب گول چیز کو "کوفان" کہتے ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ یہاں پر لوگوں کا اجتماع ہوتا تھا، چونکہ اس لفظ کے ایک معنی اجتماع ہیں البتہ اس نام کی اور بھی وجہ تسمیہ ذکر کی گئی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ یہ شہر ۱۷ ہجری میں خلیفہ دوم کے دور میں وجود میں آیا۔ بعض لوگوں نے اس کے تھوڑے سے عرصے کے بعد لکھا ہے یہ شہر عراق کے سب سے بڑے شہر "قُبّةُ الاسلام" کے عنوان سے اور مسلمانوں کی ہجرت کی جگہ ہے اور سعد ابن ابی وقاص نے اس کی بنیاد رکھی۔

بعض کہتے ہیں کہ اس شہر کی بنیاد کی وجہ یہ ہے کہ عراق کی فتح اور ساسانی لشکر کے غلبے کے بعد سعد ابن ابی وقاص مدائن آئے۔ کچھ لوگوں کو خلیفہ دوم کے پاس بھیجا تاکہ انہیں ان فتوحات کی خوشخبری دیں۔ خلیفہ نے ان لوگوں کا رنگ اڑا ہوا اور بیماری کی حالت میں دیکھا۔ جب انہوں نے اس کی وجہ پوچھی، تو آنے والوں نے عراق کے علاقہ کے خراب پانی اور ناسازگار آب و ہوا کا تذکرہ کیا۔ خلیفہ نے حکم دیا کہ لشکر کے رہنے کے لیے ایسی جگہ کا انتخاب کیا جائے جو ان کے مزاج کے

www.shiabookspdf.com

موافق ہو۔ سعد نے اس جگہ کا انتخاب کیا۔ ابتدا میں بصرہ جیسے شہر میں گھر بنائے۔ چند دن نہ گزرے تھے کہ آگ لگ گئی اور یہ گھر جل گئے۔ پھر ان کو اینٹوں سے تعمیر کیا۔ سعد نے مسلمانوں کو اختیار دیا کہ وہ کوفے میں رہیں یا مدائن میں۔ کچھ لوگوں نے کوفے میں رہنے کو ترجیح دی۔ کچھ مدت کے بعد وہ سلامت واپس چلے گئے۔ [۱] کوفے کی تعریف ونفرین میں بہت سی روایات ہیں۔ یہ روایات ان لوگوں کے بارے میں ہیں جو مختلف ادوار میں اس سرزمین کوفہ میں زندگی بسر کرتے تھے۔ آیہ شریفہ "وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ" [۲] سے بعض روایات میں کوفہ مراد لی گئی ہے۔ ایک دوسری حدیث میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے نقل ہے:

"اَلْكُوْفَةُ رَوْضَةٌ مِنْ رِيَاضِ الْجَنَّةِ"

"کوفہ بہشت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے۔"

اسی روایت کے ذیل میں آیا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام، تین سوستر انبیاءؑ، چھے سو وصی اور سیّد الاوصیاء حضرت علی ابن ابی طالبؑ کی مبارک قبور کوفے میں ہیں۔ امام صادق علیہ السلام کی ایک دوسری حدیث بھی نقل ہے:

"اِنَّهُ لَيْسَ بَلَدٌ مِنَ الْبُلْدَانِ وَمِصْرٌ مِنَ الْاَمْصَارِ اَكْثَرُ مُحِبًّا لَنَا مِنْ اَهْلِ الْكُوْفَةِ" [۳]

"شہروں میں کوئی شہر ایسا نہیں ہے جہاں کوفے سے زیادہ ہمارے چاہنے والے رہتے ہوں۔" لیکن ہم جانتے ہیں کہ کوفے پر ایسی مصیبتیں پڑیں کہ دشمنانِ اسلام بالخصوص دشمنانِ اہل بیتؑ قابض ہو گئے کہ یہ شہر عملاً دشمنانِ اسلام، دشمنانِ اہل بیتؑ کے ٹھکانوں میں تبدیل ہو گیا۔

۲۔ حضرت امام علیؑ اور اہلِ کوفہ کے مزاج کا تجزیہ

ہم جانتے ہیں کہ امام عالی مقامؑ کی حکومت کے لیے اہل عراق و کوفہ ہی تھے۔ جو سرکش و نافرمان تھے۔ کئی بار نہج البلاغہ کے خطبوں میں اس بات پر امام عالی مقامؑ نے ناراضی کا اظہار فرمایا۔ حالانکہ امیر شام کی کامیابیوں کا راز شام کے لوگ اور ان کی فرمانبرداری کا جذبہ ہے۔

مختصر یہ کہ مورخین نے اس موضوع کو مثبت پہلو سے پیش کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ اہلِ عراق سمجھ دار تھے، اپنے حکمرانوں اور شہنشاہوں کے عیوب کو ڈھونڈتے تھے اور ان کے کاموں پر تنقید کرتے تھے۔ جب کہ اہلِ شام کا حل اور مسائل

[۱] معجم البلدان مادّہ کوفہ، تاریخ کامل ج ۲ ص ۵۲۷۔ لغت نامہ دہخدا مادّہ کوفہ۔
[۲] سورۂ والتین، آیہ ۲
[۳] سفینۃ البحار، مادّہ کوفہ

www.shiabookspdf.com

کو سمجھنے میں کند ذہن لوگ تھے۔ پس پردہ ہونے والی سازشوں کی تلاش نہیں کرتے تھے۔ [۱]

لیکن مرحوم مغنیہ کے قول کے مطابق یہ بے بنیاد تصور کے سوا کچھ نہیں۔ اہلِ عراق کو امام علی علیہ السلام کی عادلانہ حکومت پر کیا اعتراض ہے۔ اہلِ عراق ہمیشہ وعدہ خلافی اور نفاق میں زندگی گزارتے تھے؟ (یہ کون سی عقلمندی ہے کہ لوگوں کو نافرمانی اور اختلاف پر اکساتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دشمن اور اُس کے تسلط کے مقابلے میں ذلت و رسوائی کا سامنا کرنا پڑتا ہے)۔

صحیح بات یہ ہے کہ مورخین (قدیم و جدید) نے لکھا ہے جن میں سے ایک طٰہٰ حسین نے اپنی کتاب "علی و بنوہ" میں لکھا ہے کہ امیر شام نے مکر و حیلے سے اقتدار اور غلبہ حاصل کیا اور لوگوں کے دین اور ان کی فکر کو پیسوں سے خرید لیا (اپنی رکاوٹیں دور کرنے کے لیے جو چاہتا تھا وہ کرتا تھا) جب کہ مولا علی علیہ السلام اس قسم کے سیاسی بندے نہیں تھے۔ حق و عدالت اور دین کو ہر چیز پر ترجیح دیتے تھے۔ بغیر کسی وجہ کسی چیز کو نہ بخشتے تھے اور لوگوں کی اطاعت کو مال و زر خرید کی طرح نہ سمجھتے تھے۔

امام عالی مقامؑ خود اس گفتگو کے گواہ ہیں کہ بعض طرف داروں کی، لوگوں کی تجاویز اور مشوروں کے جواب میں فرمایا:

"أَتَأْمُرُونِّي أَنْ أَطْلُبَ النَّصْرَ بِالْجَوْرِ فِيمَنْ وُلِّيتُ عَلَيْهِ؛ وَاللهِ لَا أَطُورُ بِهِ مَا سَمَرَ سَمِيرٌ وَمَا أَمَّ نَجْمٌ فِي السَّمَاءِ نَجْماً"

کیا تم مجھے یہ مشورہ دے رہے ہو کہ جن کا میں حاکم ہوں، ان پر ظلم و ستم کر کے چند لوگوں کی مدد حاصل کروں۔ (بیت المال کو ناحق استعمال کروں) خدا کی قسم جب تک میرے جسم میں خون کا ایک قطرہ بھی موجود ہے، یہ شب و روز موجود ہیں، آسمان کے ستارے یکے بعد دیگر طلوع اور غروب ہوتے ہیں، ہرگز ایسا کام نہیں کروں گا۔ [۲]

حضرتؑ نے ان لوگوں سے جو آپ کی سیاست کا امیر شام کی سیاست سے موازنہ کر رہے تھے فرمایا:

"وَاللهِ! مَا مُعَاوِيَةُ بِأَدْهَىٰ مِنِّي لٰكِنَّهُ يَغْدِرُ وَ يَفْجُرُ وَ لَوْلَا كَرَاهِيَةُ الْغَدْرِ لَكُنْتُ مِنْ أَدْهَى النَّاسِ"

"خدا کی قسم! امیر شام مجھ سے زیادہ چالاک نہیں ہے مگر (وہ اپنے ذاتی مقاصد کی تکمیل کے لیے) چالاکی سے کام لیتا ہے اور گناہ کا مرتکب ہوتا ہے۔ اگر میں دھوکا دہی اور فریب سے بیزار نہ ہوتا تو میں ہی سب سے چالاک سیاستدان ہوتا۔" [۳]

یہی وہ مطالب ہیں کہ جو ہم اپنے زمانے میں بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ کچھ افراد اپنے اجتماعی تجزیات

---

[۱] ابن ابی الحدید نے اس گفتگو کو جاحظ سے نقل کیا ہے۔ شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید، ج۱، ص ۳۴۳

[۲] حاشیہ، نہج البلاغہ، خطبہ ۱۲۶

[۳] حاشیہ، نہج البلاغہ، خطبہ ۲۰۰

www.shiabookspdf.com

(معاملات) میں اپنے ذاتی مفادات اور اپنی پسند وناپسند کی حفاظت کے لیے ہر قسم کے ذرائع استعمال کرتے ہیں، ایسے لوگوں کو لائق ہوشیار اور زیرک سیاستدان شمار کرتے ہیں۔ حالانکہ باایمان، مدبر افراد جو کوشش کرتے ہیں کہ ان کے معاملات شریعت وعقل کے اصولوں کے مطابق انجام پائیں انہیں نالائق اور نااہل شمار کیا جاتا ہے۔

بدقسمتی سے یہ بڑی غلطی اب تک موجود ہے اور یہ معاشرے کی عظیم اجتماعی وسیاسی غلطیوں کا سرچشمہ ہے۔ عرصۂ دراز سے ان ہی غلطیوں کی بنا پر اس رُوئے زمین پر کتنے پاک لوگوں کا خون بہایا گیا ہے بہر حال حقیقت کچھ اور ہے۔ اہلِ عراق بالخصوص کوفہ کی آبادی مختلف ثقافتوں کے لوگوں سے تشکیل پائی ہے۔ خلیفہ ثالث کے زمانے کی سیاست نے ان لوگوں کو دنیا کی رنگینیوں میں محو کر دیا۔ اُس زمانے کی غلط روِش (لوگوں کو بیت اعمال کی غلط تقسیم) نے انہیں غلط راستے پر لگا دیا۔ قبائل کے سرداران سیاسی حق وحساب اور رشوت کے انتظار میں ہوتے تھے۔ اسی دلیل کی بنا پر امیر شام نے بہت سے قبائل کے سرداروں اور شخصیات کو بھاری رقم دے کر خرید لیا۔ جو یکے بعد دیگرے امیر شام سے مل گئے۔ حالانکہ اہلِ شام ان خطرناک طوفانوں سے نسبتاً دور تھے۔

مزید برآں اہلِ عراق اور شام کے جذبات مختلف تھے۔ اہلِ شام اکثر باعمل تھے۔ حالانکہ اہلِ عراق زیادہ تر اہلِ سخن گفتگو کے ماہر (باتیں بنانے والے تھے) اہلِ شام اجتماع نظم ونسق کے پابند تھے، وفاداری کا جذبہ شامیوں میں زیادہ تھا، جبکہ بے وفائی اور عہد شکنی اہلِ عراق بالخصوص اہلِ کوفہ کی خصوصیات میں شامل تھی۔

البتہ یہ گفتگو ہمارے زمانے میں اور یہاں تک کہ حضرت علی علیہ السلام، امام حسن علیہ السلام اور امام حسین علیہ السلام کے بعد کے زمانے تک اہلِ عراق پہ منطبق نہیں ہوتی۔ اسی دلیل کی بنا پر معصومینؑ کی روایات میں اہلِ عراق وکوفہ کی اس حقیقت میں کوئی اشکال نہیں کہ لوگ تاریخ اور جغرافیہ کے لحاظ سے ایک زمانے میں منفی صفات رکھتے ہوں اور کسی دوسرے زمانے میں مثبت صفات کے مالک ہوں۔

دوسرا حصہ

ثُمَّ قَالَ علیہ السلام أُنْبِئْتُ بُسْرًا قَدِ اطَّلَعَ الْيَمَنَ وَ إِنِّي وَ اللهِ لَأَظُنُّ أَنَّ هٰؤُلَاءِ الْقَوْمَ سَيُدَالُونَ مِنْكُمْ بِاجْتِمَاعِهِمْ عَلَى بَاطِلِهِمْ وَ تَفَرُّقِكُمْ عَنْ حَقِّكُمْ وَ بِمَعْصِيَتِكُمْ إِمَامَكُمْ فِي الْحَقِّ وَ طَاعَتِهِمْ إِمَامَهُمْ فِي الْبَاطِلِ وَ بِأَدَائِهِمُ الْأَمَانَةَ إِلَى صَاحِبِهِمْ وَ خِيَانَتِكُمْ وَ بِصَلَاحِهِمْ فِي بِلَادِهِمْ وَ فَسَادِكُمْ فَلَوِ ائْتَمَنْتُ أَحَدَكُمْ عَلَى قَعْبٍ لَخَشِيتُ أَنْ يَذْهَبَ بِعِلَاقَتِهِ

www.shiabookspdf.com

"مجھے یہ خبر دی گئی ہے کہ بسرابن ارطاۃ نے یمن پر قبضہ کرلیا ہے۔ بخدا! میں تو اب ان لوگوں کے متعلق یہ خیال کرنے لگا ہوں کہ وہ عنقریب سلطنت و دولت کو تم سے ہتھیا لیں گے، اس لیے کہ وہ مرکزِ باطل پر رہ کر متحد اور یکجا ہیں اور تم اپنے مرکزِ حق سے دور اور منتشر۔ تم امرِ حق میں اپنے امام کے نافرمان اور وہ باطل میں بھی اپنے امام کے مطیع وفرمانبردار ہیں۔ وہ اپنے ساتھی امیر شام کے ساتھ امانت داری سے فرض کو پورا کرتے ہیں اور تم خیانت کرنے سے نہیں چوکتے۔ وہ اپنے شہروں میں امن بحال رکھتے ہیں اور تم شورشیں برپا کرتے ہو، میں اگر تم میں سے کسی کو لکڑی کے ایک پیالے کا بھی امین بناؤں تو یہ خدشہ رہتا ہے کہ وہ اس کے کنڈے کو توڑ ڈالے گا۔"

شرح وتفسیر

کہاں خرابی ہے؟

اس خطبے کے دوسرے حصے میں امیر المومنین علیہ السلام بسرابنِ ارطاۃ (شام کے مشہور ظالم) کے یمن پر غلبہ کرنے سے متعلق اشارہ فرماتے ہیں۔ اس کے بعد اہلِ عراق کے اعمال اور ان کی تاریکیوں کو دقیق اسباب کے ساتھ ذکر فرمایا ہے۔

نہج البلاغہ کے بعض شارحین نے لکھا ہے کہ امیر شام نے، بسرابن ارطاۃ جو خون بہانے والا، زمین پر فساد پھیلانے والا اور قتل وغارت گری کرنے والا تھا، کو ذمے داری دی اور ایک مسلح لشکر کے ساتھ مدینے کی طرف بھیجا اور حکم دیا کہ جہاں بھی شیعیان علی علیہ السلام نظر آئیں ان پر سختی کرو اور انہیں ہمیشہ خوف کی حالت میں رکھو۔ جب مدینے میں داخل ہو جاؤ، وہاں کے لوگوں کو اس طرح ڈراؤ کہ موت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں کیونکہ انہوں نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پناہ دی، اُن کی مدد کی اور ہمارے باپ ابوسفیان کو شکست دی۔

معروف مصری مورخ طٰہٰ حسین نقل کرتے ہیں:

"بُسر نے امیر شام کے حکم پر پورے طریقے سے عمل کیا۔ یہاں تک کہ خود بُسر پر خون سوار ہو گیا، اس نے خون بہانے، مال لوٹنے، حقوق غصب کرنے، اور ہتکِ حرمت کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ وہ مدینے آیا اور ایسی مصیبتیں ڈالیں کہ تمام لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا، انہیں امیر شام کی بیعت کرنے پر مجبور کر دیا۔ اس کے بعد بُسر یمن کی طرف آیا، وہاں خون بہانے کے ساتھ ساتھ لوگوں کو اتنا خوف زدہ کر دیا کہ انہوں نے امیر شام کی بیعت کی اور عبید اللہ

www.shiabookspdf.com

ابن عباس کے دو فرزندوں کو شہید کر دیا۔"[۱]

ابنِ اثیر مزید فرماتے ہیں:

"یہ دو جوان بنی کنانہ کے صحرا نشینوں میں سے کسی آدمی کے پاس تھے جب بُسر نے ان کو قتل کرنا چاہا تو اس کنانی شخص نے کہا ان کا کیا گناہ ہے؟ انہیں کیوں قتل کرتے ہو؟ اگر انہیں قتل کرنا چاہتے ہو تو مجھے بھی قتل کر دو (تاکہ ان کی حفاظت کرنے میں کوتاہی نہ ہو) بُسر شرمندہ نہ ہوا اور اس کو بھی قتل کر دیا۔"[۲]

بہر حال یہ خبریں امیر المومنینؑ تک پہنچیں اور آپ نے شدید ناراضی کا اظہار کیا اور یہ عظیم خطبہ ارشاد فرمایا:

"أُنْبِئْتُ بُسْراً قَدِ اطَّلَعَ [۳] الْيَمَنَ وَإِنِّي- وَاللهِ- لَأَظُنُّ أَنَّ هٰؤُلَاءِ الْقَوْمَ سَيُدَالُوْنَ [۴]

"مجھے خبر ملی ہے کہ بُسر ابن ارطاۃ نے یمن پر قبضہ کیا ہے۔ خدا کی قسم، یہ ستم گر گروہ جلد تم سب پر مسلط ہو جائیں گے اور تم سے حکومت چھین لیں گے۔"

اس کے بعد امام عالی مقامؑ نے اس مطلب کے اسباب کو بیان فرمایا اور اس کے متعلق چار اہم موضوع جو ہمیشہ کامیابی کے راز ہوتے ہیں، کی طرف اشارہ کیا۔ سب سے پہلے فرماتے ہیں:

"بِاجْتِمَاعِهِمْ عَلٰى بَاطِلِهِمْ، وَتَفَرُّقِكُمْ عَنْ حَقِّكُمْ"

"وہ اپنے باطل پر متحد ہیں اور تم حق پر ہوتے ہوئے بھی منتشر ہو۔"

اتحاد ہر وقت کامیابی کا ضامن ہے۔ بالخصوص اس وقت حق والے متحد ہوں۔ مگر کتنی تکلیف کی بات ہے کہ اہلِ حق منتشر ہیں اور اہلِ باطل متحد، جبکہ باطل اِنتشار کا سرچشمہ ہے اور حق وحدت و اتحاد کا علمبردار۔ جی ہاں! تمام اجتماعی کاموں کی کامیابی کے لیے سب سے پہلے وحدت اور اتفاق کا ہونا ضروری ہے۔ اس کے برعکس اِنتشار و اختلاف زہرِ قاتل ہے۔

دوسری بات یہ ہے:

"بِمَعْصِيَتِكُمْ إِمَامَكُمْ فِي الْحَقِّ، وَطَاعَتِهِمْ إِمَامَهُمْ فِي الْبَاطِلِ"

"تم حق بات پر اپنے پیشوا کی اطاعت نہیں کرتے ہو، حالانکہ وہ باطل پر ہوتے ہوئے اپنے پیشوا کے فرمانبردار ہیں۔"

جی ہاں! نظم و ضبط ہر جگہ کامیابی کے لیے شرط قرار دی گئی ہے۔ کوئی فوج و لشکر، کوئی قوم و ملت اپنے رہنما کی اطاعت

[۱] فی ظلال نہج البلاغہ ج ۱ ص ۱۸۸

[۲] کامل ابن اثیر، ج ۳، ص ۳۸۳۔ تاریخ طبری ج ۴ صفحات، ۱۰۸، ۲۰۶

[۳] اطلع کا مادّہ طلع سے ہے اس کے معنی غلبہ، کامیابی کے ہیں۔

[۴] یدالون، بابِ اِفعال سے فعلِ مضارع مجہول جس کے معنی ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنا ہے۔ اور مادّہ دولہ سے ہے۔

www.shiabookspdf.com

کے بغیر مقصد تک نہیں پہنچ سکتی ہے۔اس دلیل کی بنا پر نظم وضبط کو مسائل کے حل کے لیے آج کل لوگ زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔

تیسری بات یہ ہے:

"وَبِأَدَائِهِمُ الْأَمَانَةَ إِلَى صَاحِبِهِمْ وَخِيَانَتِكُمْ"

"وہ اپنے رہنما کی نسبت امانت دار ہیں،اس کے برعکس تم خیانت کرتے ہو۔"

ان کی امانت داری ان کے مخالف گروہ کے مقابلے میں فوج، سرمایہ اور امکانات پیدا کرتی ہے لیکن تمہاری خیانت ان تمام چیزوں کو برباد کرتی ہے۔ایک ایسا گروہ جس کے پاس امکانات کا فقدان ہو، اور ضرورت کے مطابق تیاری نہ ہو اس کا نتیجہ شکست کے علاوہ کچھ نہیں۔نہج البلاغہ کے بعض شارحین نے امانت سے"بیعت" مراد لی ہے۔

لیکن خطبے کے جملوں پر توجہ دینے سے اوپر ذکر شدہ تفسیر زیادہ واضح نظر آتی ہے۔اگر بیعت کے علاوہ اطاعت کے معنی بھی لیے جائیں جیسا کہ ذکر ہوا ہے، تو مزید تکرار کی ضرورت نہیں۔

چوتھی بات یہ ہے:

"وَبِصَلَاحِهِمْ فِي بِلَادِهِمْ وَفَسَادِكُمْ"

"وہ لوگ اپنے شہروں کی اصلاح کے لیے کوشش کرتے ہیں مگر تم لوگ فساد میں مشغول ہو۔"

اس ترتیب سے وہ لوگ اتحاد، نظم وضبط، امانت داری اور اپنے شہروں کی اصلاح چاہتے ہیں اور تم لوگ منتشر، نافرمان، خیانت کار اور مفسد ہو۔طبیعی امر ہے کہ ان جیسے لوگ اس قسم کے(تم جیسے) لوگوں پر کامیابی حاصل کرتے ہیں۔

حکومت چلانے والے خواہ کتنے ہی اچھے منتظم، صاحب تدبیر اور طاقتور کیوں نہ ہوں، مگر ایسے عوام کے ہوتے ہوئے کسی بامقصد نتیجے پر نہیں پہنچ سکتے کیوں کہ عوام ہی دراصل حکمرانوں کے دست وبازو ہوتے ہیں۔جی ہاں! حق اپنے کمزور اور مفسد طرف داروں کی وجہ سے کمزور ہوتا ہے اور باطل اپنے طرف داروں کی قوت اور اتحاد سے طاقت ور ہوتا ہے۔

امیرالمومنینؑ اپنی گفتگو کی تکمیل کے سلسلے میں فرماتے ہیں:

"فَلَوِ ائْتَمَنْتُ أَحَدَكُمْ عَلَى قَعْبٍ [۱] لَخَشِيتُ أَنْ يَذْهَبَ بِعِلَاقَتِهِ" [۲]

"(میں تم لوگوں پر کیسے اعتماد کروں) اگر میں تمہیں امانت کے طور پر ایک پیالہ بھی دوں اور تم سے کہوں کہ اسے مضبوطی سے پکڑو تو تم اُسے توڑ ڈالو گے۔"

---

[۱] قعب: اہلِ لغت کے بعض احباب کے مطابق اس کے معنی لکڑی کا پیالہ ہیں اور بعض کے مطابق بڑے پیالے کو کہتے ہیں۔

[۲] علاقہ، اگر اس کے عین پر فتح آجائے تو یہ معنوی رابطے کے معنی میں آتا ہے۔اور اگر عین پر کسرہ ہو تو مادّی رابطے کا معنی دیتا ہے۔

www.shiabookspdf.com

وہ لوگ جو اس قدر چھوٹے اور کم اہمیت کے معاملے (موضوعات) میں قابلِ اعتماد نہیں ہوتے ہیں تو حکومتِ اسلامی، جنگ و صلح، بیت المال اور اس قسم کے اہم معاملات میں کیسے ممکن ہے کہ ان پر اعتماد کیا جائے۔

نکات

ا۔بُسر،امیر شام کا خونخوار نمائندہ

مورخینِ اسلام اس نکتے پر متفق نظر آتے ہیں کہ امیر شام نے اپنے اہداف کی تکمیل کے لیے ایسے مہروں سے کام لیا جو اصحابِ پیغمبرؐ سے ذرا بھی شباہت نہیں رکھتے تھے۔ ان میں ایک بُسر ابنِ ارطاۃ ہے جو ابنِ ابی الحدید کے مطابق ایک سنگدل، خون بہانے والا اور مکمل طور پر ایک بے رحم آدمی تھا۔ امیر شام کو خبر ملی کہ یمن کے کچھ لوگوں نے شور و غوغا بلند کیا ہے اور اُسے ایک دوستانہ خط ارسال کیا ہے تو اس نے بُسر کو بلایا اور اُسے حکم دیا کہ حجاز، مدینہ اور مکہ کے راستے یمن جاؤ اور جہاں علیؑ کے محب نظر آئیں تو ان سے سختی سے بات کرو تا کہ تمہاری بات ماننے کے سوا ان کے پاس کوئی چارہ نہ ہو۔ اس کے بعد زبان کی سختی سے باز آؤ اور میری بیعت کی دعوت دو، جو نہ مانے اُسے قتل کرو؛ شیعیانِ علیؑ جہاں بھی ملیں تہہ تیغ کر دو۔

اس نے امیر شام کے حکم پر عمل کیا۔ جب وہ مدینے پہنچا، ایک خطبہ دیا اور مدینے کو لوگوں کو بُرا بھلا کہا۔ انہیں سخت لہجے میں خبردار کیا اور خلیفۂ ثالث کے قتل کا قصہ بیان کیا اور انہیں ذمے دار ٹھہرایا۔ اس قدر خوف زدہ کیا کہ جو لوگ بُسر کو جانتے تھے بہت خوف زدہ ہو گئے۔ پھر اس نے امیر شام کی بیعت کی دعوت دی۔ ایک گروہ نے اس کی بیعت کر لی، بسر نے بہت سارے گھروں کو جلایا یہاں تک کہ اصحابِ پیغمبر کو بھی نہیں بخشا۔ اُس نے کہا اگر امیر شام کی بیعت نہ کی تو یقیناً قتل کیے جاؤ گے۔ اس طریقے سے بسر نے مدینے پر قبضہ کیا اور پھر مکے آیا اور انہیں ڈرایا دھمکایا۔ امیر شام کی مخالفت سے خوف زدہ کیا اور کہا، اگر تم لوگوں نے مخالفت کی تو تمہاری جڑوں کو کاٹ دوں گا۔ تمہارے مال اور تمہارے گھروں کو مسمار کروں گا۔ طائف میں بھی یہی کام انجام دیا۔ یہاں سے وہ نجران آیا، وہاں کے عیسائیوں کو بھی خوف زدہ کیا اور کہا اگر تم سے کوئی اختلاف کی خبر آئی تو ایسا کام کروں گا کہ تمہاری نسلیں ختم ہو جائیں گی، تمہارے گھر اور تمہاری کھیتیاں ویران کر دی جائیں گی۔ اسی سلسلے کو جاری رکھتے ہوئے صنعا تک پہنچا، جیسا کہ ہم اشارہ کر چکے ہیں قتل و غارت گری اور رعب و وحشت سے صنعاء اور یمن پر مسلط ہو گیا۔

جب امیرالمومنینؑ کو یہ خبر ملی تو جاریہ بن قدامہ سعدی کو دو ہزار افراد کے ساتھ یمن بھیجا۔ یمن کے لوگ حضرت علی علیہ السلام کے ساتھ وفادار تھے۔ جاریہ کے آنے سے ان میں قوت پیدا ہو گئی۔ انہوں نے امیر شام کے حامیوں کے خلاف

www.shiabookspdf.com

قیام کیا۔ وہ شہر چھوڑ کر بھاگ گئے اور غاروں میں پناہ لی۔ شیعیان علیؑ نے ان کا تعاقب کیا اور ان سب کو تلاش کیا اور بسر کے تعاقب میں نکلے، بُسر نے اپنی اور اپنے ساتھیوں کی جانوں کو خطرے میں دیکھا تو آئے دن ایک جگہ سے دوسری جگہ تبدیل ہوتا رہا۔ وہ جہاں جاتا وہاں کے لوگ اِس خونخوار آدمی کی مخالفت کرتے تھے۔ یہاں تک کہ بسر کو یہ خوف محسوس ہونے لگا کہ لوگ اسے گرفتار کرلیں گے۔ اب اس کی سب سے بڑی کوشش یہ تھی کہ کسی طرح ان لوگوں کی گرفت سے بھاگ سکے، تاکہ امیر شام کے پاس پہنچ سکے اور اپنی کامیابیوں کی داستان سنائے اور اُسے بتائے کہ امیر شام کی حکومت کے قیام کے لیے اس نے تیس ہزار آدمی قتل کیے کچھ لوگوں کو زندہ جلایا۔

حدیث میں آیا ہے کہ حضرت علی علیہ السلام نے بسر کی اس طرح مذمت کی:

"خداوندا! اس آدمی نے اپنے دین کو دنیا کے لیے بیچ ڈالا، بے شمار بے حرمتیاں کیں۔ تیری اطاعت پر مخلوق کی اطاعت کو مقدم سمجھا۔ خداوندا! اسے اس وقت تک موت نہ دے جب تک اس کی عقل کو زائل نہ کردے۔ (ہر خاص وعام کے سامنے رسوا نہ کردے) ایک لحظہ بھی اسے تیری رحمت نصیب نہ ہو۔"

کچھ دن نہ گزرے تھے کہ اس کی حالت پاگلوں جیسی ہوگئی؛ عقل سے پیادہ ہوگیا؛ فضول باتیں زبان سے نکلنے لگیں؛ بار بار کہتا تھا کہ مجھے تلوار دے دو تاکہ لوگوں کو قتل کروں۔ لوگوں نے لکڑی کی بنی تلوار اس کے ہاتھ میں دے دی۔ اور ہوا سے بھری مشک اس کے پاس رکھ دی وہ اس مشک پر اس لکڑی کی تلوار سے اس حد تک وار کرتا کہ بے ہوش ہوجاتا۔ یہاں تک بعض لوگوں نے کہا کہ عقل سے اس قدر ہاتھ دھو بیٹھا کہ نجاستیں کھاتا۔ جب اس کے ہاتھ باندھ دیے جاتے تب بھی نجاسات پر خود کو گرادیتا اور کھاتا اس حالت میں وہ دنیا سے چل بسا۔[1]

مسعودی "مروج الذہب" میں اس داستان کو نقل کرنے کے بعد مزید کہتا ہے کہ بُسر لوگوں سے کہتا، "تم لوگ مجھے نجاست کھانے سے منع کرتے ہو، حالاں کہ ابن عباسؓ کے دو فرزند، جنہیں میں نے مظلومانہ طریقے سے قتل کیا ہے، مجھے کھانے کو دے رہے ہیں۔[2]

۲۔ ملتوں (قوموں) کی فتح وشکست کا راز

امیر المومنین علیہ السلام نے اس خطبے میں ایک مختصر وجامع عبارت میں اقوام اور ملتوں کی شکست وکامیابی کے راز کو بیان

[1] شرح نہج البلاغۃ، ابن ابی الحدید، ج ۲، ص ۳ تا ۱۸۔ منہاج البراعۃ، ج ۳، ص ۳۶۰۔ الغدیر، جلد ۱۱، ص ۱۹

[2] مروج الذہب، ج ۳، ص ۱۶۳ (بحث ذکر ایام الولید بن عبدالملک)

www.shiabookspdf.com

فرمایا ہے جو نہ صرف اہلِ عراق، حجاز، یمن اور بسر ابن ارطاۃ پر صادق آتا ہے بلکہ ہر زمانے میں اس خطبے سے روشنی حاصل ہوسکتی ہے۔سب سے پہلے "وحدتِ کلمہ" سے گفتگو فرماتے ہیں جو افواج، نظم ونسق اور ان کے امور کی تقویت کا باعث بنتی ہے۔ وحدت کلمہ وہ چیز ہے جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں اسلام کے سپاہیوں کی اپنے دشمنوں پر کامیابی کا راز ہے۔ہمارے زمانے میں اقوام اور ملتوں کے درمیان ان کے اثرات نظر آتے ہیں۔ہم ایسے بہت سے گروہوں کو دیکھتے ہیں جو قلیل تعداد میں ہونے کے باوجود اپنے اتفاق واتحاد کی بدولت اپنے سے بہت بڑے گروہوں پر غالب آجاتے ہیں، کیوں کہ وہ نااتفاقی اور انتشار کا شکار ہوتے ہیں۔

قرآن مجید مسلمانوں کی وحدتِ کلمہ کو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معجزوں میں سے قرار دیتا ہے۔ [1] مسلمانوں کی وحدت کو جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں ایمان کے سائے میں وجود میں آئی تھی، ایک نعمت الٰہی قرار دیا [2] انتشار واختلاف کو زمینی وآسمانی عذاب کی طرح قرار دیا۔ [3]

امیر المومنین علیہ السلام نے نظم وضبط اور ایک رہبر کی پیروی کو ایک دوسرے عنوان سے ذکر فرمایا ہے۔اگرچہ یہ بھی اتحاد وہم آہنگی کی بنیاد ہے۔اپنے زمانے میں کچھ انقلابات کو دیکھتے ہیں کہ کامیابی سے ہمکنار ہیں اور دوسرے انقلابات جو شکست سے دوچار ہوئے، کامیاب انقلابات ایک رہبر کی پیروی کی دلیل ہیں۔اور شکست خوردہ انقلابات انتشار اور مختلف مراکز میں تقسیم ہونے کی دلیل ہیں۔

حضرت علی علیہ السلام نے امانت کے مسئلے کو کامیابی کا تیسرا راز شمار کیا ہے۔کوئی قوم اور ملت سعادت اور کامیابی کے راستے پر گامزن نہیں ہوسکتی مگر یہ کہ وہ اپنی امانتوں کی حفاظت کرے اور ان سے جتنا ہوسکے استفادہ کرے۔یہ اس وقت ممکن ہے جب لوگوں کی اکائیاں امانت دار ہوں۔اپنے اجتماعی مفادات کے تحفظ کی کوشش کریں۔آخر کار حضرت علی علیہ السلام نے معاشرے کے ہر فرد کی اصلاح کو کامیابی کا چوتھا عامل (عنصر) قرار دیا ہے۔دوسری تعبیر میں یہ کہ جب تک لوگ معاشرے کے مصالح ومقاصد کو مدِنظر نہ رکھیں۔اپنے ذاتی مفاد کو قربان نہ کریں، اپنی اصلاح کی کوشش نہ کریں تو ہرگز مشکلات پر قابو نہیں پاسکتے۔وہ کمزور وناتواں دشمن کے چنگل میں پھنس جاتے ہیں، وہ لوگ جو معاشرے کے بگاڑ سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ایسے لوگ معاشرے کو بھی اور اپنے گھر (خاندان) کو برباد کردیتے ہیں۔

---

[1] هُوَ الَّذِيٓ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ ۝ وَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ ۭ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ ۭ (سورۂ انفال، آیات ۶۲، ۶۳)

[2] وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَاۗءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ۚ (سورۂ آل عمران، آیت ۱۰۳)

[3] قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓي اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا (سورۂ انعام، آیت ۶۵)

www.shiabookspdf.com

تیسرا حصّہ

اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ قَدْ مَلِلْتُهُمْ وَ مَلُّوْنِيْ وَ سَئِمْتُهُمْ وَ سَئِمُوْنِيْ فَاَبْدِلْنِيْ بِهِمْ خَيْرًا مِنْهُمْ وَ اَبْدِلْهُمْ بِيْ شَرًّا مِنِّيْ اَللّٰهُمَّ مِثْ قُلُوْبَهُمْ كَمَا يُمَاثُ الْمِلْحُ فِي الْمَاءِ اَمَا وَ اللهِ لَوَدِدْتُ اَنَّ لِيْ بِكُمْ اَلْفَ فَارِسٍ مِنْ بَنِيْ فِرَاسِ بْنِ غَنْمٍ هُنَالِكَ لَوْ دَعَوْتَ اَتَاكَ مِنْهُمْ فَوَارِسُ مِثْلُ اَرْمِيَةِ الْحَمِيْمِ.

"پروردگار! میں ان سے تھک گیا ہوں (ان کی بُری نیتوں کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتا) اور وہ بھی مجھ سے تھک گئے ہیں۔ میں ان سے ناراض ہوں اور وہ بھی مجھ سے ناراض ہیں۔ مجھے اُن سے بہتر افراد عنایت فرمادے۔ میری جگہ پر ان کے لیے ایک بُرے شخص کو مسلط کردے۔ پروردگار! ان کے دل (غم و اندوہ) سے بھردے جیسا کہ نمک پانی میں ختم ہوجاتا ہے۔ جان لو! خدا کی قسم، تمہاری جگہ بنی فراس کے ایک ہزار سوار (شجاع اور وفادار) میرے نزدیک تم سے بہتر ہوتے۔ پھر امام علیؑ نے ان کی تعریف میں یہ شعر بطور مثال پیش فرمایا:

هُنَالِكَ لَوْ دَعَوْتَ أَتَاكَ مِنْهُم   فَوَارِسُ مِثْلُ أَرْمِيَةِ الْحَمِيْمِ

"اگر تم کسی موقع پر انہیں پکارو، تو تمہارے پاس ایسے سوار پہنچیں گے جو تیز روی میں گرمیوں کے ابر کی مانند ہیں۔"
اس کے بعد امام عالی مقام خطبہ ختم کرکے منبر سے اُترے۔

شرح وتفسیر

میں تم لوگوں سے اکتا گیا ہوں

خطبے کے تیسرے اور آخری حصّے میں امام عالی مقامؑ نے غمزدہ دل کے ساتھ بارگاہ الٰہی میں صدا دی۔ ان پر نفرین کی۔ لیکن یہ ایک ایسی نفرین تھی کہ جن کے دلوں میں بیداری کا جذبہ تھا اُن کے لیے ایک تنبیہہ تھی کہ انہیں آگاہی دے، گمراہی وضلالت کی وادی میں گمشدہ لوگوں کو ذات احدیت کی طرف دعوت دے۔ کیونکہ امام عالی مقامؑ کی نفرین نصیحت اور بیداری کا درس دیتی ہے۔

حضرت امیرالمومنینؑ فرماتے ہیں:

www.shiabookspdf.com

"اَللّٰهُمَّ إِنِّي قَدْ مَلِلْتُهُمْ وَمَلُّونِي وَسَئِمْتُهُمْ وَسَئِمُونِي"[۱]

"پروردگار! (میں نے نصیحتیں کیں لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئے) میں ان سے تھک گیا ہوں اور وہ مجھ سے تھک گئے ہیں، میں ان سے ناراض ہوں اور وہ مجھ سے ناراض ہیں"

یہ بات واضح اور نمایاں ہے کہ جب رہبر اور اُس کے پیروکاروں کے اہداف، اخلاق اور نیتوں میں ہم آہنگی نہ ہو تو یہ مشکلِ عظیم سامنے آجاتی ہے کہ عادل، آگاہ اور شجاع رہنما، ناتواں، دنیا پرست اور جاہل پیروکاروں کے مقابلے میں کمزور نظر آتا ہے، اس کی نصیحتیں انہیں فائدہ نہیں دیتی ہیں۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ رہنما بھی پیروکاروں سے تھک جاتا ہے اور پیروکار بھی اُس سے تھک جاتے ہیں، بقول سعدی۔ جتنا دانا نادان سے نفرت کرتا ہے اتنا ہی نادان دانا سے خوف رکھتا ہے:

گر ملولی ز ما ترش منشین　　　　که تو هم در میان ما تلخی

اگر تم ہم سے ہو ناراض تو کوئی بات نہیں　　　　ہمارے درمیاں تم بھی تو نیک نام نہیں

اگر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک جاہل اور گمراہ قوم کی رہبری ذمے داری لی، تو اس کی وجہ یہ تھی کہ اُن کی قوم نے اپنے پیغمبر کی نصیحت سنی اور قبول کی اور اُن کے اخلاق واطوار کو اپنے اندر جذب کرنے کی کوشش کی جبکہ بعض پیغمبروں کو ایسے پیروکار نہیں مل سکے، نتیجتاً پیغمبر اپنی امت سے اور امت پیغمبر سے ناراض رہی۔ نہیں بھولنا چاہیے کہ حضرت لوطؑ کی قوم مکمل طور پر گناہوں سے آلودہ تھی، حضرت لوطؑ پیغمبر سے پاک دامنی کے جرم میں نفرت کا اظہار کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ حضرت لوطؑ اور ان کے پیروکاروں کو اپنے شہر سے نکال باہر کرو، یہ وہ لوگ ہیں جو پاک دامنی کو چاہتے ہیں اور ہماری ہاں میں ہاں نہیں ملاتے۔[۲] حضرت علیؑ نے ان لوگوں سے اس طرح نفرت کا اظہار فرمایا:

"فَأَبْدِلْنِي بِهِمْ خَيْرًا مِنْهُمْ، وَأَبْدِلْهُمْ بِي شَرًّا مِنِّي"

"پروردگار ان لوگوں کے بدلے مجھے اچھے افراد عنایت فرما اور ان لوگوں کے لیے میری جگہ پر بدتر آدمی کو مسلط فرما۔"

ایسا کیوں ہوا کہ نہ تو پیروان (کوفہ کے عوام) امامؑ کے صحیح اطاعت گزار تھے اور نہ امامؑ جیسا ہادی اور رہبر ایسے پیروکاروں کے لیے مناسب تھا، پھر حکمتِ پروردگار میں یہی امر ہوا تو جواب یہ ہے کہ یہ اہلِ کوفہ کے لیے ایک آزمائش اور امتحان تھا اور خلافت امام ایک نعمت الٰہی تھی، جب اہل کوفہ اس نعمت کے کفران کے مرتکب ہونے لگے اور اطاعت امامؑ سے پہلو تہی کرنے لگے تو یہ نعمت ان سے سلب کر لی گئی اور امامؑ کی نفرین کا شکار ہو گئے۔ امامؑ کی یہ نفرین کتنی جلدی پوری ہو گئی کہ بنی

---

[۱] سَئِمْتُهُمْ سأم کے مادّے سے ہے جس کے معنی افسردگی کے ہیں۔

[۲] سورۂ اعراف، آیت ۸۲

www.shiabookspdf.com

امیہ اور ان کے خونخوار سنگدل اور سفاک عمال ان پر مسلط ہو گئے اور ان کے ساتھ جو کچھ کیا، اس کی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی۔ اسلامی تاریخ کا عجوبہ ہے کہ جس زمانے میں آپؑ نے نفرین کی اس کے تھوڑے عرصے بعد تاریخ کے بے مثال ظالم وستم گر حجاج بن یوسف کی پیدائش ہوئی۔[۱]

حجاج بن یوسف کے حکومت تک پہنچنے سے پہلے ہی اہلِ عراق اور کوفہ اپنے جرائم کا کفارہ ادا کر چکے تھے، لیکن حجاج کی حکومت میں اپنے عروج کو پہنچے تھے۔

واضح رہے کہ مولاؑ کا جملہ "أَبْدِلْهُمْ بِي شَرًّا مِنِّي" سے یہ مقصد نہیں ہے کہ میں برا ہوں اور مجھ سے برا شخص مسلط کردے بلکہ تمام خوبیوں کے مقابلے میں تمام خامیوں کا بھی ذکر کرنا مقصد ہے سورۂ فرقان میں جہنم کے دردناک عذاب کی طرف اشارہ کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"قُلْ أَذٰلِكَ خَيْرٌ أَمْ جَنَّةُ الْخُلْدِ الَّتِي وُعِدَ الْمُتَّقُونَ"[۲]۔

کہو کیا (یہ دردناک عذاب) جہنم بہتر ہے یا بہشت جس کا پرہیز گاروں کے ساتھ وعدہ کیا گیا ہے؟

ایک دوسری تعبیر کے مطابق اُس زمانے میں نہ اہل عراق وکوفہ اچھے تھے کہ جن کے بدلے امام علی علیہ السلام اللہ تعالیٰ سے ان سے زیادہ اچھے لوگوں کے طلب گار ہیں اور نہ امامؑ (العیاذباللہ) بُرے تھے کہ خدا ان سے زیادہ بدتر حاکم کو ان پر مسلط کر دیتا۔ اس قسم کے مواقع پر صیغۂ افعل تفضیل کے مفہوم نے اپنے معمول کو کھو دیا ہے، اس کی مثال دو متضاد چیزوں کے مقائیسے کے لیے اس طرح دی جاسکتی ہے۔

امام عالی مقامؑ کی یہ نفرین حقیقت میں اس نفرین کی طرح ہے، جو قرآن مجید میں اولوالعزم پیغمبر حضرت نوحؑ سے نقل ہوئی ہے:

"رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكَافِرِينَ دَيَّارًا"

"پروردگارا! روئے زمین پر کسی کافر کو بھی باقی نہ رکھ۔"[۳]

حضرت علی علیہ السلام نفرین کو اس طرح جاری رکھتے ہیں، خداوندا! ان لوگوں کو اس طرح ڈبو دے جیسے نمک پانی میں حل ہوتا ہے:

"اَللّٰهُمَّ مِثْ قُلُوبَهُمْ كَمَا يُمَاثُ الْمِلْحُ فِي الْمَاءِ"

مولا علی علیہ السلام کا "ان کے دلوں کو پگھلا دے" سے ممکن ہے یہ احتمال ہو کہ ان کے دل غم واندوہ سے پُر ہوں۔ یعنی

---

[۱] منہاج البراعہ، ص ۳۶۸، مشہور مورخ مسعودی کے مطابق حجاج کی پیدائش ۴۱ھ میں ہوئی اور ۹۵ھ میں ۵۴ سال کی عمر میں مرگیا۔

[۲] سورۂ فرقان، آیت ۱۵

[۳] سورۂ نوحؑ، آیہ ۲۶

www.shiabookspdf.com

اِنسان کی ہمدردیاں مجروح ہوں۔ یہ کہا جائے کہ اس کا دل پگھل گیا۔ خطبہ ۲۷ (خطبۂ جہاد) بھی اس طرح کے معنی میں آیا ہے۔ آپؑ فرماتے ہیں:

"وَاللهِ يُمِيتُ الْقَلْبَ وَ يَجْلِبُ الْهَمَّ مِنَ اجْتِمَاعِ هٰؤُلَاءِ الْقَوْمِ عَلٰى بَاطِلِهِمْ وَ تَفَرُّقِكُمْ عَنْ حَقِّكُمْ"

"خدا کی قسم! یہ عمل دل کو مجروح اور غمزدہ کردیتا ہے کہ وہ اپنے مرکز باطل پر مجتمع ہیں اور تم اپنے مرکز حق سے دور اور منتشر ہو۔"

حقیقت میں اس جملے کا مفہوم یہ ہے کہ مولاؑ اہلِ کوفہ پر نفرین کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ خداوند ان لوگوں کی نافرمانی، نفاق، دورخی اور بے عملی کی وجہ سے ان کے ہوش وخرد کو چھین لے تا کہ ساری زندگی حیران و پریشان رہیں۔ آیات و روایات میں متعدد مقامات ملتے ہیں جہاں قلب کو عقل ودرایت یا معیارِ عقل ودرایت کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ جس طرح سورۂ انعام، آیت ۲۵ میں پڑھتے ہیں:

"وَجَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ"[1]

"ہم نے ان کے دلوں پر پردے ڈال دیے تاکہ وہ قرآن درک نہ کرسکیں۔"

حقیقت میں خدائے متعال کی طرف سے ایک سخت وعید ہے جس کی طرف قرآن مجید اور روایات میں سرکش اور منافق لوگوں کے بارے میں اشارہ ہوا ہے۔ یہی سزا ہے انسان کے لیے کہ حقائق کو جانتے ہوئے نہ دیکھے، نہ سنے اور نہ سمجھے اور مشکل راہوں میں پریشانی کے عالم میں ہلاک ہوجائے۔

اس خطبے کے آخری حصے میں امامِ عالی مقامؑ تمنا کرتے ہیں کہ اے کاش! اس کمزور وناتواں لشکر کی جگہ قبیلہ بنی فراس کے تھوڑے سے ہی لوگ ہوتے جو شجاعت اور وفاداری میں شہرت رکھتے ہیں۔ آپؑ فرماتے ہیں:

"أَمَا وَاللهِ! لَوَدِدْتُ أَنَّ لِيْ بِكُمْ أَلْفَ فَارِسٍ مِنْ بَنِيْ فِرَاسِ بْنِ غَنْمٍ"

"آگاہ رہو! خدا کی قسم! تمہاری جگہ بنی فراس بن غنم کے ایک ہزار سوار زیادہ پسند کرتا ہوں جو (بہادر اور وفادار ہیں) تاکہ حق وعدالت کے دشمنوں کو ان کی مدد سے ان کے اصل مقام پر پہنچا سکوں۔"

اس کے بعد امام عالی مقامؑ نے اس شعر کو مثال کے طور پر پیش کیا:

هنالك لودعوت اتاك منهم　　　فوارس مثل ارمية الحميم

---

[1] سورۂ اسراء، آیت ۴۶

www.shiabookspdf.com

اس شعر کے معنی یہ ہیں کہ اگر ان کو بلاؤ تو گرمیوں کی بارش کی طرح تیز وتند سوار تمہاری طرف آئیں گے اور فارسی شاعر کے قول کے مطابق اس تیز رفتار بادل کی طرح جس میں پانی کم ہوتا ہے دشمن کی سرکشی وسرکوبی کے لیے بہت جلد پہنچ جائیں گے۔اس کے بعد امامؑ نے خطبہ کو ختم کیا اور منبر سے اُترے۔

کلام سید رضی

"قال السیّد الشریف: أَقُوْلُ: أَلْاَرْمِيَةُ جَمْعُ رَمِيٍّ وَ هُوَ السَّحَابُ والحميمُ هاهنا: وَقْتُ الصَّيْفِ. وإِنَّمَا خَصَّ الشَّاعِرُ سَحَابَ الصَّيْفِ بِالذِّكْرِ لِأَنَّهُ أَشَدُّ جُفُوْلًا وَ أَسْرَعُ خُفُوْفاً؛ لِأَنَّهُ لَا مَاءَ فِيْهِ. وَإِنَّمَا يَكُوْنُ السَّحَابُ ثَقِيْلَ السَّيْرِ لِامْتِلَائِهِ بِالْمَاءِ. وَذٰلِكَ لَايَكُوْنُ فِي الْأَكْثَرِ إِلَّا زَمَانَ الشِّتَاءِ. وَإِنَّمَا أَرَادَ الشَّاعِرُ وَصْفَهُمْ بِالسُّرْعَةِ إِذَا دُعُوْا، وَ الْإِغَاثَةِ إِذَا اسْتُغِيْثُوْا. وَالدَّلِيْلُ عَلَى ذَالِكَ قَوْلُهُ: هُنَالِكَ، لَوْدَعَوْتَ، أَتَاكَ مِنْهُمْ"

مرحوم سیّد رضیؒ کہتے ہیں کہ اس شعر میں لفظ "ارمیة۔ رمی کی جمع ہے (شقی کے وزن پر) ابر کے معنی میں ہے۔"حمیم" یہاں موسم گرما کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔شاعر نے گرمیوں کے ابر کی تخصیص اس لیے کی ہے کہ وہ تیز رفتار اور ہلکا ہوتا ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ پانی سے خالی ہوتا ہے اور ابرست گام اس وقت ہوتا ہے جب اس میں پانی بھرا ہوا ہو اور ایسے ابر (ملک عرب میں) عموماً سردیوں میں اٹھتے ہیں۔اس شعر سے شاعر کا مقصود یہ ہے کہ انہیں جب مدد کے لیے پکارا جاتا ہے اور ان سے فریادرسی کی جاتی ہے تو وہ تیزی سے بڑھتے ہیں اور اس کی دلیل شعر کا پہلا مصرع "هُنَالِكَ لَوْدَعَوْتَ أَتَاكَ مِنْهُمْ۔" ہے۔

نکتہ

بنوفراس بن غنم کون تھے؟

ابن ابی الحدید اپنی شرح نہج البلاغہ میں ان کے متعلق لکھتے ہیں:

یہ عرب کے ان قبائل میں سے تھے جن کی شجاعت و بہادری کا چرچا تھا۔ان کا ایک مشہور سردار جن کا نام ربیعہ بن مکدم تھا جو زندگی اور موت دونوں میں خواتین اور بچوں کا حامی تھا۔کہا جاتا ہے کہ وہ موت کے بعد بھی مظلومین کی حمایت کرتا

www.shiabookspdf.com

رہا اس کی حمایت کی داستان اس طرح ہے کہ بنی سُلیم کے ایک گروہ نے اس پر حملہ کیا جب کہ ان کے ساتھ خواتین اور بچے تھے اور وہ اکیلا دفاع کر رہا تھا۔ دشمنوں نے اس کی طرف ایک تیر پھینکا جو اس کے دل میں پیوست ہو گیا۔ اور قریب تھا کہ گھوڑے سے زمین پر گرے لیکن اس نے اپنا نیزہ زمین میں گاڑ دیا اور اس کے سہارے پر گھوڑے پر بھی بغیر حرکت کے رہا، خواتین اور بچوں کو اشارہ کیا کہ جلدی سے قبیلے تک پہنچ جائیں۔ بنی سلیم اس کی شجاعت سے خوف زدہ تھے، اس خیال سے کہ وہ زندہ ہے قریب نہ آ سکے۔ اس کی عدم حرکت سے کم از کم اس کی زندگی کا گمان کرتے رہے۔ ان میں سے ایک نے اس کے گھوڑے کی طرف تیر پھینکا۔ وہ گھوڑے سے زمین پر آئے اور معلوم ہوا کہ کچھ مدت پہلے ہی ان کی جان جا چکی تھی۔ حالاں کہ اس سے پہلے وہ اپنی خواتین اور بچوں کو اپنے قبیلے تک پہنچا چکے تھے اور دشمنوں کی اسیری سے ان کو سلامتی سے لے جا چکے تھے۔ [1] کتاب "بلوغ الادب" میں آیا ہے کہ اس قبیلے کا ہر آدمی دوسرے قبیلوں کے دس بہادر آدمیوں کے برابر تھا۔ اور انہیں عرب کے بہادر ترین قبائل میں شمار کیا جاتا تھا۔ [2]

توجہ رہے کہ کوفے میں یہ امامؑ کے سپاہی دس ہزار آدمیوں کے برابر تھے، بلکہ ایک روایت کے مطابق ایک لاکھ آدمیوں کے برابر تھے۔ امامؑ کی خواہش تھی کہ وہ ایک ہزار بنی فراس کے بہادر آدمیوں میں تبدیل ہو جاتے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ لشکر کوفہ کے افراد کس قدر بے استقامت تھے اور بنی فراس کس قدر شجاع اور استقامت والے تھے۔ ذاتی طور پر شجاع ہونے کے علاوہ وہ ایمان کے سائے میں رہ کر اسلام کی خاطر شجاعت دکھانے میں پیش پیش تھے۔ اس لیے قرآن فرماتا ہے:

"كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللهِ" [3]

"خدا کے حکم سے بہت تھوڑے سے گروہ کثرت رکھنے والے گروہوں پر غالب آ گئے۔"

---

[1] شرح نہج البلاغہ، ابن ابی الحدید ج ۱ ص ۳۴

[2] بلوغ الادب ج ۲ ص ۱۲۵

[3] سورۃ بقرہ، آیت ۲۴۹

www.shiabookspdf.com

چھبیسواں خطبہ

ومن خطبة له علیه السلام

وَفِیهَا یَصِفُ الْعَرَبَ قَبْلَ الْبَعْثَةِ ثُمَّ یَصِفُ حَالَهُ قَبْلَ الْبَیْعَةِ لَهُ

بعثت سے پہلے عرب کی حالت اور بیعت سے پہلے کی حالت، امام عالی مقامؑ نے بعثتِ پیغمبرؐ سے پہلے عرب کی معاشی زندگی کی حالت اور مسلمانوں کی بیعت سے پہلے اپنے حال کی تشریح فرمائی۔

خطبہ، ایک نظر میں

امامؑ کا اس خطبے کو ارشاد فرمانے کی وجہ کیا تھی، دوسری تعبیر کے مطابق اس خطبے کو لکھنے کا کیا مقصد تھا، بعض محققین نے یہ بتایا کہ امیر شام کے کارندوں کے مصر پر قبضے اور محمدؒ ابن ابی بکر کی شہادت کے بعد کچھ لوگوں نے آپؑ سے درخواست کی کہ خلفائے گزشتہ کے متعلق اظہارِ خیال کریں۔ حضرتؑ نے جواب دیا، کیا اس وقت اس سوال کا موقع ہے؟ تمہیں خبر ہی نہیں کہ مصر پر قبضہ ہو چکا ہے اور میرے شیعوں کا قتل عام ہو رہا ہے، کیوں واجب اور موجودہ کو چھوڑ کر دوسرے مسائل میں جن کے لیے کافی وقت ہے، خود کو مصروف رکھتے ہو؟ پھر فرمایا، میں ایسا خط تمہیں دوں گا کہ جس میں تمہارے سوالوں کا جواب موجود ہے مگر میں تم سے چاہتا ہوں کہ میرے حقوق کو ہاتھ سے نہ جانے دو۔ [1]

کبھی یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس خطبے کے ذیل میں جہاد کی دعوت ہے۔ یہ خیال اس گفتگو کے ساتھ تناقض پیدا کرتا ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کلام آپؑ نے جنگِ صفین سے پہلے صادر فرمایا ہے۔ ہوسکتا ہے یہ گفتگو اس جنگ کی طرف

---

[1] مصادر نہج البلاغہ، جلد ۱، ص ۳۹۰

www.shiabookspdf.com

اشارہ ہو جو آپؑ نے اپنی شہادت سے پہلے لوگوں کو آمادہ رکھنے کے لیے کی ہو۔ جو بھی ہے آپؑ کی دردناک شہادت جنگ کی تیاری میں رکاوٹ بنی۔

بہر حال یہ خطبہ تین حصّوں پر مشتمل ہے۔ سب سے پہلے یہ کہ زمانۂ جاہلیت میں عرب کی حالت اور بعثت پیغمبر اکرمؐ کے متعلق اشارہ فرمایا اور بتادیا کہ وہ لوگ کن مشکلات و تکالیف میں گرفتار تھے کہ ظہورِ پیغمبر اسلامؐ کی برکتوں سے انہیں ان بدبختیوں سے چھٹکارا ملا، اس خطبے کے دوسرے حصے میں رحلتِ پیغمبرؐ کے بعد کے واقعات کی طرف اشارہ فرمایا کہ کس طرح آپؑ کے تسلیم شدہ حق کو چھین لیا اور تنہا کر دیا اور امام عالی مقامؑ نے اسلام و قرآن کی حفاظت کے لیے) خاموشی اختیار کی، حالانکہ سخت ناراض تھے۔ تیسرے حصے میں امیر شام و عمرو عاص کی بیعت کی داستان سے مشروط کر دیا ہے جن کی وجہ سے مسلمان صدماتِ جانی و مالی اور اخلاقی سے دوچار ہوئے۔ اس خطبے کے آخر میں حکم دیتے ہیں کہ اس ظالم و ستم گروہ کے ہاتھوں کو روکنے کے لیے جنگ کی تیاری کریں۔

پہلا حصہ

اِنَّ اللّٰهَ بَعَثَ مُحَمَّدًا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نَذِيْرًا لِّلْعَالَمِيْنَ وَ اَمِيْنًا عَلَى التَّنْزِيْلِ وَ اَنْتُمْ مَعْشَرَ الْعَرَبِ عَلٰى شَرِّ دِيْنٍ وَ فِيْ شَرِّ دَارٍ مُنِيْخُوْنَ بَيْنَ حِجَارَةٍ خُشْنٍ وَ حَيَّاتٍ صُمٍّ تَشْرَبُوْنَ الْكَدِرَ وَ تَأْكُلُوْنَ الْجَشِبَ وَ تَسْفِكُوْنَ دِمَاءَكُمْ وَ تَقْطَعُوْنَ اَرْحَامَكُمْ اَلْاَصْنَامُ فِيْكُمْ مَنْصُوْبَةٌ وَ الْاٰثَامُ بِكُمْ مَعْصُوْبَةٌ.

"اللہ تبارک و تعالیٰ نے آنحضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تمام جہانوں کو ان کی بداعمالیوں سے متنبہ کرنے والا اور اپنی وحی کا امین بنا کر بھیجا۔ اے گروہِ عرب، اس وقت تم بدترین دین پر اور بدترین گھروں میں تھے۔ دروں، پتھروں اور زہریلے سانپوں میں تم بود و باش رکھتے تھے۔ بت تمہارے درمیان گڑے ہوئے تھے اور گناہ تم سے چمٹے ہوئے تھے۔"

شرح و تفسیر

زمانۂ جاہلیت میں عرب کی حالت

خطبے کے اس حصے میں امام عالی مقامؑ نے عرب کی جاہلیت کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ ان کی زندگی کے چاروں پہلوؤں (فکری، عاطفی، اقتصادی اور اجتماعی) کی ایسی تصویر کشی کی ہے کہ اگر عرب کی جاہلیت کے بارے میں جو ساری

www.shiabookspdf.com

کتابیں لکھی گئی ہیں، ان کی چھان بین کریں، تب بھی اس خلاصے سے زیادہ نہ پائیں گے۔ اس بحث کو آغاز خطبہ میں انتخاب کرنے کی ظاہری دلیل یہ ہے کہ حضرت امام علی علیہ السلام قبل از اسلام کے لوگوں کا اس طرح تعارف کرانا چاہتے ہیں تا کہ ان کا بعثت پیغمبرؐ کے بعد کے لوگوں کی حالت کے ساتھ موازنہ کریں کہ وہ ان کی اہمیت کو سمجھ سکیں۔ اور اس بیش قدر سرمائے کو اپنے انتشار و اختلافات کی نذر نہ کریں، چونکہ نعمتوں کی اہمیت کا اندازہ اُس وقت ہوتا ہے جب ان کی کمی محسوس کی جائے، امیر المومنینؑ خطبے کی ابتدا میں فرماتے ہیں:

"إِنَّ اللهَ بَعَثَ مُحَمَّداً صلى الله عليه وآله نَذِيراً لِلْعَالَمِينَ وَأَمِيناً عَلَى التَّنْزِيلِ"

"اللہ نے آنحضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو رسالت کے ساتھ مبعوث فرمایا تا کہ دنیا والوں کو ڈرائیں (راہِ حق وعدالت کے سرکش اور منحرف لوگوں کو اللہ کے عذاب سے ڈرائیں) اور انہیں اپنی آیات کا امین قرار دیا"۔

توجہ رہے کہ حضرت امام علی علیہ السلام نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو صرف نذیر (ڈرانے والے) کہنے پر اکتفا کیا ہے، جب کہ ہم جانتے ہیں آنحضرتؐ بشیر بھی ہیں اور نذیر بھی۔ جس طرح قرآن مجید میں متعدد جگہوں میں یہ دو صفتیں پہلو بہ پہلو ذکر ہوئی ہیں:

"يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِداً وَمُبَشِّراً وَنَذِيراً" [1]

"اے پیغمبرؐ! ہم نے تمہیں گواہ، بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے"۔

اور دوسری آیات میں بھی اس طرح ذکر ہوا ہے۔ [2] لیکن ذمے داریوں کی ادائیگی کی جانب توجہ اور خلاف ورزیوں سے دوری شاید وہی مجازات وتنبیہہ ہیں، جو نذیر کے لقب اور موضوع سے وابستہ ہیں۔ اسی دلیل کی بنا پر بہت سی آیات پیغمبر اکرمؐ اور تمام انبیاءؑ کے بارے میں ان کے نذیر ہونے کی طرف رہنمائی کرتی ہیں۔ اور کسی مقام پر بھی صرف بشیر کے عنوان پر تکیہ کیا ہوا نظر نہیں آتا۔

آج کل کے دنیاوی قوانین میں ہمیشہ یہی جزا وسزا رائج العمل ہیں اور تشویقی مسائل میں بہت کم ضامن کے عنوان سے استفادہ کیا جاتا ہے۔ بہر حال اِنذار (ڈرانے) کا آخری ہدف یہی ہے کہ انسان اپنی ذمے داریوں کا احساس کرے اور ان سے عہدہ برآ ہونے کی سعی کرے۔ اس نکتے کو فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ پیغمبر اکرمؐ تمام جہانوں کے انسانوں کے لیے نذیر ہیں۔ اور یہ بات بخوبی واضح ہے کہ دین اسلام، دین جاودانی ہے، کیونکہ "عالمین" ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے کہ جس میں زمان ومکان کی قید نہیں ہے۔

---

[1] سورۂ احزاب، آیت ۴۵

[2] سورۂ سبا، آیت ۲۸، فاطر، آیت ۲۴، فتح، آیت ۸، سورۂ بقرہ، آیت ۱۱۹

www.shiabookspdf.com

"اَمِیْناً عَلَی التَّنْزِیْلِ" کی تعبیر سے ضمناً مقام عصمت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف اشارہ ہوتا ہے، وہ کتاب الٰہی کی امانت کی اچھی طرح حفاظت کرتے ہیں۔ بغیر کسی تبدیلی کے تمام عالم انسانیت کو خدا کا پیغام پہنچاتے ہیں۔

امام عالی مقامؑ نے دس مختصر اور جامع جملوں میں دورِ جاہلیت میں عرب کی جاہلیت، جو چار چیزوں کے گرد گردش کرتی ہے، کی وضاحت فرمائی، آپؑ نے فرمایا:

"وَاَنْتُمْ مَعْشَرَ الْعَرَبِ عَلٰی شَرِّ دِیْنٍ"

"یہ ایسی حالت تھی کہ تم عرب لوگ بدترین دین اور بدترین گھر رکھتے تھے۔"

بت پرستی سے بڑھ کر کون سا برا دین ہے؟ ایک عاقل اور ہوشیار انسان ایک پتھر یا لکڑی کو خود تراشے اور اس کے سامنے سجدہ ریز ہو، اپنی تقدیر کو اس کے حوالے کرے اور اپنی مشکلات میں اس سے پناہ مانگے؟ یا وہ بُت جو خرما (کھجور) سے بنائے اور اس کے سامنے سجدہ کرے اور قحط سالی میں کھا لے؟ ان کا سب سے بڑا انحراف عرب جہالت ہے کہ اپنے دین کو احمقانہ عقائد اور عقل و منطق سے دور خرافات سے پُر کرلیا، جو تاریخ کی کتابوں میں تفصیل سے مذکور ہیں۔ ان کے عقائد و افکار کی بحث کے ذیل میں اشارہ کیا جائے گا۔

اس کے بعد حضرت امام علی علیہ السلام نے ان کی اقتصادی زندگی کے رقت بار حالات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

"وَفِیْ شَرِّ دَارٍ مُنِیْخُوْنَ [1] بَیْنَ حِجَارَةٍ خُشْنٍ وَحَیَّاتٍ صُمٍّ تَشْرَبُوْنَ الْکَدِرَ وَتَاْکُلُوْنَ الْجَشِبَ" [2]

"تم عرب کے لوگ بدترین گھر اور بدترین جگہ میں زندگی بسر کرتے تھے، جہاں زہریلے سانپوں (جو کسی سے ڈرتے نہیں اور زیادہ خطرناک ہیں) کے درمیان گندا پانی پیتے اور حرام غذا کھاتے تھے۔"

شرِ دار (بدترین گھر) سے عرب جُہلا کی سکونت کی جگہ مراد ہے۔ چونکہ اس خطبے میں ان میں سے بہت سارے (بالخصوص مولا علی علیہ السلام کے مخاطبین) مکے یا مدینے میں رہنے والے تھے، ممکن ہے یہی وجہ ہو کہ ان دو شہروں نے اپنا معنوی چہرہ مکمل طور پر ختم کیا تھا اور بت پرستی، شرارت اور فساد کی بھینٹ چڑھ گئے تھے۔

ناہموار فضا، خشک بیابان اور بے آب و گیاہ کی حالت نے ان دو شہروں کو گھیر لیا تھا۔ اگر تھوڑا سا بارش کا پانی کنویں کی تہہ میں یا تالابوں میں باقی ہوتا تو وہ بھی تیز ہوا یا لوگوں کی دخالت کی وجہ سے گدلا ہو جاتا تھا اور وہ پانی پینے سے لوگ نفرت کرتے تھے مگر مجبوری میں پیتے تھے۔ ان کی غذا و خوراک اس سے بہتر نہیں تھی۔

---

[1] منیخون، نوخ کے مادّے سے ہے جو اونٹ کی نیند کی حالت کو کہتے ہیں، چونکہ اونٹ کھردرے پتھر کے درمیان استراحت کرتا ہے۔

[2] جشب ناانصافی و ناہمواری کے معنی میں آیا ہے۔

www.shiabookspdf.com

نہج البلاغہ کے شارحین میں سے کسی ایک نے نقل کیا ہے کہ کسی عرب سے پوچھا گیا:

"أَيَّ الْحَيَوَانَاتِ تَأْكُلُونَ فِي الْبَادِيَةِ؟"

"تم بیابان میں کس جانور کا گوشت کھاتے ہو؟"

اس نے جواب دیا:

"نَأْكُلُ كُلَّ مَادَبَّ وَدَرَجَ إِلَّا أُمَّ حُبَيْنٍ." [1]

"ہم ہر موجود کو کھاتے ہیں جو حرکت کرے مگر گرگٹ کو نہیں کھاتے۔"

حیاتِ صُمٍّ سے (بہرے سانپ) مراد ہیں چونکہ نہ سننے کی وجہ سے زیادہ خطرناک اور زہریلے ہوتے ہیں۔

خطبے کے تیسرے حصے میں عرب کے اجتماعی حالات اور بدامنی پر روشنی ڈالتے ہوئے امام عالی مقام فرماتے ہیں:

"تَسْفِكُونَ دِمَاءَكُمْ"

"تم مسلسل خون بہاتے رہتے تھے۔" (نہ صرف دشمن پر بلکہ اپنے اوپر بھی رحم نہیں کھاتے تھے)

"تَسْفِكُونَ دِمَاءَكُمْ" کے جملے میں فعل مضارع کا استعمال اور اسی طرح کے دوسرے جملوں کا استعمال ان کے آپس کے ناخوشگوار حالات کے تسلسل کی طرف اشارہ ہے کہ ان کے درمیان درحقیقت ان کی خونریزی کے لیے کوئی روشن دلیل تو تھی نہیں، معمولی سے بہانے بنا کر تلوار کھینچ لیتے تھے اور اپنی جانوں کو بھی ہلاکت میں ڈال دیتے تھے۔ ایک معمولی بہانے سے، کئی دن کئی مہینے بلکہ برسوں تک اس جنگ کو طول دیتے تھے۔ معروف جنگوں، جن کی طرف بعد میں اشارہ کیا جائے گا، کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ یہ لوگ کتنے جاہل اور بے خبر تھے جو معمولی چیزوں پر جان سے مارتے اور خون بہاتے تھے۔

چوتھے حصے میں آپؑ نے عرب کے خاندانی حالات کی طرف اشارہ فرمایا۔ آپؑ نے فرمایا:

"وَتَقْطَعُونَ أَرْحَامَكُمْ"

"تم اپنے عزیزوں سے قطع رحمی کرتے تھے"

یہ جملہ حقیقت میں مسئلہ وئید یعنی اپنی بیٹیوں کو زندہ درگور کرنے اور انہیں قتل کرنے کی طرف اشارہ کرتا ہے، چونکہ وہ لوگ اپنی بیٹیوں کو ننگ و عار اور بدبختی سمجھتے تھے۔ جس شخص کی کوئی بیٹی ہوتی، اسے اپنے قوم قبیلے سے ایک مدت تک شرمندگی کا سامنا کرنا پڑتا۔

"وَإِذَا بُشِّرَ أَحَدُهُم بِالْأُنثَىٰ ظَلَّ وَجْهُهُ مُسْوَدًّا وَهُوَ كَظِيمٌ ﴿۵۸﴾ يَتَوَارَىٰ مِنَ الْقَوْمِ مِن سُوءِ مَا

[1] شرح نہج البلاغہ ابن میثم، جلد ۲، ص ۲۴

www.shiabookspdf.com

يُبَشَّرَ بِهٖ ۭ اَيُمْسِكُهٗ عَلٰي هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ فِي التُّرَابِ ۭ اَلَا سَاۗءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ؀[1]

"اور جب ان میں سے کسی ایک کولڑکی کے پیدا ہونے کی خوشخبری دی جائے تو رنج کے مارے اس کا منہ کالا ہو جاتا ہے۔اور وہ زہر کا سا گھونٹ کر رہ جاتا ہے۔(بیٹی کی) عار سے جس کی اس کو خوشخبری دی گئی ہے، اپنی قوم کے لوگوں سے چھپا پھرتا ہے(اور سوچتا رہتا ہے) کہ آیا اس کو ذلت اٹھا کے زندہ رہنے دے یا (زندہ ہی) اس کو زمین میں گاڑ دے دیکھو تو یہ لوگ کس قدر برا حکم لگاتے ہیں۔"

اپنے فرزندوں کے قتل کے سلسلے میں صرف بیٹیوں پر اکتفا نہ کیا بلکہ بیٹوں کو بھی غربت کے خوف سے قتل کر دیتے تھے جو کہ سرمایۂ زندگی شمار ہوتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے ان کاموں سے روکا ہے:

"وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ ۭ"[2]

"اپنی اولادوں کو غربت کے خوف سے قتل نہ کرو ہم آپ کو اور ان کو بھی رزق دیتے ہیں۔"

کبھی یہ ہوتا تھا کہ باپ بیٹے کو ایک چھوٹے سے بہانے سے قتل کر دیتا، بیٹا باپ کو اور بھائی بھائی کو قتل کر دیتا تھا۔ ان کے درمیان قطع رحم بہت خطرناک طریقے سے سرایت کر چکا تھا۔

اس گفتگو کے اختتام پر امام عالی مقام نے ان کے معنوی و مادّی مفاسد کو دو جملوں میں خلاصہ کیا ہے۔فرماتے ہیں:

"اَلْاَصْنَامُ فِيْكُمْ مَنْصُوْبَةٌ وَّالْاٰثَامُ بِكُمْ مَعْصُوْبَةٌ"

"تمہارے درمیان بت پھیلے ہوئے تھے اور گناہوں نے تمہیں مکمل طور پر گھیرا ہوا تھا۔"

"منصوبہ" سے اس نکتے کی طرف اشارہ ہے کہ وہ نہ صرف یہ کہ بت پرستی سے شرمندہ نہیں تھے بلکہ اس پر فخر کرتے تھے اور اپنے معاشرے کے ہر گوشہ و کنار میں بت نصب کیے ہوئے تھے۔

"معصوبة"۔ "عصب" کے مادّے سے ہے (ایسا رشتہ جس سے گوشت پوست ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہوں) یہاں پر ان گناہوں کی طرف اشارہ ہے، جیسے خونریزی، قطع رحم کرنا، ناموس پر تجاوز کرنا، مال و اسباب کو لوٹنا، جوا اور شراب اور فحش کاموں کی آلودگی وغیرہ نے تمام وجود عرب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔

اس ترتیب سے امامؑ نے اس مختصر جملے سے عقیدتی و اخلاقی مشکلات اقتصادی اور خاندانی انحرافات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ان کی معاشرتی پستی کو چار نکات میں بیان فرمایا ہے کہ ان میں سے ہر ایک، ایک تفصیلی بحث کا متقاضی ہے۔

---

[1] سورہ نحل، آیات ۵۸، ۵۹

[2] سورہ اسرا، آیت ۳۱

www.shiabookspdf.com

نکات

زمانۂ جاہلیت پر ایک طائرانہ نظر

زمانۂ جاہلیت سے مربوط مسائل پر بحث کرنا، وہ مباحث ہیں کہ جو اسلام اور عظمت پیغمبرؐ کی معرفت کے لیے ضروری ہیں۔ دانش مندوں اور مؤرخین اسلام نے ان تمام مسائل کو جمع کرنے کی کوشش کی ہے۔

ہم نے خطبہ دوم کی تشریح میں ان مسائل کی طرف اشارہ کیا ہے، لیکن چوں کہ امامؑ نے خطبے کے پہلے حصے میں اس موضوع کی طرف پُرمعنا اشارے کیے ہیں، اس لیے ضروری ہے کہ جاہلیت کے عربوں کی زندگی کے اُن چاروں محوروں پر روشنی ڈالی جائے جو کہ خطبے کے اس حصے میں مولاؑ کی مورِدِ نظر ہیں:

الف: عرب کے عقیدتی انحرافات پر بہت کچھ کہنے کو ہے۔ بت پرستی نے پورے عرب معاشرے کو گھیر رکھا تھا، وہ بت جن کا عمومی طور پر تمام عرب کے قبائل احترام کرتے تھے اور وہ خانۂ کعبہ میں نصب تھے۔ قبیلے کے بت، خاندان کے بت، وہ بت جو مختلف شکلوں میں بنائے گئے تھے، اور وہ بت جو بغیر شکل کے تھے۔ پتھر کے ٹکڑوں سے بنائے گئے تھے۔

فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں تصور کرتے تھے۔ حالانکہ وہ خود بیٹیوں سے نفرت کرتے تھے۔ قیامت کا انکار کرتے تھے۔ ان میں سے اکثر اپنے اہم کاموں میں بتوں سے مشورہ کرتے تھے۔ مشورے کا طریقہ یہ تھا کہ تیر کی لکڑی پر "اِفْعَلْ" اور "لاتفعل" لکھ دیتے تھے۔ بت کی زبان خیال کرتے اور اُسے تھیلے میں ڈالتے اور ہلاتے تھے ان میں سے ایک کو باہر لے آتے اور اُسے بت کا حکم مان کر واجب العمل قرار دیتے تھے۔ ان کے خرافاتی عقیدے مثلاً چڑیل، اچھے و بُرے پرندے اور اس قسم کے معاملات کو اپنے فکر و خیال میں فال بد و نیک سے تعبیر کرتے تھے۔

ب: یعنی ان کی اقتصادی بدحالی کا حال یہ تھا کہ نہ صرف بیٹیوں بلکہ بیٹوں کو بھی، جو سرمایۂ زندگی شمار ہوتے ہیں، فقر و غربت کے خوف سے قتل کر دیتے تھے۔ قتل و غارتگری، دوسروں سے مال کی لوٹ مار اور دھوکے سے حاصل کیا ہوا مال ان کی آمدنی کا بڑا ذریعہ تھا۔ کھلے پاؤں نیم عریاں جسم، ان کی اقتصادی کمزوری کی عکاسی کرتے ہیں۔ اگر کسی کے پاس سادہ لباس بھی ہوتا تو دوسروں پر فخر کرتا کہ میرے پاس وہ لباس ہے جو سردیوں، بہار اور گرمیوں میں بھی کام آتا ہے:

مَنْ يَكُ ذَابَتٍّ فَهٰذَا بَتِّيْ مُقَيِّظٌ، مَصَيِّفٌ، مُشَتِّيْ

ج: عرب میں آپس کا حال یہ تھا کہ وہ کسی شخص اور کسی چیز پر رحم نہیں کرتے تھے۔

www.shiabookspdf.com

ابنِ خلدون کے مطابق کہ اُن کی ایسی وحشیانہ طبیعت تھی کہ ہر وقت فساد و غارت گری کی طرف مائل تھے۔ جو چیز ہاتھ میں آئے لوٹ لیتے تھے۔ ان کاموں سے وہ لطف اٹھاتے۔ وہ اپنے رزق کو تلواروں کے سائے میں دیکھتے۔ قتل و غارت گری کے لیے کسی ممانعت کو قبول نہیں کرتے تھے۔

منقول ہے کہ جب پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بہشت اور وہاں کی نعمتوں کی تعریف سنتے تو پوچھتے تھے کہ کیا وہاں جنگ وجدال کا وجود ہوگا؟ جب جواب نفی میں ملتا تو کہتے "اِذَنْ لَا خَیْرَ فِیْهَا"۔ "پھر تو کوئی فائدہ نہیں۔"

بعض تاریخوں میں آیا ہے کہ عرب کے جاہلوں کے درمیان ایک ہزار سات سو جنگیں ہوئیں۔ اِن میں سے بعض کا دورانیہ سو سال تک تھا۔ نسلیں آگئیں اور چلی گئیں، جنگ کی آگ اس طرح پھیلی کہ بعض اوقات فضول و بے مقصد بہانوں سے طول پکڑتی تھی۔ عرب کے جاہل یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ خون کو خون ہی سے دھویا جاسکتا ہے بلکہ بعض اوقات چھوٹی سی بات پر کئی لوگ قتل ہوجاتے۔

بعض تاریخوں میں ذکر ہے کہ "سلامان" نامی قبیلے سے اپنی اہانت کا بدلہ لینے کی غرض سے ایک شخص بنام "شنفری" آیا، اُس عہد کیا کہ وہ ایک سو آدمیوں کو قتل کرے گا۔ ننانوے افراد کو قتل کرکے بھاگ گیا۔ سو نفر کے خیال میں ہی تھا کہ ایک حادثے میں دنیا سے چلا گیا، اس کے قبیلے کے کسی فرد نے اس کی کھوپڑی کو اُٹھایا۔ اس کے قبیلے والوں نے کہا "اس نے اپنا وعدہ پورا کردیا اور اپنا انتقام لیا"۔ [1] ممکن ہے ان میں سے بعض داستانوں میں مبالغہ ہو۔ بہر حال معلوم ہوتا ہے کہ جن حالات میں وہ زندگی بسر کرتے تھے اِن کے مطابق داستان مناسب ہے۔

د: اِجتماعی خرابیوں کے معاملے میں بھی افسوناک حالت ہے۔ ان کی زندگی شراب کے ساتھ وابستہ تھی۔ یہاں تک کہ تجارت کے لفظ سے شراب فروشی مراد لیتے تھے۔ شجاعت و بہادری کے نام پر آدم کُشی کیا کرتے تھے اور غیرت وعفت کے نام پر نوزائدہ لڑکیوں کو زندہ درگور کرتے تھے۔ وہ تین چیزوں سے عشق رکھتے تھے، عورت، شراب اور جنگ۔ ان کا ایک شاعر یہ کہتا ہے:

اِذا متُّ فادفِنِّی اِلیٰ جَنْبِ کَرْمَةٍ تُرَوِّیْ عِظَامِیْ بَعْدَ مَوْتِیْ عُرُوْقُهَا
وَلَا تَدْفِنَنِّیْ فِی الْفَلَاتِ فَاِنَّنِیْ اَخَافُ اِذَا مَامِتُّ اَلَّا اَذُوْقَهَا

"جب میں مرجاؤں مجھے انگور کے درخت کے کنارے دفن کردو تا کہ اس کی جڑیں میری ہڈیوں کو سیراب کریں۔

[1] آلوسی نے بلوغ الادب، ج ۲، ص ۳۵۰ پر شنفری کا تعارف اس طرح کرایا ہے کہ وہ عرب کا جاہل شاعر تھا۔

www.shiabookspdf.com

مجھے ہرگز بیابان میں دفن نہ کریں کیونکہ ڈرتا ہوں کہ میرے مرنے کے بعد وہ میری ہڈیوں سے شراب چوس لے گا۔"

وہ یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ دوستوں اور ہم عمروں کی مدد کریں چاہے وہ حق پر ہوں یا باطل پر۔ جوا کھیلنے میں اتنے عادی ہو چکے تھے کہ کبھی کبھی وہ اپنی خواتین کو شریک بناتے۔ بدکار عورتیں ان کے درمیان اس قدر تھیں کہ لوگوں کو کھلم کھلا دعوت دیتیں۔ اُن میں سے کچھ نے اپنے گھروں پر جھنڈے نصب کر دیے تھے تا کہ اوباش لوگ وہاں کھچے چلے آئیں، انہیں ذوات الاعلام، (پرچم والیاں) کہا جاتا تھا۔ اس قسم کی خرابیاں ان کے درمیان اس قدر تھیں کہ سب کا ذکر کرنا طوالت کا باعث ہے۔[1]

ہاں! عرب کے جاہل اس قسم کے تھے۔ خداوند عالم نے اسلام کی برکت سے انہیں نجات دی، نہ صرف خرافات، بت پرستی اور پست عقائد سے آزاد کیا بلکہ ان کی بگڑی ہوئی اجتماعی، اقتصادی اور عائلی حالت کو بھی درست کیا، اور یوں مقدادؓ، ابوذرؓ، عمارؓ اور بلال جیسے افرادؓ افراد کی تربیت کی جو مکمل انسانیت کا نمونہ تھے۔ زمانہ جاہلیت کا بعد والے زمانے سے موازنہ کیا جائے تو رسالت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عظمت عیاں ہو جاتی ہے۔ ہمارے زمانے میں وسیع تر اور خطرناک شکلوں میں آثار جہالت کا ظہور ہونا تعلیماتِ انبیاءؑ بالخصوص تعلیماتِ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جدا ہونے کی وجہ سے ہے۔ یہ رسالت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عظمت کے لیے ایک دوسرا گواہ ہے۔

بدترین اور بہترین گھر

قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ عرب جاہلوں کی قیام گاہوں کی بحث میں حضرت امامؑ نے خطبے میں بدترین جگہ اور بدترین گھر سے توصیف کی، حالانکہ خطبہ دوّم میں اُسی زمانے کی توصیف - خَيْرُ دَارٍ وَشَرُّ جِيْرَانٍ - بدترین گھر اور بدترین ہمسائیگان سے تعبیر کیا۔ توجہ دینے سے معلوم ہوتا ہے کہ سرزمین مکہ کو دونوں عبارتوں سے پہچانا جاتا ہے تضاد نظر آتا ہے۔ لیکن تھوڑی دقت سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ سرزمین مکہ بہترین گھر، یعنی خانہ کعبہ کی جگہ ہے۔ لیکن عرض میں تمام سرزمین مکہ مقدس ہے۔

دوسرا حصہ

فَنَظَرْتُ فَإِذَا لَيْسَ لِي مُعِيْنٌ إِلَّا أَهْلُ بَيْتِي فَضَنِنْتُ بِهِمْ عَنِ الْمَوْتِ وَأَغْضَيْتُ عَلَى الْقَذٰى

[1] مزید آگاہی کے لیے کتاب بلوغ الارب۔ اسلام و جاہلیت و تاریخ الکامل ج، اوسید المرسلین، علامہ خوئی کی شرح نہج البلاغہ کی طرف رجوع کریں۔

www.shiabookspdf.com

وَشَرِبْتُ عَلَى الشَّجَا وَصَبَرْتُ عَلَى اَخْذِ الْكَظَمِ وَعَلَى اَمَرَّ مِنْ طَعْمِ الْعَلْقَمِ.

"میں نے نگاہ اٹھا کر دیکھا تو مجھے اپنے اہل بیتؑ کے علاوہ کوئی معین و مددگار نظر نہیں آیا، میں نے انہیں موت کے منہ میں دینے سے بخل کیا۔ آنکھوں میں خس وخاشاک تھا مگر میں نے چشم پوشی کی۔ حلق میں پھندے تھے، مگر میں نے غم وغصہ کے گھونٹ پی لیے اور گلوگرفتگی کے باوجود حنظل سے زیادہ تلخ حالات پر صبر کیا۔"

شرح وتفسیر

دردناک صبر

اس خطبے میں امیر المومنین علیہ السلام نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد کے حوادث، بالخصوص خلافت کی داستان کی طرف ایک جامع اشارہ فرمایا۔ اور اپنے مسلّم حق (حقِ خلافتِ رسولؐ) جو حقیقت میں مسلمانوں کا حق تھا، کے بارے میں فرماتے ہیں:

"فَنَظَرْتُ فَاِذَا لَيْسَ لِي مُعِينٌ اِلَّا اَهْلُ بَيْتِي"

"میں نے نگاہ اٹھا کر دیکھا تو اپنے اور مسلمانوں کے حق کی خاطر سوائے اپنے اہل بیتؑ کے کسی کو نہ دیکھا۔"

ظاہر ہے کہ اس گروہ کے مدمقابل جنہوں نے رحلتِ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد خلافت کے حصول کے لیے پروگرام بنایا، تھوڑے سے مددگاروں کے ساتھ قیام کرنا اور کسی نتیجے تک پہنچنا ممکن نہیں تھا۔ کیونکہ اس قیام سے نہ صرف نتیجے تک نہیں پہنچ سکتے تھے بلکہ خاندان پیغمبرؐ کے بہترین افراد قتل ہو جاتے۔ یہی نہیں بلکہ ممکن تھا کہ مسلمانوں میں ایسا رخنہ پڑ جاتا جو رحلت پیغمبرؐ کے بعد منافقین چاہتے تھے۔ وہ اس موقع سے فائدہ اُٹھاتے اور وجودِ اسلام کو خطرہ میں ڈالتے۔ اس لیے امامؑ نے دردناک سکوت کو قیام پر ترجیح دی۔

اس بنا پر امام عالی مقامؑ نے اپنی گفتگو کو تسلسل دیتے ہوئے فرمایا:

"وَاَغْضَيْتُ[1] عَلَى الْقَذَى[2] وَشَرِبْتُ عَلَى الشَّجَا[3] وَصَبَرْتُ عَلَى اَخْذِ الْكَظَمِ[4] وَعَلَى

---

[1] اَغْضَيْتُ، مادّہ غضی سے ہے جس کے معنی آنکھوں کی پلکیں ہیں۔

[2] قذی، بروزن قضا سے مراد وہ چیزیں جو آنکھوں میں چبھ جائیں اور آنکھوں میں تکلیف ہو۔

[3] شجا، شجو کے مادّے سے ہے جس کے معنی شدت غم کے ہیں۔

[4] کظم: غضب کا ہم وزن ہے۔ راغب نے اپنی مفردات میں سانس نکلنے کی جگہ کو کہا ہے۔

www.shiabookspdf.com

أَمَرَّ مِنْ طَعْمِ الْعَلْقَمِ.[1]

"میں نے قیام نہ کیا کیونکہ میں اپنے اہل بیتؑ کی موت پر راضی نہ تھا حالانکہ آنکھوں میں خس وخاشاک اور حلق میں پھندے تھے۔گلوگیری کے باوجود حنظل سے زیادہ تلخ حالات پر صبر کیا۔"

نکات

۱۔ رحلت پیغمبرؐ کے بعد کے طوفانوں کا رُخ

یہ اُن تعبیرات کی طرح ہیں جو امیر المومنینؑ نے خطبہ شقشقیہ میں بیان کی ہیں، بلکہ ان سے بھی شدید ہیں۔ان سے معلوم ہوتا ہے کہ مولا علی علیہ السلام کا خلافتِ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محرومی کی پچیس سالہ زندگی میں ہر لحہ ہر دن انتہائی تلخ اور کٹھن گزرا۔اس لیے نہیں کہ وہ اقتدار پر نہیں تھے کیونکہ آپؑ نے کئی بار اپنے خطبوں میں تخت وتاج سے اپنی بے اعتنائی کو واشگاف انداز میں بیان فرمایا ہے۔ چونکہ یہ صرف ایک الٰہی ذمے داری ہے نہ کہ فخر ومباہات کا مقام ہے۔اس بات پر آپؑ شدید ناراضی کا اظہار فرماتے کہ لوگ آہستہ آہستہ روح اسلام سے دور ہوتے جا رہے ہیں اور بہت ساری دورِ جاہلیت کی رسومات زندہ ہو رہی ہیں۔تاریخ بتاتی ہے کہ بالآخر امیر شام حاکم بنا اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خلافت خودغرض اور موروثی سلطنت کی شکل میں تبدیل کر دی گئی۔اس کے بعد یزید اور اس کے ساتھی تخت نشین ہوئے۔وہ لوگ اس قدر بداعمال تھے کہ بدترین حکومتوں میں بھی اس قسم کے خودغرض افراد کی مثال بہت کم ملتی ہے۔امیر المومنین علیہ السلام کے ان جامع جملوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؑ کے خلاف کس قدر سختیاں کی گئیں۔ایک طرف تو حکومت پر غاصبانہ قبضہ کر لیا گیا اور لوگوں کو ڈرایا دھمکایا گیا، دوسری طرف امامؑ جو جانشینیِ رسولؐ کے سب سے زیادہ مستحق تھے اور خود پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے اس منصب پر فائز تھے، انہیں اس طرح گوشہ نشینی پر مجبور کر دیا کہ سوائے آپ کے اہل بیتؑ کے کوئی اور آپ کا یاور و ناصر نہیں رہا۔معروف حدیث میں ہم پڑھتے ہیں جسے مورخین نے نقل کیا ہے۔امام عالی مقامؑ فرماتے ہیں:

لَوْ وَجَدْتُ أَرْبَعِيْنَ ذَوِيْ عَزْمٍ لَقَاتَلْتُ۔

"اگر چالیس عزم مصمم کے لوگ مجھے مل جاتے تو میں ان سے برسرپیکار ہو جاتا۔" (پیغمبر اکرمؐ کی مقرر کردہ حکومت

[1] علقم، مجمع البحرین میں اس درخت کو کہا ہے جو زیادہ تلخ اور کڑوا ہوتا ہے۔

www.shiabookspdf.com

اسلامی کو راستے سے منحرف کرنے کی کسی کو اجازت نہیں دیتا)[1]

ان تعبیرات سے معلوم ہوتا ہے کہ خلافت کے حامی اہل بیتؑ کے قتل تک سے باز نہیں نہ آتے۔فرماتے ہیں:

"فَضَنِنْتُ بِهِمْ عَنِ الْمَوْتِ"

"میں نے انہیں موت کے منہ میں دینے سے بخل سے کام لیا۔"

یہ حقیقت کتنی خوفناک ہے؟ اگرچہ اس قسم کے اہم اخلاقی مسائل پوری دنیا کی حکومتوں کے لیے عجیب نہیں ہیں۔ یہ احتمال بھی موجود تھا کہ خلافت کے متعصب حامی اس بہانے کی تلاش میں تھے کہ فرزندان امام کو علی علیہ السلام کی جانشینی کے راستے سے ہٹائیں تا کہ اہل بیتؑ میں سے حصول خلافت کے لیے کوئی باقی نہ رہے۔

مگر اس دوران امام عالی مقامؑ کی زندگی اس قدر کٹھن اور ناخوشگوار تھی کہ درحقیقت یہ امام علی علیہ السلام کی پوری عمر کے سخت ترین دن تھے۔ آپؑ نے گوشہ نشینی کی زندگی بسر کی۔ حکومت اسلامی کے نام پر غیر اسلامی اور غیر شرعی کام ہوتے دیکھتے رہے اور خاموش رہنے پر مجبور تھے۔ حکمران عقائد میں تحریف، احکام اسلامی کو سمجھنے میں غلطی اور طبقاتی تقسیم و بے عدالتی کے مرتکب ہوتے تھے۔ آخر کار حکومت فرعون وقیصر وکسریٰ کی سلطنت کی طرح خودغرض اسلامی حکومت میں تبدیل ہوگئی۔

اس سوال کا جواب نہج البلاغہ کے خط ۶۲ میں ملے گا، جہاں امامؑ فرماتے ہیں:

"خدا کی قسم! مجھے یقین نہیں تھا اور مجھے گمان بھی نہیں ہوا تھا کہ عرب آنحضرتؐ کے بعد رہبری وخلافت کو ان کے اہل بیتؑ سے چھین لیں گے اور آپؐ کے بعد مجھ سے دور ہو جائیں گے جس چیز نے مجھے سب سے زیادہ تکلیف پہنچائی وہ لوگوں کا اس شخص کے گرد جمع ہونا تھا جس کی انہوں نے بیعت کر لی (ایک ایسا شخص جو مجھے اس اہم ترین عہدے کے لیے کسی طرح موزوں نظر نہیں آتا اور میں اس کے دور حکومت میں سنگین مشکلات اور مصیبتوں کی پیش گوئی کر رہا ہوں) میں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گیا اور اس کی بیعت نہیں کی (نہ میرے پاس اس کی مخالفت کی طاقت تھی اور نہ حمایت کر سکتا تھا) یہاں تک کہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ ایک گروہ اسلام سے پھر گیا اور چاہتا تھا کہ دین اسلام نیست ونابود ہو جائے (نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی) مجھے خوف ہوا کہ اگر اس وقت میں نے اسلام اور مسلمانوں کی مدد نہ کی تو اسلام کی بنیادوں میں شگاف پڑ جائے گا اور اسلام (معاذ اللہ) مٹ جائے گا۔ یہ میرے لیے اپنی خلافت وحکومت کے نکل جانے سے بڑا نقصان ہوتا، اس لیے میں نے ان حادثات کو روکنے کے لیے قدم روک لیے تا کہ باطل درمیان سے ہٹ جائے اور دین اسلام منافقوں کے خطرے سے رہا ہو جائے۔"

[1] شرح نہج البلاغہ، ابن میثم، جلد ۲، ص ۲۶، شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید، ج ۲، ص ۲۲

www.shiabookspdf.com

"فَنَهَضْتُ فِي تِلْكَ الْأَحْدَاثِ حَتَّىٰ زَاحَ الْبَاطِلُ وَزَهَقَ وَاطْمَأَنَّ الدِّينُ وَتَنَهْنَهَ"[1]

اِن تعبیروں سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت اِمام علی علیہ السلام دو مسئلوں سے دوچار تھے۔ ایک طرف اپنے مسلّم حق کا ضائع ہونا اور مسلمان مشاہدہ کررہے تھے کہ آپؑ کا حق ضائع ہونے سے ایک عجیب سا انحراف (بحران) پیدا ہوا۔ اور دوسری طرف آپؑ دیکھ رہے تھے کہ دشمنان اسلام اور منافقین اسلام کو جڑ سے ختم کرنے کے لیے خطرناک سازشوں میں مصروف ہیں۔ شرعی، منطقی اور عقلی بنیادوں پر اِمام علی علیہ السلام نے اِسلام کی نصرت کے لیے اہم و مہم کا خیال رکھا۔ اس پہلی مشکل کے مقابلے میں اِمامؑ کلیجہ تھام کر رہ گئے اور اپنی بے قراری کو برداشت کیا۔

۲: کیا اِمام علی علیہ السلام نے خلیفۂ اوّل کی بیعت کی؟

خلیفۂ اوّل اور سقیفہ بنی ساعدہ کے فیصلے کے مقابل اِمام علی علیہ السلام کا مقام کیا تھا؟ اس کے متعلق مورخین اور محدثین کی آپس میں بحث ہے۔ شیعہ و سنّی علماء و دانشمند اس مسئلے میں متفق نہیں ہیں۔ شارح بحرانی کہتے ہیں کہ اکثر علمائے شیعہ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ حضرت علی علیہ السلام نے خلیفۂ اوّل کی بیعت نہیں کی۔ بنی ہاشم کا ایک گروہ اس مسئلے میں آپؑ کے ساتھ تھا، لیکن بعد میں ایک گروہ آیا اور آپؑ کو بالجبر خلیفۂ اوّل کے پاس لے گیا اور امامؑ اور دیگر بنی ہاشم نے کراہت کے ساتھ بیعت کر لی۔

ایک دوسرے قول کے مطابق امیر المومنین علیہ السلام خانہ نشین ہو گئے اور باہر آنا جانا بند کر دیا، اہل حکومت نے بھی یہ سمجھ کر کہ آپ تنہا ہیں اور حکومت کے خلاف کوئی مخالفانہ اقدام نہیں کریں گے، آپؑ کو نظر انداز کر دیا۔ یہاں ایک اور نظریہ ہے اور محدثین اہل سنّت کی اکثریت کا یہی خیال ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اِمام عالی مقامؑ چھ مہینے تک بیعت سے کنارہ کش تھے۔ جب خاتون جنتؑ اس دنیا سے رحلت فرما گئیں، اس کے بعد آپؑ نے اپنے اختیار سے بیعت کی۔ مرحوم شرف الدّین نے کتاب المراجعات میں ایک خوبصورت تجزیہ کیا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ایک طرف اِمام عالی مقامؑ وصیّت پیغمبرؐ اور نص قرآنی کے ذریعے ملنے والی خلافت چاہتے تھے دوسری طرف منافقین اور دشمنانِ اسلام، اسلام کو ختم کرنے کے لیے کمر بستہ تھے۔ انصار و مہاجرین کے اختلافات ان کے لیے مزید راہ ہموار کرتے تھے ان کی درخواست پر توجہ نہیں دی گئی۔

اسی وجہ سے کچھ مدّت تک بیعت نہ کی تاکہ پہلے مسئلہ (خلافت و امامت) کو ثابت کریں اور اس کے بعد اسلام کی

[1] ۶۲واں مکتوب، جسے مولاؑ نے جناب مالک اشترؓ کے ہمراہ اہلِ مصر کے لیے بھیجا تھا۔

www.shiabookspdf.com

حفاظت اور منافقین کی شرارت کے دفاع کے لیے بیعت کی تا کہ دوسرا مسئلہ پروان نہ چڑھے۔[1]

نہج البلاغہ کے بعض خطبوں میں بھی اس معنی کی طرف اشارہ ہوا ہے۔[2] پھر بھی خطبوں اور خطوط کی بحث میں اس سلسلے میں مناسب گفتگو کی جائے گی انشاء اللہ تعالیٰ۔

تیسرا حصّہ

و منها وَ لَمْ يُبَايِعْ حَتَّى شَرَطَ اَنْ يُؤْتِيَهُ عَلَى الْبَيْعَةِ ثَمَناً فَلَا ظَفِرَتْ يَدُ الْبَائِعِ وَ خَزِيَتْ اَمَانَةُ الْمُبْتَاعِ فَخُذُوا لِلْحَرْبِ اُهْبَتَهَا وَ اَعِدُّوا لَهَا عُدَّتَهَا فَقَدْ شَبَّ لَظَاهَا وَ عَلَا سَنَاهَا وَ اسْتَشْعِرُوا الصَّبْرَ فَاِنَّهُ اَدْعَى اِلَى النَّصْرِ.

"اُس نے امیر شام کی بیعت نہ کی جب تک یہ شرط اس سے منوا نہ لی کہ وہ اس بیعت کی قیمت ادا کرے۔ اس بیعت کرنے والے کے ہاتھوں کو فتح وظفر مندی حاصل نہ ہو اور خریدنے والے کے معاہدے کو ذلّت و رسوائی حاصل ہو (لو اب وقت آ گیا ہے کہ) تم جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ اور اس کے لیے ساز و سامان تیار کرو۔ اس کے شعلے بھڑک اُٹھے ہیں اور لپٹیں تیز ہو رہی ہیں اور صبر و استقامت کو اپنا شعار بناؤ کہ اس سے نصرت و کامرانی حاصل ہونے کا زیادہ امکان ہے۔"

شرح وتفسیر

سیاسی رسوائی کا معاملہ

اس خطبے کے تیسرے حصے میں امامؑ، عمرو بن عاص کے امیر شام کے ساتھ بیعت کے مسئلے پر رسوا کن معاہدے اور اس کے نتیجے کے متعلق اشارے کے ضمن میں مسلمانوں کو وعدہ توڑنے والوں کے خلاف جنگ پر آمادہ رہنے کی دعوت دیتے ہوئے فرماتے ہیں:"

"وَلَمْ يُبَايِعْ حَتَّى شَرَطَ أَنْ يُؤْتِيَهُ عَلَى الْبَيْعَةِ ثَمَنًا"

"اُس نے امیر شام کی بیعت نہیں کی جب تک یہ شرط نہ منوالی کہ وہ اس کی قیمت ادا کرے۔"

---

[1] المراجعات، نامہ ۸۴

[2] نہج البلاغہ، نامہ ۶۲

www.shiabookspdf.com

مؤرخین نے لکھا ہے کہ امامؑ جنگ جمل کی کامیابی کے بعد کوفہ آئے۔ کوفے کو دارالحکومت بنایا اور جریر ابن عبداللہ بجلی کو امیر شام سے بیعت لینے کے لیے شام بھیجا۔ امیر شام امامؑ کی بیعت کے لیے آمادہ نہیں ہوا اور اس کے بارے میں کچھ لوگوں سے مشورے کیے، اُس کے بھائی عتبہ بن ابوسفیان نے کہا! اس معاملے میں عمرو ابن عاص سے مدد لو کیونکہ تمہیں معلوم ہے کہ وہ زیادہ ہوشیار اور صاحب نظر ہے۔ لیکن وہ ایسا شخص ہے جو خلیفہ ثالث کی زندگی میں اس کے قابو میں نہیں آیا۔ طبعی امر ہے کہ وہ تمہیں تسلیم نہیں کرے گا مگر یہ کہ تم اسے قابل قبول رقم دو تا کہ وہ اپنا دین بیچ کر یہ کام کر دے۔ کیونکہ وہ ایک دنیا پرست آدمی ہے۔

امیر شام نے عمرو عاص کو خط لکھا اور اس معاملے میں مدد مانگی اور اُسے شام بلایا۔ عمرو عاص نے اپنے بیٹوں سے مشورہ کیا۔ عبداللہ نامی بیٹے نے اس قسم کے کاموں اور امیر شام کی حاشیہ نشینی سے روکا مگر محمد نامی بیٹے نے اُسے تشویق دلائی کہ وہ امیر شام سے جا ملے۔ عمرو عاص کے شام آنے کے بعد کسی مجلس میں امیر شام نے اُسے کہا:

"يَا أَبَا عَبْدِ اللهِ! أَدْعُوكَ إِلَى الْجِهَادِ هٰذَا الرَّجُلِ الَّذِي عَصَى اللهَ وَ شَقَّ عَصَى الْمُسْلِمِيْنَ وَ قَتَلَ الْخَلِيْفَةَ وَ أَظْهَرَ الْفِتْنَةَ وَ فَرَّقَ الْجَمَاعَةَ وَ قَطَعَ الرَّحِمَ"

"اے اباعبداللہ (عمرو بن عاص کی کنیت) میں نے تجھے دعوت دی ہے کہ اس شخص سے، جس نے خدا کی نافرمانی کی ہے، مسلمانوں کے اتحاد کو پارہ پارہ کر دیا ہے، خلیفہ کو قتل کیا، فتنہ برپا کیا، مسلمانوں کی جمعیت کو منتشر کیا اور رشتے داروں سے قطع رحمی کی ہے [1]، جنگ کرو۔"

عمرو عاص اس (امیر شام) کے جھوٹ و دروغ گوئی سے باخبر تھا اور جانتا تھا کہ حضرت علی علیہ السلام کے بارے میں یہ باتیں درست نہیں ہیں، اس کی طرف رُخ کیا اور کہا، آپ کی نظر میں یہ شخص کون ہے؟ امیر شام نے کہا میری نظر میں علی علیہ السلام ہیں۔ عمرو عاص نے کہا:

"وَ اللهِ! مَا أَنْتَ وَ عَلِيٌّ بِحِمْلَى بَعِيْرٍ لَيْسَ لَكَ هِجْرَتُهُ وَ لَا سَابِقَتُهُ وَ لَا صُحْبَتُهُ وَ لَا جِهَادُهُ وَ لَا فِقْهُهُ وَ لَا عِلْمُهُ. وَ وَاللهِ! إِنَّ لَهُ مَعَ ذٰلِكَ لَحَظّاً فِي الْحَرْبِ لَيْسَ لِأَحَدٍ غَيْرَهُ"

"خدا کی قسم! اے امیر شام تم ہرگز علی علیہ السلام کے برابر نہیں ہو سکتے نہ ہجرت پیغمبرؐ کے وقت، نہ اُس سے پہلے، نہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ہم نشینی میں، نہ جہاد میں، نہ فقہ میں، نہ علم میں۔ مزید کہتا ہے کہ خدا کی قسم تمام خطرات کے باوجود جنگ میں علیؑ کا اتنا حصہ ہے کہ کوئی بھی اُن کے برابر نہیں ہو سکتا۔"

[1] خلیفہ ثالث کی بنی ہاشم سے رشتے داری کے تعلق کی طرف اشارہ ہے۔

www.shiabookspdf.com

اس تمام صورتحال اوران تمام خطرات کے باوجود جواس کام میں ہیں، اگر میں تمہاری بیعت کروں اوران کے ساتھ جنگ کروں تو مجھے کیا دو گے؟ امیر شام نے کہا، جوتم کہو گے۔ عمرو عاص نے کہا، "کامیابی کے بعد حکومت مصر میرے حوالہ کرو۔" امیر شام نے غور وخوض کے بعد کہا "میں نہیں چاہتا کہ عرب تمہارے بارے میں یہ کہیں کہ دنیاوی اغراض کی خاطر بیعت کرلی ہے۔"

عمرو بن عاص نے کہا، "اِن باتوں کو چھوڑ دو (مطلب یہ کہ میں کہتا ہوں مصر کی حکومت مجھے دے دو) بالآخر امیر شام نے اپنے بھائی سے مشورہ کرنے کے بعد عمرو عاص کی تجویز قبول کرلی اور قرارداد پر دستخط کردیے۔ [۱] قابل توجہ بات یہ ہے کہ عمرو عاص نے مصر کی حکومت کے حصول کے لیے اصرار کیا۔ چونکہ مصر اس وقت دنیا کے اہم مراکز میں شمار ہوتا تھا۔ دولت و قدرت کا مرکز تھا۔ اور یہ کہ خلیفۂ دوّم کے زمانے میں اس نے مصر کو فتح کیا تھا۔ خوبصورتی و ماڈی حوالے سے مصر کا مشاہدہ کر چکا تھا۔ اس لیے کہ وہ عمر کی خلافت کی تمام مدّت میں مصر کا والی رہ چکا تھا۔ اس کے بعد خلیفۂ ثالث کے دور میں بھی چار سال تک اس سرزمین پر حکومت کی یہاں تک کہ بعد میں خلیفۂ ثالث نے اُسے معزول کیا۔

بہرحال امام عالی مقامؑ اپنی گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے فرماتے ہیں:

"فَلَا ظَفِرَتْ يَدُ الْمُبَايِعِ، وَخَزِيَتْ أَمَانَةُ الْمُبْتَاعِ." [۲]

"اس بیعت کرنے والے کے ہاتھوں کو فتح حاصل نہ ہو اور خریدار کو سوائے ذلت و رسوائی کے کچھ حاصل نہ ہو۔"

درحقیقت یہ گفتگو اس خریدار اور بیچنے والے پر ایک لعنت ہے۔ یہ بات صحیح ہے کہ امیر شام نے اپنی بات پر عمل کیا اور حکومت مصر کو اُس کے حوالے کیا۔ لیکن یہ حکومت چند سال سے زیادہ نہ رہ سکی عمرو بن عاص کی موت نے اسے مہلت نہیں دی۔

اس کے علاوہ وہ باتیں جو اس نے اپنی عمر کے اختتام کے دوران کہی ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا انجام برا تھا اور اسے اس کامیابی کی اہم باطنی راحت اور سرخوشی ہرگز نصیب نہ ہوئی۔ [۳] امیر شام نے اگرچہ اپنے ان کاموں کے ذریعے اپنی حکومت کو مستحکم تو کیا مگر سب جانتے ہیں کہ اس کی حکومت رسوا ہوگئی۔ تمام صحابہ کرام جو مہاجرین وانصار سے تھے اور نیک نام اور پرہیزگار تھے اس سے دور ہو گئے اور دشمنان اسلام کے بچے کھچے افراد اور دور جاہلیت کے سرکردہ افراد اس

[۱] شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید، ج ۲، ص ۶۱ کے بعد۔

[۲] مبتاع: خریدار کے معنیٰ میں ہے، یہ امیر شام کی طرف اشارہ ہے۔ اس کے بالمقابل بائع (بیچنے والا) ہے جو کہ عمرو عاص ہے۔

[۳] کتاب اسد الغابہ فی معرفۃ الصحابہ (عمرو عاص کے حالات) کی طرف رجوع کریں۔

www.shiabookspdf.com

کے گرد جمع ہو گئے، تخت حکومت کے پائے صرف قتل و غارتگری اور جبر و تشدد پر استوار تھے اس کے علاوہ حکومت میں کچھ باقی نہیں تھا۔

یہ امکان بھی موجود ہے کہ اُوپر کا جملہ نفرین کے لیے نہ ہو بلکہ خبر دینے کے لیے ہو یعنی اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ دین کو دنیا کے لیے بیچنا ہرگز کامیابی کا زینہ نہیں ہوسکتا۔ یہ سودا بیچنے والے کو بھی نقصان دیتا ہے اور خریدنے والے کو بھی رسوا کرتا ہے قرآن اس مطلب کی طرف اشارہ کرتا ہے:

"أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَىٰ فَمَا رَبِحَت تِّجَارَتُهُمْ" [۱]

"یہ وہی لوگ ہیں جو ہدایت کے بدلے میں گمراہی حاصل کرتے ہیں، یہ تجارت انہیں کوئی فائدہ نہیں دے گی۔"

ایک دوسری جگہ فرمانِ الٰہی ہے:

"أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الْحَيَاةَ الدُّنْيَا بِالْآخِرَةِ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ ﴿٨٦﴾" [۲]

"یہ وہ لوگ ہیں جو آخرت کو دنیاوی زندگی کے لیے فروخت کرتے ہیں۔ نہ ان کے عذاب میں کمی کی جائے گی نہ ان کا کوئی یار و مددگار ہوگا۔"

امامؑ کے کلام میں اَمانت سے مراد حکومت مصر اور وہاں کے مسلمانوں کے حقوق ہیں۔ یہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ انسانوں پر حکومت کرنا ایک الٰہی امانت ہے جو صرف پاک اور صالح لوگوں کے ہاتھ میں ہوتا کہ وہ لوگوں کو فائدہ پہنچائیں۔ اور وہ لوگ مطلب پرستی، ذاتی فائدے اور خواہشات کے لیے حکومت کرتے ہیں، وہ اس امانت الٰہی میں خیانت کرتے ہیں، ان کے یہ کام رسوائی کا سبب بنتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سارے مفسرین نے اس آیت "إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَن تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا" [۳]۔ خدا تمہیں حکم دیتا ہے کہ لوگوں کی امانتیں امانت رکھوانے والوں کے حوالے کردو۔" کی تفسیر میں حکومت یا ولایت کو امانتِ الٰہی کا ایک روشن مصداق شمار کیا ہے۔ اس گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے امامؑ فرماتے ہیں:

---

[۱] سورۂ بقرہ، آیت ۱۶

[۲] سورۂ بقرہ، آیت ۸۶

[۳] سورۂ نساء آیت ۵۸

www.shiabookspdf.com

"فَخُذُوْا لِلْحَرْبِ اُهْبَتَهَا"۔[۱] "وَاَعِدُّوْا لَهَا عُدَّتَهَا فَقَدْ شَبَّ"[۲] "لَظَاهَا"[۳] "وَعَلَا سَنَاهَا"[۴]

"اب جب شام کا حکمران اپنی حکومت کی بنیادوں کو مضبوط کرنے کے لیے مسلمانوں کے شہروں پر بے رحمانہ حملہ کر رہا ہے اور لوگوں کی وفاداریوں کو رشوت دے کر خرید رہا ہے، تم جنگ کی تیاری کرو، سامان جنگ فراہم کرو کہ (حاکمِ شام کے کارندوں کے ساتھ) جنگ کی آگ بھڑک اٹھی ہے اور شعلے بلند ہو گئے ہیں۔"

معلوم ہوتا ہے کہ امام عالی مقامؑ نے منافقین اور بالخصوص شام کے حکمرانوں کے ساتھ تمام اختلافات ختم کرنے کے لیے کوششیں کیں لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ روز بروز سازشوں کا بازار گرم ہوتا گیا۔ آپؑ نے جنگ کی تیاری کا حکم دیا۔ چونکہ یہ شعلے دشمن کی طرف سے اُٹھ رہے تھے۔ اس جنگ کے آثار ظاہر ہونے لگے۔ تاریخ اسلام بھی گواہی دیتی ہے کہ منافقین اور دشمنان امامؑ نے تیزی کے ساتھ جنگ کی تیاری کی ہے۔ طلحہ و زبیر وغیرہ کو خطوط بھیجے گئے۔ یہ بھی ان کی جنگی تیاری کی گواہی دے رہے ہیں۔ حضرت علی علیہ السلام کامیابی کے اہم راز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"وَاسْتَشْعِرُوا الصَّبْرَ فَإِنَّهُ أَدْعَىٰ إِلَى النَّصْرِ"۔

"صبر و استقامت کو اپنا شعار بناؤ کہ اس سے نصرت و کامرانی کا زیادہ امکان ہے۔"

توجہ رہے کہ اِستشعار "شعر" کے مادّے سے ہے جس کے معنی زیر جامہ کے ہیں، اس کے بالمقابل دِثَار جو ظاہری لباس کے معنی میں ہے۔ اس سے یہ حقیقت واضح اور روشن ہو جاتی ہے کہ صبر و استقامت کا تعلق جسم کی اندرونی کیفیت سے ہے اور یہ انسانی روح کو سخت حالات میں مدد دیتی ہے۔

نکات

۱۔ دنیاوی سیاست میں اخلاقی اصولوں کی کوئی حیثیت نہیں

"الملکُ عقیمٌ"

---

[۱] اُهبة، لقمہ کے وزن پر ہے۔ تیاری کے معنی میں ہے۔ تأھُّب، کسی کام کے لیے تیاری پکڑنے کے معنی میں آتا ہے۔ إهاب (کتاب کا ہم وزن) اُس کھال کے معنی میں آیا ہے جو ابھی رنگا نہ گیا ہو، بلکہ رنگے جانے کے مرحلے میں ہو۔

[۲] شَبَّ، شباب کے مادّے سے ہے یعنی جوانی۔ آگ بھڑکانے کے مورد میں بھی یہ مادّہ استعمال کیا جاتا ہے۔

[۳] لَظَاهَا، راغب کی مفردات میں خالص آگ کے شعلوں کو کہا گیا ہے۔

[۴] سَنَاهَا، جنگ کے شعلے اٹھنے کی طرف اشارہ ہے۔

www.shiabookspdf.com

"حکومت بانجھ ہوتی ہے۔"

ایک ضرب المثل کے طور پر معروف ہے۔ یہ جملہ اس حقیقت کو بیان کرتا ہے کہ مادّی سیاست خود پسندی، دنیاوی جاہ وحشم اور ذاتی خواہشات پر مبنی ہوتی ہے۔ رشتے داری یہاں تک کہ بیوی بیٹا، باپ اور ماں کو لوگ بھول جاتے تھے۔ ممکن ہے یہ سب اقتدار کی خاطر قربان کر دیں، کیونکہ اس قسم کے سیاستدانوں کی نظر میں سب سے اہم چیز اپنا ذاتی مفاد ہے۔ اس سے بڑھ کر کوئی چیز اہمیت نہیں رکھتی۔ اس قسم کے طور طریقے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر چیز ان کی خواہشات پر قربان ہو۔

"فَضَنِنْتُ بِهِمْ عَنِ الْمَوْتِ۔ کے جملے سے امام کا مقصد ہے" میں نہیں چاہتا کہ اپنے اہل بیتؑ کو موت کے منہ میں دھکیل دوں۔" معلوم ہوتا ہے کہ خلافت غصب کرنے والے اپنے ارادوں میں اس طرح پرعزم تھے کہ اگر امامؑ اپنے حق کو حاصل کرنے کے لیے بنی ہاشم کی مدد سے قیام کرتے تو یہ غاصب اس کے لیے تیار تھے کہ ان سب کو شہید کر دیتے۔ تعجب کا مقام ہے۔

معروف حدیث نبویؐ میں ارشاد ہوتا ہے:

"حُبُّكَ لِلشَّيْءِ يُعْمِي وَيُصِمُّ" [1]

"اپنے مال سے محبت نے تمہیں اندھا اور بہرا کر دیا ہے۔"

اور جب بات حکومت اور اقتدار کی ہو تو یہ حدیث کہیں زیادہ صادق آتی ہے۔ اس قسم کی مثالیں ہر دور میں ملتی ہیں۔ خطبۂ بالا میں جو کچھ ذکر ہوا وہ اس قسم کی حکومتوں کا نمونہ شمار کیا گیا ہے۔ تاریخ ایسے لوگوں کے حالات کی وضاحتوں سے پُر ہے جو اپنی جان و مال کی محبت میں اس قدر اندھے اور بہرے ہو چکے تھے کہ عام مسائل کو بھی بھول چکے تھے۔

۲۔ دین کو دنیا کے عوض فروخت کرنے والے

دین کی الٰہی اہمیت اور معنوی قیمت اور اس کو تھوڑے سے دنیاوی مفاد میں فروخت کرنے سے متعلق بحثیں پہلے نکتے میں ہو چکی ہیں۔ اِن کا ایک نمونہ عمرو بن عاص تھا، جس کے بارے میں اوپر کے خطبے میں ذکر ہو چکا ہے، اُس نے مصر میں تھوڑے سے دنوں کی حکومت کے لیے اپنے دین وایمان کو فروخت کیا۔ مورخین کے مطابق عمر کے آخر حصے میں پشیمان ہوا لیکن واپسی کا راستہ بدقسمتی سے ممکن نہیں تھا۔ قرآن مجید کی متعدد آیات میں اِس موضوع کو انحراف کے اہم عوامل میں شمار کیا ہے۔ بنی اسرائیل کے علماء کے ایک گروہ نے ظہور اسلام سے پہلے ہی توریت کی پیشگوئیوں میں پیغمبرؐ کے بارے میں کھلم کھلا

[1] بحارالانوار، ج ۷۴، ص ۱۶۵

www.shiabookspdf.com

بیان فرمایا ہے۔ آسمانی کتابوں میں ان کی نشانیاں بتائی ہیں۔ مگر آپ کا ظہور ہوا اور ان کے مادّی فائدے خطرے میں پڑ گئے تو انہیں چھپالیا، یا اس میں تحریف کرنے لگے۔

"وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ ۡ فَنَبَذُوْهُ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ وَاشْتَرَوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ فَبِئْسَ مَا يَشْتَرُوْنَ" [1]

"جب صاحبانِ کتاب (آسمانی کتابیں جن پر نازل ہوئیں) سے خدا نے عہد لیا کہ تم اُسے لوگوں کے لیے آشکار کرو، چھپاؤ نہیں لیکن انہوں نے نظر انداز کیا اور تھوڑی سی قیمت پر فروخت کیا، کتنی بُری قیمت پر خریداری کی!"

ظاہر ہے قرآن مجید تھوڑی سی قیمت کی وجہ سے ان کی مذمت نہیں کرتا بلکہ مقصد یہ ہے کہ مادّی دولت اور متاع خواہ کتنی ہی قیمتی اور گراں بہا کیوں نہ ہو خدائے متعال کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتی:

"فَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِيْلٌ"

"(سمجھ لو کہ) دنیاوی زندگی کا ساز و سامان آخرت کے (عیش و آرام کے) مقابلے میں بہت ہی تھوڑا ہے۔" [2]

عام طور پر وہ تمام لوگ جو مخلوق کی اطاعت کو خالق کی رضامندی پر مقدم سمجھتے ہیں، ناجائز منافع کو خدا کی اطاعت پر فوقیت دیتے ہیں اور خواہشاتِ نفسانی کے حصول کے لیے حکمِ خدا کو اہمیت نہیں دیتے۔ یہ لوگ دین کو دنیا کے ہاتھوں فروخت کرنے والوں میں شمار ہوتے ہیں۔ صرف وہی لوگ جو ہر کام اور ہر چیز میں خدا کی رضاجوئی چاہتے ہیں اور خواہشاتِ نفسانی کو بھول جاتے ہیں، اس گروہ سے خارج ہیں۔ یہی لوگ حزب اللہ ہیں جو رضائے حق کے مقابلے میں ماں باپ اور خاندان کو بھی اہمیت نہیں دیتے۔ [3]

۳۔ استقامت اور کامیابی کا رابطہ

اگرچہ کامیابی کے لیے مختلف عوامل کارفرما ہیں، ان میں اہم ترین سبب صبر و استقامت ہے۔ ان دونوں کا آپس میں ربط اس قدر ہے کہ معروف ادیبوں نے بھی صبر و استقامت کو ایک ساتھ، لازم و ملزوم قرار دیا ہے۔ قرآن مجید میں یہ حقیقت وضاحت سے بیان کی گئی ہے۔ یہاں تک کہ بعض گروہوں نے اسلام کے سپاہیوں کی اپنے دشمنوں کے مقابلے میں کامیابی کو صبر و استقامت میں مضمر قرار دیا ہے۔ قرآن فرماتا ہے:

[1] سورۂ آلِ عمران، آیت ۱۸۷

[2] سورۂ توبہ، آیت ۳۸

[3] سورۂ مجادلہ، آیت ۲۲

www.shiabookspdf.com

"اِنۡ یَّکُنۡ مِّنۡکُمۡ عِشۡرُوۡنَ صٰبِرُوۡنَ یَغۡلِبُوۡا مِائَتَیۡنِ ۚ وَاِنۡ یَّکُنۡ مِّنۡکُمۡ مِّائَۃٌ یَّغۡلِبُوۡۤا اَلۡفًا" [1]

"اگر تم میں سے بیس صبر واستقامت والے لوگ ہوں تو وہ دوسو پر غالب آجائیں گے اگر سو آدمی ہوں تو ہزار پر غالب آجائیں گے۔"

یہ وجہ تھی کہ بہت سارے اسلامی غزوات میں افرادی قوت اور ساز وسامان کی کمی کے باوجود، جو کہ یقیناً دشمنوں کے فائدے میں تھا، مسلمان صبر واستقامت ہی کی وجہ سے اپنے دشمن پر فتح مند ہوئے۔ ایسا صبر واستقامت جو خدا اور معاد پر ایمان کا مظہر تھا۔ مورد بحث خطبے میں امام عالی مقامؑ نے اس مسئلے کو صراحت سے بیان فرمایا ہے:

"وَاسۡتَشۡعِرُوۡا الصَّبۡرَ فَاِنَّہٗ اَدۡعٰی اِلَی النَّصۡرِ"

"... صبر واستقامت کو اپنا شعار بناؤ کہ اس سے تمہیں کامیابی ملنے کا امکان ہے۔"

اس سلسلے میں بہت ساری گفتگو ہوسکتی ہے۔ جو نہج البلاغہ میں مولا علی علیہ السلام کے دیگر کلمات اور خطبوں کے ذیل میں آئے گی۔ یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ شعار خواہ وہ لباس زیریں کے معنی میں ہو یا علامت ونشان کے معنی میں، دونوں فتح وکامرانی کے اسباب شمار ہوتے ہیں۔ کیونکہ پہلی صورت میں روح وجسم میں استقامت کے نفوذ کر جانے کی طرف کنایہ ہے اور دوسری صورت میں دشمن کو ہمیشہ صبر واستقامت والے افراد سے وحشت ہوتی ہے۔

---

[1] سورۂ انفال، آیت ۶۵

www.shiabookspdf.com

www.shiabookspdf.com

ستائیسواں خطبہ

ومن خطبة له علیه السّلام

وَقَدْ قَالَهَا یَسْتَنْهِضُ بِهَا النَّاسَ حِیْنَ وَرَدَ خَبَرُ غَزْوِ الْاَنْبَارِ بِجَیْشِ مُعَاوِیَةَ فَلَمْ یَنْهَضُوْا. وَ فِیْهَا یَذْکُرُ فَضْلَ الْجِهَادِ وَ یَسْتَنْهِضُ النَّاسَ وَ یَذْکُرُ عِلْمَهُ بِالْحَرْبِ وَ یُلْقِیْ عَلَیْهِمُ التَّبِعَةَ لَعَدَمِ طَاعَتِهٖ''

امام عالی مقامؑ نے یہ خطبہ اُس وقت ارشار فرمایا کہ جب آپ کو خبر ملی کہ امیر شام کے لشکر نے شہر انبار پر حملہ کیا ہے، مگر لوگ جہاد کے لیے آمادہ نہیں ہوئے۔ امامؑ نے اس میں جہاد کی فضیلت بیان کی اور لوگوں کو شام کے لشکر کے خلاف قیام کی طرف متوجہ کیا۔ جنگی فنون سے آگاہی دی، لوگوں کو ان کی ذمہ داریاں بتائیں، مگر لوگوں نے اطاعت نہ کی۔

خطبے کی سند اور زمان و مقامِ صدور

ابن ابی الحدید کے مطابق یہ خطبہ امام علی علیہ السلام کے مشہور خطبوں میں سے ہے۔ سیّد رضیؒ کے علاوہ بھی بہت سارے محققین اور محدثین نے اپنی کتابوں میں لکھا ہے۔ ان میں سے مبرّد نے اپنی کتاب "کامل" کی ابتدا میں (تھوڑے فرق کے ساتھ) ذکر کیا ہے اور اس کی ابتدا میں لکھا ہے:

علی علیہ السلام کو خبر دی گئی کہ امیر شام کے لشکر نے شہر انبار (عراق کی سرحد پر ایک شہر) پر حملہ کیا ہے۔ اور آپؑ کے نمائندہ حسان بن حسان کو بہت سے لوگوں سمیت شہید کر دیا ہے۔ امیر المومنین علیہ السلام ناراض ہوئے، آپؑ چل پڑے، اس حال میں کہ آپؑ کی عبا زمین پر گھسٹتی جا رہی تھی یہاں تک کہ نخلیہ (کوفہ کے نزدیک لشکر گاہ) پہنچے۔ لوگ حضرت علی علیہ السلام کے پیچھے چل

www.shiabookspdf.com

پڑے امیر المومنین علیہ السلام منبر پر رونق افروز ہوئے، حمد وثنائے پروردگار اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود وسلام بھیجنے کے بعد یہ خطبہ ارشاد فرمایا۔ [۱]

مرحوم کلینی نے اپنی کتاب "کافی" کی بحث جہاد میں اس کا ذکر کیا ہے۔ [۲]

مصادر نہج البلاغہ کے لکھنے والے نے مرحوم سیّد رضیؒ سے پہلے نہج البلاغہ کے دس منابع کو نقل کیا ہے۔ ان میں سے البیان والتبیین جاحظ، عیون الاخبار ابن قتیبہ، الاخبار الطوال دینوری، غارات ثقفی، عقد الفرید ابن عبدربہ، اغانی ابوالفرج اصفہانی۔ [۳]

جیسا کہ اوپر کہا گیا یہ خطبہ امامؑ نے نخیلہ کے مقام پر اس وقت ارشاد کیا جب آپ کو یہ خبر دی گئی کہ سفیان بن عوف نے جسے خطبے کے متن میں "اخو غامد" کہا گیا ہے، عراق کی سرحد پر حملہ کیا ہے، آپؑ کے نمائندہ حسان بن حسانؓ کو بہت سے لوگوں سمیت شہید کر دیا ہے، اموال لوٹ لیے گئے ہیں اور گھروں کو جلا دیا گیا اور سفیان کا لشکر کسی مزاحمت کا سامنا کیے بغیر واپس چلا گیا۔

سفیان بن عوف کہتا ہے کہ امیر شام نے مجھے بلایا اور کہا، "تجھے ایک بڑے لشکر کے ساتھ فرات کی طرف بھیجتا ہوں، جب تم سرزمین ہیت (عراق میں انبار سے ذرا اونچائی پر واقع ہے) پہنچو گے اگر کافی لشکر ہو تو اس پر حملہ کر دینا ورنہ انبار پر حملہ کرنا اگر وہاں مقابلہ سخت نہ ہو تو پھر مدائن پر حملہ کرنا پھر واپس شام آجانا خبردار کوفے کے قریب نہ جانا، جان لو! انبار اور مدائن پر حملہ، کوفے پر حملے کے مترادف ہے۔ چونکہ ایسا کرنے سے عراقیوں کے دل دہل جاتے ہیں اور ہمارے دوست خوش ہو جاتے ہیں۔ اس سفر کے دوران یہ دیکھنا کہ جو ہماری حکومت کو قبول نہ کرے اُسے قتل کر دو اور وہ تمام دیہات جو تمہاری راہ میں رکاوٹ بنیں انہیں ویران کر دو، ان کے مال واسباب کو لوٹ لو کیونکہ مال کا لوٹ لینا ہمارے دشمنوں کے لیے لوگوں کو قتل کرنے کی طرح دردناک ہے۔ سفیان نے اس دستور پر عمل کیا۔ جب وہ شہر انبار پہنچا، حسان بن حسان بکریؓ کچھ گروہ کے ساتھ مقابلے میں آیا۔ پہلے حملے میں شامیوں کو دور کر دیا، لیکن لشکرِ شام بڑا تھا اور حسانؓ نے دیکھا کہ ان کی طاقت کو کم نہیں کیا جا سکتا ہے، وقت شہادت تک لڑنے کا عزم کر لیا اور گھوڑے سے اتر پڑے اور سورۂ احزاب کی آیت ۲۳ پڑھی:

"مِنَ الْمُؤْمِنِينَ رِجَالٌ صَدَقُوا مَا عَاهَدُوا اللَّهَ عَلَيْهِ ۖ فَمِنْهُم مَّن قَضَىٰ نَحْبَهُ وَمِنْهُم مَّن

---

[۱] شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید، ج ۲، ص ۷۵

[۲] کافی، ج ۵، ص ۴

[۳] مصادر نہج البلاغہ، ج ۱، ص ۳۹۷

www.shiabookspdf.com

يَّنْتَظِرُ "

"مؤمنین میں کچھ ایسے ہیں جو درجۂ شہادت تک پہنچ چکے اور کچھ انتظار میں ہیں"۔

پھر آپؑ نے فرمایا:

"جو شہادت کے لیے تیار نہیں ہے، وہ جب ہم جنگ میں مشغول ہوں، شہر سے باہر چلا جائے کیوں کہ دشمن فرار ہونے والوں کا پیچھا نہیں کر پائے گا اور جو شہادت کے لیے تیار ہے وہ ہمارے ساتھ رہے کچھ گروہ چلے گئے۔"

آپؑ نے تیس آدمیوں کے ساتھ مل کر قیام کیا یہاں تک کہ سب شہادت کے منصب پر فائز ہوئے، اس حادثے نے قلبِ امامؑ کو سخت اذیت پہنچائی اور مذکورہ خطبہ جو مولاؑ کی دردمندی اور دشمن کے مقابلے میں لوگوں کی کوتاہیوں کا بیان ہے، ارشاد فرمایا۔

خطبہ، ایک نظر میں

پہلے اشارہ ہو چکا ہے، یہ خطبہ۔ جو کہ خطبۂ جہاد کے نام سے معروف ہے۔ امیرالمومنینؑ کے مشہور ترین خطبوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس تمام خطبے کا محور جہاد ہے۔

خطبے کے پہلے حصے میں جہاد کی اہمیت، اس کے اہم آثار اور ترکِ جہاد کے نتائج کی خوبصورت انداز میں تشریح کی گئی ہے۔ دوسرے حصے میں اہل کوفہ کی سخت مذمت کی گئی ہے۔ اس کے بعد سفیان غامدی کے شہر انبار پر حملہ، حسان بن حسانؓ جو امامؑ کا وفادار اور بہادر نمائندہ تھا، کی شہادت، نیز تمام تباہ کاریوں کی خبر دی گئی ہے۔

تیسرے حصے میں اُس زمانے میں اہل عراق کی سُست روی کی سرزنش اور ان کی سخت مذمت کی گئی ہے۔ آخری حصے میں خوں خوار و بے رحم دشمن سے جنگ کے لیے اپنی آمادگی کے بارے میں بیان فرمایا ہے۔ مجموعی طور پر اس خطبے میں ایک عجیب شجاعانہ روح حاکم ہے کہ ہر سننے والے کو شدید متاثر کرتی ہے۔

توجہ رہے کہ نہج البلاغہ کے مشہور شارح ابن ابی الحدید اپنی گفتگو میں کہتے ہیں:

"بہت سارے لوگ جہاد کی اہمیت اور اس کے لیے شوق دلانے کے لیے بہت کچھ کہتے ہیں مگر ان سب کی گفتگو کا ماخذ کلام امیرالمومنینؑ ہی ہے۔ پھر جہاد کے بارے میں "ابن نباتہؒ" کے مشہور خطبے کی طرف اشارہ فرماتے ہیں اور یہ خطبہ حضرت علی علیہ السلام کے خطبے کے مقابلے میں ایسا ہے جیسے لوہے کی تلوار کے مقابلے میں لکڑی کی تلوار ہو۔ اس خطبے کا حضرت

www.shiabookspdf.com

علی علیہ السلام کے خطبے کے ساتھ موازنہ نہیں ہو سکتا۔"[1]

پہلا حصّہ

اَمَّا بَعْدُ فَاِنَّ الْجِهَادَ بَابٌ مِنْ اَبْوَابِ الْجَنَّةِ فَتَحَهُ اللهُ لِخَاصَّةِ اَوْلِيَائِهِ وَ هُوَ لِبَاسُ التَّقْوٰى وَ دِرْعُ اللهِ الْحَصِينَةُ وَ جُنَّتُهُ الْوَثِيقَةُ فَمَنْ تَرَكَهُ رَغْبَةً عَنْهُ اَلْبَسَهُ اللهُ ثَوْبَ الذُّلِّ وَ شَمِلَهُ الْبَلَاءُ وَ دُيِّثَ بِالصَّغَارِ وَ الْقَمَاءَةِ وَ ضُرِبَ عَلٰى قَلْبِهِ بِالْاِسْهَابِ وَ اُدِيلَ الْحَقُّ مِنْهُ بِتَضْيِيعِ الْجِهَادِ وَ سِيمَ الْخَسْفَ وَ مُنِعَ النَّصَفَ.

"جہاد جنت کے دروازوں میں سے ایک دروازہ ہے، جسے اللہ نے اپنے خاص دوستوں کے لیے کھولا ہے۔ یہ پرہیز گاری کا لباس اللہ کی محکم زرہ اور مضبوط سپر ہے۔ جو اس سے پہلو بچاتے ہوئے اِسے چھوڑ دیتا ہے، خدا اسے ذلّت و خواری کا لباس پہنا تا اور مصیبت وابتلا کی ردا اُڑھا دیتا ہے اور ذلّتوں اور خواریوں کے ساتھ ٹھکرا دیتا ہے مدہوشی اور غفلت کا پردہ اس کے دل پر چھا جاتا ہے۔ جہاد کو ضائع و برباد کرنے سے حق اس کے ہاتھ سے لے لیا جاتا ہے۔ ذلّت اسے سہنا پڑتی ہے اور انصاف اس سے روک لیا جاتا ہے۔"

شرح وتفسیر

جہاد جنت کے دروازوں میں سے ایک دروازہ

اس خطبے کے پہلے جملوں میں فلسفۂ جہاد اور اس کے بابرکت اثرات کو پانچ جامع جملوں میں بیان کیا گیا ہے۔ اس کے بعد جہاد کو ترک کرنے کے بُرے اثرات کی سات جملوں میں وضاحت کی گئی ہے۔ سب سے پہلے اہمیتِ جہاد کے بارے میں فرمایا:

"اَمَّا بَعْدُ، فَاِنَّ الْجِهَادَ بَابٌ مِنْ اَبْوَابِ الْجَنَّةِ"

"حمد وثنائے الٰہی کے بعد، جہاد جنت کے دروازوں میں سے ایک دروازہ ہے۔"

معلوم ہے کہ رحمت خداوندی، رضائے خداوندی اور بہشتِ بریں تک پہنچنے کے لیے مختلف اسباب ہیں۔ احادیث

[1] شرح نہج البلاغہ، ابن ابی الحدید، ج ۲، ص ۸۰

www.shiabookspdf.com

میں انہیں بہشت کے دروازوں کے عنوان سے متعارف کرایا گیا ہے۔ ان میں سب سے اہم چیز جہاد ہے۔ اِسی وجہ سے ہم امام صادقؑ کی حدیث میں پڑھتے ہیں کہ پیغمبر اکرمؐ فرماتے ہیں:

"لِلجَنَّةِ بَابٌ يُقَالُ لَهُ: بَابُ الْمُجَاهِدِيْنَ يَمْضُوْنَ اِلَيْهِ فَاِذَا هُوَ مَفْتُوْحٌ وَ هُمْ مُتَقَلِّدُوْنَ بِسُيُوْفِهِمْ، وَالْجَمْعُ فِي الْمَوْقِفِ، وَالْمَلَائِكَةُ تُرَحِّبُ بِهِمْ" [1]

"بہشت میں بابُ المجاہدین کے نام سے ایک دروازہ ہے کہ وہ اس کی طرف حرکت کرتے ہیں اور اس دروازے کو کھلا ہوا پائیں گے حالانکہ تلواریں ان کے کمربستہ ہوں گی۔ یہ اُس وقت ہوگا جب تمام لوگ حساب کے لیے کھڑے ہوں گے۔ مگر مجاہدین بغیر حساب کے بہشت کی طرف جائیں گے۔ ملائکہ ان کا استقبال کریں گے۔"

واضح ہو کہ اسلام میں جہاد کے دو شعبے ہیں:۔ بیرونی دشمن سے جہاد اور نفس امارہ کے ساتھ جہاد۔ پہلے کو جہادِ اصغر اور دوسرے کو جہادِ اکبر کہتے ہیں، مگر دونوں کو جنت کے دروازے شمار کیا گیا ہے۔ جہادِ اکبر کے بغیر اللہ سے ملاقات نہیں کی جا سکتی اور جہادِ اصغر کے بغیر دنیا وآخرت کی سربلندی حاصل نہیں ہوتی۔ دوسرے جملے میں فرماتے ہیں:

"فَتَحَهُ اللّٰهُ لِخَاصَّةِ أَوْلِيَائِهِ"

"اس دروازے کو اللہ نے اپنے خاص دوستوں کے لیے کھولا ہے۔"

یہ بات درست ہے کہ اندرونی اور بیرونی دشمن سے جہاد کرنا تمام مسلمانوں کا فرض ہے۔ لیکن یہ جہاد صرف اللہ کے خاص دوست ہی نیتِ خالص کے ساتھ مرحلۂ آخر تک کر سکتے ہیں، دوسرے لوگ اس مرحلے میں استقامت نہیں کر سکتے، باطل نیتوں کے ساتھ نام ونمود، شہرت، مالِ غنیمت اور ان جیسے میدانوں میں آشکار ہو جاتے ہیں۔ اولیاء اللہ اور خاصانِ خدا ہی جہاد کو خلوصِ نیت کے ساتھ آخری مرحلے تک پہنچا سکتے ہیں۔ یہ وہی لوگ ہیں جو جہادِ اکبر واصغر کی تمام مشکلات کے سامنے خندہ پیشانی سے گزرتے ہیں اور اس راستے کی تمام سختیوں کے مقابلے میں استقامت کا مظاہرہ کرتے ہیں جن وانس اور شیاطین کو اپنے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امام عالی مقامؑ نے کہا کہ اللہ نے جہاد کے دروازے کو صرف اولیاء اللہ کے لیے کھلا رکھا ہے۔ جب کہ یہ سارے مسلمانوں کا فریضہ ہے؟ اس میں اشکال کی گنجائش باقی نہیں رہتی ہے۔

اس جملے میں اس نکتے سے بھی استفادہ کیا جا سکتا ہے کہ اگر کوئی جہادِ اکبر واصغر دونوں کو انجام دے تو وہ بھی خاصانِ خدا میں شمار ہوگا۔

---

[1] اصولِ کافی، ج ۵، ص ۲، کتاب الجہاد، باب فضل الجہاد، حدیث ۲

www.shiabookspdf.com

جہاد کی تیسری، چوتھی اور پانچویں صفت بیان کرتے ہوئے مولا علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"وَهُوَ لِبَاسُ التَّقْوٰى وَدِرْعُ اللهِ الْحَصِينَةُ، وَجُنَّتُهُ الْوَثِيقَةُ۔"

"وہ تقویٰ کا لباس اور خداوند کی مضبوط زرہ اور اُس کی اطمینان بخش ڈھال ہے۔"

ہم جانتے ہیں کہ لباس انسان کی خوبصورتی اور زینت کا سامان ہے اور جسم کو گرمی، سردی اور ایسی دوسری آفات سے بچانے کا ضامن ہے جو عریاں ہونے کی صورت میں اس کے بدن پر وارد ہوتی ہیں اسی طرح جہاد بھی ملتوں اور اقوام کی عزّت و سربلندی اور ہر قسم کے آفات کو روکنے کا ضامن ہے، اس لیے اس خطبے کو تسلسل دیتے ہوئے ایک دوسری تعبیر کو بیان فرمایا ہے۔ برہنہ جسم کا ہونا مکمل طور پر ایک بُری اور تکلیف دہ چیز ہے۔ جو قوم یا ملّت جہاد کو ترک کردے وہ ذلیل وخوار ہو جاتی ہے۔ مگر اس مقام پر لفظ لباس کو لفظ تقویٰ کی طرف کیوں اضافہ کیا گیا ہے؟ ممکن ہے یہ وجہ ہو کہ تقویٰ کی بنیادوں کی حفاظت امن و امان کے نفاذ کے بغیر ممکن نہیں ہے اور امن و امان بغیر جہاد کے حاصل نہیں ہوتا ہے۔ مذکورہ جملے کی تفسیر میں ایک اور احتمال بھی ہے جو سورۂ اعراف، آیت ۲۶ کی جانب اشارہ کرتی ہے، جس میں ظاہری لباس کا ذکر چھیڑنے کے بعد لباس کو ایک نعمتِ الٰہی کے عنوان سے یاد کیا گیا ہے:

"وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ذٰلِكَ خَيْرٌ۔"[1]

"تقویٰ کا لباس ظاہری لباس سے بہتر اور کارآمد ہے۔"

کہنے کا مقصد یہ ہے، جیسا کہ قرآن میں اشارہ ہوا ہے، تقویٰ کے لباس کا مکمل مصداق جہاد ہی ہے۔ جو ہر لحاظ سے معاشرے کو امن و امان میں رکھتا ہے۔[2] اور حُسن وخوبصورتی کا سامان ہے۔ امیر المومنینؑ نے جہاد کو بعد کے جملے میں زرۂ محکم اور تیسرے جملے میں اطمینان بخش ڈھال سے تشبیہ دی ہے، یہ دونوں جنگ میں دفاع کے سامان ہیں۔ کیونکہ پرانی جنگوں میں جس کے جسم پر زرہ اور ہاتھ میں ڈھال نہ ہوتی تو وہ دشمن کی ضربات سے محفوظ نہ رہتا۔ وہ قوم اور ملّت جنہوں نے جہاد کو ترک کیا، وہ دشمنوں کے حملوں کی زد میں آئیں گی۔ ممکن ہے یہ تعبیر اس حقیقت کی طرف اشارہ ہو کہ جہاد کا مطلب دوسروں پر حملہ کرنا، تجاوز کرنا، اموال کو لوٹنا اور دوسروں پر اپنا عقیدہ مسلط کرنا نہیں، اس لیے کہ ہم معتقد ہیں کہ اسلام اور قرآن کی منطق اس قدر مضبوط ہے کہ بغیر تیر و تلوار کے پیشرفت ہو سکتی ہے۔ اس بنا پر شریعت نے جہاد کا مطلب اسلامی معاشرے کی حفاظت اور تبلیغ کے راستے میں آزادی اور رکاوٹوں کو دور کرنا بیان کیا ہے۔

---

[1] سورۂ اعراف، آیت ۲۶

[2] توجہ رکھیے کہ پہلی تفسیر میں لباس التقویٰ کے اضافے کا مطلب اضافہ لامیہ ہے اور دوسری تفسیر میں اضافہ ذیابی ہے۔

www.shiabookspdf.com

آج کل کی جنگوں میں اگر چہ پرانے زمانے کی زرہیں اور ڈھالیں متروک ہو چکی ہیں، لیکن ان سے کہیں زیادہ مضبوط وسائل موجود ہیں جیسا کہ زرہ پوش دستے اور مضبوط مورچوں نے ان کی جگہ لی ہے۔ اور کیمیائی حملوں سے بچنے کے لیے مخصوص لباس تیار کیے گئے ہیں کہ انسان اس قسم کے حملوں میں محفوظ رہے۔ یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ جہاد اصغر کے متعلق اِن جملوں میں جو کچھ کہا گیا، وہ جہاد اکبر پر بھی صادق آتا ہے۔ چونکہ اگر جہاد بالنفس نہ ہو تو انسان کا دل اور اس کی جان شیطان کے حملوں کے سامنے شکست سے دوچار ہو جاتے ہیں۔

اس کے بعد امامؑ نے ترکِ جہاد کے منفی پہلوؤں کے متعلق سات مختصر اور جامع نکتوں میں اِشارہ فرمایا ہے، ان میں سے ہر ایک اپنی جگہ پر اٹل ہے۔ سب سے پہلے یہ:

"فَمَنْ تَرَكَهُ رَغْبَةً عَنْهُ أَلْبَسَهُ اللهُ ثَوْبَ الذُّلِّ"۔

اگر کوئی جہاد کو لاپروائی کی وجہ سے ترک کر دے تو خدا اسے ذلت وخواری کا لباس پہنا دے گا (جیسا کہ لباس تمام جسم کو چھپاتا ہے اس طرح ذلت ورسوائی اس کی زندگی کو گھیر لیتی ہے)

"رَغْبَةً عَنْهُ" کی تعبیر سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ افراد جو عذر ناتوانی، بیماری اور کسی عضو میں نقص کی وجہ سے جہاد پر قدرت نہیں رکھتے ہیں، وہ اس حکم سے مستثنیٰ ہیں۔ جیسا کہ قرآن مجید میں اشارہ ہوتا ہے۔[1]

دوسری بات یہ ہے:

"وَشَمِلَهُ الْبَلاءُ"

"ہر طرف سے بلائیں اُسے گھیر لیتی ہیں۔"

اس قسم کا شخص یا معاشرے کے افراد غیر محفوظ گھر یا شہر میں رہتے ہیں جہاں پر درندے، موذی موجودات ان کی طرف حملے کرتے ہیں اور آرام سے ان تک پہنچ جاتے ہیں۔ جی ہاں! جہاد لوہے کی دیوار ہے جو ان بلاؤں کو روکتی ہے اور درندہ صفت انسانوں کو دور کر دیتی ہے۔

تیسری بات یہ ہے:

"وَدُيِّثَ[2] بِالصَّغَارِ[3] وَالْقَمَاءَةِ۔[4]

---

[1] سورۂ توبہ آیات ۹۱، ۹۲
[2] دُیِّث: دیث کے معنی میں ہے، یعنی خوار و ذلیل بے غیرت افراد۔
[3] صغار: ذلت و پستی کے معنی میں ہے۔
[4] القماءۃ: ذلت اور پستی۔

www.shiabookspdf.com

"ایسا شخص حقارت و پستی میں گرفتار ہو جاتا ہے۔"

کیوں پست اور حقیر کیوں نہ ہو وہ جس نے جہاد جیسے عظمت و بلندی کے سرمایہ کو ہاتھ سے جانے دیا ہو اور اب تہی دست رہ گیا ہو۔

یہ بات صحیح ہے کہ یہ جملہ پہلے جملے کے قریب المعنی ہے، مگر فرق ہے، اُس میں ذلّت کہا گیا ہے اور یہاں پر حقارت و پستی کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ ان دونوں کا مفہوم مختلف ہے لیکن یہ لازم و ملزوم بھی ہیں۔ جہاد کے ترک کرنے سے چوتھی مصیبت یہ آتی ہے:

"وَضُرِبَ عَلٰى قَلْبِهِ بِالْإِسْهَابِ۔"[1]

"انسان کی عقل و فہم تباہ ہو کر رہ جاتی ہے۔"

کمزور، مغلوب اور شکست خوردہ افراد ہمیشہ توہمات میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ حقائق کو سمجھنے میں مشکل پیش آتی ہے اور دشمن کے خوف سے ہولناک تخیلات میں گم ہو جاتے ہیں یا یہ کہ اپنی کامیابی کے لیے منفی راستوں کا انتخاب کرتے ہیں تلواروں کے سائے میں جنگ جیتنے کی کوشش کرنے کے بجائے جادوگروں کے سائے میں پناہ لیتے ہیں۔ پوری تاریخ میں اس قسم کے لوگوں کی کئی مثالیں ملتی ہیں۔ ظاہر ہے کمزور اور بے بس افراد ہی ایسے غلط راستے اختیار کرتے ہیں، لیکن بہادر مجاہدین ان توہمات سے بالکل دور رہتے ہیں۔

پانچویں بات یہ ہے:

"وَأُدِيلَ الْحَقُّ مِنْهُ بِتَضْيِيعِ الْجِهَادِ۔"[2]

"جہاد کو ترک کرنے کی بنا پر اس کا حق چھین لیا جاتا ہے۔"

کیونکہ مشہور ضرب المثل میں کہا گیا ہے "حق چھینا جاتا ہے دیا نہیں جاتا" اس دنیا کے غاصب، فسادی اور جارح لوگ حقدار کو اُس کا حق نہیں دیتے، اس لیے کمزور طاقت پیدا کریں اور اپنے حقوق کو ان ستمگروں کے چنگل سے چھین لیں۔

خطبہ ۲۹ میں امامؑ کے مبارک کلمات میں یہ بات ذکر ہے:

"لَا يُدْرَكُ الْحَقُّ إِلَّا بِالْجِدِّ۔"

---

[1] اسهاب، کم عقلی اور پُرحرفی کے معنی میں ہے۔ یہاں پہلا معنی یعنی کم عقلی مراد ہے۔

[2] اُدیل، دولت کے مادّے سے نکلتے ہیں۔ مقاییس اللغة کے مطابق یہ لفظ دو معنوں میں آیا ہے: ایک حالت یا جگہ کا بدلنا اور دوسرا ضعف اور سستی۔ اس مقام پر پہلا معنی مراد ہے۔

www.shiabookspdf.com

"حق تلاش کے بغیر حاصل نہیں ہوتا۔"

چھٹی بات یہ ہے:

"وَسِيْمَ الْخَسْفَ"

"ایسے لوگ (جہاد ترک کرنے والے) بربادی کے راستے پر گامزن ہوتے ہیں۔"

توجہ رہے کہ "خسف" چاند گرہن اور زمین میں دھنس جانے کو کہتے ہیں اور "سیم" "سوم" کے مادّے سے ہے جو کسی چیز کے پیچھے حرکت کرنے کو کہتے ہیں۔ جملے کا مفہوم یہ ہے کہ جہاد کو ترک کرنے والے حقیقت میں نابودی اور بربادی کے راستے پر گامزن ہوتے ہیں۔ پوری تاریخ میں بار بار دیکھا گیا ہے کہ کئی اقوام اور ملتیں جہاد میں سستی کی وجہ سے صفحۂ ہستی سے مٹ چکی ہیں۔ [۱]

ساتویں بات یہ ہے:

"وَمُنِعَ النَّصَفَ" [۲]

"عدالت سے محروم ہو جاتے ہیں۔"

اس معنی کی دلیل روشن ہے اس لیے کہ عدالت کے طرف دار غالباً اقلیت میں ہوتے ہیں۔ اگر تعداد میں کم نہ ہوں تو کیفیت اور قدرت کے لحاظ سے اقلیت میں ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مفاد پرست حکمران اپنے مظالم کے زور پر مظلوم ملتوں کے حقوق کو پامال کرتے ہیں اور اپنے مال اور جاہ و جلال کو فزونی بخشتے ہیں۔ مظلوم اور ستم رسیدہ ملتیں جہاد کے زیر سایہ اجتماعی عدالت کو قائم کرسکتی ہیں اور ان مظالم کے فشار سے محفوظ ہوسکتی ہیں۔ اس ترتیب سے ہم دیکھتے ہیں کہ اس خطبے کے چند جملوں میں امام عالی مقامؑ نے جہاد کے اہم آثار اور انسانی معاشرے کی تقدیر کے متعلق بیان فرمایا ہے اور فلسفۂ جہاد اور اس کے مسائل کا منطقی خاکہ ترسیم کرکے دکھلایا۔

اِن تعبیروں سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاد نہ صرف آخرت میں معنوی فائدہ دیتا ہے بلکہ اس دنیا ہی میں اس کا صلہ مل جاتا ہے۔ انسان کو چاہیے کہ دنیاوی و آخروی (دونوں) فائدے طلب کرے۔ کون ہوگا جو ذلت و پستی کا خواہش مند ہوگا اور چاہے گا کہ لوگ اس کے حقوق غصب کرلیں اور بالآخر اس صفحۂ ہستی سے مٹ جائے؟

اگر ہم اِن چیزوں کے مخالف ہیں تو ہمیں کمر ہمت باندھ لینی چاہیے کہ قیام کریں، جہاد کریں۔ یہ ایسے گراں بہا

---

[۱] نہج البلاغہ کے شارحین کی ایک جماعت نے ذلّت و رسوائی کے معنی بتائے ہیں۔

[۲] نصف و انصاف عدالت کے معنی میں ہیں۔

www.shiabookspdf.com

نتائج ہیں جن کی وجہ سے ہمارے جہاد کی مشکلات آسان ہو جاتی ہیں۔ جیسے طبیب کی شفا دینے والی کڑوی دوائی۔

نکات

۱۔ جہاد ملتوں کی عظمت و سربلندی کا راز

جہاد کے متعلق بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ توجہ رہے کہ امام عالی مقامؑ نے جہاد کی اہمیت کے بارے میں نہج البلاغہ کے خطبوں میں متعدد بار گفتگو فرمائی ہے۔ ہم اتنی گنجائش رکھتے ہیں کہ اس کے متعلق بحث کریں۔ جس بنیادی اہمیت کے حامل اصول کی طرف توجہ دلانا چاہتے ہیں، وہ یہ ہے کہ جہاد زندگی کا ایک قانون ہے اور ہر موجود جب تک اس کی زندگی باقی ہے جہاد میں مشغول ہے۔ جس دن وہ جہاد کو ترک کرے گا اُس دن اُس کی موت ہے۔

گھاس پھوس مختلف تکالیف کا سامنا کرتے ہیں۔ اپنے وجود کو باقی رکھنے کے لیے یہ ان آفات سے ٹکر لیتے ہیں۔ درختوں کی جڑیں پانی اور کھاد کو پانے کے لیے زمین کی گہرائیوں میں حرکت کرتی ہیں، جب کوئی سخت رکاوٹ (مثلاً پتھر) کا سامنا ہو تو اُسے توڑ کر آگے بڑھنے کی کوشش کرتی ہیں۔ اگر اُسے توڑ نہ سکیں تو گھوم کر اپنا راستہ طے کرتی ہیں۔ جانداروں کے تمام طبقے اپنے زندہ رہنے کے لیے پیش آنے والی رُکاوٹوں کا سامنا کرتے ہیں۔ کچھ پرندوں کو ہم جانتے ہیں کہ اپنا گھونسلہ بنانے کے لیے دور دور تک ہجرت کرتے ہیں۔ کبھی کبھی قطب شمال سے قطب جنوب تک کا سفر بھی طے کرتے ہیں۔ انسان کے جسم کے اندر خون کی گردش جہاد ہی کا عمل انجام دیتی ہے۔

جسم کا دفاع کرنے والے، جنہیں سفید خلیے کہا جاتا ہے، انسان کی پوری زندگی میں امن کے اُن بیرونی دشمنوں (جراثیم و وائرس) سے برسرِ پیکار رہتے ہیں جو آب و ہوا، غذا اور کھال پر موجود زخم کے ذریعے جسم میں داخل ہو جاتے ہیں۔ خداداد طبیعی الہام کی بدولت یہ مدافع، کیمیائی و جسمانی جنگوں سے واقف ہیں اور مختلف ذرائع سے دشمن کو شکست دیتے ہیں اور انسان کو محفوظ رکھتے ہیں۔

اگر ان اسباب کو دفاعی طاقت کے طور پر استعمال میں نہ لائیں تو مختصر مدت میں مختلف قسم کی بیماریاں انسان کا تعاقب کرتی ہیں۔ خطرناک بیماری "ایڈز" اس دفاعی طاقت کے معدوم ہونے کے سوا اور کچھ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس بیماری میں مبتلا لوگ مختصر وقت میں سخت بیماریوں کی زد میں آ جاتے ہیں۔

المختصر جہاد سعادت مندی، کامیابی اور عزت و سربلندی کا راز ہے، مگر حق و عدالت کے بغیر اختیار کیا ہوا جہاد ظلم و

www.shiabookspdf.com

تعدی اور غنڈا گردی کے سوا کچھ نہیں۔ اس دلیل کی بنیاد پر قرآن مجید کی آیات، روایات اور خطبۂ بالا کے جملوں میں جہاد کو اتنی اہمیت دی گئی ہے جتنی کسی اور موضوع کو نہیں دی گئی ہے۔ بالخصوص جب جہاد کو اُس کے عام معنیٰ میں لیں (جہادِ اکبر اور جہادِ اصغر) کہ جس سے تمام دینی و الٰہی دستورات وابستہ ہیں، تو جہاد کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔ رسول خدا ﷺ کی ایک جامع حدیث اہمیتِ جہاد کے بارے میں پڑھتے ہیں:

"مَنْ تَرَكَ الْجِهَادَ أَلْبَسَهُ اللهُ ذُلًّا فِي نَفْسِهِ وَفَقْرًا فِي مَعِيشَتِهِ وَمَحْقًا فِي دِينِهِ"

"جو شخص جہاد کو ترک کرے اللہ اسے ذلّت کا لباس پہنا دیتا ہے اور مادّی زندگی میں بھی فقر و تنگدستی میں گرفتار کر لیتا ہے اور اس کا دین برباد ہوتا ہے۔" [۱]

اس حدیث سے اچھی طرح استفادہ کیا جا سکتا ہے کہ ترکِ جہاد سے انسان معنوی زندگی کو بھی خطرے میں ڈالتا ہے اور مادی زندگی کو بھی۔ رسول اکرم ﷺ کی ایک دوسری حدیث میں ہم پڑھتے ہیں جو کہ حضرت امام الصادق علیہ السلام سے نقل ہوئی ہے:

"أُغْزُوا تُوَرِّثُوا أَبْنَائَكُمْ مَجْدًا"

"جنگ کرو تا کہ اپنی اولاد کے لیے عظمت و سربلندی کو میراث میں قرار دو۔" [۲]

نہج البلاغہ کے کلماتِ قصار میں آپؑ نے فلسفۂ جہاد کو بیان کرتے ہوئے فرمایا:

"وَالْجِهَادُ عِزًّا لِلْإِسْلَامِ" [۳]

"خدا نے جہاد کو اسلام اور مسلمانوں کے لیے عزت و سربلندی کا باعث قرار دیا ہے۔"

جہاد کے سلسلے میں نہج البلاغہ کے مختلف خطبوں میں بہت سارے مطالب بیان کیے گئے ہیں، جو انشاء اللہ آئندہ بیان کیے جائیں گے۔

۲۔ کیا اسلامی جہاد صرف دفاعی ہے؟

یہ سوال کئی برسوں سے مسلمان دانش وروں کے درمیان گردش کر رہا ہے۔ ایک گروہ کی کوشش یہ ہے کہ زمانہ پیغمبرؐ کے دور میں ہونے والے تمام غزوات کو دفاع کی شکل میں پیش کرے تا کہ اسلام پر یہ الزام عائد نہ ہو کہ یہ مذہب تلوار کے

[۱] بحار الانوار، ج ۹۸، ص ۹

[۲] اصول کافی، ج ۵، ص ۸

[۳] کلمات قصار، ۲۵۲

www.shiabookspdf.com

زور سے پھیلا ہے یا دوسری تعبیر کے مطابق اسلامی نظام پر کشور کشائی اور اقتدار کو وسعت دینے کی تہمت نہ لگائی جا سکے۔

ان کے مقابل دوسرا دانشور گروہ ہے جس کا خیال ہے کہ غزوات اسلامی کو دو حصوں میں تقسیم کیا جانا چاہیے ایک دفاعی اور دوسرا جارحیت پر مبنی۔ یہاں تک کہ وہ اس کے قائل ہیں کہ آج کل کے مسلمانوں پر بھی یہ دونوں طریقے واجب ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اسلام پر فرض ہے کہ وہ ظالم اور طاقتور دشمنوں کے چنگل میں پھنسی ہوئی مظلوم اقوام کو آزادی دلائے اور یہ ایک طرح کی جارحیت ہے۔ وہ یہ بھی لازم سمجھتے ہیں کہ اپنی منطقی تبلیغات کو پھیلانے کے لیے راہ ہموار کریں اس راہ میں آنے والی ہر رکاوٹ کو طاقت کے ذریعے اپنے راستہ سے ہٹا دیں اور یہ بھی جارحیت ہی کی ایک قسم ہے۔

اس جگہ ایک تیسرا نظریہ بھی سامنے آتا ہے اور وہ یہ کہ اسلامی جارحیت درحقیقت ایک دفاعی عمل ہے کیونکہ بعض اوقات دفاعی مسائل میں جارحیت ضروری ہو جاتی ہے۔ مثال کے طور پر ایسے مظلوموں کی حمایت جن پر تمام راستے بند کر دیے گئے ہوں یا آج کل کے زمانے میں انسانیت دوستانہ مداخلت اور اُن مظلوموں کا دفاع جو ظلم و ستم کا شکار ہیں، خواہ اس کے لیے طاقت استعمال کرنی پڑے، ہر مومن پر لازم ہے۔

اس کے علاوہ دوسرے مقصد یعنی تبلیغات منطقی کی راہ میں حائل دشواریوں کو دور کرنے کے لیے جارحیت کے استعمال کی اصل حقیقت بھی دفاعی ہے، یعنی اگر دشمن اس راہ میں رکاوٹیں کھڑی کرتا ہے تو اسلام اس کے مقابلے میں طاقت استعمال کرنے کی اجازت دیتا ہے۔

وہ تعبیریں جو پہلے خطبے میں دیکھنے میں آئی ہیں، وہ سب جہاد کے دفاعی ہونے پر واضح دلیل ہیں۔ کیونکہ ایک مقام پر جہاد کو "لباس" دوسرے مقام پر "زرہ" اور تیسرے مقام پر "ڈھال" سے تشبیہ دی گئی ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ یہ تینوں چیزیں حقیقت میں دفاع کے ذرائع ہیں۔ آنے والے جملوں میں ناگہانی حملوں جو کہ ایک دفاعی پہلو ہے کے حوالے سے کچھ لطیف اشارے ملتے ہیں۔ ان میں سے ایک جملے میں آپؑ ارشاد فرماتے ہیں:

"قُلْتُ لَكُمْ: اُغْزُوْهُمْ قَبْلَ أَنْ يَغْزُوْكُمْ"

"میں تمہیں کہتا ہوں، قبل اس کے کہ وہ تم پر حملہ کریں تم ان پر حملہ کرو (دشمن کے حملے کو روکنے کے لیے حملہ)۔"

اس اجتماعی اور مکمل قانون میں صرف ایک استثنا ہو سکتا ہے اور وہ بت پرستی ختم کرنے کے لیے جہاد کی اجازت ہے۔ کیونکہ اسلام بت پرستی کی لعنت کو انسانی معاشرے کے لیے معنوی اور مادّی دونوں لحاظ سے سب سے بڑا خطرہ تصور کرتا ہے۔ اسی لیے جہاں تبلیغ اور منطقی دلائل سے اسے ختم کرنا ممکن نہ ہو، وہاں جہاد کی اجازت دی گئی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ممکن ہے کہ ظالم حکمران، توسیع پسندانہ اور جارحانہ عزائم رکھنے والے اس خصوصی اجازت

www.shiabookspdf.com

(مظلوموں کے دفاع کی خاطر اور ثقافتی اور فکری انحطاط کے خلاف جہاد کرنا) کو اپنے مذموم ذاتی مفادات کے حصول کے لیے استعمال کرنے لگیں، لیکن ان مفاہیم کی اہمیت میں کوئی کمی نہیں آئے گی۔ مقدس مفاہیم اور عناوین کا غلط استعمال دنیا میں ہمیشہ سے ہوتا رہا ہے۔ جہاد کے اہداف کی مزید تفصیل کے لیے تفسیر نمونہ جلد دوم سورۂ بقرہ آیت ۱۹۳ کی تفسیر ملاحظہ کریں۔

دوسرا حصہ

اَلَا وَ اِنِّیْ قَدْ دَعَوْتُکُمْ اِلٰی قِتَالِ هٰٓؤُلَاءِ الْقَوْمِ لَيْلًا وَ نَهَارًا وَ سِرًّا وَ اِعْلَانًا وَ قُلْتُ لَكُمْ اغْزُوهُمْ قَبْلَ اَنْ يَغْزُوكُمْ فَوَاللّٰهِ مَا غُزِیَ قَوْمٌ قَطُّ فِیْ عُقْرِ دَارِهِمْ اِلَّا ذَلُّوا فَتَوَاكَلْتُمْ وَ تَخَاذَلْتُمْ حَتّٰی شُنَّتْ عَلَيْكُمُ الْغَارَاتُ وَ مُلِكَتْ عَلَيْكُمُ الْاَوْطَانُ وَ هٰذَا اَخُو غَامِدٍ [وَ] قَدْ وَرَدَتْ خَيْلُهُ الْاَنْبَارَ وَ قَدْ قَتَلَ حَسَّانَ بْنَ حَسَّانَ الْبَكْرِیَّ وَ اَزَالَ خَيْلَكُمْ عَنْ مَسَالِحِهَا وَ لَقَدْ بَلَغَنِیْ اَنَّ الرَّجُلَ مِنْهُمْ كَانَ يَدْخُلُ عَلَی الْمَرْاَةِ الْمُسْلِمَةِ وَ الْاُخْرٰی الْمُعَاهِدَةِ فَيَنْتَزِعُ حِجْلَهَا وَ قُلْبَهَا وَ قَلَائِدَهَا وَ رُعُثَهَا مَا تَمْتَنِعُ مِنْهُ اِلَّا بِالْاِسْتِرْجَاعِ وَ الْاِسْتِرْحَامِ ثُمَّ انْصَرَفُوا وَافِرِيْنَ مَا نَالَ رَجُلًا مِنْهُمْ كَلْمٌ وَ لَا اُرِيْقَ لَهُمْ دَمٌ فَلَوْ اَنَّ امْرَاً مُسْلِمًا مَاتَ مِنْ بَعْدِ هٰذَا اَسَفًا مَا كَانَ بِهٖ مَلُوْمًا بَلْ كَانَ بِهٖ عِنْدِیْ جَدِيْرًا.

"میں نے اس قوم (امیر شام اور شام کے حاکموں) سے لڑنے کے لیے رات بھی اور دن بھی، اعلانیہ بھی اور پوشیدہ طور پر بھی تمہیں پکارا اور تم سے کہا کہ قبل اس کے کہ وہ جنگ کے لیے بڑھیں، تم ان پر دھاوا بول دو۔ خدا کی قسم جن قوموں پر ان کے گھروں کی حدود کے اندر ہی حملہ ہو جاتا ہے وہ ذلیل و خوار ہوتے ہیں۔ لیکن تم نے جہاد کو دوسروں پر ٹال دیا اور ایک دوسرے کی مدد سے پہلو تہی کرنے لگے۔ یہاں تک کہ تم پر غارت گریاں ہوئیں اور تمہارے شہروں پر زبردستی قبضہ کر لیا گیا۔ (اب سنو! شام کا ایک ظالم حاکم) اخو غامد (سفیان ابن عوف، جو کہ بنی غامد سے ہے) ہی کو دیکھ لو کہ اس کی فوج کے سوار شہر انبار کے اندر پہنچ گئے اور (میرے گورنر اور نمائندے) حسان ابن حسان بکریؒ کو قتل کیا اور تمہارے محافظ سواروں کو سرحدوں سے ہٹایا۔ اور مجھے تو یہ اطلاعات بھی ملی ہیں کہ اس جماعت کا ایک آدمی مسلمان اور ذمی عورتوں کے گھروں میں گھس جاتا تھا اور ان کے پیروں کے زیور، ہاتھوں سے کنگن، گلوبند اور گوشوارے اُتار لیتا تھا اور ان کے پاس اس سے حفاظت کا کوئی ذریعہ نظر نہیں آتا تھا، سوائے اس کے کہ "انّا للّٰہ و انّا الیہ راجعون" کہتے ہوئے صبر سے کام لیں یا خوشامد کر کے اس سے رحم کی التجا کریں۔ (ان تمام مظالم کے بعد) وہ بہت سے مالِ غنیمت کے ہمراہ اپنے شہر کی جانب پلٹ گئے، نہ کسی کو زخم آیا نہ

www.shiabookspdf.com

خون بہا۔ اب اگر کوئی مسلمان ان سانحات کے بعد رنج و ملال سے مرجائے تو اسے ملامت نہیں کی جاسکتی بلکہ میرے نزدیک ایسا ہی ہونا چاہیے۔"

شرح وتفسیر

اگر کوئی اس غم میں مرجائے تو وہ اسی کا سزاوار ہے

خطبے کے اس حصے میں امامؑ جہاد کی تمام خصوصیات اور اہمیت کے تفصیلی اور جامع بیان کے بعد خطبے کے اصل موضوع پر گفتگو فرماتے ہیں اور ترکِ جہاد کے بدترعواقب میں سے ایک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"أَلَا وَ إِنِّي قَدْ دَعَوْتُكُمْ إِلَى قِتَالِ هٰؤُلَاءِ الْقَوْمِ لَيْلًا وَ نَهَارًا، وَ سِرًّا وَ إِعْلَانًا وَ قُلْتُ لَكُمْ: اُغْزُوهُمْ قَبْلَ أَنْ يَغْزُوكُمْ"

"آگاہ ہوجاؤ کہ میں دن ورات کی خاموشی میں بھی اور اعلانیہ بھی تم لوگوں کو اس گروہ (امیر شام اور شام کے حاکموں) سے جنگ کے لیے تیار ہونے کے لیے کہتا رہا ہوں کہ قبل اس کے کہ وہ تم پر حملہ کریں تم ان سے جنگ شروع کردو۔"

میں نے تمہیں یہ بھی بتایا کہ اس ظالم اور ستمگر گروہ کی فطرت میں توسیع پسندی اور جارحیت چھپی ہوئی ہے اور جب بھی انہیں موقع ملتا ہے بے گناہوں کے قتل، ان کے اہل وعیال کو قید اور ان کے اموال کو لوٹنے سے دریغ نہیں کرتے۔ لہٰذا عقل و شرع تمہیں اجازت دیتے ہیں کہ ان کی جڑ و بنیاد کو ابتداء ہی میں درہم برہم کردو اور ان کی قوت اور طاقت کو ان کے تمہارے اوپر حملہ آور ہونے سے پہلے ہی پارہ پارہ کردو تاکہ فتنے کی آگ اس وسیلے سے بجھ جائے۔

اس کے بعد حضرتؑ اسی ضمن میں ایک اور اہم استدلال کے ساتھ روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں:

"فَوَاللهِ! مَا غُزِيَ قَوْمٌ قَطُّ فِي عُقْرِ دَارِهِمْ إِلَّا ذَلُّوا"

"خدا کی قسم ہر زمانے میں جب بھی کوئی قوم اپنے دشمن کو اپنے گھر پر حملہ کی اجازت دے دیتی ہے تو ذلیل وخوار ہو جاتی ہے۔"

یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ جب کوئی شخص اپنے ہی گھر میں دشمن کی دراندازی کا شکار ہوجاتا ہے تو وہ آسانی سے جذبہ مزاحمت ومقاومت کو کھو بیٹھتا ہے اور شکست تسلیم کرلیتا ہے۔

دوسری طرف حملہ آور گھر بار، شہر، علاقہ یا قومیت کا جو اس کے حملے کی زد میں آتی ہیں کوئی لحاظ نہیں رکھتا، وہ صرف

www.shiabookspdf.com

تباہی پھیلاتا ہے، قتل و غارت گری کرتا ہے اور پیش قدمی کرتا چلا جاتا ہے۔ آباد گھروں اور شہروں کو ویران اور سنسان کر دیتا ہے لیکن مدافعت کرنے والا مجبور ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ برداشت کرے، کیونکہ اس کے مال و متاع کی حفاظت اسے پابند کر دیتی ہے۔ یہی چیز اس کی سرگرمیوں کو محدود کر دیتی ہے اور بعض اوقات اسے شکست سے دوچار کر دیتی ہے۔ اس کے علاوہ جب کسی کے گھر پر حملہ ہوتا ہے کہ اکثر اوقات اس کے بیوی بچے بھی جنگ میں شامل ہو جاتے ہیں۔ حملہ آور ان کا کوئی لحاظ کیے بغیر خوں ریزی کرتا ہے، لیکن گھر کا مالک ان کی حفاظت کے مسئلے کی وجہ سے پوری طرح دفاع نہیں کر سکتا، یہ سب مسائل صاحب خانہ کے دفاع کو اور دشوار کر دیتے ہیں۔ یہ سب امور اور اسی جیسی دوسری وجوہات اُن قوموں کی شکست کی دلیل ہیں جو اپنے دشمنوں کو اپنے شہر اور ملک پر حملہ کرنے کی اجازت دے دیتی ہیں۔ اسی وجہ سے چند غزوات کے علاوہ دوسرے اسلامی غزوات میں مجاہدین کو اس بات کے پابند تھے کہ شہر سے باہر جائیں اور دشمنوں کے آنے سے پہلے اُن تک پہنچ جائیں۔

اس کے بعد امام نتیجۂ آخر کے طور پر فرماتے ہیں:

فَتَوَاكَلْتُمْ [۱] وَ تَخَاذَلْتُمْ حَتّٰى شُنَّتْ [۲] عَلَيْكُمُ الْغَارَاتُ وَ مُلِكَتْ عَلَيْكُمُ الْاَوْطَانُ۔

"لیکن تم لوگوں نے ہر کام نہ صرف دوسروں پر ڈال دیا ہے بلکہ ان کی مدد سے بھی ہاتھ اٹھالیا ہے جس کی وجہ سے دشمن پے در پے شدید حملے کر رہا ہے اور تمہاری زمینیں تمہارے قبضے سے نکل گئیں۔"

تَوَاكُلْ اصل میں اپنے کام کو دوسروں کی گردن پہ ڈالنے کو کہتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں اس کا مفہوم یہ ہے کہ ہر کوئی اپنی مسئولیت کو دوسروں کی ذمّے داری میں دے دے اور اس کے نتیجے میں میدان خالی کر دے۔

تخاذل، یہ ہے کہ اپنے دوست کی مدد کرنے سے چشم پوشی کر کے اُسے اُس کے حال پر چھوڑ دے۔ بالآخر رشتۂ اتحاد کی ڈور ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے اور دشمن بلا خوف و خطر حملہ کرے۔ یہ معاشرے کی ایک بدترین صفت ہے کہ لوگ اپنی ذمّے داریوں کو دوسروں کی گردن پر ڈال دیں، ہر کوئی اپنے کام سے کام رکھے اور اپنے دوسرے بھائیوں کو مصیبت کے وقت تنہا چھوڑ دے۔ اس کام کا یہی نتیجہ نکلتا ہے جو مولا علیؑ نے اوپر کی گفتگو میں بیان کیا ہے۔ یعنی دشمن کے لیے راہ ہموار ہوتی ہے کہ وہ بار بار حملہ کرے، آبادیوں اور شہروں کو یکے بعد دیگرے تہس نہس کر دے۔

اس کے بعد امام علی علیہ السلام آنکھوں دیکھا حال کے عنوان سے اخو غامدی (سفیان بن عوف غامدی) کے دردناک حملے

---

[۱] تواکلتم، وَکَلَ کے مادّے سے ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ دو یا اس سے زیادہ آدمی اپنی ذمّے داری دوسروں پر ڈال دیں۔

[۲] شُنَّت، شَنَن کے مادّے سے ہے جس کے معنی خشکی اور بوسیدگی کے ہیں۔ پھر ہر اس جگہ اس کا اطلاق ہونے لگا کہ جہاں پانی وغیرہ ہر طرف سے بہنے لگے۔ جیسا کہ پرانی مشک پھٹ جائے اور اس میں موجود پانی ہر طرف بکھر جائے۔ جملہ شنّت علیکم الغارات اُن مختلف اور مسلسل حملوں کی جانب اشارہ ہے جو شام کے لٹیروں نے عراق کے مختلف علاقوں پر کیے۔

www.shiabookspdf.com

کی روداد بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"وَ هٰذَا أَخُو غَامِدٍ وَ قَدْ وَرَدَتْ خَيْلُهُ الْأَنْبَارَ وَ قَدْ قَتَلَ حَسَّانَ بْنَ حَسَّانَ الْبَكْرِيَّ وَ أَزَالَ خَيْلَكُمْ عَنْ مَسَالِحِهَا"

"اب سن لو! شام کے غارت گر لشکر کے سپہ سالار اخو غامد نے شہر انبار پر حملہ کیا اور اس کا لشکر شہر میں داخل ہو گیا ہے۔ حسان ابن حسان بکریؓ (میرے نمائندے) کو شہید کیا ہے اور تمہاری سرزمین کی سرحدوں کی حفاظت کرنے والوں کو شہر سے نکال دیا ہے۔"

توجہ رہے کہ مسالح "مسلحہ" کی جمع ہے جو مرز اور سرحد کے معنی میں آیا ہے۔ کیوں کہ وہاں اسلحہ جمع کیا جاتا ہے اور سرحدوں کے محافظین ان کے ذریعے سرحدوں کی حفاظت کرتے ہیں۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اخو غامد نے انبار شہر (عراق اور شام کی سرحد کے قریب واقع ہے) پر حملہ کیا۔"أَزَالَ خَيْلَكُمْ عَنْ مَسَالِحِهَا" کی تعبیر بتاتی ہے کہ وہ بغیر کسی مزاحمت کے سرحدوں سے گزر کر شہر میں داخل ہو گیا۔اس قصے کی تفصیل خطبے کی ابتدا میں گزر چکی ہے۔

پھر امام عالی مقامؑ نے اخو غامد اور اس کے ظالم لشکر کی سفاکیوں پر سخت نکتہ چینی کرتے ہوئے فرمایا:

"وَ لَقَدْ بَلَغَنِي أَنَّ الرَّجُلَ مِنْهُمْ كَانَ يَدْخُلُ عَلَى الْمَرْأَةِ الْمُسْلِمَةِ، وَ الْأُخْرَى الْمُعَاهَدَةِ فَيَنْتَزِعُ حِجْلَهَا[1] وَ قُلْبَهَا[2] وَ قَلَائِدَهَا[3] وَ رُعُثَهَا[4] ،مَا تَمْتَنِعُ مِنْهُ إِلَّا بِالِاسْتِرْجَاعِ وَ الِاسْتِرْحَامِ"

"مجھے خبر ملی ہے کہ ان لوگوں میں سے کسی نے مسلمان و غیر مسلمان جن کی جان و مال اسلام کی پناہ میں تھی، خواتین کے گھروں میں داخل ہو کر کنگن، زیورات، چادروں، اور گوشواروں کو چھین لیا۔ حالانکہ ان کے پاس دفاع کے لیے فریاد اور رونے کے سوا کچھ نہ تھا۔"

اشارہ یہ ہے کہ کوئی ایک مسلمان بھی ان مسلم اور غیر مسلم (جو کہ اسلام کی پناہ میں تھے) عورتوں کے دفاع کے لیے نہ اٹھا، گویا ان کے سروں پر قبر کی مٹی پڑی ہو۔اتنی ننگ و عار ان کے سروں پر سوار تھی کہ ان کے مال و اسباب کو بھی لوٹا گیا اور ان کے ناموس پر حملے بھی ہوئے اور جو ان کی پناہ میں تھے وہ بھی ظلم و ستم کا شکار ہوئے۔ یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ نہج البلاغہ کے

---

[1] حِجل بروزن فِعل اور حَجل بروزن فَضل، اس کا معنی عرب کی عورتوں کی پنڈلی میں پہننے والی زینت کی چیز ہے۔ حَجَلَة (حجلہ) اس مخصوص کمرے کو کہا جاتا ہے کہ جہاں دلہن کو بناؤ سنگھار کی جاتا ہے۔

[2] قلب: بروزن قفل، کنگن کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

[3] قلائد، قلادہ کی جمع ہے جو کہ گلے کے ہار کے معنی میں ہے۔

[4] رُعث، بروزن شتر، گوشوارہ کے معنی میں ہے۔

www.shiabookspdf.com

مفسرین نے کلمہ "استرجاع" کی دو معنوں میں تفسیر کی ہے۔

پہلی تفسیر یہ ہے کہ "وہ گریہ وزاری جو انسان کے گلے سے ہچکی کی آواز میں نکلتی ہے" اور دوسری "اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ" کا کلمہ جو کہ معمولاً اُس سخت مصیبت کے وقت ادا کیا جاتا ہے جو کسی انسان کی بس کی بات نہیں۔

اس کے بعد مولا علیؑ فرماتے ہیں:

"ثُمَّ انْصَرَفُوا وَافِرِيْنَ مَا نَالَ رَجُلًا مِّنْهُمْ كَلْمٌ [1] وَلَا أُرِيْقَ لَهُمْ دَمٌ"

"وہ لوگ ان مظالم کے ڈھائے جانے کے بعد بہت سارے مال غنیمت کے ساتھ اپنے وطن پہنچے۔ یہاں تک کہ ان میں سے کسی نے بھی کوئی تکلیف سہی نہ ان کے جسم سے خون کا قطرہ بہا۔"

آخری نتیجے کے طور پر آپؑ نے یہ سخت جملہ فرمایا:

"فَلَوْ أَنَّ امْرَأً مُسْلِمًا مَاتَ مِنْ بَعْدِ هٰذَا أَسَفًا مَا كَانَ بِهِ مَلُوْمًا، بَلْ كَانَ بِهِ عِنْدِيْ جَدِيْرًا"

"اگر اس دردناک حادثے کی وجہ سے کسی مسلمان کی موت واقع ہو تو یہ ملامت کا باعث نہیں بلکہ میری نظر میں سزاوار ہے۔"

امامؑ نے اس مطلب کی گہرائیوں سے پردہ اُٹھایا اور وہ یہ کہ مسلمان ان حوادث پر یقین رکھتے ہوئے کیوں کوتاہی کرتے ہیں کہ دشمن بلاخوف وخطر ان پر حملہ کرتا ہے، ان کے مال واسباب کو لوٹتا ہے حتّٰی کہ ناموس پر تجاوز کرتا ہے اور کوئی موقع ضائع کئے بغیر بھرے ہاتھ اپنے گھر واپس جاتا ہے۔ جی ہاں۔ کوئی باعزت مسلمان اس دردناک حادثے کو برداشت نہیں کرسکتا۔ اگر کوئی اس غم واندوہ اور غصّے میں مرجائے تو قباحت نہیں ہے۔ توجہ دینے کی ضرورت ہے کہ ناموس پر تجاوز، مسلم و غیر مسلم خواتین کے زیورات کو چھیننا اور ان کی ہتکِ عزت ایک ساتھ بیان ہوئے ہیں۔ اس سے اوّلاً: معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں کسی کی ناموس کی کتنی اہمیت ہے، ثانیاً: اسلام اپنی پناہ میں آنے والے غیر مسلموں سے کتنا وفادار ہے کہ ان کے دفاع کا خیال رکھتا ہے۔

بہرحال اس اندوہ ناک واقعے کی گہرائیوں کو بیان کرنے سے اِمامؑ کا مقصود پورا ہوگیا۔ واضح رہے کہ یہ گفتگو صرف گزشتہ زمانے کے امیر شام کے لشکر کے انبار پر حملے سے مخصوص نہیں ہے، بلکہ ایک قاعدہ کلّی ہے جو کہ تمام مسلمانوں (آج یا کل) کے لیے صادق آتا ہے۔ گویا اِمام عالی مقامؑ آج کے مسلمانوں سے جو کہ مشرق ومغرب کے حملوں کی زد میں ہیں، ان کے مال اور ناموس خطرے میں ہیں اور یہ ان ظالموں، لیٹروں کی مقابلے میں اپنے دفاع سے غافل ہیں، مخاطب ہیں۔ اس

[1] كَلْمٌ زخم وجراحت کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

www.shiabookspdf.com

گفتگو سے ظاہر ہوتا ہے کہ کوئی مسلمان مردان ظالموں کی اسلامی سرزمین پر تجاوز، قبلۂ اوّل پر تجاوز، ان کے مراکز اور اموال پر حملے اور ہتک ناموس پر غصے کی وجہ سے مر جائے تو باعثِ ملامت نہیں ہے۔

نکات

ا۔ شکست و کامیابی بغیر دلیل کے نہیں

خطبے کے اس حصے میں امام عالی مقامؑ نے کسی بھی جنگ میں شکست و کامیابی کے لیے جنگی معاملات میں وسیع تجربے اور نئی معنوی و روحانی قوت کو اہم عامل قرار دیا ہے جن کی طرف مکتبِ اہل بیتؑ سے تعلق رکھنے والوں کو توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ آپؑ فرماتے ہیں۔ "شکست کا ایک اہم عامل مرعوب ہو جانا اور دشمن کو دھاوا بولنے دینا یہاں تک کہ دشمن گھروں میں داخل ہو جائیں۔ یہ عامل ایک ناقابل انکار حقیقت ہے۔ اس سلسلے میں ہم خطبے کی تفسیر میں وضاحت سے دلائل دے چکے ہیں۔

دوسرا عامل "تواکُل" ہے جس کے معنی اپنی ذمے داری کو کسی دوسرے کے کاندھے پر ڈال دینا ہے۔ اگر معاشرے میں ہر کوئی اپنی ذمے داری کو خود انجام دے، اپنے گناہ کو کسی پر نہ تھوپے اور اپنے حصّے کی ذمے داری نبھائے تو بہت کم شکست کا سامنا کرنا پڑے گا۔ بدقسمتی وہاں سے شروع ہو جاتی ہے جب کوئی اپنی ذمے داریوں سے فرار اختیار کرے اور دوسروں کو قصوروار ٹھہرائے۔ تو اس قسم کے معاشرے میں سب قصوروار ہوں گے اور دشمن کے مقابلے میں ایسے لوگوں کی شکست یقینی ہو جاتی ہے۔

تیسرا عامل تخاذُل ہے اور وہ یہ کہ کوئی بھی کسی حادثے کا شکار ہو دوسرے اُس کو اُس کے حال پر چھوڑ دیں، اس کی مدد نہ کریں۔ اگر کسی شہر پر حملہ ہو جائے اور دوسرے شہروں کے لوگ متاثرہ شہر والوں کی مدد نہ کریں تو یقینی بات ہے اس کے بدلے میں دوسرے شہر والے پہلے شہر والوں کی مدد نہیں کریں گے۔ اور سب تنہا اپنی اپنی تمام مشکلات کا مقابلہ کریں گے اس صورت میں دشمن کے حملوں کی کامیابی یقینی ہے۔ لیکن اگر صورت حال بدل جائے اور مسلمان اپنے دشمنوں پر دھاوا بول دیں، اجتماعی ذمے داریوں میں حصہ لیں، اسلام اور اسلامی ممالک کے دفاع کا احساس کریں اور جب کبھی کسی بڑے اسلامی ملک پر حملہ ہو جائے تو تمام اسلامی ممالک ایک ساتھ اٹھ کھڑے ہوں اور اس کی مدد کو پہنچ جائیں تو یقیناً کامیابی ان کے قدم چومے گی۔ خطبہ ۱۶۶ میں بھی اس مطلب کے کچھ حصوں کی طرف اشارہ ہوتا ہے:

www.shiabookspdf.com

"أَيُّهَا النَّاسُ! لَوْ لَمْ تَتَخَاذَلُوْا عَنْ نَصْرِ الْحَقِّ وَ لَمْ تَهِنُوْا عَنْ تَوْهِيْنِ الْبَاطِلِ لَمْ يَطْمَعْ فِيْكُمْ مَنْ لَيْسَ مِثْلَكُمْ وَلَمْ يَقْوَ مَنْ قَوِيَ عَلَيْكُمْ."

"اے لوگو! اگر تم حق کی امداد اور نصرت سے پہلو نہ بچاتے اور باطل کو کمزور کرنے سے کمزوری نہ دکھاتے تو جو تمہارا ہم پلّہ نہ تھا، وہ تم پر دانت نہ رکھتا اور جس نے تم پر قابو پالیا وہ تم پر قابو نہ پاتا۔"

۲۔ مذہبی اقلیتوں کی حمایت

ممکن ہے بعض لوگ یہ تصور کرتے ہوں کہ مذہبی اقلیتوں کے احترام کا مسئلہ صرف ایک نعرہ ہے لیکن فقہ اسلامی اور اس خطبے میں امامؑ کے کلام کی تعبیروں پر توجہ دینے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام حقیقی معنوں میں اُن کا حامی ہے، جب تک اسلام کی مخالفت میں کوئی کام انجام نہ دیں، اُن کی جان و مال اور عزت وآبرو محفوظ ہے۔

اس خطبے میں امامؑ نے شدید ناراضی کا اظہار کیا ہے کہ شام کے لیٹروں نے یہودی و نصرانی عورتوں (جو اسلام کی پناہ میں ہیں) کے زیورات کیوں لوٹ مار کر کے چھین لیے، یہاں تک کہ امامؑ نے انہیں مسلمان خواتین کے برابر قرار دیا اور ان دونوں (مسلمان وغیر مسلمان خواتین) کی نسبت امام سخت پریشانی اور بے قراری کا اظہار کرتے ہیں، کیوں اُن کی حرمت پامال ہوئی اور اُن کے زیورات چھینے گئے؟ مولاؑ ان لیٹروں کے مقابلے میں سستی روی کا مظاہرہ کرنے پر اہلِ عراق کو سخت ملامت اور سرزنش کرتے ہیں۔

۳۔ دینی غیرت

دینی غیرت کا مطلب یہ ہے کہ انسان احکام الٰہی اور حق وعدالت کی راہ میں ہونے والی بے قاعدگیوں پر خاموش نہ رہے اور ان سے لاپروائی نہ برتے بلکہ جس حد تک بے قاعدگیاں زیادہ ہوں اتنا ہی ان کے مقابلے میں جوش وخروش زیادہ دکھائے۔ جو ان اُمور کے مقابلے میں سردمہری دکھائے گا اور نظر انداز کرے گا وہ بے غیرت شمار ہوگا۔ قرآن مجید بعض باایمان جنگجوؤں جنھوں نے وسائل کی کمی کی وجہ سے میدان جنگ میں شرکت نہ کی، کے بارے میں فرماتا ہے:

"وَّلَا عَلَى الَّذِيْنَ اِذَا مَآ اَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَآ اَجِدُ مَآ اَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ ۠ تَوَلَّوْا وَّاَعْيُنُهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا اَلَّا يَجِدُوْا مَا يُنْفِقُوْنَ ۝" [1]

---

[1] سورۂ توبہ، آیت ۹۲

www.shiabookspdf.com

"اور نہ ہی ان لوگوں پر کوئی الزام ہے جو تمہارے پاس آئے کہ تم ان کے لیے سواری بہم پہنچا دو اور تم نے کہا کہ میرے پاس (تو کوئی سواری) موجود نہیں کہ تم کو اس پر سوار کروں تو وہ لوگ (مجبوراً) پھر گئے اور حسرت (وافسوس) سے اس غم میں کہ ان کو خرچ میسّر نہ آیا ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔"

یہ کون سا عامل ہے جو ان افراد کو جو ذرائع کی عدم دستیابی کی بنا پر جہاد میں شرکت سے محروم ہو جاتے ہیں، زار و قطار رونے پر مجبور کر دیتا ہے (توجہ رہے کہ اس جگہ "تفیض" کے معنی بہت زیادہ آنسو بہانا ہے) یہ چیز سوائے غیرت دینی کے کچھ نہیں۔

اسی زیرِ بحث خطبے میں امامؑ اس صورتحال کی سنگینی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"اگر کوئی مسلمان اس جانکاہ حادثے کے صدمے سے مر جائے تو موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا بلکہ میرے خیال میں وہ اسی کا سزاوار ہے۔"

دینی حمیت و غیرت قوانین اسلام کی سرحدوں اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی دفاع کے لیے ایک اہم عنصر ہے۔

توجہ رہے کہ امام صادق علیہ السلام کی حدیث میں آیا ہے کہ خداوند عالم نے دو فرشتوں کو ایک قوم کے عذاب پر مامور کیا۔ جب وہ اپنی ذمے داری کو انجام دینے اس جگہ پہنچے تو ایک آدمی جو ظاہراً نورانی، صالح اور پرہیز گار تھا، کو دیکھا جو بارگاہِ خداوندی میں تضرّع اور گریہ کر رہا تھا۔ ان میں سے ایک نے دوسرے سے کہا: اس دُعا مانگنے والے کو دیکھا؟ دوسرے نے کہا، ہاں لیکن میں اپنی ذمے داری کو انجام دے رہا ہوں۔"

دوسرے نے کہا، میں کچھ نہیں کروں گا یہاں تک پروردگار کی بارگاہ میں پہنچوں اور دوسرا حکم لوں۔ جب اُس نے بارگاہ ایزدی میں عرض کیا، پروردگار! میں ایک ایسے شہر میں پہنچا جہاں تیرے ایک بندے کو دیکھا کہ حالت فریاد و تضرّع میں ہے۔ حکم ملا کہ جاؤ! اپنی مسئولیت کو انجام دو اور شہر کو تباہ کر دو۔ "فَإِنَّ ذٰلِكَ رَجُلٌ لَمْ يَتَغَيَّرْ وَجْهُهُ غَضَبًا لِي قَطُّ" وہ ایسا آدمی ہے کہ میرے خوف سے اس کا چہرہ ہرگز متغیر نہیں ہوتا اور ذرّہ برابر دینی غیرت نہیں رکھتا۔ [1]

تیسرا حصّہ

فَيَا عَجَبًا عَجَبًا وَ اللهِ يُمِيتُ الْقَلْبَ وَ يَجْلِبُ الْهَمَّ مِنَ اجْتِمَاعِ هٰؤُلَاءِ الْقَوْمِ عَلٰى بَاطِلِهِمْ وَ

[1] بحار الانوار، ج ۹۷، ص ۸۹، حدیث ۶۰

www.shiabookspdf.com

تَفَرُّقِكُمْ عَنْ حَقِّكُمْ فَقُبْحاً لَكُمْ وَ تَرَحاً حِيْنَ صِرْتُمْ غَرَضاً يُرْمٰى يُغَارُ عَلَيْكُمْ وَلَا تُغِيْرُوْنَ وَ تُغْزَوْنَ وَلَا تَغْزُوْنَ وَ يُعْصَى اللهُ وَ تَرْضَوْنَ فَاِذَا اَمَرْتُكُمْ بِالسَّيْرِ اِلَيْهِمْ فِيْ اَيَّامِ الْحَرِّ قُلْتُمْ هٰذِهٖ حَمَارَّةُ الْقَيْظِ اَمْهِلْنَا يُسَبَّخْ عَنَّا الْحَرُّ وَ اِذَا اَمَرْتُكُمْ بِالسَّيْرِ اِلَيْهِمْ فِي الشِّتَاءِ قُلْتُمْ هٰذِهٖ صَبَارَّةُ الْقُرِّ اَمْهِلْنَا يَنْسَلِخْ عَنَّا الْبَرْدُ كُلُّ هٰذَا فِرَاراً مِنَ الْحَرِّ وَ الْقُرِّ فَاِذَا كُنْتُمْ مِنَ الْحَرِّ وَ الْقُرِّ تَفِرُّوْنَ فَاَنْتُمْ وَ اللهِ مِنَ السَّيْفِ اَفَرُّ.

"العجب ثم العجب۔ خدا کی قسم باطل پران لوگوں کا ایکا کرنا اور تمہاری جمعیت کا حق سے منتشر ہونا دل کو مردہ کردیتا ہے اور رنج واندوہ بڑھا دیتا ہے۔ تمہارا بُرا ہو تم غم وحزن میں مبتلا رہو۔ تم تو تیروں کا ازخود نشانہ بنے ہوئے ہو۔ تمہیں ہلاک وتاراج کیا جارہا ہے مگر تمہارے قدم حملے کے لیے نہیں اُٹھتے، وہ تم سے لڑ بھڑ رہے ہیں اور تم جنگ سے جی چرا رہے ہو۔ اللہ کی نافرمانیاں ہورہی ہیں اور تم راضی ہورہے ہو۔ اگر گرمیوں میں ان کی طرف بڑھنے کے لیے کہتا ہوں تو تم کہتے ہو یہ انتہائی شدت کی گرمی کا زمانہ ہے اتنی مہلت دیجیے کہ گرمی کا زور ٹوٹ جائے۔ اگر سردیوں میں چلنے کے لیے کہتا ہوں تو تم کہتے ہو کہ کڑاکے کا جاڑا پڑ رہا ہے اِتنا ٹھہریے کہ سردی کا موسم گزر جائے۔ جب یہ سردی اور گرمی سے بچنے کے لیے باتیں ہیں۔ جب تم سردی اور گرمی سے اس طرح بھاگتے ہو تو پھر خدا کی قسم! تم تلواروں کو دیکھ کر اس سے کہیں زیادہ بھاگو گے۔"

شرح وتفسیر

وہ اپنے باطل پر متحد ہیں اور آپ اپنے حق پر منتشر ہیں

خطبے کے اس حصے میں حضرت امام علی علیہ السلام نے شکست وکامیابی کے دوسرے پہلو کو بیان کیا اور اہل کوفہ وعراق کی پہلوتہی کی مذمت کی تا کہ ممکن ہے کہ یہ بیان مردہ ضمیروں کو زندہ کرے اور قبل اس کے کہ ملک کی حالت مزید بگڑ جائے، بیدار ہوں اور دشمن کے مقابلے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوں۔ سب سے پہلے آپؑ فرماتے ہیں:

"فَيَا عَجَبًا![1] عَجَبًا- وَ اللهِ - يُمِيْتُ الْقَلْبَ وَ يَجْلِبُ الْهَمَّ مِنِ اجْتِمَاعِ هٰؤُلَاءِ الْقَوْمِ عَلٰى بَاطِلِهِمْ، وَ تَفَرُّقِكُمْ عَنْ حَقِّكُمْ"

[1] یا عجبا عجبا، اس کے متعلق بعض شارحین نہج البلاغہ نے کہا ہے کہ یہ دراصل عَجِبْتُ عَجَبًا تھا۔ بعنوان مفعول مطلق منصوب ہے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ پہلا مفعول مطلق ہو اور دوسرا تاکید کے لیے ہو۔ شرح نہج البلاغہ ابن میثم ج ۲ ص ۳۶

www.shiabookspdf.com

"واعجب ثم العجب! خدا کی قسم اِن لوگوں کا باطل پر متحد ہونا اور تمہارا حق پر ہوتے ہوئے منتشر ہونا دل کو مردہ کر دیتا ہے، غم واندوہ بڑھادیتا ہے۔ وہ (شام کے لُٹیرے) اپنے باطل پر متحد ہیں اور تم اپنے حق پر منتشر ہو۔"

ہمیشہ تعجب اس بات پر ہوتا ہے جسے طبیعت قبول نہیں کرتی ہے اور جس کی علّتیں نا قابلِ یقین ہوں۔ طبیعت اس چیز کا تقاضا کرتی ہے کہ حق کے طرف دار اپنے ایمان محکم کے ساتھ استقامت کریں اور دفاع کریں۔ باطل کے طرف داروں کو دفاع کے لیے طاقت ور ہونے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ اس لحاظ سے ان کی حمایت میں کمی اور سستی نظر آنی چاہیے۔ لیکن اگر ہم دیکھیں کہ حق کے طرف دار منتشر، کمزور ارادے کے حامل، سست اور ضعیف ہیں جبکہ باطل پرست متحد اور اپنے ارادوں میں مستحکم ہیں تو تعجب ہوتا ہے۔

حضرت علی علیہ السلام اہلِ عراق کے پیشوا تھے۔ ولایت میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جانشین برحق ہونے کی وجہ سے تمام مکہ و مدینہ کے لوگ، مہاجرین وانصار وغیرہ اور دوسری اکثر جگہوں کے لوگوں نے آپؑ کی بیعت کی تھی۔ آپؑ کی حقانیت کی دلیل آپؑ کے زہد، اعمال، افکار اور عدالت سے نمایاں تھی۔ مگر شام کے لُٹیرے ایک ایسے شخص کے نقش قدم پر چلے جس کی لوٹ مار، جاہ طلبی اسلام اور دور جاہلیت میں اُس کے بڑے خاندان کا حال کسی سے ڈھکا چھپا نہیں۔ اس نے امامؑ کے مقابلے میں طوفان برپا کیا۔ کیا یہ مقام تعجب نہیں ہے کہ وہ اپنے پیشوا کی حمایت میں اُس کے پیچھے کھڑے ہیں اور یہ (مسلمان) اس طرح کی عہد شکنی کریں؟ یہی مقام ہے کہ جہاں امامؑ سخت ناراض ہو رہے ہیں اور اُنہیں سرزنش اور ملامت کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ اسی کے حقدار ہیں۔ آپؑ فرماتے ہیں:

"فَقُبْحاً لَکُمْ وَ تَرَحاً[1]، حِیْنَ صِرْتُمْ غَرَضاً یُرْمیٰ"

"تمہارا برا ہو، تم حزن وملال میں مبتلا ہو۔ تم تیروں کا از خود نشانہ بنے ہوئے ہو۔"

"یُغَارُ عَلَیْکُمْ وَلَا تُغِیْرُوْنَ۔"

"تمہیں ہلاک وتاراج کیا جارہا ہے مگر تمہارے قدم حملے کے لیے نہیں اُٹھتے۔"

"وَ تُغْزَوْنَ وَلَا تَغْزُوْنَ"

"وہ تم سے لڑ رہے ہیں اور تم جی چرا رہے ہو۔"

"وَیُعْصَی اللہُ وَ تَرْضَوْنَ"

"اللہ کی نافرمانیاں ہو رہی ہیں اور تم راضی ہو۔"

---

[1] تَرَحاً، اندوہ وغم کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ امامؑ نے بطور نفرین کہا ہے: عنقریب تم غم واندوہ میں گرفتار ہو جاؤ گے۔

www.shiabookspdf.com

حقیقت میں امام عالی مقامؑ نے سرزنش اور ملامت کے بارے میں اپنی دلیل کو چند چیزوں میں سمیٹا ہے، جن کی جڑ ایک ہی چیز ہے اور وہ سستی و کاہلی ہے، جس کی وجہ سے دشمن اس طرح جسارت کرے کہ بار بار حملے کرے، لوٹ مار کرے اور بے گناہوں کا خون بہادے اور یہ لوگ (مسلمان) ان غمگین اور ناروا واقعات پر خاموش تماشائی بنے بیٹھے ہیں۔

امامؑ نے ان کی سستی، کمزوری اور کم ہمتی کی وجہ سے ہمیشہ محکوم رہنے پر ایک واضح دلیل کی طرف اشارہ کیا ہے:

"فَإِذَا أَمَرْتُكُمْ بِالسَّيْرِ إِلَيْهِمْ فِي أَيَّامِ الْحَرِّ قُلْتُمْ: هٰذِهِ حَمَارَّةُ[۱] الْقَيْظِ[۲]؛ أَمْهِلْنَا يُسَبَّخُ[۳] عَنَّا الْحَرُّ. وَ إِذَا أَمَرْتُكُمْ بِالسَّيْرِ إِلَيْهِمْ فِي الشِّتَاءِ. قُلْتُمْ: هٰذِهِ صَبَارَّةُ الْقُرِّ. أَمْهِلْنَا يَنْسَلِخُ[۴] عَنَّا الْبَرْدُ!"

"اگر گرمیوں میں ان کی طرف بڑھنے کو کہتا ہوں تو تم کہتے ہو یہ انتہائی گرمی کا زمانہ ہے، اتنی مہلت دیں کہ گرمی کا زور ٹوٹ جائے۔ اگر سردیوں میں چلنے کے لیے کہتا ہوں تو تم کہتے ہو کہ کڑا کے کا جاڑا پڑ رہا ہے اتنا ٹھہریے کہ سردی کا موسم گزر جائے۔"

"كُلُّ هٰذَا فِرَارًا مِنَ الْحَرِّ وَ الْقُرِّ"[۵]

"لیکن یہ سردی و گرمی کے بہانے سے فرار کا راستہ ڈھونڈتے ہیں۔"

"فَإِذَا كُنْتُمْ مِنَ الْحَرِّ وَ الْقُرِّ تَفِرُّونَ، فَأَنْتُمْ وَ اللهِ مِنَ السَّيْفِ أَفَرُّ"

"جب تم سردی اور گرمی سے بچنے کے لیے بھاگتے ہو تو پھر خدا کی قسم! تم تلواروں کو دیکھ اس سے کہیں زیادہ بھاگو گے۔"

گویا جنگ موسم بہار میں ہونی چاہیے۔ وہاں پر بھی پھولوں سے بھرے صحرا، چہچہاتے پرندے، آبشار اور روح کو تازگی دینے والی ہوائیں ہونی چاہئیں، جہاں سپاہی بیٹھیں اور دشمنوں کو اپنی آنکھ کے اشاروں سے شکست دے دیں۔

زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ ان بے خبر لوگوں نے پوری تاریخ اسلام کو بھلا دیا۔ پیغمبر اکرمؐ کے صحابہ نے مدینے اور تبوک

---

[۱] حمارۃ: حمر کے مادّے سے ہے، اس کے معنی سرخ رنگ کے ہیں یعنی گرمی کی شدت سے آگ کی طرح سرخ ہونا۔

[۲] قیظ۔ فیض کے وزن پر گرمی کی شدت کے لیے استعمال ہوا ہے۔

[۳] یُسَبَّخ۔ اس کا مادّہ سبخ ہے جس کے معنی فارغ ہونے کے ہیں۔ یہاں اس سے مراد گرمی کی تپش کا کم ہونا ہے۔

[۴] ینسلخ، یعنی سردی کی شدت سے بچنا۔

[۵] قُرّ، کہا جاتا ہے کہ اس کے دو معنی ہیں۔ پہلا: معنا سردی اور دوسرا معنی، جگہ لینا اور وہاں ٹھہرنا۔ ممکن ہے پہلا معنی بھی دوسرے معنی کی طرف پلٹے، کیوں کہ سردی کی شدت انسان کو کام سے روک دیتی ہے۔

www.shiabookspdf.com

کے درمیانی فاصلے کو اُس شدت کی گرمی میں، ننگے پاؤں طے کیا۔ پانی اور غذا کے ناکافی ہونے کے باوجود جنگوں میں نامناسب حالات کو برداشت کیا اور شیروں کی طرح دشمن پر حملہ کیا۔ اگر یہ کوفیوں کی طرح سُست ہوتے اور گرمی وسردی کو مدنظر رکھتے تو یہ اسلام کا تناور درخت کبھی ثمر آور نہ ہوتا۔ نہ صرف اسلام بلکہ دنیا کے کسی کونے میں بھی سپاہی سست، ڈرپوک اور منتشر ہوتے ہیں تو کبھی کامیابی حاصل نہیں کر پاتے ہیں بلکہ ذلیل وخوار اور شکست سے دوچار ہوتے ہیں۔ درحقیقت ان کی گفتگو کفار اور منافقین سے مشابہ ہے، جو کہتے تھے، لَا تَنۡفِرُوۡا فِی الۡحَرِّ "اس گرمی میں نہ نکلو۔"

قرآن جواب میں کہتا ہے:

قُلۡ نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا ؕ لَوۡ كَانُوۡا يَفۡقَهُوۡنَ ﴿۸۱﴾

"فرما دیجیے: دوزخ کی آگ سب سے زیادہ گرم ہے، اگر وہ سمجھتے ہوتے۔"[۱]

درحقیقت اہلِ کوفہ جو اس طرح کی فضول باتیں کرتے ہوئے اتنے سنگدل اور خونخوار دشمن سے جہاد سے گریز کرتے تھے، دراصل منافقت کا شکار تھے۔ ایسی منافقت جو اسلام کے اُصولوں، اور مولا علیؑ ابن ابی طالبؑ کی نسبت کمزور ایمان رکھنے کی وجہ سے پیدا ہوتی تھی۔ بہر حال حقیقی مجاہدین وہ ہیں جو مختلف میدانوں میں جوش و ولولے کے ساتھ جنگ کرتے ہیں اور کامیاب ہوجاتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو نہ آب و ہوا کی ناسازگاری کی پروا کرتے ہیں اور نہ راستے کی کٹھنائیوں کی فکر کرتے ہیں۔ بے شک اگر دشمن کو پتا چلے کہ مدِمقابل جنگجو تکلیف دہ گرمی وسردی میں جنگ کرنے سے گریز کرتے ہیں، تو وہ اُسی وقت اپنے حملے کو شروع کرتا ہے اور اس کمزوری سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اپنی کامیابی کے لیے چارہ جوئی کرتا ہے۔

نکات

ا۔ یہ تمام سرزنش اور ملامت کس لیے؟

امیر المومنین علیہ السلام کے فکر انگیز کلام کے مطالعے سے یہ سوال ذہن میں اُبھرتا ہے کہ مولاؑ جیسے منتظم اور صاحب تدبر پیشوا نے کیوں کوفے والوں پر سخت حملے کیے اور ترش روی سے پیش آئے؟ ان پر شدید سرزنش، اور ملامت کے تازیانے برسائے؟ اس کے علاوہ آپؑ مزید فرماتے ہیں:

---

[۱] سورۂ توبہ، آیہ ۸۱

www.shiabookspdf.com

"میں چاہتا تھا کہ تم لوگوں کو نہ دیکھوں اور نہ تم سے تعلق قائم کروں............اللہ تمہیں قتل کرے، تم لوگوں نے مجھے رنجیدہ کر دیا۔"

لیکن اگر ہم کوفہ و اہلِ کوفہ کی عہد شکنی، نفاق پھیلانے، بے وفائی اور کاہلی کا مطالعہ کریں تو اس شدید ملامت اور سرزنش کا فلسفہ واضح ہو جاتا ہے۔ گویا حضرت علی علیہ السلام نے ان عقل کے اندھوں کے لیے آخری دوا اور چارے کے طور پر یہ خطبہ ارشاد فرمایا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ کسی معاملے پر ان کی غیرت جوش نہیں مارتی تھی۔ دشمن کی طرف سے ہر قسم کی تحقیر اور جبری احکامات کو قبول کیا کرتے تھے۔ امامؑ اپنی اس طرزِ گفتار کے ذریعے چاہتے ہیں کچھ ایسا کام کریں کہ اگر ان (کوفیوں) کے دل میں تھوڑا سا بھی احساس ہے تو اٹھ کھڑے ہوں اور دشمن کے مقابلے میں قیام کریں۔ اس روش سے استفادہ کرنا نفسیاتی حوالے سے بعض گروہوں کے نزدیک مفید اور کارآمد ہوتا ہے۔

یہ گفتگو حقیقت میں ایسے شخص کی ہے جو اپنے پیروکاروں سے مایوس ہو، اور انہیں بیدار کرنے لیے اسکے پاس ان تند و تلخ کلمات سے استفادہ کرنے کے سوا کوئی دوسری راہ نہیں۔ عجیب بات ہے کہ ان سخت جملوں کے باوجود یہ لوگ بیدار نہ ہوئے۔ جب انہیں لشکر ترتیب دینے اور دشمن کی طرف حرکت کرنے کے لیے دعوت دی گئی تو تھوڑے سے گروہ کے سوا کسی نے لبیک نہ کہی۔ اسی وجہ سے امامؑ نے مجبور ہو کر کچھ لوگوں کو فرات کے اطراف کے دیہاتوں اور آبادی (جو کہ جنگجو اور امامؑ کے وفادار تھے) کی طرف بھیجا، تا کہ انہیں لشکر ترتیب دینے کی دعوت دیں۔

درحقیقت اس پوری تاریخ میں اہل کوفہ نے اپنے آپ کو بنی اسرائیل کی خود سر قوم جیسا ثابت کر دکھایا۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں بیت المقدس میں موجود دشمنوں پر حملے کے لیے ابھارا تو انہوں نے کہا:

"قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِنَّ فِيْهَا قَوْمًا جَبَّارِيْنَ ۖ وَاِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَا حَتّٰى يَخْرُجُوْا مِنْهَا ۚ فَاِنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا فَاِنَّا دٰخِلُوْنَ ﴿۲۲﴾ ...فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ﴿۲۴﴾" [1]

"انہوں نے کہا، اے موسیٰ! اس میں تو زبردست (ظالم) لوگ (رہتے) ہیں اور ہم اس میں ہرگز داخل نہیں ہوں گے یہاں تک کہ وہ اس (زمین) سے نکل جائیں، پس اگر وہ یہاں سے نکل جائیں تو ہم ضرور داخل ہو جائیں گے ـ ـ ـ ـ ـ پس تم جاؤ اور تمہارا رب (ساتھ جائے) سو تم دونوں (ہی ان سے) جنگ کرو، ہم تو یہیں بیٹھے ہیں۔"

چوتھا حصہ

[1] سورۂ مائدہ، آیات ۲۲ـ۲۴

www.shiabookspdf.com

يَا أَشْبَاهَ الرِّجَالِ وَلَا رِجَالَ حُلُومُ الْأَطْفَالِ وَعُقُولُ رَبَّاتِ الْحِجَالِ لَوَدِدْتُ أَنِّي لَمْ أَرَكُمْ وَلَمْ أَعْرِفْكُمْ مَعْرِفَةً وَاللهِ جَرَّتْ نَدَمًا وَأَعْقَبَتْ سَدَمًا قَاتَلَكُمُ اللهُ لَقَدْ مَلَأْتُمْ قَلْبِي قَيْحًا وَشَحَنْتُمْ صَدْرِي غَيْظًا وَجَرَّعْتُمُونِي نُغَبَ التَّهْمَامِ أَنْفَاسًا وَأَفْسَدْتُمْ عَلَيَّ رَأْيِي بِالْعِصْيَانِ وَالْخِذْلَانِ حَتَّى لَقَدْ قَالَتْ قُرَيْشٌ إِنَّ ابْنَ أَبِي طَالِبٍ رَجُلٌ شُجَاعٌ وَلَكِنْ لَا عِلْمَ لَهُ بِالْحَرْبِ لِلّٰهِ أَبُوهُمْ وَهَلْ أَحَدٌ مِنْهُمْ أَشَدُّ لَهَا مِرَاسًا وَأَقْدَمُ فِيهَا مَقَامًا مِنِّي لَقَدْ نَهَضْتُ فِيهَا وَمَا بَلَغْتُ الْعِشْرِينَ وَهَا أَنَا ذَا قَدْ ذَرَّفْتُ عَلَى السِّتِّينَ وَلَكِنْ لَا رَأْيَ لِمَنْ لَا يُطَاعُ.

"اے مردوں کی شکل وصورت والے نامردو! تمہاری عقلیں بچوں کی سی، اور تمہاری سمجھ حجلہ نشین عورتوں کی مانند ہے۔ میں تو یہی چاہتا تھا کہ نہ تم کو دیکھتا نہ تم سے جان پہچان ہوتی۔ ایسی شناسائی جو ندامت کا سبب اور رنج واندوہ کا باعث بنی ہے۔ اللہ تمہیں مارے، تم نے میرے دل کو پیپ سے بھر دیا ہے اور میرے سینے کو غیظ وغضب سے چھلکا دیا ہے، تم نے مجھے غم وحزن کے گھونٹ پے درپے پلائے، نافرمانی کرکے میری تدبیر اور رائے برباد کردی، یہاں تک کہ قُریش کہنے لگے کہ علیؑ ہے تو مردِ شجاع، لیکن جنگ کے طور طریقوں سے واقف نہیں۔ اللہ اُن کا بھلا کرے، کیا ان میں سے کوئی ہے جو مجھ سے زیادہ جنگ کا تجربہ رکھنے والا اور میدانِ وغا میں مجھ سے زیادہ کارنمایاں کیے ہوئے ہو۔ میں تو ابھی بیس برس کا بھی نہیں تھا کہ حرب و ضرب کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا اور اب ساٹھ سے اُوپر ہوگیا ہوں، لیکن اُس کی رائے ہی کیا جس کی بات نہ مانی جائے۔"

شرح وتفسیر

مجھے رنجیدہ خاطر کردیا

اس فکر انگیز خطبے کے آخر میں امامؑ نے ان کی رُوح پر ملامت وسرزنش کے تازیانے مارے تاکہ غفلت کی نیند سونے والے یہ متلوّن مزاج لوگ خواب غفلت سے بیدار ہوں اور اپنی آنکھیں کھولیں اور نظارہ کریں کہ جان لیوا حالات میں پھنسے ہوئے ہیں، شاید کہ یہ بیدار ہوں، مردانہ وار اور خدا کی پسند کے مطابق اِن شام کے لُٹیروں کے مملکت اسلامی کی طرف اٹھنے والے ہاتھ کاٹ دیں۔

سب سے پہلے آپؑ تین سخت جملوں کے ذریعے مخاطب ہوئے اور فرمایا:

"يَا أَشْبَاهَ الرِّجَالِ وَلَا رِجَالَ!"

www.shiabookspdf.com

"اے مردنُما نامردو!"

"حُلُوْمُ [۱] الْاَطْفَالِ"

"تمہاری خواہشیں بچوں کی طرح ہیں (معمولی سی بات پر دھوکا کھاتے ہیں، خوش ہو جاتے ہیں اور خطرے سے لاپروا ہوتے ہیں)"

"وَ عُقُوْلُ رَبَّاتِ [۲] الْحِجَالِ" [۳]

"تمہاری عقلیں حجلہ نشین عورتوں کی سی ہیں (سوائے عیش وعشرت اور زر وزیور کے کسی چیز کے خیال میں نہیں ہوتی ہیں)۔"

سب سے پہلے امامؑ نے اہل شام کی غیرت، شجاعت، مردانگی اور حمیت دینی کے نہ ہونے کی وجہ سے سرزنش کی، کیونکہ وہ شکل وصورت میں مرد تھے مگر مردوں کی صفات ان میں نہ تھیں۔ پھر آپؑ نے سخت لہجے میں فرمایا:

"لَوَدِدْتُ أَنِّيْ لَمْ أَرَكُمْ وَلَمْ أَعْرِفْكُمْ مَعْرِفَةً-وَاللهِ-جَرَّتْ نَدَمًا. وَ أَعْقَبَتْ سَدَمًا"

"میں چاہتا ہوں کہ میں تمہیں نہ دیکھوں اور تم سے جان پہچان نہ رکھوں، خدا کی قسم ایسی شناسائی جو ندامت اور غم و اندوہ کا باعث ہے۔"

اس مطلب پر تاریخ گواہ ہے کہ کوفہ وعراق کے لوگوں کی دوستی آپؑ کے پورے دورِ خلافت میں آپ کو سوائے غم واندوہ، جس کا سبب ان کی سستی بے وفائی، عہد شکنی، کمزوری، انتشار اور نفاق تھا، کے کوئی نتیجہ نہ دے پائی اور یہ گروہ صاحب تدبّر اور دانا امامؑ کی رہبریت وقیادت کی راہ میں عظیم مشکلات کا باعث ہوئے۔ طبیعی امر ہے کہ امامؑ آرزو وتمنا کریں کہ کاش انہیں کبھی نہ دیکھتے اور وہ آپؑ کے گرد جمع نہ ہوتے۔ بالآخر انہیں نفرین کا ہدف قرار دیتے ہوئے آپؑ نے فرمایا:

قَاتَلَكُمُ اللهُ! لَقَدْ مَلَأْتُمْ قَلْبِي قَيْحًا وَ شَحَنْتُمْ صَدْرِي غَيْظًا وَ جَرَّعْتُمُوْنِيْ نُغَبَ [۴] التَّهْمَامِ أَنْفَاسًا. وَ أَفْسَدْتُمْ عَلَيَّ رَأْيِيْ بِالْعِصْيَانِ وَ الْخِذْلَانِ حَتّٰى لَقَدْ قَالَتْ قُرَيْشٌ: إِنَّ ابْنَ أَبِيْ طَالِبٍ رَجُلٌ

[۱] حلوم۔ حِلم کے مادّے سے ہے جو کہ تنہائی پسندی کے معنی میں ہے۔ اور چوں کہ انسان نیند کی حالت میں ایک گوشے میں آرام سے خواب میں دکھائی دینے والے مناظر کو دیکھ رہا ہوتا ہے، اس لیے یہ لفظ خواب پر بھی منطبق ہوتا ہے۔

[۲] ربّات۔ ربّۃ کی جمع ہے یعنی کسی چیز کا مالک۔ تانیث کی علامت "تا" کے پیش نظر یہ لفظ مونث کے لیے استعمال ہوگا۔

[۳] حِجال۔ حجلہ کی جمع ہے، جو کہ عُجلہ کے وزن پر ہے۔

[۴] نغب۔ نغبۃ کی جمع ہے، جو کہ لقمہ کے وزن پر ہے، پانی وغیرہ کے گھونٹ کے معنی میں ہے۔ یعنی امامؑ نے اپنے غم واندوہ کو کڑوے مشروب سے تشبیہ دی ہے، جس کے مولاؑ نے گھونٹ بھرے۔

www.shiabookspdf.com

شُجَاعٌ، وَلٰکِنۡ لَا عِلۡمَ لَهٗ بِالۡحَرۡبِ۔"

"خدا تمہیں مارے اور اپنی رحمت سے دُور کرے اور لعنت میں گرفتار کرے۔[۱] تم سب نے مجھے رنجیدہ کیا اور میرے سینے کو غیض وغضب سے چھلکا دیا اور غم وحزن کے گھونٹ پے در پے پلا دیے، نافرمانی کر کے میری تدبیر اور منصوبے (دشمن کی سرکوبی اور ایک اسلامی معاشرے کے قیام) کو تباہ کر دیا، یہاں تک کہ دوست اور دشمن شک میں پڑ گئے، قریش جو میری سابقہ جنگوں سے واقف تھے کہنے لگے: ابوطالبؑ کا بیٹا ہے تو شجاع، مگر فنونِ جنگ سے واقف نہیں ہے۔"

عام طور پر قومیں اور ملّتیں اپنی مشکلات اور پسماندگی کا ذمے دار اپنے پیشواؤں اور رہنماؤں کو ٹھہراتی ہیں، مگر حقیقت اس کے برعکس ہے یعنی پیشوا بہت لائق ہے، لیکن پیروکاروں میں کمزوری اور فکری وفرہنگی انحطاط ہے۔ یہ بات ایک بزرگ پیشوا کے لیے تکلیف دہ ہیں کہ جس کے پیروکار سُست اور بے ارادہ ہوں اور کام کا نتیجہ ہمیشہ منفی ہو۔ اس کے باوجود وہ اپنے پیشوا کو ان تمام حالات کا ذمے دار ٹھہراتے ہیں۔

بالآخر اس خطبے کے آخر میں امام عالی مقامؑ قریش کے ایک گروہ کی ناروا باتوں کا جواب دیتے ہیں۔ قریش نے آپؑ کو فنون جنگ سے ناواقفیت کی تہمت دی۔ آپؑ نے فرمایا:

"لِلّٰهِ[۲] اَبُوْهُمْ وَهَلْ اَحَدٌ مِّنْهُمْ اَشَدُّ لَهَا مِرَاسًا[۳] وَاَقْدَمُ مَقَامًا مِّنِّيْ"

"خدا اُن کے والدین کی حفاظت کرے! کیا ان میں سے کوئی ہے جو جنگوں میں مجھ سے زیادہ پیش پیش رہا ہو اور میدانِ وغا میں مجھ سے زیادہ کارِ نمایاں انجام دیے ہوں۔"

"لَقَدْ نَهَضْتُ فِيْهَا وَمَا بَلَغْتُ الْعِشْرِيْنَ وَهَا اَنَاذَا قَدْ ذَرَّفْتُ[۴] عَلَى السِّتِّيْنَ وَلٰكِنْ لَا رَأْيَ لِمَنْ لَا يُطَاعُ۔"

"میں اس دن جنگ کے لیے تیار تھا (میدانِ جنگ میں قدم رکھا) جب میں ابھی بیس برس کا بھی نہ تھا اب ساٹھ سال کا ہو گیا ہوں (چالیس سال سے زیادہ جنگ کے ایک سپہ سالار یا پہلی صف کے دستے کے سپاہی کے طور پر تجربہ

---

[۱] قَاتَلَ کی تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ خدا اور اس کے حکم کے مدمقابل کھڑے تھے، یقینی طور پر ایسے لوگ مغلوب ہو جاتے ہیں اور بارگاہ الٰہی میں مردود واقع ہوتے ہیں، اسی لیے بہت سے مفسرین نے یہاں اور سورۂ توبہ کی آیت ۳۰ (قاتلهم الله) کے ذیل میں اسے لعن اور رحمتِ خداوندی سے دور ہونے سے تفسیر کیا ہے۔

[۲] لله ابو هم، یہ جملہ تعریف کے مقام پہ بولا جاتا ہے اور کبھی تعجب وحیرت کے وقت ادا کیا جاتا ہے۔

[۳] مراس اور ممارسة دونوں کا معنی یکساں ہے جو کہ مشق اور مرتبہ ہے۔

[۴] "ذرّفت" ذرف کے مادہ سے ہے، اور اشک بہانے کے معنی میں ہے۔

www.shiabookspdf.com

رکھتا ہوں) مگر کیا کروں؟ جس کی اطاعت نہ کی جائے اس کا تجربہ اور تدبیر کام نہیں آتے، خواہ وہ کتنا ہی تجربہ کار کیوں نہ ہو۔"

نکات

ا۔ نالائق پیروکار پیشواؤں کو ذمّے دار ٹھہراتے ہیں

بے شک کامیابی اور ناکامی بغیر وجہ کے نہیں ہوتی ہیں۔ وہ تمام لوگ یا بعض لوگ جو کامیابیوں اور ناکامیوں کو اتفاقی اور نامعلوم وجوہات سے نسبت دیتے ہیں، یہ ایسے لوگ ہیں جو نہیں چاہتے ہیں کہ تلخ حقیقتوں کا سامنا کریں اور ان کا تجزیہ و تحلیل کریں۔ اس قسم کے معمولی تجزیوں میں وہ حکومت، مدیریت اور آگاہی پر قدرت رکھنے کو کامیابی و ناکامی کا راز سمجھتے ہیں۔ حالاں کہ مسئلہ اس کے برعکس ہے۔ جذبات و آگاہی کے اعتبار سے پیشوا زیادہ طاقتور ہوتا ہے لیکن اس کے پیروکار کمزور، ڈرپوک، ارادوں میں کمزور اور تجربہ نہ ہونے کی وجہ سے اپنے پیشوا کی حکیمانہ ہدایات کو بخوبی نہیں سمجھ سکتے ہیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں ایک طاقتور رہنما اپنے پیروکاروں کی فساد کی آگ میں جل جاتا ہے اور یہ ایک لائق، مدبر اور حکیم رہبر کے لیے زیادہ دردناک ہے۔

آپ دیکھیں کہ اس خطبے میں علی علیہ السلام ایک شمع کی طرح دلسوزی سے فریاد کر رہے ہیں۔ اور اہلِ کوفہ کی ملامت و سرزنش کر رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی عہد شکنی، کمزوری اور انتشار نے نہ صرف دشمن بلکہ مولا علی علیہ السلام کے ان دوستوں کو بھی جنھوں نے امامؑ کی ہمرکابی میں غزوات میں ساتھ دیا تھا، امامؑ سے برگشتہ کر دیا اور انہوں نے بھی امامؑ کو فنونِ جنگ سے لاعلم قرار دیا امام علی علیہ السلام نے انہیں گزشتہ تاریخ یاد دلا دی اور فرمایا۔

میں چالیس سال سے کچھ زیادہ جنگوں میں کامیاب تجربہ رکھتا ہوں۔ وہ مجھے کیسے تہمت دے سکتے ہیں میں فنون جنگ سے ناواقف ہوں؟ میری مشکل کی جگہ کوئی اور ہے۔ میرے پاس ایسے پیروکار ہیں جن میں نظم وضبط کا فقدان ہے اور نافرمان ہیں۔ حساس معاملات میں وہ ہٹ دھرمی سے کام کرتے ہیں جس کا نتیجہ شکست ہے۔

جنگِ صفین کا ناموافق تجربہ، امیر شام و عمرو عاص کی شاطرانہ چالاکی کی داستان (قرآن کو نیزے پر اُٹھانے کا مسئلہ) اور اس سے بھی بڑھ کر ابوموسیٰ اشعری کی حکمیت کا مسئلہ اس مدعا کے لیے بہترین گواہی ہے۔

اِس دور میں تمام محققین بلکہ غیر محققین اس بات کو مانتے ہیں کہ اگر لشکرِ عراق میں سرکشی و نافرمانی نہ ہوتی تو جنگِ صفین میں یقینی کامیابی ہوتی اور وہ خونیں واقعات جو بنی اُمیہ کی حکومت کی وجہ سے تاریخ اسلام میں وقوع پذیر ہوئے، پیش

www.shiabookspdf.com

نہ آتے یہی وجہ ہے کہ تاریخ اسلام اور تاریخ زندگانیِ امام علیؑ میں جنگ صفین کے واقعات کو دردناک واقعات کے عنوان سے یاد کیا جا سکتا ہے اس لیے کہ اس کے منفی اثرات بہت بری طرح پھیلے ہوئے تھے اور حضرت علی علیہ السلام کے دل کو سخت تکلیف پہنچائی گئی تھی۔

نہ صرف علی علیہ السلام کے زمانے میں بلکہ آج بھی بہت سے عاقبت نااندیش لوگ امیرالمومنینؑ کی جنگی حکمت عملی اور امورِ مملکت کے انتظام کے بارے میں (اپنی تاریخ اسلام سے لاعلمی کی وجہ سے) اعتراض کرتے ہیں اور یہی آپؑ کی مظلومیت کا سب سے بڑا سبب ہے۔ وہ عظیم ہستی جس نے مالک اشترؒ کو ایسا فرمان دیا جس میں حکومت چلانے کے ایسے درخشندہ اصول ہیں جو تاریخ میں روزِ روشن کی طرح عیاں ہے اور چودہ سو سال گزرنے کے باوجود اُمورِ مملکت کے لیے ایک عالی شان دستور پیش کرتا ہے۔ محکم اصولوں پر استوار ہے۔ اُن کے فرامین "كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ تُؤْتِي أُكُلَهَا كُلَّ حِينٍ بِإِذْنِ رَبِّهَا" [۱] کا مصداق ہیں، جن سے دوست و دشمن بہرہ مند ہوتے ہیں۔ نہج البلاغہ میں موجود آپؑ کے خطبے اور خطوط سیاست میں آپؑ کی پختگی کا ثبوت دیتے ہیں۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ ان کے متعلق صحیح فیصلہ ہو۔

صرف یہی مقام نہیں کہ علی علیہ السلام اس مسئلے سے پردہ اُٹھاتے ہیں بلکہ بہت سارے مقامات پر اس تلخ حقیقت کی طرف اشارہ فرماتے ہیں کہ بے وفا، نافرمان اور خیانت کار لوگ میری تدبیر کو تباہ کر دیتے ہیں۔ اتفاق کی بات ہے کہ اسی داستان (لشکرِ شام کا شہر اَنبار پر حملہ) کے بعد آپؑ کے کلمات قصار ایک حصے میں بھی ہم پڑھتے ہیں:

"وَاللهِ مَا تَكْفُوْنَنِيْ أَنْفُسَكُمْ فَكَيْفَ تَكْفُوْنَنِيْ غَيْرَكُمْ إِنْ كَانَتِ الرَّعَايَا قَبْلِيْ لَتَشْكُوْا حَيْفَ رُعَاتِهَا وَ إِنَّنِي الْيَوْمَ لَاَشْكُوْ حَيْفَ رَعِيَّتِيْ كَأَنَّنِي الْمَقُوْدُ وَ هُمُ الْقَادَةُ أَوِ الْمَوْزُوْعُ وَ هُمُ الْوَزَعَةُ"

"تم اپنے آپ سے میرا بچاؤ نہیں کر سکتے، دوسروں سے کیا بچاؤ کرو گے۔ مجھ سے پہلے رعایا اپنے حاکموں کے ظلم و جور کی شکایت کیا کرتی تھیں مگر میں آج اپنی رعایا کی زیادتیوں کا گلہ کرتا ہوں گویا کہ میں رعیّت ہوں اور وہ حاکم، میں حلقہ بگوش ہوں اور وہ فرماں روا۔" [۲]

ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں:

"أُرِيْدُ أَنْ أُدَاوِيَ بِكُمْ وَ أَنْتُمْ دَائِيْ"

[۱] سورۂ ابراہیم، آیات ۲۴، ۲۵
[۲] کلمات قصار ۲۶۱

www.shiabookspdf.com

"میں چاہتا ہوں کہ اپنی بیماریوں کا علاج تمہارے وسیلے سے کروں مگر تم خود میری بیماری اور درد ہو۔"

اس کے بعد آپؑ نے بارگاہ خداوندی میں شکایت کی:

"اَللّٰهُمَّ قَدْ مَلَّتْ أَطِبَّاءُ هٰذِهِ الدَّاءِ الدَّوِيِّ وَ كَلَّتِ النَّزَعَةُ بِأَشْطَانِ الرَّكِيِّ! أَيْنَ الْقَوْمُ الَّذِيْنَ دُعُوْا اِلَى الْاِسْلَامِ فَقَبِلُوْهُ وَ قَرَأُوا الْقُرْاٰنَ فَأَحْكَمُوْهُ وَ هِيْجُوْا اِلَى الْقِتَالِ فَوَلِهُوْا وَ لَهَ اللِّقَاحِ اِلٰى أَوْلَادِهَا"

"پروردگار! اس تکلیف دہ بیماری کے علاج سے طبیعت عاجز آچکی ہے، بازو ان لوگوں کی اس بے عملی کی وجہ سے تھک گئے۔ کہاں ہے وہ قوم جسے اسلام کی دعوت دی گئی تو اُس نے نے قبول کی اور قرآن پڑھا تو اس پر عمل بھی کیا اور جہاد کے لیے پکارا گیا تو اس طرح عاشقانہ انداز میں بڑھے، جیسے دودھ پلانے والی اونٹیاں اپنے بچوں کی طرف جاتی ہیں۔" [۱]

اس تمام بحث سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ امامؑ کے لیے مشکلات کیوں پیدا ہو رہی تھیں اور آپؑ کی حکومت کو ناکام بنانے کی سازش اور اس کے عوامل کا اصل سرچشمہ کہاں تھا۔ اگر امامؑ کے گرد کوفے کے ان بے عمل اور ناکارہ افراد کے بجائے باعمل اور فرماں بردار لوگ ہوتے تو تاریخِ اسلام کی شکل دوسری ہوتی۔ [۲]

۲۔ ایک سوال کا جواب

نہج البلاغہ کے مفسرین نے یہاں پر ایک سوال اٹھایا ہے، کیا اس قسم کی سیاست (شدّت اور سختی سے لوگوں کی ملامت کرنا) لوگوں کے لیے صحیح ہے؟ کیا اس طرح کی گفتگو معاشرے میں تنہائی کا باعث نہیں؟

اس کے ساتھ ایک اور سوال کا اضافہ کرتے ہیں کہ امامؑ گفتار ورفتار، صبر واستقامت اور محبت وشفقت کا نمونہ تھے، تو ایسی صورتحال میں آپؑ نے لوگوں سے اس طرح گفتگو کرنا کیسے گوارا کیا؟ (بہت گہرا اور جامع سوال ہے)

لیکن جیسا کہ ہم نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے کہ یہ طرز بیان سست، لاپروا اور کمزور ارادوں کے مالک لوگوں کو احساس دلانے کے لیے آخری ذریعہ تھا۔ یہ وہ چیزیں ہیں کہ عام لوگوں کی زبان سے کہی جاتی ہیں (ایسا کام کرنا چاہیے کہ ان کی غیرت جوش میں آئے)

اس بنا پر اس طرح کا طرزِ بیان فصاحت وبلاغت سے ہم آہنگ ہے۔ علم کلام کے مطابق گفتگو حالات کے تقاضے

---

[۱] خطبہ ۱۱۹

[۲] پیام امام شرح نہج البلاغہ کی پہلی جلد کے مقدمے میں مولا علی کی شخصیت پر بحث ہو چکی ہے۔

www.shiabookspdf.com

کے مطابق ہونی چاہیے۔

یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ امام عالی مقام نے جہاد فی سبیل اللہ کی طرف لوگوں کو تشویق دلانے اور مادّی و معنوی اہلیتوں کو بیان کرنے کی خاطر یہ روش اختیار کی۔ نہج البلاغہ کے بعض شارحین کا یہ کہنا[1] کہ امام کا یہ بیان "لَا يَزِيدُنِي كَثْرَةُ النَّاسِ حَوْلِي عِزَّةً وَلَا تَفَرُّقُهُمْ عَنِّي وَحْشَةً" اس چیز کو بیان کرنے کے لیے ہے کہ آپؑ اپنے اطرافیوں کی تعداد کی زیادتی پر نہ تو کامیابی اور غرور کا احساس کرتے تھے اور نہ اُن کے بکھر جانے پر تنہائی کا احساس کرتے تھے، سمجھ میں نہ آنے والی بات ہے، اس لیے کہ بہر حال جنگوں میں افرادی قوت اور طاقت ور لشکر کا ہونا کارآمد ہے۔ کوئی بھی شخص ایک عظیم طاقتور لشکر سے اکیلا جنگ نہیں کر سکتا۔

۳۔ ایک اور سوال

اوپر بیان کیے ہوئے خطبے میں ذکر کیا گیا ہے کہ امامؑ نے ارشاد فرمایا: "میں اُس زمانے میں فنون جنگ سے واقف تھا جب کہ میری عمر بیس سال بھی نہیں تھی۔" اس جگہ یہ سوال پیش آتا ہے کہ ہجرت رسولؐ کے وقت امیر المومنین علیہ السلام کی عمر کم از کم ۲۳ سال تھی اور سب جانتے ہیں کہ تمام اسلامی جنگیں ہجرت کے بعد واقع ہوئیں، یہ تاریخی حقیقت آپؑ کے اس جملہ سے کس طرح مطابقت رکھتی ہے۔

ہم اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ یہ صحیح ہے کہ رسمی طور پر جنگیں ہجرت کے بعد شروع ہوئیں، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ مکہ کے قیام کے آخری کئی سال رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے اتنے سنگین اور خطرناک تھے جو کسی طرح حالت جنگ سے کم نہیں تھے ان میں سے ایک نمونہ مکہ کے مسلح شمشیر زنوں کا لیلۃ المبیت میں آنحضرتؐ کے گھر کا محاصرہ کرنا تھا جس میں امامؑ نے بے مثال ایثار کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی جان خطرے میں ڈال کر حضورؐ کی جان بچائی۔ یہاں تک کہ تواریخ میں ملتا ہے کہ اس سے پہلے بھی مشرکین مکہ حضورؐ کے قتل کی سازشیں کرتے رہتے تھے جس سے حفاظت کے لیے حضرت ابو طالبؑ مسلسل حضورؐ کی نگرانی کرتے رہتے تھے۔

مرحوم علامہ مجلسیؒ نے بحار الانوار میں نقل کیا ہے کہ جب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے گھر سے باہر نکلتے تو مکہ کے مشرکین کے بچے آپؐ پر پتھر برساتے تھے اور زخمی کر دیتے تھے۔ امیر المومنینؑ آپ کے دفاع کے لیے ان پر جوابی حملہ کرتے اور انہیں بھگا دیتے تھے۔ یہ اور ان جیسے بہت سے حادثات اس بات کا ثبوت دیتے ہیں کہ اگرچہ حضور اکرمؐ کی مکی

---

[1] فی ظلال نہج البلاغہ، جلد ۱، ص ۱۹۲

www.shiabookspdf.com

زندگی کے دوران مسلمانوں اور مشرکین کے درمیان باقاعدہ کوئی جنگ نہیں ہوئی لیکن حالت ایسی ہی تھی جو جنگ سے مشابہ تھی، جو امامؑ کی تدبیر سے جیتی گئی اور دفاع کی راہیں ہموار ہوئیں۔

شاید یہ جملہ "نَهَضْتُ فِيهَا وَمَا بَلَغْتُ الْعِشْرِينَ" جو اس خطبے میں وارد ہوا ہے جنگ کے لیے تیار رہنے کی طرف اشارہ ہو، نہ کہ آغازِ جنگ کی طرف۔

۴۔ ماجرا کا اندوہناک انجام

نہج البلاغہ کے بعض شارحین لکھتے ہیں کہ جس وقت انبار شہر پر شامیوں کے حملے، ان کی غارتگری اور خوں ریزی کی ناگوار خبر اور آپ کے نمائندہ حسان بن حسان بکریؓ کے شہید ہونے کی اطلاع امامؑ کو ملی تو آپؑ نے یہ خطبہ دیا اور کچھ دیر خاموش رہے تاکہ ملاحظہ کریں کہ کسی طرف سے کوئی مثبت جواب ملے، مگر جب سب خاموش رہے تو آپؑ سخت غصے کی حالت میں خود پیدل چل پڑے اور نخیلہ (کوفے میں لشکر کے قیام کی جگہ) پہنچ گئے۔ آپؑ کے پیچھے کچھ اور افراد بھی پہنچ گئے اور ایک گروہ نے عرض کی کہ یا امیر المومنین علیہ السلام آپ کوفہ واپس چلے جائیں، ہم آپؑ کی اس مشکل کو حل کر دیتے ہیں۔ امامؑ نے جواب دیا تم خود اپنی مشکلیں حل نہیں کر سکتے تو میری کیا مدد کرو گے، مگر ان کے بے انتہا اصرار کرنے پر آپؑ انتہائی غمگین اور رنجیدہ پلٹے اور "سعید بن قیس ہمدانی" کو سفیان بن عوف اور اس کے خونخوار لشکر کے تعاقب میں روانہ کیا، وہ آٹھ ہزار سپاہیوں کے ساتھ اس کے تعاقب میں گئے، لیکن وہ فرار ہو کر عراق کی سرحدوں سے باہر نکل چکا تھا۔

اس واقعے نے امیر المومنینؑ کو انتہائی رنجیدہ اور غمگین کر دیا تھا۔ محسوس ہوتا تھا کہ آپ ذاتی طور پر خطبہ کہنے کے لیے آمادہ نہیں تھے اور ایک روایت کے مطابق آپؑ نے اس خطبۂ جہاد کو لکھ کر سعد کو جو کہ آپؑ کا صحابی تھا، دیا تاکہ لوگوں کو سنا دیں۔

بہت سے لوگ خوابِ غفلت سے بیدار ہو گئے اور عذر خواہی کے طور پر امامؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بہت سے لوگوں نے دوسروں کو بھی ابھارنا شروع کیا، اسی دوران حجر بن عدیؓ اور سعید بن قیسؓ (جو آپ کے لشکر کے افسروں میں تھے) آپؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ آپؑ جو حکم دیں گے ہم اس کی اطاعت کریں گے ہماری زندگیاں آپؑ کے اختیار میں ہیں، آپؑ نے جواب دیا کہ دشمن سے مقابلے کے لیے روانہ ہونے کی تیاری کرو۔ اس سے امامؑ کی مراد لشکر امیر شام سے جنگ تھی۔ اس کے بعد آپؑ نے اپنے اصحاب سے مشورے کے بعد معقل بن قیس تمیمیؓ کو جو آپؑ کے بہت دلیر اور ہوشیار صحابی تھے، آس پاس کے علاقوں کی طرف روانہ کیا تاکہ مزید لشکر اکٹھا کیا جا سکے مگر معقلؓ کے کام مکمل کرنے سے پہلے

www.shiabookspdf.com

ہی امیرالمومنین علیہ السلام ابن ملجم کی زہر آلود شمشیر سے شہید ہو گئے۔

www.shiabookspdf.com

اٹھائیسواں خطبہ

خطبہ، ایک نظر میں [1]

یہ خطبہ امیرالمومنین علیہ السلام کے مشہور معروف خطبوں میں سے ایک ہے۔ کتاب "ارشاد" میں شیخ مفیدؒ کے قول کے مطابق یہ ایک ایسی گفتگو ہے کہ ہر صاحب عقل وفہم کے لیے ایک یادگار کی حیثیت رکھتی ہے، جسے وہ اپنے دلوں میں محفوظ رکھیں گے۔

سیّد رضیؒ کے قول کے مطابق (جیسا کہ آگے ذکر ہوگا) کہ انسانوں کو دنیا میں زہدو پرہیز گاری کی طرف جو چیز پوری قوت وتوانائی کے ساتھ لے جاتی ہے، وہ امامؑ کی یہی گفتگو ہے۔

بعض محققین نے اس مختصر خطبے کے بعض حصوں کو خطبہ ۲۵ میں شمار کیا ہے۔ امامؑ نے دس اہم نکات کے ذریعے آخرت کی طرف توجہ دلائی ہے اور دنیاوی زندگی میں تقویٰ و پرہیز گاری اس دنیا کی مادّی چمک دمک سے روگردانی اور آخرت کی ہمیشہ رہنے والی زندگی کی طرف متوجہ کیا ہے اور ان خطرات سے جو انسان کی سعادت مندی کے لیے نقصان دہ ہو سکتے ہیں، متنبہ کیا ہے۔

یہ خطبہ حقیقت میں اُن خطبوں میں سے ہے جو انسان کو دنیاوی زندگی میں زہدو تقویٰ کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ دنیا کی چمک دمک سے متنفر کرتے ہیں اور آخرت کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ اس کی تعبیریں اس قدر واضح ہیں کہ جو بھی تھوڑی بہت ہوشمندی سے کام لے خوابِ غفلت سے بیدار ہو جائے گا اور ہر حصے کو منطقی تجزیہ و تحلیل کے ساتھ اپنی تعبیرات میں پیش کرے گا۔

---

[1] یہ خطبہ شیعہ سنی کتابوں میں نقل ہے۔ البیان والتبیین، ج ۱، ص ۱۸۱، اعجاز القرآن، ص ۲۲۲، تحف العقول، عقد الفرید، ج ۲، ص ۳۰۶، مروج الذہب، ج ۲، ص ۴۱۳، علامہ مجلسیؒ نے بحارالانوار میں ارشاد مفید سے تھوڑے سے فرق کے ساتھ نقل کیا ہے۔

www.shiabookspdf.com

حصہ اوّل

اَمَّا بَعْدُ فَاِنَّ الدُّنْیَا اَدْبَرَتْ وَ اٰذَنَتْ بِوَدَاعٍ وَاِنَّ الْاٰخِرَةَ قَدْ اَقْبَلَتْ وَ اَشْرَفَتْ بِاطِّلَاعٍ اَلَا وَ اِنَّ الْیَوْمَ الْمِضْمَارَ وَ غَدًا السِّبَاقَ وَ السَّبَقَةُ الْجَنَّةُ وَ الْغَایَةُ النَّارُ اَفَلَا تَائِبٌ مِنْ خَطِیْئَتِهٖ قَبْلَ مَنِیَّتِهٖ اَلَا عَامِلٌ لِنَفْسِهٖ قَبْلَ یَوْمِ بُؤْسِهٖ اَلَا وَ اِنَّکُمْ فِیْ اَیَّامِ اَمَلٍ مِنْ وَرَائِهٖ اَجَلٌ فَمَنْ عَمِلَ فِیْ اَیَّامِ اَمَلِهٖ قَبْلَ حُضُوْرِ اَجَلِهٖ فَقَدْ نَفَعَهٗ عَمَلُهٗ وَلَمْ یَضْرُرْهُ اَجَلُهٗ.

"دنیا نے پیٹھ پھیر کر اپنے رخصت ہونے کا اعلان کر دیا اور آخرت نے سامنے آ کر اپنی آمد سے آگاہ کر دیا ہے۔ یاد رکھو آج کا دن تیاری کا ہے اور کل دوڑ کا ہوگا۔ جس طرف آگے بڑھنا ہے وہ تو جنّت ہے اور جہاں باعمل اشخاص پہنچ جائیں گے اور پیچھے رہ جانے والوں کا انجام دوزخ ہے۔ کیا موت سے پہلے اپنے گناہوں سے توبہ کرنے والا کوئی نہیں اور کیا اس روز مصیبت کے آنے سے پہلے عمل کرنے والا ایک بھی نہیں۔ تم امیدوں کے دور میں ہو (جہاں فرصت عمل بہت ہے) اس کے پیچھے موت کا ہنگام ہے۔ جو شخص موت سے پہلے ان امیدوں کے دنوں میں عمل کر لیتا ہے تو یہ عمل اس کے لیے سودمند ثابت ہوتا ہے اور موت اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی اور جو شخص ان فرصت عمل کے دنوں میں اور موت کے آنے سے پہلے یہ فرصت بے عملی میں ضائع کر دیتا ہے، وہ شدید خسارے میں رہتا ہے اور موت کی آمد اس کے نقصانات کی انتہا ہوتی ہے۔" (کیونکہ اس نے اتنی قیمتی اور ناقابلِ واپسی فرصت کو اپنے ہاتھ سے جانے دیا)

شرح وتفسیر

دنیا وآخرت امام علیؑ کی نظر میں

جیسا کہ اوپر اشارہ ہو چکا ہے کہ اس خطبے میں حضرت امامؑ نے انسانوں کو زہد وتقویٰ کی طرف لے جانے اور دنیا کی چمک دمک سے روگردانی کرنے کے لیے دس اہم نکات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ جیسا کہ حدیث میں وارد ہے اور زندگی کے تجربات سے بھی ثابت ہے کہ "حُبُّ الدُّنْیَا رَاْسُ کُلِّ خَطِیْئَةٍ" "دنیا کی محبت تمام گناہوں کا سرچشمہ ہے۔" اور اس حب دنیا سے دامن چھڑانا اور اس سے بے رخی برتنا ہی اصلاحِ نفس اور فردی اور اجتماعی خرابیوں کے خلاف جہاد کی طرف پہلا اور اہم ترین قدم ہے۔

www.shiabookspdf.com

سب سے پہلا نکتہ یہ ہے آپؑ نے دنیا کی بے رُخی اور اہلِ دنیا سے رخصت ہونے کی طرف اشارہ فرمایا:

"أَمَّا بَعْدُ فَإِنَّ الدُّنْيَا قَدْ أَدْبَرَتْ، وَآذَنَتْ [1] بِوَدَاعٍ۔"

امابعد دنیا نے اپنا منہ پھیر لیا اور اپنے رخصت ہونے کا اعلان کیا ہے۔

دنیا نے کیسے رُخ پھیر دیا اور رخصت ہونے کا اعلان کیا؟ اس کی علامتیں بہت روشن ہیں، گزشتہ نسلوں کی یعنی بادشاہوں، حکمرانوں، طاقتور جوانوں اور بوڑھوں کی خاموش قبریں، یہ سب دنیا کی بے رخی اور اس کے رخصت ہونے کی گواہی دے رہی ہیں۔ بوڑھوں کی خمیدہ کمر، ان کے سفید بال اور قریب المرگ لوگوں کی مختلف بیماریاں اس دنیا کی بے رخی اور رخصتی کے اعلان کی علامتیں ہیں۔ دنیا ظاہری طور پر خاموش ہے مگر بولتی ہے، ہزاروں زبانوں سے بولتی ہے۔ یہی وہ باتیں ہیں کہ مولا علیؑ نے نہج البلاغہ کے دوسرے خطبوں میں سے کسی ایک میں اس کی طرف اشارہ فرمایا ہے:

"فَكَفَى وَاعِظًا بِمَوْتَى عَايَنْتُمُوهُمْ، حُمِلُوا إِلَى قُبُورِهِمْ غَيْرَ رَاكِبِينَ وَأُنْزِلُوا فِيهَا غَيْرَ نَازِلِينَ، فَكَأَنَّهُمْ لَمْ يَكُونُوا لِلدُّنْيَا عُمَّارًا وَكَأَنَّ الْآخِرَةَ لَمْ تَزَلْ لَهُمْ دَارًا"

"تمہاری عبرت کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ مُردوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہو اور انہیں بے اختیار قبروں کے حوالے کر چکے ہو اور قبر کے درمیان رکھ چکے ہو، حالاں کہ وہ خود نہ سوار ہو کر یہاں آ سکتے تھے اور نہ وہ خود قبروں میں اتر سکتے تھے۔ گویا یہ دنیا میں نہیں بسے ہوئے تھے اور گویا آخرت کا گھر ہی ان کا وطن رہا ہو۔" [2]

دوسرے نکتے میں آخرت کی آمد کی طرف اشارہ ہے، آپؑ فرماتے ہیں؛

"وَإِنَّ الْآخِرَةَ قَدْ أَقْبَلَتْ، وَأَشْرَفَتْ بِاطِّلَاعٍ۔" [3]

"آخرت نے آ کر اپنی آمد سے آگاہ کر دیا۔"

آخرت کی سب سے پہلی منزل موت ہے کہ اس دنیا میں بسنے والے تمام انسانوں کو یکے بعد دیگرے اس منزل کی طرف رواں دواں ہونا ہے۔، اور یہ بجائے خود آخرت کی آمد کی علامت ہے۔ اسی ترتیب کے ساتھ امام عالی مقامؑ تمام لوگوں کو جلدی یا بہ دیر اس دنیا سے رخصت ہونے اور دوسرے گھر کی طرف جانے کی تیاری کرنے کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ کہ وہ تمام چیزیں جو اس پُر خطر سفر کے لیے ضروری ہیں فراہم کر لیں اور قبل اس کے کہ فرصت کا وقت نکل جائے اپنا زادِ راہ تیار

---

[1] آذنت، اذن کے مادّے سے لیا گیا ہے، اس کے معنا اعلان کرنے کے ہیں۔ اسی وجہ سے اذان کو اذان کہتے ہیں کہ نماز کے وقت کا اعلان کرتی ہے۔

[2] خطبہ ۱۸۸

[3] اِطلاع۔ طلع کے مادہ سے ہے جس کے معنی ظہور کے ہیں۔ اور آگاہی کے بھی معنی میں آیا ہے۔

www.shiabookspdf.com

کرلیں۔

تیسرے نکتے میں آپؑ نے اس زندگی (دنیا) اور اُس زندگی (آخرت) کے درمیان خط کھینچا اور ربط پیدا کیا اور اس طرح دو اقوال کے درمیان ارتباط پیدا کیا کہ آپؑ نے فرمایا:

"أَلَا وَإِنَّ الْيَوْمَ الْمِضْمَارَ [1] وَغَدًا السِّبَاقَ [2] وَالسَّبَقَةُ الْجَنَّةُ وَالْغَايَةُ النَّارُ"

"جان لو آج کا دن مشق اور تیاری کا دن ہے اور کل کا دن مقابلے کا دن ہے۔ بہشت والوں کے لیے انعام کا دن اور دوزخ اور جہنم والوں کے عذاب کا دن ہے۔"

اس جملے میں انتہائی خوبصورت تشبیہ دی گئی ہے۔ انسان کو آخرت کے لیے اپنی تیاری اس طرح کرنی چاہیے کہ جیسے وہ کسی بڑے مقابلے میں شرکت کر رہا ہے۔ ظاہر ہے ایسے موقعوں پر پہلے سے ہی آمادگی ہو۔ خود کو اچھی طرح تیار کرے۔ ایسی سواری جو گھوڑوں کے ساتھ مشق اور ورزش کرا کے چاق و چوبند نظر آئے مگر اور مقابلے کے وقت کمزور اور لاغر ہو اسے عرب لوگ "مضمار" سے تعبیر کرتے ہیں۔ یعنی کسی زمانے میں یا کسی جگہ کمزوری دکھانا۔ توجہ رہے کہ کتاب "مفردات" میں راغب کے قول کے مطابق ہر کمزور و لاغر حیوان کو ضامر نہیں کہا جاتا، بلکہ دوران مشق کمزوری دکھانے والے جانور کو کہتے ہیں، جہاں اسے چالاکی دکھانی چاہیے تھی۔ اس کے بعد مقابلے کا وقت شروع ہو جاتا ہے۔ اور ہر مقابلے میں آگے جانے والوں کے لیے انعام اور پیچھے رہ جانے والوں کو نقصان ہوتا ہے۔ حضرت امام علی علیہ السلام نے دنیا کی زندگی کو تیاری اور آمادگی کا وقت اور میدانِ آخرت کو میدان مقابلہ اور بہشت کو آگے بڑھنے والوں کے لیے انعام اور دوزخ کو پیچھے رہ جانے والوں کے لیے نقصان میں شمار کیا ہے۔

ظاہر ہے مقابلے کے میدان میں کوئی بھی شخص تیاری میں مشغول نہیں رہ سکتا، بلکہ اس وقت کے لیے پہلے سے ہی مواقع فراہم کرنا ضروری ہے۔ میدان حشر بھی نیکیاں انجام دینے، گناہوں سے توبہ کرنے اور دلوں کو پاکیزہ اور تزکیہ نفس کی جگہ نہیں، یہ تمام چیزیں دنیا میں ہی فراہم کرے۔ کوئی بھی اس موقع کو فراموش کر دے تو معنوی اور روحانی لحاظ سے اس دنیا میں شکست کا انجام دوزخ ہے۔

یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ آگے بڑھنے والے اور انعام حاصل کرنے والے سب کے سب برابر نہیں ہیں۔ یکے بعد

---

[1] مضمار: جیسا کہ ہم اوپر متن میں بیان کر چکے ہیں۔ مکان یا زمان میں لاغر ہونے کے ہیں۔ بعض لوگوں نے کہا کہ گھوڑوں کے مقابلے کے وقت پوری تیاری سے میدان میں لے جائے لاغر ہو جائے۔ یعنی مقابلے کے میدان کے لیے مضمار کا اطلاق ہوتا ہے"۔

[2] سباق، کا مادہ سبق ہے، یہ باب مفاعلہ سے ہے اور اس کا معناسبقت لے جانے کے ہیں۔

www.shiabookspdf.com

دیگرے، پہلا، دوسرا، تیسرا درجہ رکھتے ہیں، بڑا امتحان اور انجام آخرت کا مطلب بھی یہی ہے۔ جو کچھ ہم نے کہا، اس سے روشن ہوتا ہے کہ "مسابق" مسابقہ کے معنی میں آیا ہے اور "سُبَق" کا معنی ایسا ہدف جس کی طرف انسان پیش رفت کرتا ہے اور "سُبْقَةٌ" بروزن "لُقْمَةٌ" انعام کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں مرحوم سیّد رضیؒ نے اس خطبے کے ذیل میں ایک خوبصورت نکتے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اور وہ یہ کہ جنت (بہشت) کے مقام پر "وَالسَّبَقَةُ الْجَنَّةُ" کیوں ارشاد کیا اور جہنم (نار) کے تذکرہ میں غایۃ کا لفظ کیوں استعمال کیا، سبقۃ کیوں نہیں استعمال کیا؟ کہا جاتا ہے کہ "سَبَقَةٌ" وہ خاص ہدف ہے جس کی طرف پیش رفت کی جاتی ہے اور بہشت ایسی ہی جگہ ہے لیکن دوزخ پسندیدہ چیز نہیں ہے بلکہ ایک برا انجام ہے کہ شکست خوردہ ہی اس میں داخل کیے جاتے ہیں۔

امام عالی مقامؑ کی یہ گفتگو، آیہ شریفہ "سَابِقُوْا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ جَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ" [۱] "اپنے پروردگار کی مغفرت کی طرف آگے بڑھو اور جنّت کی وسعت زمین و آسمان کی وسعت کے برابر ہے"، سے متصادم نہیں، کیونکہ "سَابِقُوْا" کی تعبیر اس دنیا میں مقابلے کے معنی نہیں ہیں بلکہ ایک دوسری دنیا کے لیے تیار رہنے کے معنی میں ہے۔ اس دلیل کی بنا پر جنّت و بہشت کو اس مقابلے کا آخری ہدف قرار دیا گیا ہے۔ دوسری تعبیر میں یہ کہ اس دنیا میں نیک اعمال انجام دینے کا مقابلہ ہے اور آخرت میں ہمیشہ رہنے والی بہشت کی طرف جانے کا مقابلہ ہے جو کہ اعمال کا نتیجہ ہے۔

چوتھے نکتے میں امام علی علیہ السلام نے اس بڑے اور خطرناک سفر کے اہم ترین توشہ کی طرف اشارہ کیا ہے اور وہ توبہ ہے، آپؑ فرماتے ہیں:

"أَفَلَا تَائِبٌ مِنْ خَطِيئَتِهِ قَبْلَ مَنِيَّتِهِ! [۲] أَلَا عَامِلٌ لِنَفْسِهِ قَبْلَ يَوْمِ بُؤْسِهِ"

"کیا موت سے پہلے توبہ کرنے والا کوئی نہیں اور کوئی پیدا نہیں ہوا ہے کہ بُرا وقت آنے سے پہلے نیک عمل کرے۔"

مولائے کائناتؑ نے ان تعبیروں کو غافل اور سوئے ہوئے لوگوں کو بیدار کرنے اور آگاہ لوگوں کو شوق و حرکت میں لانے کے لیے ارشاد فرمایا۔ جو حقیقت میں گزشتہ جملوں کا منطقی نتیجہ ہیں۔ کیونکہ دنیا جلدی سے گزر رہی ہے اور آخرت جلد

---

[۱] سورۂ حدید، آیہ ۲۱)

[۲] منیہ، کا مادہ منی سے ہے، بروزن نُہی اس کا معنا کسی چیز کو مقدر یعنی چھپا کر رکھنے کے ہیں، منیہ کا ایک خصوصی معنا موت بھی ہے چوں کہ موت ایک چھپا ہوا عمل ہے، اور اس سے مراد انسان کے اندر میں چھپی ہوئی امیدیں، آرزوئیں بھی ہیں

www.shiabookspdf.com

آئے گی۔ آج کا دن تیاری کا ہے اور کل کا دن سعادت مندی اور قساوت کے مقابلے کا ہے۔ عقلمند اور ہوشیار لوگ توبہ کیوں نہیں کرتے، خدا کی طرف پلٹتے کیوں نہیں ہیں، فرصت کے دنوں کے ضائع ہونے سے پہلے نیک عمل اور اس سفر کے لیے تیاری کیوں نہیں کرتے؟ یہ وہ چیزیں ہیں کہ دوسرے خطبے میں بھی اس کی طرف اشارہ ہوا ہے:

"فَاعْمَلُوْا وَ اَنْتُمْ فِيْ نَفَسِ الْبَقَاءِ، وَ الصُّحُفُ مَنْشُوْرَةٌ وَ التَّوْبَةُ مَبْسُوْطَةٌ" [1]

"عمل کرو جب تک تمہاری زندگی ہے عمل کی کتاب کھلی ہے اور توبہ کا دروازہ کھلا ہے۔"

قیامت کو "يَوْمُ بُؤُسٍ" سے تعبیر کیا ہے۔ اس لیے کہ سخت حالات شدید عذاب اور اس دن کی خلافِ معمول پریشانی ہے۔ اس دن کے عذاب کے بارے میں قرآن مجید کی مختلف آیات میں ذکر موجود ہے۔ انسان کو خبردار کیا جاتا ہے کہ آج کے فرصت کے دنوں میں ان مشکلات میں گھرے ہوئے دن کے لیے فکر کرے، اور اعمال کا ذخیرہ کرے۔

پانچویں نکتے میں مولائے کائنات علیہ السلام نے دنیا کی محدود زندگی اور جلدی گزرنے والی مگر زیادہ قیمتی فرصتوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ جن سے غفلت سخت شرمندگی اور دردناک ہے۔ آپؑ فرماتے ہیں:

"أَلَا وَ إِنَّكُمْ فِيْ أَيَّامِ أَمَلٍ مِنْ وَرَائِهِ أَجَلٌ، فَمَنْ عَمِلَ فِيْ أَيَّامِ أَمَلِهِ قَبْلَ حُضُوْرِ أَجَلِهِ فَقَدْ نَفَعَهُ عَمَلُهُ وَ لَمْ يَضْرُرْهُ أَجَلُهُ"

"آگاہ رہو کہ تم اُمیدوں کے دور میں ہو (معنوی ذخائر سے فائدہ اٹھانے کے لیے زیادہ فرصت تمہارے پاس ہے) اور موت تمہارا پیچھا کر رہی ہے۔ اس حال میں (اس فرصت سے ہر کوئی فائدہ اُٹھائے) اُمید کے دنوں میں جب کہ موت آنے سے پہلے عمل صالح انجام دے اس کا یہ عمل اسے سودمند ثابت ہوگا اور موت اُسے نقصان نہیں دے سکتی۔"

"وَ مَنْ قَصَّرَ فِيْ أَيَّامِ أَمَلِهِ قَبْلَ حُضُوْرِ أَجَلِهِ فَقَدْ خَسِرَ عَمَلُهُ وَ ضَرَّهُ أَجَلُهُ"

"جو کوئی شخص اُمیدوں کے دور میں اور موت کے آنے سے پہلے اپنے عمل میں کوتاہی کرے نقصان میں مبتلا ہوگا اور موت کا آنا اس کے لیے نقصان دہ ثابت ہوگا۔" (کیونکہ اس قیمتی اور ناقابل واپسی وقت میں سے اس نے اپنے وقت کو ضائع کر دیا۔)

مولائے کائناتؑ نے أَيَّامِ أَمَلٍ یعنی امید کے دن کی کیا خوب تعبیر ہے کہ اس جہاں کی کارآمد فرصتوں کو روشن کرتی ہے، کیونکہ عمر کے لحظات انسان کو سعادت جاودانی کی طرف لے جانے کے لیے بہترین فرصت ہیں۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اس جلدی گزرنے والی زندگی کے لحظات میں توبہ سے استفادہ کرنے سے آتش جہنم کا طوفان تھم جاتا ہے اور انسان اپنی عمر میں

---

[1] خطبہ ۲۳

www.shiabookspdf.com

انجام دینے والے عمل خالص سے اپنے لیے ہمیشہ رہنے والی جنت کو خرید لیتا ہے۔

نکات

۱۔ دنیا و آخرت کی زندگی احادیث اسلامی کی رُو سے

اسلام اور تمام آسمانی ادیان کی نظر میں دنیا ایک ناپائیدار گھر ہے۔ انسان اسی گھر سے اُس باقی رہنے والے گھر کے لیے زادِ راہ، کمال و معرفت اور بال و پر پیدا کرنے کے لیے قدم اٹھاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے قسم قسم کے امتحانات اور سخت آزمائشوں، خواہ عبادات ہوں یا ترکِ شہوات اور مصائب کے ذریعے اُس ابدی جہان میں جانے کے لیے آمادہ کر دیتا ہے، جو پاک و پاکیزہ افراد کے لیے خیر و برکت سے بھری ہوئی ہے۔

اس حقیقت کے بیان کے لیے روایات میں کئی تعبیرات سے استفادہ کیا گیا ہے جن میں سے ہر ایک تعبیر دوسری تعبیر سے خوبصورت اور جامع تر ہے۔ اوپر والے خطبے میں اِس دنیا کو ایک دوسری دنیا کے لیے مشق اور تیاری کی جگہ سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اس امتحان میں کامیاب ہونے والوں کو بہشت اور ناکام رہنے والوں کے لیے دوزخ کا ذکر کیا گیا ہے۔ معروف حدیث میں ہم پڑھتے ہیں:

"اَلدُّنْيَا مَزْرَعَةُ الْاٰخِرَةِ"۔[1]

"دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔"

ظاہر ہے کہ کھیتی زندگی گزارنے کی جگہ نہیں ہے، بلکہ ایک دوسرے مقام کے لیے سامان (تھوڑی خوراک) فراہم کرنے کی جگہ ہے۔ ایک دوسری تعبیر میں جو نہج البلاغہ میں آئی ہے کہ دنیا کو "مَتْجَرٌ" تجارت کی جگہ اور کبھی "دارِ موعظہ" (نصیحت و علم و آگہی حاصل کرنے کی جگہ) اور کبھی "مُصَلّیٰ" (نماز کی جگہ) سے تعبیر کیا ہے، چنانچہ فرماتے ہیں:

"اِنَّ الدُّنْيَا دَارُ صِدْقٍ لِمَنْ صَدَقَهَا... وَدَارُ مَوْعِظَةٍ لِمَنِ اتَّعَظَ بِهَا، مَسْجِدُ أَحِبَّاءِ اللهِ وَمُصَلّٰى مَلَائِكَةِ اللهِ وَمَهْبِطُ وَحْيِ اللهِ وَمَتْجَرُ أَوْلِيَاءِ اللهِ"

"دنیا سچ کی جگہ ہے اُس شخص کے لیے جو اس کے ساتھ صحیح برتاؤ کرے۔ نصیحت کا گھر کا ہے اس شخص کے لیے جو اس سے نصیحت لے۔ خدا کے دوستوں کی مسجد، خدا کے فرشتوں کی جائے عبادت، وحیِ الٰہی کے نازل ہونے کی جگہ اور اولیاء

---

[1] غوالی اللآلی، ج ۱، ص ۲۶۷، میں رسولِ خداؐ سے منقول ہے۔

www.shiabookspdf.com

خدا کی تجارت گاہ ہے۔"[۱]

ایک دوسری تعبیر میں حضرت امام علی ابن حسین علیہ السلام نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے اپنے اصحاب خاص (حواریوں) سے فرمایا:

"إِنَّمَا الدُّنْيَا قَنْطَرَةٌ فَاعْبُرُوهَا وَلَا تَعْمُرُوهَا"

"دنیا ایک پُل ہے جس پر سے گزرنا چاہیے نہ کہ ٹھہرنا چاہیے۔" اسے آباد کرنے اور اس کی چمک دمک سے پرہیز کیجیے۔"[۲]

اسی معنی کو ایک دوسری حدیث میں کتاب "موعظہ ہای لقمان حکیم" میں امام صادق علیہ السلام سے نقل کیا گیا ہے کہ انہوں نے دنیا کو ایک پُل سے تشبیہ دی جو نہر پر لگایا جاتا ہے اور اس کے اوپر سے گزرنا چاہیے۔[۳] نہج البلاغہ کی دوسری تعبیرات میں دنیا کا "دَارُ مَمَرٍّ"[۴] (گذرنے کی جگہ) اور "دَارُ مَجَازٍ"[۵] (عبور کرنے کی جگہ) کے عنوان سے تعارف کرایا گیا ہے۔ ایک دوسری حدیث امام ہادی علیہ السلام سے نقل ہوئی ہے جس میں دنیا کو ایک بازار سے تشبیہ دی گئی ہے کہ بعض لوگ اُس سے فائدے مند ہوتے ہیں اور بعض نقصان اُٹھاتے ہیں، آپؑ فرماتے ہیں:

"اَلدُّنْيَا سُوقٌ رَبِحَ فِيهَا قَوْمٌ وَخَسِرَ آخَرُونَ"

"دنیا ایک بازار ہے کچھ لوگوں نے فائدہ اٹھایا اور کچھ لوگوں نے نقصان۔"[۶]

یہ تمام تعبیریں بتاتی ہیں کہ دنیا کو اپنا آخری ہدف نہیں سمجھنا چاہیے، یہ صرف ایک ابدی جگہ کے لیے نتیجہ بخش معارف الٰہی حاصل کرنے اور عمل صالح انجام دینے کے لیے وسیلہ ہے۔ ممکن ہے اس کا مطلب بعض کے خیال میں سادہ ہو مگر حقیقت میں انسانوں کی زندگی میں انسانیت ساز مسئلہ ہے۔ یہی مسئلہ دنیا کے مادّی امور اور ان احکامات میں بھی ہے جو انسان کے اختیار میں ہیں کہ انہیں کس نظر سے دیکھتا ہے۔ کیا سامان اور وسیلہ کے تناظر میں دیکھتا ہے یا آخری ہدف کے تناظر میں۔

اس خطبے کے شروع میں امامؑ نے تاکید کی ہے کہ دنیا میدانِ مقابلہ یعنی آخرت کے لیے تیاری کی جگہ ہے، یہ

---

[۱] کلمات قصار ۱۳۱

[۲] بحار الانوار، ج ۱۴، ص ۳۱۹، حدیث ۲۱

[۳] بحار الانوار، ج ۷۰، ص ۳۹، حدیث ۳۶

[۴] نہج البلاغہ، کلمات قصار ۱۳۳

[۵] نہج البلاغہ خطبہ ۲۰۳

[۶] بحار الانوار، ج ۷۵، مواعظ امام ہادیؑ، ص ۳۶۶

www.shiabookspdf.com

درحقیقت ان تمام ہدایتوں اور نصیحتوں کی اساس ہے جو اس خطبے میں دی گئی ہیں۔

۲۔ناقابلِ تلافی نقصان

ایک دوسرا نکتہ جس کا اس عظیم خطبے کے سیاق وسباق سے اشارہ ملتا ہے، اس کی طرف زیادہ توجہ کی ضرورت ہے۔ اس دنیا میں انسان بہت سارے نقصانات اٹھاتا ہے اور فرصت کے موقعوں کو ضائع کر دیتا ہے، جس کی وہ عمر کے آخری حصے میں (مکمل) تلافی نہیں کرسکتا ہے۔ انسان کو جو امتحان پیش آتے ہیں، حقیقت میں وہ ایک بار ہی انجام پا سکتے ہیں۔ ایک مرتبہ آمادگی وتیاری کے وقت اور ایک مرتبہ امتحان کے میدان میں تکرار ممکن نہیں ہے کہ غافل بے خبر یا کوتاہ عمل انسان نقصان اٹھانے کے بعد اپنی کمزوریوں اور بے چارگیوں کی تلافی کی فکر میں پڑے۔ بس اسی وجہ سے حضرت امامؑ نے مذکورہ جملوں میں ارشاد فرمایا:

"مَنْ قَصَّرَ فِیْ أَیَّامِ أَمَلِهٖ قَبْلَ حُضُوْرِ أَجَلِهٖ فَقَدْ خَسِرَ عَمَلُهٗ وَضَرَّهٗ أَجَلُهٗ"

"جس شخص نے فرصت کے ایام میں موت کے آنے سے پہلے کوتاہی کی (نیک عمل انجام نہیں دیے) وہ عمل کے معاملے میں خسارے میں رہے گا اور موت کا آنا اس کے لیے نقصان دہ ہوگا۔"

ندامتیں ہرگز کسی مشکل کو حل نہیں کرتیں اور نہ یہ فریاد:

"رَبِّ ارْجِعُوْنِ لَعَلِّیْٓ أَعْمَلُ صَالِحًا فِیْمَا تَرَكْتُ"

"اے خدا مجھے دوبارہ دنیا میں پلٹا دے تاکہ میں دوبارہ نیک اعمال بجالاؤں۔"

جواب میں کہا جائے گا:

"كَلَّا!" (ہرگز ایسا نہیں ہوسکتا) ہر چیز کا سامنا کرنا پڑے گا۔

بقول شاعر:

افسوس ہے کہ جوانی کے دن گزر گئے ہمیشہ رہنے والی زندگی کا سرمایہ ختم ہوگیا
کنارے پر پیاسا کچھ سوتا سا رہا مگر افسوس زندگی کا آب و دانہ گذر گیا

ایک دوسرے شاعر نے کہا:

"افسوس کہ اپنی عمر کو اغیار کے پیچھے دوڑتے ہوئے خرچ کیا اور دوستوں سے بھی رہ گیا اور مقصد تک بھی نہ پہنچا،

www.shiabookspdf.com

تجارت نہ کرسکا اور سرمایہ زندگی ہاتھ سے چلا گیا، اور دنیا کے بازار سے سوائے حسرت وغم کے کوئی جنس نہیں خرید سکا۔"[1]

دوسرا حصہ

وَمَنْ قَصَّرَ فِي اَيَّامِ اَمَلِهِ قَبْلَ حُضُورِ اَجَلِهِ فَقَدْ خَسِرَ عَمَلُهُ وَضَرَّهُ اَجَلُهُ اَلَا فَاعْمَلُوا فِي الرَّغْبَةِ كَمَا تَعْمَلُونَ فِي الرَّهْبَةِ اَلَا وَاِنِّي لَمْ اَرَ كَالْجَنَّةِ نَامَ طَالِبُهَا وَلَا كَالنَّارِ نَامَ هَارِبُهَا اَلَا وَاِنَّهُ مَنْ لَا يَنْفَعُهُ الْحَقُّ يَضُرُّهُ الْبَاطِلُ وَمَنْ لَا يَسْتَقِيمُ بِهِ الْهُدَى يَجُرُّ بِهِ الضَّلَالُ اِلَى الرَّدَى اَلَا وَاِنَّكُمْ قَدْ اُمِرْتُمْ بِالظَّعْنِ وَدُلِلْتُمْ عَلَى الزَّادِ وَاِنَّ اَخْوَفَ مَا اَخَافُ عَلَيْكُمُ اثْنَتَانِ اتِّبَاعُ الْهَوَى وَطُولُ الْاَمَلِ فَتَزَوَّدُوا فِي الدُّنْيَا مِنَ الدُّنْيَا مَا تَحْرُزُونَ بِهِ اَنْفُسَكُمْ غَداً.

کوچ کی صدا دی جا چکی ہے

"اے لوگو! جس طرح تم خوف اور مصیبت کے دنوں میں عمل کرتے ہو، اسی طرح آرام وراحت کے دنوں میں بھی کیا کرو (صرف سختیوں اور مشکلات ہی میں خدا کی یاد میں نہ ہو) جان لو! میں کسی چیز کو جنت کی طرح نہیں دیکھتا کہ جس کے طلب گار خواب میں ہیں اور جہنم ایسی چیز ہے جس سے بھاگنے والا خواب غفلت میں ہے۔ آگاہ ہو جاؤ! جو لوگ حق سے فائدہ نہیں اُٹھاتے، ان کو نقصان اُٹھانا پڑے گا اور کوئی شخص جو راہ ہدایت پر ثابت قدم نہ رہے اسے گمراہی ہلاکت کی وادی میں دھکیل دے گی۔

جان لو! تمہیں جانے کا حکم مل چکا ہے اور اس پر خطر سفر کے توشے کی طرف رہنمائی مل چکی ہے اور مجھے تمہارے بارے میں دو خوفناک چیزوں کی فکر ہے۔ خواہش پرستی اور لمبی خواہشات (جو پہلے تو انسان کو حق کی پیروی سے دور رکھتی ہیں اور پھر آخرت کو بھلا دیتی ہیں اس وقت ایسا ہی ہے) اس دنیا میں رہتے ہوئے اتنا زادِ راہ لے لو کہ کل تم اپنے نفسوں کو بچا سکو!"

شرح وتفسیر

چھٹے نکتے میں حضرت امام عالی مقامؑ نے ایک اہم مسئلے کو اٹھایا ہے، جس سے اکثر لوگ غافل ہیں۔ اور وہ یہ ہے آپؑ نے فرمایا:

[1] سورۂ مؤمنون، آیہ ۱۰۰

www.shiabookspdf.com

"أَلَا فَاعْمَلُوا فِي الرَّغْبَةِ كَمَا تَعْمَلُونَ فِي الرَّهْبَةِ!"

"آگاہ رہو! جیسا کہ خوف اور مصیبت کے وقت (خدا کے حکم پر عمل کرتے ہو) آرام کے وقت بھی عمل کرو۔"

خدا پرستی یہ نہیں کہ مشکلات کے وقت خدا کو یاد کریں اور اس کے لطف و کرم سے لطف اندوز ہوں، مگر جب ان مشکلات کا طوفان تھم جائے تو اُسے فراموش کریں۔ اگر ایسا ہوتا تو مشرک اور بت پرست بھی جاہلیت کے زمانے میں خدا کے مخلص بندے ہوتے، کیوں کہ قرآن ان کے بارے میں فرماتا ہے:

"فَإِذَا رَكِبُوا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ فَلَمَّا نَجَّاهُمْ إِلَى الْبَرِّ إِذَا هُمْ يُشْرِكُونَ"

"جب وہ کشتی پر سوار ہوئے، دریا کے تلاطم خیز موجوں میں پھنس گئے تو خدا کو اخلاص سے پکارا، لیکن جب خدا نے انہیں خشکی پر پہنچایا اور نجات دی تو اپنے شرک کی طرف واپس پلٹ گئے۔"[1]

اس قسم کے افراد کے لیے ایک دوسری جگہ ارشاد ہوا:

"وَإِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِي الْبَحْرِ ضَلَّ مَنْ تَدْعُونَ إِلَّا إِيَّاهُ فَلَمَّا نَجَّاكُمْ إِلَى الْبَرِّ أَعْرَضْتُمْ وَكَانَ الْإِنْسَانُ كَفُورًا!"

"اور جب سمندر میں تمہیں کوئی مصیبت لاحق ہوتی ہے تو وہ (سب بت تمہارے ذہنوں سے) گم ہو جاتے ہیں جن کی تم پرستش کرتے رہتے ہو، سوائے اسی (اللہ) کے (جسے تم اس وقت یاد کرتے ہو)، پھر جب وہ (اللہ) تمہیں بچا کر خشکی کی طرف لے جاتا ہے (تو پھر اس سے) رُوگردانی کرنے لگتے ہو، اور انسان بڑا ناشکرا واقع ہوا ہے۔"[2]

مشکلات و تکالیف کے آنے کے بعد خدا کی طرف رُخ کرنا کوئی فخر کی بات نہیں، بلکہ فخر اس میں ہے کہ آرام، راحت اور سلامتی کے وقت انسان خدا کو یاد کرے، اور اپنی گردن میں بندگی کا طوق ڈال لے۔ وہ لوگ جوان اوقات میں خدا کو یاد کرتے ہیں خدا انہیں سختی اور تکلیف کے دنوں میں اپنے لطف و کرم سے محروم نہیں کرتا ہے۔ خالص ایمان کی علامت یہ ہے کہ انسان، صحت، بیماری، جوانی، پیری، فقر و غنا، شکست و کامرانی، آزادی و قید یعنی تمام حالتوں میں خدا کی یاد میں رہے اور اُس کے سامنے سر تسلیم خم کرے۔ اسی لیے انبیاء کرامؑ، اماموںؑ اور پیشوایان کو ہم دیکھتے ہیں کہ تمام حالتوں میں خدا کی یاد میں رہتے ہیں۔

امیر المومنینؑ کے حالات کو دیکھیں کہ جب آپؑ گوشہ نشین ہو گئے تھے اور ظاہری طور پر ایک جگہ محدود ہو گئے تھے

---

[1] سورہ عنکبوت آیت ۶۵

[2] سورہ اسراء آیت ۶۷

www.shiabookspdf.com

اور وہ وقت جب آپؑ تخت حکومت پر فائز تھے، دونوں قسم کے حالات میں یکساں نظر آتے ہیں، رات کی عبادتوں میں اللہ سے راز و نیاز، بےکسوں اور بےسہارا لوگوں کی مدد کو پہنچنا، دنیا کی نسبت زہد و تقویٰ، آپؑ کی زندگی کی دونوں حالتوں میں ظاہر و آشکار تھی۔ ساتویں نکتے میں بھی تمام انسانوں کو تنبیہ کرتے ہیں اور فرماتے ہیں:

"أَلَا وَإِنِّي لَمْ أَرَ كَالْجَنَّةِ نَامَ طَالِبُهَا وَلَا كَالنَّارِ نَامَ هَارِبُهَا"

"جان لو میں ہرگز کسی چیز کو بہشت کی طرح نہیں دیکھتا ہوں کہ جس کے طلب گار خوابِ غفلت میں ہیں، اور جہنم ایسی چیز ہے کہ جس سے بھاگنے والے خوابِ غفلت میں ہیں۔"

کچھ افراد کو دیکھتے ہیں کہ جب انہیں ایک چھوٹا سا سفر پیش آتا ہے جس میں تھوڑا سا مادّی فائدہ ہو تو رات کے اندھیرے میں نیند سے بیدار ہو جاتے ہیں یا جب تھوڑا سا (جزوی) خطرہ پیش آتا ہے تو وہ سوتے نہیں پاتے، اس حالت میں کیسے ممکن ہے کہ کوئی شخص بہشت۔ ہمیشہ رہنے والا گھر ہے اور یہ ایسی نعمت ہے جس سے بڑی کوئی نعمت نہیں ہو سکتی۔ کا طلب گار ہو یا دوزخ کی آگ۔ اس سے بڑی رنج اور تکلیف کی مثال نہیں ملتی۔ سے خوف زدہ ہو، لیکن یوں خوابِ غفلت میں مگن ہو جیسے سب کچھ ٹھیک ہو رہا ہو۔ یہ خیال ممکن ہے دوسری دنیا کے بارے میں ایمان کی کمزوری سے پیدا ہو یا دنیاوی زرق برق اور دنیاوی فائدوں میں غرق ہونے کی وجہ سے پیدا ہو۔ بہر حال رہبرانِ الٰہی کی ذمّے داری ہے کہ وہ لوگوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کریں، ایمان کی بنیادوں کو تقویت دے کر اور اس فانی دنیا کے سود و زیاں کے خدشوں کو مٹا کر انہیں اُن کے اصل مقصد اور ذمّے داریوں سے آشنا کریں۔

آٹھویں نکتے میں اسی سلسلے کے ایک اہم مسئلے کی طرف اشارہ فرمایا:

"أَلَا وَإِنَّهُ مَنْ لَا يَنْفَعُهُ الْحَقُّ، يَضُرُّهُ الْبَاطِلُ وَمَنْ لَا يَسْتَقِيمُ بِهِ الْهُدَىٰ، يَجُرُّ بِهِ الضَّلَالُ إِلَى الرَّدَىٰ"

"جان لو! جو حق سے استفادہ نہیں کرتا باطل کا زیاں اُسے دامن گیر ہوگا اور جسے نورِ ہدایت راہِ راست پر نہ لا پائے اُسے گمراہی ہلاکت کی وادی میں دھکیل دے گی۔"

اس گفتگو کا اصل مفہوم اس وقت روشن ہوگا جب ہم حق و باطل کی واضح تعریف سے آشنا ہوں۔ حق حقیقتوں کو کہا جاتا ہے، خواہ وہ حق تکوینی ہو یا تشریعی۔ حق تکوینی اس جہاں کی حقیقتیں ہیں، جب کہ اس کے بالمقابل باطل، سراب، خیالات و توہّمات، ایسے موجودات کہ جو فقط خیالی دنیا میں وجود رکھتے ہیں۔

تشریعی دنیا میں حق سے مراد وہ امتیازات اور الٰہی قوانین ہیں جو افراد یا گروہوں کے لیے ان کی ذاتی صلاحیتوں کی

www.shiabookspdf.com

بنیاد پر مقرر کیے گئے ہیں۔ اور باطل، قانون کے لباس میں قوانین کو توڑنے، آزادی کے طلب گاروں کے روپ میں آزادیوں کو سلب کرنے، عدل کی چھتری تلے عدالت کی دھجیاں اُڑانے کو کہتے ہیں۔ ظاہر ہے جو انسان حق کے راستے پر نہ چلے، خواہ عالمِ تکوینی ہو یا تشریعی، باطل خیالات جو کسی کے نزدیک درست نہیں کے، جال میں گرفتار ہوتا ہے۔ معلوم ہے کہ ایسا انسان کسی طرح سے بھی اعلیٰ مقام تک نہیں پہنچ سکتا ہے۔ یہی اصلیتیں آثار کا منبع ہیں مگر خام و بے بنیاد خیالات سوائے نقصان کے کیا فائدہ دے سکتی ہیں؟ ممکن ہے انسان کچھ دن کسی نہ کسی طریقے سے لوگوں کو غافل کردے، اور جھوٹے وعدوں کے ذریعے انہیں مشغول رکھے نتیجتاً وہ بند راستے میں پھنس جائے گا، ایسا بند راستہ کہ جہاں خود اس کے لیے اور دوسروں کے لیے سوائے نقصان اور بدبختی کے کچھ نہیں ہے۔

اس بنا پر آپؑ کا فرمان "وہ شخص جسے حق فائدہ نہ دے باطل کا نقصان اُسے دامن گیر ہوگا اور وہ شخص جو ہدایت کے نور سے بہرہ مند نہ ہو وہ گمراہی کی وادی میں ہلاک ہوگا" یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو واضح اور روشن تر ہے۔

یہ بات سچ ہے کہ حق کو قبول کرنے اور اس کی پیروی کرنے میں اکثر تلخی ہوتی ہے، لیکن یہ ایسی تلخی ہے کہ جس میں شفا کی تاثیر ہے کہ جس کا انجام بیماری اور موت کے چنگل سے آزاد ہونا اور سلامتی ہے۔

جو کچھ اوپر بیان ہوا اس سے یہ مطلب واضح ہوتا ہے کہ حق و باطل کوئی خود ساختہ وجود نہیں ہیں۔ عالمِ تکوین میں حق سے مراد عینی و خارجی موجودات ہیں اور عالمِ تشریع میں وہی اوامر و نواہی ہیں جن کا سرچشمہ افعالِ انسانی کے متوقع مفاسد و مصالح ہیں۔ اللہ نے موقع دیا تو مناسب موقع پر مزید وضاحت کریں گے۔

بہر حال اس جملے کے بیان سے امام عالی مقامؑ کا منشا و مقصد ایک ایسا کلیہ ہے جو انسانوں کے نامۂ اعمال پر اثر انداز ہے، پر توجہ دلانے کے علاوہ یہ بھی ہے کہ لوگ سمجھ جائیں کہ اگر اللہ کے دستور جو حق اور عدالت کے عین مطابق ہیں، ان کی پیروی نہ کریں تو ظلم و ستم کے چنگل میں پھنس جائیں گے اور تمام عمر باطل کے نقصان کی لپیٹ میں آجائیں گے اور اس گمراہی کا انجام بھی یہی ہوگا یعنی ظلم و ستم میں گرفتار ہو جائیں گے۔ نویں نکتے میں حضرت امام علیؑ نے ایک دوسرے اہم مطلب کی طرف اشارہ کیا ہے کہ جس میں تمام لوگ شریک ہیں اور با دلِ ناخواستہ انہیں جھکنا پڑتا ہے۔ آپؑ فرماتے ہیں:

"أَلَا وَإِنَّكُمْ قَدْ أُمِرْتُمْ بِالظَّعْنِ [1] وَدُلِلْتُمْ عَلَى الزَّادِ۔

"جان لو! کہ تمہارے لیے تیاری کا حکم مل چکا ہے اور اس پُر خطر راستے کے لیے زادِ راہ تلاش کرو۔"

---

[1] ۔ ظَعن، بروزن طعن کوچ کرنا ایک مکان سے دوسرے مکان کی طرف۔ اس لیے "ظعینہ" ہودج کے معنی میں ذکر ہوا ہے جو سفر کے وسائل میں سے ایک ہے جس پر خواتین سوار ہو جاتی ہیں۔

www.shiabookspdf.com

سفر (یا) حرکت کرنے کا حکم وہی موت کا قانون ہے جو تمام انسانوں کی زندگیوں پر لاگو ہے۔ بچے جوانی کی طرف سفر کرتے ہیں اور جوان بڑھاپے کی طرف سفر کرتے ہیں اور اس کا نتیجہ موت ہے۔ یہ ایک ایسا قانون ہے کہ کسی کو فرار کی گنجائش نہیں۔ یہ ایک ایسا قانون ہے کہ کسی کو بھی پوری قوت و توانائی اور ہوشمندی سے اس کی مخالفت کی سکت نہیں ہو سکتی یہ ایک ایسا سفر ہے کہ خالق کائنات نے اسے تکمیل انسانیت کے لیے دستور العمل بنایا ہے۔ قرآن مجید میں جگہ جگہ تشریعی پر تکوینی فرمان تشریعی شکل میں آیا ہے:

"كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ"۔[1]

"ہر ذی روح کو موت کا ذائقہ چکھنا ہوگا۔"

ایک دوسری جگہ فرمایا گیا:

"أَيْنَمَا تَكُونُوا يُدْرِككُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنتُمْ فِي بُرُوجٍ مُّشَيَّدَةٍ"۔[2]

"تم جہاں کہیں رہو موت آ کر ہی رہے گی خواہ تم مضبوط محلات میں ہی چھپ جاؤ۔"

یہاں تک پیغمبر اکرمؐ جو مخلوقات میں سب سے افضل ترین مخلوق ہیں ان سے بھی اس طرح حظاب ہوا:

"إِنَّكَ مَيِّتٌ وَإِنَّهُم مَّيِّتُونَ"۔[3]

"یقیناً (اے رسولؐ) تم وفات پاؤ گے اور وہ لوگ بھی مر جائیں گے نہ صرف انسان بلکہ تمام خلقت خدا کو موت کی طرف رجوع کرنا ہے۔"

كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ"۔[4]

"اس کی ذات کے علاوہ تمام چیزیں فنا ہونے والی ہیں۔"

یہ احتمال بھی موجود ہے کہ جملہ أُمِرْتُمْ بِالظَّعْنِ میں سفر کرنے کے حکم سے مراد دنیا سے سفر کرنے کی تیاری ہو۔ جیسا کہ خطبہ ۲۰۴ میں آیا ہے کہ آپؑ فرماتے ہیں:

"تَجَهَّزُوا رَحِمَكُمُ اللهُ فَقَدْ نُودِيَ فِيكُمْ بِالرَّحِيلِ"۔[5]

---

[1] سورۃ ال عمران آیت ۱۸۵

[2] سورۂ نساء آیت ۷۸

[3] سورۂ زمر، آیت ۳۰

[4] سورۂ قصص، آیت ۸۸

[5] ۔ أُمِرْتُمْ بِالظَّعْنِ ۔ امر تکوینی اور اجل الٰہی کا معنی دیتا ہے۔ اس طرح کی اور تعبیروں کی مثالیں ہیں۔

www.shiabookspdf.com

"حرکت کی تیاری کرو اس لیے کہ تمہارے درمیان سفر کی صدا دی جا چکی ہے۔"

مگر توشۂ آخرت کے مقام پر بلا استثنیٰ تمام انبیائے الٰہی اس دستور کو خدا کی طرف سے اپنے ساتھ لائے ہیں کہ اے انسانو! تمہارے سامنے خطرات سے پُر راستہ ہے ایک ایسا راستہ ہے، جو بہت طویل اور جس کا فاصلہ دنیا اور آخرت کو گھیر لیتا ہے۔ اس راستے کو بغیر زادراہ کے طے نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اور وہ زادراہ ایمان و تقویٰ الٰہی اور عمل صالح کے کچھ نہیں ہے۔

"وَتَزَوَّدُوا فَإِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوَى"۔[۱]

"توشۂ آخرت تیار کرو بے شک بہترین توشہ پرہیزگاری ہے۔"

جو دولت بازارِ قیامت میں خریدارِ نجات کے پاس موجود ہونی چاہیے تا کہ نجات و بخشش حاصل کر سکے وہ اس شخص کا قلب سلیم اور خدا پر ایمان و عشق اور تقویٰ کے نور سے پُر ہونا ہے۔

"يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَلَا بَنُونَ إِلَّا مَنْ أَتَى اللَّهَ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ"۔[۲]

"اس دن مال و اولاد کام نہیں آئیں گے، مگر وہ جو قلب سلیم (شرک سے پاک) کے ساتھ خدا کے روبرو پیش ہو۔"

اس راستے پر چلنے والے لوگ بڑی بڑی عالی شان عمارتوں کے نقش و نگار سے اپنا دل خوش نہیں کرتے اور نہ ان کی رنگینیوں سے دھوکا کھاتے ہیں بلکہ نجات کے ساحل اور منزل مقصود تک پہنچنے کی فکر میں رہتے ہیں اور یہ دیکھتے ہیں وہاں کون سی چیز کام آئے گی:

"اَلْمَالُ وَ الْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَ الْبَاقِيَاتُ الصَّالِحَاتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَ خَيْرٌ أَمَلًا"۔

"مال اور اولاد دنیاوی زندگی کی زینت ہیں اور نیک اعمال خدا کے پاس باقی رہنے والے ہیں، جو بہتر اور امید بخش ہیں۔"[۳]

دسویں اور آخری نکتے میں مولائے کائنات علیہ السلام نے اپنے پیروکاروں کو دنیا کی نسبت آخرت کی طرف توجہ دینے اور وہ مختلف کام جو اخروی نجات کا باعث ہیں اور وہ راستے جو قرب الٰہی اور انسان کی سعادت مندی کے راستے میں خطرناک رکاوٹیں ہیں، کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ آپؑ نے فرمایا:

---

[۱] سورہ بقرہ آیت ۱۹۷

[۲] سورۂ شعراء آیات ۸۸-۸۹

[۳] سورۂ کہف، آیت ۴۶

www.shiabookspdf.com

"وَإِنَّ أَخْوَفَ مَا أَخَافُ عَلَيْكُمُ اثْنَتَانِ: اتِّبَاعُ الْهَوَىٰ، وَطُولُ الْأَمَلِ" [۱]

"خطرناک چیزیں جن سے تمہیں ڈراتا ہوں وہ دو چیزیں ہیں:- ہوا پرستی (خواہشات کی پیروی) اور لمبی آرزوئیں۔"

غیر معمولی اہمیت کی وجہ سے اسی معنی کو خطبہ ۴۲ میں زیادہ وضاحت کے ساتھ آپؑ نے فرمایا:

"أَيُّهَا النَّاسُ! وَ إِنَّ أَخْوَفَ مَا أَخَافُ عَلَيْكُمُ اثْنَانِ: اِتِّبَاعُ الْهَوَىٰ وَ طُولُ الْأَمَلِ. فَأَمَّا اتِّبَاعُ الْهَوَىٰ فَيَصُدُّ عَنِ الْحَقِّ، وَأَمَّا طُولُ الْأَمَلِ فَيُنْسِي الْآخِرَةَ"

"اے لوگو جان لو! تمہارے متعلق جس خوفناک چیز کے بارے میں مجھے ڈر ہے وہ دو چیزیں ہیں:- ہوا و ہوس کی پیروی جو انسان کو حق سے دور کر دیتی ہے اور لمبی اُمیدیں جو آخرت کو بھلا دیتی ہیں۔"

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روایات کے بہ نظر غائر مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ مولا علی علیہ السلام نے اس گفتگو کو اپنے استاد اور آقا پیغمبر اسلامؐ سے اقتباس کیا ہے، کیونکہ یہی معنی بحار الانوار میں آنحضرتؐ کے کلمات کے ضمن میں نقل ہوئے ہیں۔ [۲]

حقیقت میں یہ دو چیزیں گناہ کے سب سے خوفناک عوامل اور تقویٰ کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ ہیں، کیونکہ خواہشات کی پیروی کی کوئی حد بندی نہیں ہے۔ جب یہ انسان کے اوپر مسلط ہوں تو اس کے کان بہرے اور آنکھیں اندھی ہو جاتی ہیں۔ نہ پیغمبروں اور معصومینؑ کی حق باتوں کو سننے کی قوت رکھتے ہیں نہ چشم بصیرت اُنہیں دیکھتی یا نظارہ کرتی ہے۔ یہ چیزیں انسان کو اس طرح اندھا کر دیتی ہیں کہ وہ ایسے خطرناک راستے پر چل پڑتا ہے، جہاں ہر لحظہ گرنے کا امکان ہوتا ہے۔ مگر دنیا کی لمبی اُمیدیں اور مادّی وسائل انسان کو اس طرح دھوکا دیتے ہیں کہ وہ سمجھتا ہے کہ ابدی جگہ یہی دنیا ہے، اسی لیے وہ زندگی کی توہمات میں مبتلا ہو جاتا ہے اور ہمیشہ کے لیے اپنے مقصد (اُخروی نجات و عافیت) تک رسائی حاصل نہیں کر پاتا۔ اس خطبے کے آخر میں جہانِ انسانیت کے اس بزرگ استاد نے ایک مختصر اور جامع نتیجہ اخذ کیا، فرماتے ہیں:

"تَزَوَّدُوا فِي الدُّنْيَا مِنَ الدُّنْيَا مَا تَحْرُزُونَ [۳] بِهِ أَنْفُسَكُمْ غَدًا"

---

[۱] امل، بروزن عمل، آرزو اور امید کے معنی میں ہے۔

[۲] بحار الانوار، ج ۸۰، ص ۲۹۱۔

[۳] حرز کے مادے سے ہے جو نگاہ داری اور حفظ کے معنی میں آیا ہے۔

www.shiabookspdf.com

"اسی دنیا میں اور اس دنیا سے توشہ آخرت تیار کرو[1] تا کہ کل اپنے آپ کو محفوظ کر سکو۔"

جی ہاں! سفر طویل ہے، لمبا سفر کرنے والے کے لیے کافی مقدار میں زادِراہ چاہیے چونکہ انجانے راستے کے بارے میں کچھ پتا نہیں۔ عاقل کو چاہیے کہ اس اہم نتیجے کو دل وجان سے سن لے اور تمام محنت وقوت سے زادِراہ جمع کرے اور موت سے پہلے سفر کا بوجھ تیار کر لے۔ اس انداز سے زادِراہ جمع کرے کہ سفر کے آخر تک خرچ کافی ہو اور وہ خطرات جو راستے میں پیش آتے ہیں، ان سے پرہیز کرے اور ہر گوشہ وکنار میں شیاطین کے وسوسوں اور اعمال سے جن سے وہ اپنی طرف لے جانے کی کوشش کرتے ہیں، ان سے خوف کھائے اور دور رہے۔

نکات

ا۔ اِس دُنیا سے کون ساز ادِراہ تیار کریں

اگر انسانوں کو ان مسافروں سے تشبیہ دیں جو ایک تنگ اور ناہموار راستے سے نیکیوں اور پاکیزگی سے پُر ایک بڑی دنیا کی طرف حرکت کر رہے ہوں، یہ ہم نے کوئی غیر معقول بات نہیں کہی، بلکہ حقیقی مسافرت یہی ہے کہ انسان اس پست اور حقیر دنیا سے ایک عظیم لامتناہی جہان کی طرف سفر کرتا ہے اور وہ تمام معاملات جو اس معمولی دنیا میں ایک مکان سے دوسرے مکان کی طرف سفر کرنے کے لیے لازم ہوتے ہیں، وہی اس سفر میں بھی ضروری ہیں۔ زادِراہ، سواری، جہاں سے جارہا ہے، جہاں جارہا ہے، کیوں جارہا ہے اور راستے کے خطرات، لیٹروں سے ڈر، غرض ان میں سے ہر ایک پر طویل بحث ہے۔

توشہ وزادِراہ کے معاملے میں قرآن مجید میں تقویٰ و پرہیزگاری، اطاعتِ فرمانِ خدا، تمام نیکیوں اور پاکیزگیوں کی عظمت کو وضاحت سے بیان آیا ہے۔ نہج البلاغہ کے خطبوں میں کہیں کہیں اس معنی سے سہارا لیا گیا ہے، ان میں سے خطبہ ۱۸۳ میں فرماتے ہیں:

"وَ أَنْتُمْ بَنُوْ سَبِيْلٍ عَلَى سَفَرٍ مِنْ دَارٍ لَيْسَتْ بِدَارِكُمْ وَ قَدْ أُوْذِنْتُمْ مِنْهَا بِالْاِرْتِحَالِ وَ أُمِرْتُمْ فِيْهَا بِالزَّادِ"

"تم ان مسافروں کی مانند ہو جن کا کوئی حقیقی گھر نہیں ہے، اپنے ہمیشہ رہنے والے گھر کی طرف حرکت کر رہے ہو سفر کا حکم مل چکا ہے اور زادِراہ کا دستور تمہیں دیا جا چکا ہے۔"

---

[1] بحار الانوار، جلد ۷۰، ص ۹۱۔

www.shiabookspdf.com

اس مقام پر ایک سوال کی جگہ باقی رہ گئی ہے کہ عام طور پر لمبے سفر میں راستے کے لیے زادِراہ کی ضرورت پڑتی ہے نہ کہ منزل کے لیے، حالانکہ تقویٰ و پرہیزگاری ہی قیامت میں کام آئے گی جو نجات اور بہشت میں داخل ہونے کا سبب ہے پس تقویٰ کو زادِراہ کا نام کیوں دیا گیا ہے؟ اس نکتے پر توجہ دینے سے اس سوال کا جواب روشن ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اس لمبے سفر کی ابتدا موت کے سکرات کے وقت سے ہوتی ہے اور عالمِ برزخ میں سفر کا سلسلہ جاری رہتا ہے اسی طرح قیامت کے دن، حساب و کتاب کے دوران اور صراط کے خوفناک اور منازل میں بھی یہ سفر جاری رہتا ہے اور آخر کار بہشت پر اختتام ہوتا ہے۔ بے شک تقویٰ عالمِ برزخ میں بھی اور قیامت کے دن اور بہشت میں داخل ہونے سے پہلے کی منازل میں زادِراہ ہے۔

جی ہاں تقویٰ ہی زادِراہ ہے کہ ان پُرخطر منازل سے سلامتی کے ساتھ گزار دیتا ہے اور منزلِ مقصود جو کہ بہشت ہے، کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ یہ نکتہ بھی قابلِ غور ہے کہ آیہ شریفہ :

"إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللهِ أَتْقَاكُمْ" [1]

"اس میں شک نہیں کہ خدا کے نزدیک تم سب میں بڑا عزت دار وہی ہے جو بڑا پرہیزگار ہو۔"

میں تقویٰ کو ہی انسان کی وقعت اور کرامت کا معیار قرار دیا گیا ہے۔ اور اس معنی پر نظر رکھیں کہ ایمان سے لیے گئے تقویٰ کو سببِ نجات اور کبھی زادِراہ کے عنوان سے اور کبھی معیار و کرامت کے عنوان سے تعبیر کیا گیا ہے۔ نہج البلاغہ کے خطبہ ۲۰۴ میں روشن تر تعبیروں کو دیکھا جا سکتا ہے جو اوپر کی بحث کی وضاحت ہیں۔ فرماتے ہیں:

"وَ انْقَلِبُوْا بِصَالِحِ مَا بِحَضْرَتِكُمْ مِنَ الزَّادِ! فَإِنَّ أَمَامَكُمْ عَقَبَةً كَؤُوْدًا وَ مَنَازِلَ مَخُوْفَةً مَهُوْلَةً لَابُدَّ مِنَ الْوُرُوْدِ عَلَيْهَا وَ الْوُقُوْفِ عِنْدَهَا"

"توشۂ آخرت (ایمان تقویٰ اور عملِ صالح) کی تیاری کے ساتھ آخرت کی طرف حرکت کرو کیونکہ سخت اور خوفناک راستے پیش آتے ہیں کہ جن میں پھنس جاؤ گے۔ ذرا ٹھہر جاؤ (رک جاؤ)"

ہم خداوند بزرگ و برتر سے چاہتے ہیں کہ مرنے سے پہلے اس زادِراہ کو تیار کرنے کی توفیق مرحمت فرمائے اور خالی ہاتھ (جیسا بھی اور کچھ بھی کریں پھر ہمارا ہاتھ خالی ہے) اس سفر میں بغیر نامۂ اعمال کے نہ چلیں۔

۲۔ ہوا پرستی اور لمبی امیدیں سعادتِ انسانی کے دو سخت دشمن ہیں

[1] سورۂ حجرات، آیت ۱۳

اس خطبے کے آخر میں ہوا پرستی اور لمبی امیدوں کے عظیم خطرات کے بارے میں خبردار کیا گیا ہے۔ اس بات کی طرف توجہ دینی چاہیے کیونکہ خطرے کا اصلی نکتہ اور راز اسی جگہ ہے۔ ہوا پرستی سعادت انسانی کی راہ میں بڑی رکاوٹ ہے۔ شہوات اور خواہشاتِ نفس کی غیر مشروط پیروی سعادت بشری کی سب سے بڑی دشمن ہے۔ قرآن پیغمبروں کو بھی ان اُمور کے متعلق خبردار کرتا ہے۔ منجملہ حضرت داؤد علیہ السلام کے متعلق فرمایا کہ ہم نے داؤد علیہ السلام سے کہا:

"وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوَىٰ فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ" [۱]

"ہوائے نفس کی پیروی نہ کرنا کہ یہ تمہیں اللہ کے راستے سے گمراہ کرے گی۔"

ایک دوسری جگہ پر ہوائے نفس کو ایک خطرناک بت کے عنوان سے یاد کیا ہے، فرمایا:

"أَفَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَٰهَهُ هَوَاهُ وَأَضَلَّهُ اللَّهُ عَلَىٰ عِلْمٍ وَخَتَمَ عَلَىٰ سَمْعِهِ وَقَلْبِهِ وَجَعَلَ عَلَىٰ بَصَرِهِ غِشَاوَةً فَمَنْ يَهْدِيهِ مِنْ بَعْدِ اللَّهِ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ" [۲]

"کیا تم نے ان لوگوں کو دیکھا ہے کہ جنہوں نے اپنی ہوائے نفس کو معبود بنایا ہے؟ انہیں خدائے متعال نے (کیوں کہ یہ قابل ہدایت نہیں تھے) علم کے ساتھ گمراہ کیا ہے اور ان کے کانوں اور دل پر مہر لگا دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا ہے، اس حالت میں خدا کے علاوہ کون ہے جو اس کی (توبہ اور راہ حق کی طرف واپسی کے لیے) ہدایت کر سکے، کیا تم غور نہیں کرو گے۔"

بے شک ہوا پرستی آنکھوں اور کانوں کو اندھا اور بہرا کرتی ہے، عقل اور فکر انسانی پر مہر لگا دیتی ہے اور اسے زندگی کے روشن ترین مسائل کی تشخیص کرنے سے محروم کر دیتی ہے، اس سے بڑھ کر بھی کوئی خطرہ ہے؟

"وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوَىٰ فَإِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَأْوَىٰ" [۳]

"مگر جو شخص اپنے پروردگار کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرتا اور اپنے نفس کو ناجائز خواہشوں سے روکتا رہا تو اس کا ٹھکانا یقینا بہشت ہے۔"

اس لیے قرآن بہشت صرف اُس شخص کے واسطے قرار دیتا ہے جو خداوند عالم کی مخالفت سے ڈرتا ہے اور اپنے نفس کی خواہشات کے مقابل استقامت دکھاتا ہے۔ بے شک لمبی آرزوئیں سعادت انسانی کے لیے بدترین و خطرناک ہیں

[۱] سورۂ ص، آیت ۲۶

[۲] سورۂ جاثیہ، آیہ ۲۳

[۳] سورۂ نازعات، آیہ ۴۰، ۴۱

www.shiabookspdf.com

، کیونکہ تمام زندگی کے تجربے نشاندہی کرتے ہیں کہ انسان آرزوؤں کی بلندیوں کی حدوں کو چھو نہیں سکتا۔ جس قدر انسان آگے بڑھتا، ترقی کرتا ہے، پھر بھی تمنا رکھتا ہے کہ مزید آگے بڑھوں۔ یہ بات واضح ہے کہ ایسی طویل اور بے حد وحساب خواہشات انسان کی تمام فکری اور جسمانی قوتوں کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہیں اور آخرت اور ہمیشہ باقی رہنے والے زندگی کے لیے جدوجہد کے لیے کوئی طاقت باقی نہیں رہتی۔ کچھ لوگوں کو دیکھتے ہیں اور پہچانتے ہیں کہ وہ عمر کے آخری حصے میں بھی بُرے خیالات اور لمبی اُمیدوں میں ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں، یہاں تک کہ وہ اپنی اولاد کی تربیت بھی نہیں کرسکتے، تا کہ وہ تہذیب نفس کے راستے پر گامزن ہوں۔

ان آرزوؤں کی کچھ عجیب بات یہ ہے کہ جتنا انسان ترقی کرتا ہے اتنا ہی اس کے اندر منفی جذبے میں اضافہ ہوتا ہے اور غرور وغفلت کی لہریں اُسے خوف زدہ کردیتی ہیں۔ یہ وہ باتیں ہیں جن کے بارے میں اللہ پیغمبر اسلامؐ کی طرف مخاطب ہو کر کفار کے کچھ گروہ کے طور وطریقوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"ذَرْهُمْ يَأْكُلُوْا وَيَتَمَتَّعُوْا وَيُلْهِهِمُ الْاَمَلُ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ۔"[1]

"انہیں اپنے حال پر چھوڑ دو تا کہ کھائیں اور زندگی کی مادّی لذتوں سے بہرہ مند ہوں اور لمبی آرزوؤں نے انہیں غفلت میں رکھا ہے لیکن وہ جلد جان لیں گے۔" (کتنی بڑی غلطی کے مرتکب ہیں اور قیمتی لمحات کو اپنی جاہلیت کی وجہ سے ضائع کردیتے ہیں)۔ نہج البلاغہ کے کلمات قصار میں آیا ہے:

"مَنْ أَطَالَ الْاَمَلَ أَسَاءَ الْعَمَلَ"[2]

"جو کوئی لمبی آرزوئیں کرے گا برے اعمال کا مرتکب ہوگا۔"

شرعی اسباب سے استفادہ کرکے ان آرزوؤں تک رسائی ہرگز ممکن نہیں ہے، حلال وحرام کے آمیزش سے، دوسروں کے حقوق کو پامال کرکے اور فرمانِ خدا کو فراموش کرکے ہی لوگ اپنی آرزوؤں تک پہنچ سکتے ہیں۔

نہج البلاغہ کے خطبہ ۸۶ کے آخر میں حضرت علی علیہ السلام نے اس سلسلے میں بہت ساری تعبیرات کے ساتھ سعادت کے طلب گار انسانوں کو خبردار کیا ہے۔ آپؑ فرماتے ہیں:

"وَ اعْلَمُوْا! أَنَّ الْاَمَلَ يُسْهِي الْعَقْلَ وَ يُنْسِي الذِّكْرَ فَأَكْذِبُوا الْاَمَلَ! فَإِنَّهُ غُرُوْرٌ وَ صَاحِبُهُ مَغْرُوْرٌ"

---

[1] سورہ حجر، آیہ ۳

[2] کلمات قصار، شمارہ ۳۶

www.shiabookspdf.com

"جان لو کہ لمبی اُمیدیں عقل کو گمراہ کرتی ہیں اور یادِ خدا کو بھلا دیتی ہیں اس لیے ان آرزوؤں پر اعتبار نہ کرو، یہ فریب ہیں اور ایسی آرزوئیں کرنے والا فریب خوردہ ہے۔"

یہ مسئلہ اس قدر اہمیت کا حامل ہے کہ امام عالی مقامؑ نے خطبہ ۸۱ میں زہد و تقویٰ کا اصلی رکن قرار دیا ہے۔ فرماتے ہیں:

"أَيُّهَا النَّاسُ! اَلزَّهَادَةُ قِصَرُ الْاَمَلِ وَ الشُّكْرُ عِنْدَ النِّعَمِ وَ التَّوَرُّعُ عِنْدَ الْمَحَارِمِ"

"اے لوگو! زہد تین چیزوں پر منحصر ہے۔ امیدوں کو کم کرنا، نعمتوں پر شکر اور گناہوں سے پرہیز کرنا۔"

انسان کی آرزوئیں اس کی عمر، قدرت اور ممکنات سے ہمیشہ بلند ہوتی ہیں۔ اسی دلیل کی بنا پر ہوا پرست، دنیا کے طلبگار ہرگز اپنی آرزوؤں کی انتہا تک نہیں پہنچ سکتے ہیں۔ اکثر ناراحتی کے ساتھ جان دیتے ہوئے اور دنیا کی بے شمار تکالیف کے ساتھ اس دنیا سے رخصت ہوجاتے ہیں۔ جہانِ انسانیت کے بزرگ معلّم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک روشن اور واضح کرنے والی مثال کے ضمن میں اس مطلب کو بیان فرمایا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک دن لکڑی کے تین ٹکڑوں کو لیا، ایک ٹکڑے کو اپنے سامنے زمین پر رکھا، دوسرے ٹکڑے کو تھوڑے سے فاصلے پر رکھا اور تیسرے ٹکڑے کو کافی دور رکھا، پھر اپنے صحابہ کی طرف رخ کیا اور فرمایا: جانتے ہو یہ کیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا خدا اور اُس کا رسولؐ بہتر جانتے ہیں، آپؐ نے فرمایا: یہ جو لکڑی کا ٹکڑا میرے سامنے ہے بمنزلہ انسان ہے، دوسرا ٹکڑا جو تھوڑا دور ہے موت اور زندگی کے آخری حصے کی مثل ہے مگر تیسرا ٹکڑا جو کافی دور رکھا ہے وہ انسان کی آرزوئیں ہیں کہ وہ ان کی تلاش میں رہتا ہے، لیکن ان آرزوؤں تک پہنچنے سے پہلے موت اس کی راہ میں حائل ہوجاتی ہے۔ [1]

البتہ یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ آئندہ کی اُمیدیں اصل میں انسان کے لیے حرکت و تلاش، کوشش کی وجوہات ہیں۔ اُمید و آرزو کا وجود کسی انسان میں ہونا عیب نہیں ہے بلکہ حُسن ہے، اور اس کے بغیر زندگی گزارنا بہت مشکل ہے۔ مگر انسان کی بدبختی کا باعث وہ آرزوئیں ہیں جو غیر منطقی اور حد سے زیادہ ہوں۔ یہ وہ چیز ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک معروف حدیث میں اصل اساسی کے عنوان سے آئی ہے، آنحضرتؐ نے فرمایا:

"اَلْاَمَلُ رَحْمَةٌ لِاُمَّتِيْ وَلَوْلَا الْاَمَلُ مَا رَضِعَتْ وَالِدَةٌ وَلَدَهَا وَلَا غَرَسَ غَارِسٌ شَجَرًا"

"آئندہ کی اُمید رکھنا میری اُمت کے لیے رحمت ہے۔ اگر اُمید کا نور نہ ہوتا تو کوئی ماں اپنی اولاد کو دودھ نہیں پلاتی

[1] "تنبیہ الخواطر" ص ۲۲۶، میں کتاب میزان الحکمہ، ج ۱، ص ۱۴۳ سے نقل کیا گیا ہے۔

www.shiabookspdf.com

اور کوئی کاشت کار کاشت کاری یا شجر کاری نہیں کرتا۔" [1]

اس بنا پر اخلاق کے معلّمین پر یہ بھاری ذمّے داری عائد ہوتی ہے، کیونکہ ایک طرف اپنے دلوں کو آئندہ کی اُمیدوں کے چراغ سے روشن رکھیں اور دوسری طرف ان آرزوؤں کو اپنے منطقی و معقول حدود میں رکھیں۔

منطقی و معقول حدود وہ ہیں جو کہ انسان کی اپنی ضرورت اور قدرت کے مطابق ہوں۔ اپنے کو اس قدر ان بے مقصد آرزوؤں کی تلاش میں نہ رکھے کہ زندگی کے اصلی ہدف و مقصد کو کھو دے۔ اسلام آئندہ کی منصوبہ بندیوں کا مخالف نہیں ہے۔ بالخصوص وہ کام جو مسلمانوں کے اجتماعی اور معاشرتی سر بلندی کا باعث ہوں اور ان کی دشمنان اسلام کے ساتھ لاتعلقی پیدا کرنے کا سبب ہوں، ایسے کام نہ صرف مذموم نہیں ہیں، بلکہ عبادت کی ایک قسم شمار کیے جاتے ہیں۔ انفرادی زندگی میں بھی عاقبت اندیش ہونا ایک مقبول صفت ہے۔ یہ وہ چیز ہے کہ روایات میں اسے "حزم" سے تعبیر کیا گیا ہے۔

وہ چیز جو اسلام میں مذموم ہے وہ حقیقت میں ایسی چیز ہے کہ انسان ایسی آرزوؤں میں غرق ہو جائے کہ آخرت کو بھول جائے، اور اپنی پوری قوت و توانائیوں کو ان آرزوؤں کے حصول میں صرف کرے جن تک وہ ہرگز نہیں پہنچ سکتا۔

ضمیمہ

علّامہ سیّد رضی (قدس سرہ) مرحوم اس خطبے کے آخر میں چند وضاحتیں بیان فرماتے ہیں

قال السيد الشريف رضی ﷺ و أقول: إنه لو كان كلام يأخذ بالأعناق إلى الزهد فی الدنيا و يضطر إلى عمل الآخرة لكان هذا الكلام و كفى به قاطعاً لعلائق الآمال و قادحاً زناد الاتعاظ و الازدجار و من أعجبه قوله ع ألا و إن اليوم المضمار و غدا السباق و السبقة الجنة و الغاية النار فإن فيه مع فخامة اللفظ و عظم قدر المعنى و صادق التمثيل و واقع التشبيه سرا عجيباً و معنى لطيفاً و هو قوله ع و السبقة الجنة و الغاية النار فخالف بين اللفظين لاختلاف المعنيين و لم يقل السبقة النار كما قال السبقة الجنة لأن الاستباق إنما يكون إلى أمر محبوب و غرض مطلوب و هذه صفة الجنة و ليس هذا المعنى موجودا فی النار نعوذ بالله منها......

"میرے خیال میں اگر دنیا میں کوئی ایسا کلام ہے جو انسان کو اتنی شدت اور قوت کے ساتھ زہد کی طرف کھینچے اور آخرت کی بہتری کے لیے عمل کرنے پر تیار کرے تو وہ یہی گفتگو (امیر المومنینؑ کے اس خطبے کی گفتگو) ہے جو انسان کی طویل

---

[1] بحار الانوار، ج ۶۷، ص ۱۸۳

www.shiabookspdf.com

اور دراز امیدوں اور آرزوؤں کو قطع کر دیتی ہے اور ضمیر انسانی کو بیدار کر کے اس کے دل میں برے اعمال سے نفرت پیدا کر دیتی ہے۔ اس خطبے کے تمام جملوں میں یہ کلمات سب سے زیادہ عجیب، اہم اور حیرت انگیز ہیں مولاؑ فرماتے ہیں:

"اَلَا وَاِنَّ الْيَوْمَ الْمِضْمَارَ وَغَدًا السِّبَاقَ وَالسَّبَقَةَ الْجَنَّةُ وَالْغَايَةَ النَّارُ"

"آگاہ ہو جاؤ آج کا دن تیاری اور آمادگی کا دن ہے اور کل کا دن آزمائش اور مقابلے کا دن ہے۔ آگے بڑھ جانے اور کامیاب ہو جانے والوں کے لیے جنت ہے اور پیچھے رہ جانے اور ناکامیاب رہنے والوں کے لیے عذاب آتش دوزخ ہے۔"

امامؑ نے اس خطبے میں پُرمعنی الفاظ اور ایسی عمیق تمثیلات وتشبیہات استعمال کی ہیں جن میں عجیب اسرار و رموز اور انتہائی لطیف معانی پوشیدہ ہیں اور اس جملہ "وَالسَّبَقَةَ الْجَنَّةُ وَالْغَايَةُ النَّارُ" میں مولاؑ نے مقابلے کے انجام کے لیے دو الفاظ سبقة اور غاية استعمال فرمائے ہیں جن میں ایک لطیف نکتہ پوشیدہ ہے۔ جنت کے لیے مولاؑ نے فرمایا "السبقة الجنة" لیکن جہنم کے لیے "السبقة النار" ارشاد نہیں فرمایا کیوں کہ لفظ سبقت کسی پسندیدہ اور عزیز شے کی طرف بڑھنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اور بہشت ایسی ہی چیز ہے جس کی طرف رغبت اور شوق ہوتا ہے جبکہ آتش جہنم جس سے خدا اپنی پناہ میں رکھے، ہرگز کوئی پسندیدہ اور عزیز جگہ نہیں ہے۔ اسی لیے امامؑ نے "السبقة النار" نہیں فرمایا بلکہ ارشاد ہوا "والغاية النار" کیوں کہ غایت (انجامِ کار) کا مفہوم ایسا انجام ہے جو کسی بھی عمل کا ہو سکتا ہے خواہ یہ انجام مسرت بخش ہو یا انتہائی تکلیف و رنج دینے والا ہو۔

درحقیقت یہ کلمۂ غاية دوسرے کلمات "مَصِيْر" اور "مَآل" کی مانند ہے جن کے معنی "انجام کار" ہیں جیسے کہ خداوند عالم قرآن میں فرماتا ہے:

"قُلْ تَمَتَّعُوْا فَاِنَّ مَصِيْرَكُمْ اِلَى النَّارِ"

"اے رسول کافروں سے کہہ دو کہ تم جو چاہو کل تمہارا آخری انجام جہنم ہے۔"

ظاہر ہے کہ ایسے مواقع پر مناسب نہیں ہے کہ یہ کہا جاتا کہ "سَبَقُكُمْ اِلَى النَّارِ" (تمہاری سبقت جہنم کی طرف ہے) اس خطبے پر مزید غور کیجیے کیوں کہ اس کا باطن حیرت انگیز اور اس کی فکری گہرائی بہت زیادہ اور لطیف ہے۔ مولا علیہ السلام کے زیادہ تر کلمات اسی نہج پر ہیں۔

نہج البلاغہ کے بعض نسخوں میں "سَبْقَةٌ" (سین پر زبر) کے بجائے "سُبْقَةٌ" (سین پر پیش) درج ہے۔ سبقہ عربی زبان میں اس انعام کو کہا جاتا ہے جو مقابلہ جیتنے والے کو دیا جاتا ہے۔ دونوں الفاظ یکساں اور ہم معنی ہیں کیوں کہ انعام

www.shiabookspdf.com

اچھے کام اور مقابلہ پر دیا جاتا ہے، کسی مذموم کام کے لیے نہیں۔

www.shiabookspdf.com

انتیسواں خطبہ

و من خطبة له علیه السّلام [1]

بَعْدَ غَارَةِ الضَّحَاكِ بْنِ قَيْسٍ - صَاحِبِ مُعَاوِيَةَ - عَلَى الْحَاجِّ بَعْدَ قِصَّةِ الْحَكَمَيْنِ، وَ فِيهَا يَسْتَنْهِضُ أَصْحَابَهُ لِمَا حَدَثَ فِي الْأَطْرَافِ.

یہ خطبہ اس خطبے کا ایک حصہ ہے جو مولاؑ نے ضحاک ابن قیس کے حاجیوں کے قافلے پر حملے کے بعد، حکمین کے قصے کے بعد ارشاد فرمایا تھا، اور اس خطبے میں اپنے ساتھیوں کو حکم دیتے ہیں کہ اپنے اِردگرد رونما ہونے والے حالات کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوں۔

خطبہ، ایک نظر میں

جیسا کہ اس خطبے کے اسناد کے ذکر میں بتایا گیا کہ بعض محققین نے اس خطبے کو ستائیسویں خطبے کا حصہ قرار دیا ہے۔

[1] نہج البلاغہ کے منابع و مصادر کے مطابق، یہ خطبہ ان معروف خطبوں میں سے ہے جسے بہت سے ان علمائے کرام نے نقل کیا ہے جو سید رضی کی ولادت سے پہلے رحلت فرما چکے تھے، ان بزرگوں میں سے چند کے نام یہ ہیں:

(۱) ابوعثمان جاحظ نے البیان والتبیین میں، جلد ۱، صفحہ ۱۷۰،

(۲) ابن قتیبہ دینوری نے الامامۃ والسیاسۃ میں، جلد ۱، صفحہ ۱۵۰،

(۳) ابن عبد ربہ نے عقد الفرید میں، جلد ۴، صفحہ ۷۱

(۴) بلاذری نے کتاب انساب الاشراف میں، (مولا علیؑ کی زندگی کی شرح کے حصے میں)، صفحہ ۳۸۰،

(۵) قاضی نعمان مصری نے دعائم الاسلام میں، جلد ۱، صفحہ ۳۹۱ (البتہ اس فرق کے ساتھ جو نہج البلاغہ میں موجود ہیں)۔ شارح خوئیؒ فرماتے ہیں کہ: بحارالانوار، احتجاج اور ارشاد سے استفادہ ہوتا ہے کہ یہ خطبہ، دراصل خطبہ نمبر ۲۷ کا دوسرا حصہ ہے۔ (منہاج البراعۃ خوئی، جلد ۴، صفحہ ۳۱۔)

www.shiabookspdf.com

ایسا لگتا ہے کہ حقیقت بھی یہی ہے، کیونکہ اِن دونوں خطبوں کا مزاج بھی ایک سا ہے اور دونوں میں ایک بات بڑی شدت سے نمایاں ہے کہ کوفہ اور عراق کے لوگ، امیر شام اور شامیوں کے شدید حملوں کے مقابلے میں کافی سست اور بے جان سے ہوا کرتے تھے، گویا وہ لوگ اس بات سے ناواقف تھے کہ ان کے اطراف میں کیا کچھ ہو رہا ہے اور شامیوں نے کیا ڈھونگ رچایا ہوا ہے۔

مولاؑ شدت سے اظہارِ افسوس کے ساتھ ان کے سوئے ہوئے افکار اور ان کی سست روحوں کو بیدار کرنے کے لیے، اُن پر اپنے کلام کے کوڑے برسا رہے ہیں کہ شاید یہ لوگ ہوش کے ناخن لیں، اور جو خطرہ انہیں شامیوں کی جانب سے درپیش ہے، اُس کے مقابلے کے لیے کمر کس لیں۔

ابن ابی الحدید یوں نقل کرتے ہیں: حکمیت کے معاملے کے بعد، امیر المومنینؑ ایک بار پھر امیر شام کے خلاف جنگ کے لیے آمادہ ہو گئے۔ جب امیر شام کو اس بات کی خبر ملی تو وہ وحشت زدہ ہو گیا اور فی الفور اس نے اپنی فوجوں کو امامؑ سے مقابلے کے لیے آمادہ کیا۔ یہ وحشت اس وقت اور بھی بڑھ گئی جب اسے یہ اطلاع ملی کہ مولا علی علیہ السلام کوفہ سے نکل کر نُخیلہ سے بھی آگے تک پہنچ چکے ہیں۔ اس موقعے پر امیر شام نے ہنگامی طور پر دہشت اور خوف و ہراس پھیلانے کے لیے ضحاک ابنِ قیس فہری کو طلب کیا اور اسے حکم دیا کہ کوفے کی طرف جائے اور جس کو بھی علی علیہ السلام کا طرف دار پائے، اس پر حملہ کر کے قتل کر دے اور اس کا مال و اسباب لُوٹ لے۔ اور کہیں بھی نہ رکے۔ اگر دن میں کسی شہر میں ہے تو رات کسی اور شہر میں بسر کرے، مگر ہرگز ان فوجوں سے مقابلہ نہ کرے جو اس کی روک تھام کے لیے تیار کی گئی ہوں۔

ضحاک تقریباً چار ہزار سپاہیوں کے ہمراہ نکلا اور جس جس مقام پر پہنچا وہاں قتل و غارت گری کی اور جسے بھی امامِ عالی مقام کا طرفدار پایا، اسے قتل کر دیا۔ خانۂ خدا کے حاجیوں کے قافلے پر حملہ کر کے انہیں لوٹ لیا۔ عمرو ابن عمیس (صحابی رسولؐ، عبداللہ ابن مسعودؓ کے بھتیجے) کو ان کے کچھ ساتھیوں کے ساتھ قطقطانہ کے مقام کے قریب شہید کر دیا۔ جب ان ہنگامہ آرائیوں کی خبریں امیر المومنینؑ تک پہنچیں تو آپ نے لوگوں کو اس وحشیانہ حملے کا مقابلہ کرنے کے لیے بلایا، جب کہ ان میں سے کچھ لوگوں نے سستی کا مظاہرہ کیا، تو اس موقعے پر حضرتؑ نے یہ خطبہ ارشاد فرمایا۔[1]

پہلا حصّہ

أَيُّهَا النَّاسُ الْمُجْتَمِعَةُ أَبْدَانُهُمْ الْمُخْتَلِفَةُ أَهْوَاؤُهُمْ كَلَامُكُمْ يُوهِي الصُّمَّ الصِّلَابَ وَ

[1] شرح نہج البلاغہ، ابن ابی الحدید، جلد ۲، صفحات ۱۱۳۔۱۱۷

www.shiabookspdf.com

فِعْلُكُمْ يُطْمِعُ فِيكُمُ الْأَعْدَاءَ تَقُولُونَ فِي الْمَجَالِسِ كَيْتَ وَ كَيْتَ فَإِذَا جَاءَ الْقِتَالُ قُلْتُمْ حِيدِي حَيَادِ مَا عَزَّتْ دَعْوَةُ مَنْ دَعَاكُمْ وَ لَا اسْتَرَاحَ قَلْبُ مَنْ قَاسَاكُمْ أَعَالِيلُ بِأَضَالِيلَ وَ سَأَلْتُمُونِي التَّطْوِيلَ دِفَاعَ ذِي الدَّيْنِ الْمَطُولِ.

"اے وہ لوگو! جن کے بدن تو یکجا ہیں مگر افکار اور خواہشات منتشر ہیں! تمہاری (گرماگرم) باتیں تو سخت پتھروں کو بھی توڑ دیتی ہیں مگر تمہارے (سُست) اعمال تمہارے دشمنوں کو لالچ فراہم کر دیتے ہیں۔ اپنی محفلوں میں (تو رجز خوانی کرتے ہو اور) کہتے ہو کہ: ہم ایسا کر دیں گے، ہم ویسا کر دیں گے۔ اور جب دشمن سے لڑنے کا موقع آتا ہے تو کہتے ہو کہ: اے جنگ، تُو ہم سے دور ہو جا۔ جو بھی تم لوگوں کو زور زبردستی سے کسی کام پر مامور کرے، وہ بھی پر سکون نہیں رہ سکتا۔ تم لوگ مسلسل بہانے بازی کے ذریعے ٹال مٹول کرتے رہتے ہو اور جان چھڑاتے رہتے ہو، اور مجھ سے یہ چاہتے ہو کہ میں جنگ کے معاملے میں تاخیر سے کام لوں، بالکل اس مقروض کی طرح جو (سستی اور کاہلی کی بناء پر اپنا قرض ادا کرنے سے قاصر ہے اور) اپنے قرض خواہ سے صرف وقت اور مہلت کی گزارش کرتا رہتا ہے۔"

شرح وتفسیر

جیسا کہ اوپر (خطبہ، ایک نگاہ میں)، کے عنوان میں یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ امامؑ عالی مقام نے اس خطبے کو انتہائی حساس اور کشیدہ حالات میں ارشاد فرمایا۔ جبکہ غارت گر دشمن، عراق کے لوگوں کو خوفزدہ کرنے کے لیے ہر طرح کے مخفیانہ اور آشکار حملوں کی تمام تر چالیں ایک ساتھ چلنے لگا تھا اور امامؑ عالی مقام نے ان تمام تر حملوں کا منہ توڑ جواب دینے کے لیے یہ راہِ حل نکالی تھی کہ چاروں جانب سے منظم حملہ کیا جائے۔ لہٰذا آپؑ نے لوگوں کو تیار کرنا شروع کر دیا تھا، مگر جو سستی اور ناتوانی (مختلف وجوہات کی بناء پر) ان لوگوں پر چھا چکی تھی اس نے تمام راہیں مسدود کر دی تھیں۔

مولاؑ کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی چارۂ کار نہ تھا کہ ان سُست اور بڑے بڑے دعوے کرنے والے گروہ کو اپنے خطبوں کے آتشیں تازیانوں کے تحت ملامت کریں کہ شاید اس طرح سے وہ لوگ اپنے ہوش سنبھالیں اور اس خطرے کی شدت کو ادراک کریں جو ان کی تعاقب میں ہے۔ اس خطبے کے سب سے پہلے جملے میں مولاؑ نے اس ضعف و ذلّت کی اصل وجہ اور فساد کی جڑ کی جانب اشارہ فرمایا جو قول و فعل میں تضاد کا پایا جانا ہے۔ جس کے پیدا ہونے کی اصل وجہ بڑے اور مقدس کاموں پر ہلکا یقین رکھنا ہے۔ امامؑ انہیں مخاطب کرتے ہوئے یوں لب کشا ہو رہے ہیں:

"أَيُّهَا النَّاسُ الْمُجْتَمِعَةُ أَبْدَانُهُمْ، الْمُخْتَلِفَةُ أَهْوَاؤُهُمْ!"

www.shiabookspdf.com

"اے وہ لوگو! جن کے جسم تو یکجا ہیں مگر ان کے افکار منتشر ہیں!"

"كَلَامُكُمْ يُوهِي[1] الصُّمَّ[2] الصِّلَابَ، وَفِعْلُكُمْ يُطْمِعُ فِيكُمُ الْأَعْدَاءَ"

"تمہاری (گرما گرم) باتیں تو سخت پتھروں کو بھی توڑ دیتی ہیں، مگر تمہارے اعمال تمہارے دشمنوں کو لالچ فراہم کرتے ہیں۔"

جی ہاں، تمہاری ساری بدبختی یہیں سے شروع ہوتی ہے کہ تم میں وحدت کی روح ختم ہوگئی ہے۔ تم لوگ بظاہر متحد ہو مگر باطن میں تنہا اور منتشر ہو۔ اسی وجہ سے تم لوگ بجائے عمل کرنے کے، لفاظیوں اور رجز خوانیوں کا دامن پکڑے بیٹھے ہو اور یہی وہ کام ہے جو کہ اگر کسی بھی معاشرے میں عام ہوجائے تو وہ معاشرہ اندر سے کھوکھلا ہوجاتا ہے اور بہت ہی قلیل سی مدت میں اپنے تمام تر سرمائے گنوا دیتا ہے۔

تَقُولُونَ فِي الْمَجَالِسِ: كَيْتَ وَ كَيْتَ[3] فَإِذَا جَاءَ الْقِتَالُ قُلْتُمْ: حِيدِي حَيَادِ[4]

"تم لوگ اپنی محفلوں اور نشستوں میں تو (رجز خوانی کرتے پھرتے ہو اور) کہتے ہو کہ ہم ایسا کریں گے، ہم ویسا کردیں گے، لیکن جب جنگ کا موقع آتا ہے تو کہتے ہو، اے جنگ تو ہم سے دور ہوجا!"

یہ درحقیقت اُن منافقوں کی کھلی صفات میں سے ہے جو سست اور کمزور ارادے والے ہوتے ہیں۔ اپنی محفلوں میں تو بڑی بڑی باتیں کرتے ہیں اور شجاعت کی داستانیں سناتے اور رجز خوانی کرتے رہتے ہیں۔ لیکن گویا ان کی تمام قدرت ان کی زبان کی ہی حد تک ہوا کرتی ہے مگر جب میدانِ جنگ میں آتے ہیں تو زبوں حالی اور ناتوانی کا مظاہرہ کرتے ہیں، گویا یہ کہہ رہے ہوں کہ: "اے جنگ تو ہم سے دور ہوجا، دور ہوجا۔" میدانِ جنگ میں آنے سے انہیں وحشت ہوتی ہے اور طرح طرح کے بہانے کر کے فرار کر جاتے ہیں۔ جی ہاں، یہی حال ہے ان منافقوں کا جو بزدل بھی ہیں اور جتنا بولتے ہیں، اُتنا

---

[1] "یوھی" کا لفظ "وھی" کے مادّے سے آیا ہے۔ اور مقاییس اللّغة کے مطابق یہ دراصل سستی کے معنی رکھتا ہے۔ اور اسی لیے ہر سستی کی بات کو وھی کہتے ہیں اور جیسا کہ معلوم ہے کہ سستی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سب کچھ بکھر جاتا ہے، لہٰذا اس فقرے کو بکھر جانے کے معنی میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

[2] "صُمّ" کا لفظ اَصَمّ کی جمع ہے اور بہرے کے معنی میں آتا ہے اور یہاں پر سخت پتھروں سے مراد ہے۔ گویا کسی کے لیے بھی سننے والے کان نہیں رکھتا اور "صِلَاب" کا لفظ صلب کی جمع ہے اور مضبوط کے معنی میں آتا ہے۔

[3] "کیت و کیت" کا لفظ تکییت کے مادّے سے ہے اور اونٹ پر مال کے لاد دینے، یا پانی کے برتن کو بھر دینے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ مگر کیت و کیت کی تعبیر وہاں استعمال کی جاتی ہے جہاں انسان ہر چیز کو صرف باتوں سے ہی حل کر دینا چاہتا ہے۔

[4] (حیدی) فعلِ اَمر کا صیغہ ہے اور (حُیُوْد) کے مادّے سے ہے۔ اور (حیاد) کا لفظ اسم فعل ہے۔ جیسا کہ (نَزَالِ) کا لفظ (اِنْزِلْ) کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اس بنا پر (حیدی) اور (حیاد) دونوں الفاظ، ایک ہی مفہوم رکھتے ہیں البتہ تاکید کے لیے اس طرح کیا جاتا ہے جیسا کے معنی سے ظاہر ہے: تو ہم سے دور ہوجا، دور ہوجا!

www.shiabookspdf.com

کرنے کے اہل نہیں ہوتے۔

"حِیْدِیْ حَیَادِ" کا جملہ دراصل حَیْدٌ کے مادّے سے ہے۔ جس کے معنی ہیں کسی چیز سے کنارہ کرنا اور نفرت برتنا اور اس کے مدمقابل (فِیْحِیْ فَیَاحِ) کا جملہ ہے جس کے معنی ہیں کسی چیز پر توجہ دینا ہے۔ لہٰذا ممکن ہے کہ (حِیْدِیْ حَیَادِ) سے مراد وہ لڑنے والے اور بہادر مراد ہوں جو کہ جنگ میں پیش قدم رہتے ہیں مگر سست اور منافق افراد انہیں میدانِ جنگ سے کنارہ کشی کرنے کی دعوت دیتے رہتے ہیں، اور اس کے برخلاف لڑنے والے افراد "فِیْحِیْ فَیَاحِ" کا نعرہ لگاتے ہیں۔

یہ احتمال بھی دیا گیا ہے کہ یہ لوگ جنگ کو مخاطب کر کے ایسا کہتے ہیں "تو ہم سے دور ہوجا" اور اس بات سے ان کی دشمن سے وحشت زدہ ہونے کی حد کا اندازہ ہوتا ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس جملے سے وہ اپنے آپ کو مخاطب کر رہے ہوں اور خود کو یہ سمجھا رہے ہوں کہ جس طرح بھی ہو سکے، جلد سے جلد اس جنگ سے مجھے جان چھڑانی ہے۔

یہ لوگ رسالت مآبؐ کے دور کے منافقوں کی طرح ہیں جن کے بارے میں ہم سورہ احزاب میں پڑھتے ہیں کہ ارشاد ہو رہا ہے:

"قَدْ يَعْلَمُ اللّٰهُ الْمُعَوِّقِيْنَ مِنْكُمْ وَ الْقَآئِلِيْنَ لِاِخْوَانِهِمْ هَلُمَّ اِلَيْنَا وَ لَا يَاْتُوْنَ الْبَاْسَ اِلَّا قَلِيْلًا اَشِحَّةً عَلَيْكُمْ فَاِذَا جَآءَ الْخَوْفُ رَاَيْتَهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ تَدُوْرُ اَعْيُنُهُمْ كَالَّذِيْ يُغْشٰى عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ فَاِذَا ذَهَبَ الْخَوْفُ سَلَقُوْكُمْ بِاَلْسِنَةٍ حِدَادٍ اَشِحَّةً عَلَى الْخَيْرِ اُولٰٓئِكَ لَمْ يُؤْمِنُوْا فَاَحْبَطَ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ وَ كَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا"۔[1]

"اللہ ان لوگوں کو بخوبی جانتا ہے جو لوگوں کو جنگ سے روکتے تھے اور وہ لوگ جو اپنے بھائیوں کو کہتے تھے کہ ہماری طرف آجاؤ (اور جنگ کے معرکے سے کنارہ کشی کر لو)۔ وہ لوگ (کمزور افراد ہیں اور) صرف تھوڑی بہت جنگ لڑتے ہیں۔ وہ لوگ ہر چیز میں تمہاری نسبت کنجوس اور بخیل ہیں، اور جب انہیں کوئی خوف و ہراس لاحق ہوتا ہے تو تم انہیں اس حال میں دیکھو گے کہ ان کی نگاہیں تمہاری جانب گھوم رہی ہوں گی کہ گویا مرنے والے ہیں، لیکن جب خوف و ہراس ختم ہوجاتا ہے تو اپنی تیز طرار زبانیں تمہارے ہی خلاف غصّے میں چلا رہے ہوتے ہیں (اور مالِ غنیمت میں اپنا حصہ مانگنے اور حق جتانے کو کھڑے ہوجاتے ہیں) جبکہ وہ اس میں حریص اور بخیل ہوتے ہیں۔ یہ لوگ ہرگز ایمان نہیں لائے، اس لیے اللہ نے بھی ان کے اعمال نیست و نابود کر دیے اور یہ کام اللہ کے لیے نہایت آسان ہے۔"

---

[1] سورۂ احزاب، آیات ۱۸-۱۹

www.shiabookspdf.com

اگر اصحابِ رسولؐ میں سے صرف چند افراد ایسے تھے تو افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ مولا علی علیہ السلام کے لشکر کی اکثریت جو کہ کوفے کے لوگوں پر مشتمل تھی، وہ ایسی تھی۔ مولاؑ نے اس خطبے کو آگے بڑھاتے ہوئے فرمایا:

"مَا عَزَّتْ دَعْوَةُ مَنْ دَعَاكُمْ، وَلَا اسْتَرَاحَ قَلْبُ مَنْ قَاسَاكُمْ"

"جو تم لوگوں کو (حق کا دفاع کرنے کے لیے) بلائے، وہ کبھی عزت دار جواب نہیں پائے گا اور جو زور زبردستی کے ذریعے تم پر دباؤ ڈالے گا (اور تمہیں جہاد کے لیے بلائے گا) اس کا دل بھی کبھی پر سکون نہیں ہوگا۔"

مولاؑ کا یہ کلام درحقیقت اُن لوگوں کو ایک جواب ہے جو ممکن ہے مولاؑ کے ایسے خطبات کو ہلکا گردانیں کہ حضرتؑ نے صرف موعظہ پر کیوں کر اِکتفا کیا ہے؟ آخر ان جیسے لوگوں کو مولاؑ نے زور زبردستی کر کے یا شدت سے جنگ کے لیے کیوں نہیں پکارا، جیسا کہ دنیا کے زیادہ تر ممالک میں جنگ کے موقع پر معمول ہے؟

امامؑ جواب میں فرماتے ہیں کہ اگر میں تم لوگوں کو آزاد چھوڑ دوں اور تمہیں جہاد کی جانب بلانے کے ذریعے سے، یعنی بغیر زور زبردستی کے بلاؤں تو تم لوگ مجھے مثبت جواب نہ دو گے، اور اگر میں تمہیں شدت اور زور زبردستی کے ساتھ بلاؤں تو بھی تم لوگ کوئی ایسی قابلِ ذکر تحریک اپنے اندر نہ دکھاؤ گے کہ جس سے مجھے قلبی سکون مل جائے اور میں مطمئن ہو جاؤں کیونکہ تم لوگ سست اور کاہل ترین افراد ہو اور ایسے افراد زمانے کے لیے اور خاص طور پر پیشواؤں کے لیے دردسر ہیں۔

البتہ تاریخ بھی اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ کوفے کے لوگ بنی امیہ، ابن زیاد اور حجاج جیسوں کی کھینچی ہوئی لکیر پر ہر طرح کی شرائط پر چلنے کے لیے آمادہ ہو جاتے تھے اور اُن کے تابع ہو جایا کرتے تھے کیوں کہ وہ اپنی ناموس اور مال و اسباب کو خطرے کی زد میں دیکھتے تھے، مگر سوال یہ ہے کہ کیا علی علیہ السلام جیسے ایک عادل پیشوا کو بھی یہی کرنا چاہیے تھا، ہرگز نہیں۔ حضرت علی علیہ السلام پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے فرماتے ہیں:

"أَعَالِيلُ بِأَضَالِيلَ"

"تم لوگ مسلسل گمراہ کرنے والے بہانوں کے دامن کو تھامے ہوئے رہتے ہو اور لیت و لعل سے کام لے رہے ہو۔"[1]

"وَسَأَلْتُمُونِي التَّطْوِيلَ دِفَاعَ ذِي الدَّيْنِ الْمَطُولِ"

---

[1] ۔ اعالیل ۔ کا لفظ اعلولة کی جمع ہے اور اُن کاموں کے معنی میں آتا ہے جن کے بہانے سے انسان جان چھڑاتا رہتا ہے اور سستی برتتا ہے اور ۔ اضالیل ۔ کا لفظ اضلولة کی جمع ہے اور یہ اُن معاملات کے معنی میں ہے جو گمراہی کا سبب بنتے ہیں۔ یعنی تم لوگ اپنے آپ کو اور دوسروں کو گمراہ کرنے کے لیے بے اَساس بہانے تراشتے رہتے ہو۔

www.shiabookspdf.com

"اور مجھ سے یہ چاہتے ہو کہ میں جہاد کو تاخیر میں ڈال دوں، اُس شخص کی طرح کہ جو سستی اور کاہلی کی بنا پر اپنے قرضے کو ادا کرنے سے ناتواں ہے اور اپنے قرض خواہ سے مستقل وقت اور مہلت مانگتا ہے۔"

جی ہاں، سُست اور کمزور افراد اور بڑے بڑے دعوے کرنے والے لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں، اُن کی تمام تر کوشش اور ہم وغم یہی ہوتا ہے کہ طرح طرح کے بہانوں کے ذریعے اپنے وظائف کی انجام دہی سے جان چھڑا لیں اور اپنی سستی اور کاہلی کو بے بنیاد اور گمراہ کرنے والے بہانوں کے پردے سے چھپالیں، مستقل آج اور کل کرتے رہتے ہیں اور فرصتوں کو گنوا دیتے ہیں۔ اس چیز کو ہم رسولِ خداؐ کے دور کے منافقوں اور آسائش طلب افراد میں دیکھتے ہیں۔ جیسا کہ قرآن نے اُن کے بارے میں کہا ہے:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَا لَكُمْ اِذَا قِيْلَ لَكُمُ انْفِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اثَّاقَلْتُمْ اِلَى الْاَرْضِ ؕ اَرَضِيْتُمْ بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مِنَ الْاٰخِرَةِ ۚ فَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِيْلٌ ۝

"اے وہ لوگوں جو ایمان لائے ہو، جب تمہیں کہا جاتا ہے کہ (خدا کی راہ میں جہاد کی طرف حرکت کرو) تو تم لوگ زمین پر سنگینی کی مثال کیوں بن جاتے ہو (اور سستی کیوں کرتے ہو)؟ کیا تم آخرت کے بجائے دنیا کی زندگی پر راضی ہو گئے ہو؟ جبکہ دنیا کی زندگی کا اثاثہ، آخرت کے برابر میں، سوائے تھوڑا ہونے کے اور کچھ نہیں۔" [1]

نکتہ

کوفیوں کی سُستی کے عوامل

یہ سوال بہت سوں کے نزدیک اُٹھا ہوا ہے کہ کوفے کا لشکر ایک عادل، حکیم اور مُدبّر اور جنگ آزما رہبر اور امیرالمومنینؑ جیسا پیشوار کھتے ہوئے اس قدر سستی اور کاہلی کیوں کر دکھاتا رہا، اور اس کے برعکس شامیوں کا لشکر جو کہ بنی اُمیّہ کے جابر بادشاہوں کے ماتحت، تھا اس کے باوجود اتنی قوت کیوں کر دکھا سکا؟

اس سوال کا جواب، جیسا کہ ہم نے پہلے اشارہ کیا، اُن لوگوں کے اجتماعی سانچے میں ڈھونڈنا ہوگا۔ کوفے کی کوئی خاص تاریخ نہ تھی بلکہ یہ ایک حال ہی میں آباد ہونے والا شہر تھا جس کو کئی قوموں اور گروہوں نے مختلف رسم ورواج کے ساتھ تشکیل دیا تھا اور اُن کے درمیان بہت سی ظاہر اور مخفی دشمنی بھی پائی جاتی ہے، اس کے برخلاف شام کے لوگ بالکل ایک ہی

[1] سورۂ توبہ، آیت ۳۸

www.shiabookspdf.com

تھالی کے چٹے بٹے تھے اور ان کی بہ نسبت کم اختلافات والے تھے، اس کے علاوہ مدینے اور دوسرے مقامات سے بہت سے منافقوں اور اسلام کے دشمنوں کے گروہ وہاں جمع ہو گئے تھے اور اسلام کے خلاف کچھ نہ کچھ سازشوں میں سرگرم تھے۔ اس کے علاوہ اسلامی فتوحات نے اہل کوفہ کو بہت دولت مند بنا دیا تھا، اور یہ دولت اور آسائش پسندی کی طبیعت کا خاصہ ہے کہ یہ جہاد اور جنگ کی طبیعت کے ساتھ سازگار نہیں ہوتی۔

اسی وجہ سے لوگ مسلسل کچھ بہانوں اور عذر خواہی کی کوششوں میں رہتے تھے اور جہاد جیسے حساس اور سرنوشت رقم کرنے والے خاص خاص لمحات میں بھی بچ کر نکلنا چاہتے تھے اور بالآخر انہیں سستی اور تن آسانی کا نتیجہ بھی مل گیا، اور اُن کا وجود بنی اُمیہ کے ظالم حکام کی ضربات اور تازیانوں کی مار سے مجروح ہو گیا۔

جی ہاں! اگر کوئی بیت المال کو بغیر کسی حساب کے ان دولت کے لالچیوں کے آگے پھینکنے والا پیشوا مل جاتا تو یہ لوگ اُس کی ضرور سنتے۔ مگر امیر المومنینؑ ایسے نہ تھے کہ اتنے بڑے گناہ کے آگے سرنگوں ہو جائیں اور خدا کی رضا کو خلق کی رضا کے بدلے بیچ ڈالیں، اس حوالے سے آپؑ نے نہج البلاغہ کے ایک اور خطبے میں بھی ارشاد فرمایا ہے جو کہ احتمال کے مطابق اس خطبے کا ایک حصّہ بھی ہو سکتا ہے، فرماتے ہیں:

"وَاِنِّیْ لَعَالِمٌ بِمَا یُصْلِحُکُمْ وَیُقِیْمُ اَوَدَکُمْ وَلٰکِنِّیْ لَا اَرٰی اِصْلَاحَکُمْ بِاِفْسَادِ نَفْسِیْ۔"

"میں یہ بخوبی جانتا ہوں کہ کس چیز سے تم لوگوں کی اصلاح ہو سکتی ہے اور تمہارا یہ ٹیڑھا پن، سیدھے پن میں بدل سکتا ہے، مگر میں ہرگز تمہاری اصلاح کو اپنے نفس کے تباہ کرنے کے بدلے میں جائز نہیں سمجھتا۔"[1]

دوسرا حصہ

لَا یَمْنَعُ الضَّیْمَ الذَّلِیْلُ وَلَا یُدْرَکُ الْحَقُّ اِلَّا بِالْجِدِّ اَیَّ دَارٍ بَعْدَ دَارِکُمْ تَمْنَعُوْنَ وَمَعَ اَیِّ اِمَامٍ بَعْدِیْ تُقَاتِلُوْنَ.

اَلْمَغْرُوْرُ وَاللّٰهِ مَنْ غَرَرْتُمُوْهُ وَمَنْ فَازَ بِکُمْ فَقَدْ فَازَ وَاللّٰهِ بِالسَّهْمِ الْاَخْیَبِ وَمَنْ رَمٰی بِکُمْ فَقَدْ رَمٰی بِاَفْوَقَ نَاصِلٍ.

"ضعیف و ناتواں افراد ہرگز ظلم کو اپنے آپ سے دفع نہیں کر سکتے، اور حق سوائے کوشش اور محنت کے ہاتھ نہیں آتا، اپنے گھر کے بعد کس گھر کا دفاع کرو گے؟ (کیا دارِ اسلام سے بڑھ کر کوئی اور جگہ ہے) اور میرے بعد کس امام اور پیشوا کے

[1] نہج البلاغہ، خطبہ ۶۹

www.shiabookspdf.com

ساتھ مل کر جہاد کرنے کھڑے ہو گے؟ (کیا مجھ سے بہتر کوئی امام عادل ہے؟) خدا کی قسم اصل میں دھوکا کھایا ہوا شخص وہی ہے جس نے تم لوگوں کا دھوکا کھایا ہو اور جو شخص تم لوگوں کے ذریعے سے جیت جانا چاہے، بخدا وہ بالکل اُس شخص جیسا ہے جسے قرعہ اندازی میں ہار کا پرچہ نصیب ہو جاتا ہے اور جو شخص تمہارے سہارے سے دشمن پر تیر چلانا چاہتا ہے، وہ اُس جیسا ہے جو آگے اور پیچھے سے ٹوٹے ہوئے تیر کو چلا رہا ہے۔"

شرح وتفسیر

اس مقام پر مولاؑ سب سے پہلے تو لوگوں کی زندگی کی سب سے اہم حقیقت کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"لَا يَمْنَعُ الضَّيْمَ [1] الذَّلِيلُ! وَلَا يُدْرَكُ الْحَقُّ إِلَّا بِالْجِدِّ"

"ضعیف اور ناتوان افراد ہرگز ظلم کو اپنے آپ سے دور نہیں کر سکتے اور حق سوائے کوشش کے ہاتھ نہیں آ سکتا۔"

حق تو یہ بنتا ہے کہ ان دو جملوں کو سنہرے لفظوں میں تحریر کیا جائے اور پھر ہر روز صبح و شام، دنیا کے مظلوم لوگوں کے سامنے دہرایا جائے تا کہ یہ حقیقت اُن کی رُسومات کا حصّہ بن جائے اور اُن کی روح اور خون کی گہرائیوں میں نفوذ کر جائے۔

جی ہاں! دنیا کے ستمگر اور ظالم حضرات، ہرگز کمزور اور ناتوان افراد پر رحم نہیں کرتے اور اُن کے حق کو ان کے حوالے نہیں کرتے۔ حق کو لینا پڑتا ہے اور یہ کام سعی و کوشش، ایثار اور قربانی کے ذریعے سے ہی ہو سکتا ہے۔ یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ ظالموں اور ستمگروں سے سوائے زبردستی کے بات نہیں کی جا سکتی۔

دراصل اس دنیا کی زندگی کی خاصیت یہی ہے کہ بلند و بالا مقاصد کے حصول کے لیے، چاہے وہ مادّی ہوں یا معنوی، رکاوٹیں تو بہت آتی ہیں، اور جو ان رکاوٹوں سے مقابلہ نہ کرے اور سُستی و کاہلی دکھائے تو وہ ہرگز اپنے مقصد کو پا نہیں سکتا۔ پھر امامؑ ان کی بہانے بازیوں کی روک تھام کے لیے اس نکتے پر زور دیتے ہیں کہ تم لوگ کس چیز کے انتظار میں ہو؟

"أَيَّ دَارٍ بَعْدَ دَارِكُمْ تَمْنَعُونَ وَمَعَ أَيِّ إِمَامٍ بَعْدِي تُقَاتِلُونَ؟"

"اپنے گھر کے بعد کس کے گھر کا دفاع کرو گے؟ (کیا دارالاسلام سے برتر اور بلند تر بھی کوئی جگہ ہے؟) اور میرے بعد کس امام اور پیشوا کے ہمراہ (دشمن سے) مقابلے کے لیے اُٹھو گے؟ (کیا تمہارے پاس مجھ سے زیادہ عادل اور مجھ سے زیادہ تجربے کار امام ہے؟)"

[1] ضیم۔ ظلم وستم کے معنی میں آیا ہے۔

www.shiabookspdf.com

اگر تم لوگ اپنے گھر کا، جو کہ دار سلام ہے، دفاع نہ کرو، تو پھر کس چیز کا دفاع کرو گے، اور اگر میرے ساتھ دشمن سے لڑنے کو تیار نہیں ہو تو اور کسی کے ساتھ بھی تم نہ لڑو گے، تم ہمیشہ ہی ذلیل وخوار اور رسوار ہو گے اور باگ ڈور اُنہی کے ہاتھوں میں رہے گی اور تم لوگ اُن غلاموں اور نوکروں کی مانند ان کی نظروں میں رہو گے جنہیں کوئی اختیار نہیں ہوتا۔

درحقیقت مولاؑ چاہتے ہیں کہ وہ لوگ جس چیز کی بھی قید وبند میں جکڑے ہوئے ہیں یا جو چیز بھی ان کے پاؤں کی زنجیر بنی ہوئی ہے، کم از کم یہ لوگ اُسی چیز کے نام پر متحرک ہو جائیں اور اُٹھ کھڑے ہوں، اگر یہ لوگ حق کے طرفدار ہیں تو حق تو محنت اور کوشش کے بغیر حاصل ہو ہی نہیں سکتا، اور اگر یہ لوگ گھر اور وطن سے دلچسپی رکھتے ہیں تو وہ بھی بغیر دشمن سے لڑے محفوظ نہیں رہ سکتا اور اگر کسی امام اور پیشوا کے قائل ہو تو پھر بتاؤ کہ مجھ سے بہتر اور عدل پر مجھ سے زیادہ قائم کون سا امام اور پیشوا تمہاری نظر میں ہے؟ آخر تمہارا مسئلہ کیا ہے؟ کس بات میں تم اٹکے ہوئے ہو؟

امامؑ اس بات کے آخر میں انہیں ان کی دھوکا دہی، غیر ذمہ داری اور سازشوں کے باعث شدید مذمت کا نشانہ بناتے ہوئے، ناراضی کے ساتھ فرماتے ہیں:

"اَلْمَغْرُوْرُ -وَاللهِ!- مَنْ غَرَرْتُمُوْهُ."[1]

"خدا کی قسم حقیقت میں دھوکا کھانے والا وہ ہے جو تمہارے دھوکے کی زد میں آجائے۔"

کیوں کہ ممکن ہے کہ کوئی چالاک اور دھوکے باز آدمی، کسی کا سرمایا یا اُس کے لباس یا پھر گھر کا بعض حصّہ یا فقط ان میں سے کوئی ایک چیز برباد کر دے، مگر تم لوگوں نے تو اپنی دھوکے بازی سے میری ہر چیز کو برباد کر دیا ہے اور سارے مسلمانوں کی مقدر ساز مہم پر بے اعتنائی اور بے توجہی دکھائی ہے اور مسلمانوں کی عزت، غیرت، پاکیزگی، بلندی اور کمزور لوگوں کے حقوق تک کو پامال کر دیا ہے۔ پھر اضافہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"وَمَنْ فَازَ بِكُمْ، فَقَدْ فَازَ -وَاللهِ!- بِالسَّهْمِ الْأَخْيَبِ."[2]

"جو کوئی تمہارے ذریعے سے جیتنا چاہے، خدا کی قسم اُس کی مثال اُس شخص جیسی ہے جسے قرعہ اندازی میں ہار کا پرچہ نصیب ہو جائے۔"

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ تمہاری مدد کسی طور بھی گنتی کے قابل نہیں اور قابلِ ذکر نہیں، اور جو بھی تم جیسوں کی

---

[1] "المغرور" کا مقدم ہونا جو کہ درحقیقت مبتدا کی خبر ہے، یہاں پر حصر کے معنی میں آیا ہے، یعنی صرف ایسا شخص ہی ہے جس نے درحقیقت دھوکا اور فریب کھالیا ہے۔

[2] "اخیب" کا لفظ خیب کے مادّے سے آیا ہے اور اصل میں محروم ہونے اور مطلوب کے ہاتھ سے نکل جانے کے معنی میں آتا ہے اور "سھم اخیب" اُس تیر کو کہا جاتا ہے جو بخت آزمائی کے موقع پر ہار کی علامت رکھتا ہے۔

www.shiabookspdf.com

مدد پر بھروسہ کرے وہ بالکل ایسا ہے کہ جیسے ایک شخص کسی قرعہ اندازی میں شریک ہو جائے اور بالآخر ہار جانے والا پرچہ اُس کے نصیب میں آئے۔

قرعہ اندازی اور قسمت آزمائی کی رسم عربوں میں خاص طور پر رائج تھی۔ وہ لوگ ایک اونٹ خرید لیتے تھے۔ اور اُسے متعدد حصوں میں تقسیم کر لیتے تھے۔ پھر دس تیر رکھتے تھے جن میں سے ہر ایک تیر کا مخصوص نام ہوتا تھا، جو کہ اُس پر لکھا ہوتا تھا۔ اُن میں سے سات تیر، بالترتیب ایک حصے، دو حصے سے لے کر سات حصوں تک کے لیے منصوب ہوتے تھے۔ (مجموعی طور پر اٹھائیس حصے ہوتے تھے) اور باقی تین تیروں کے لیے کوئی حصہ نہیں ہوتا تھا، اور اُن تینوں تیروں میں سے ہر ایک کے بھی اپنے اپنے نام ہوتے تھے، درحقیقت اُن تیروں کو "سھم اخیب" یعنی ہارنے والے کا تیر کہا جاتا تھا۔

اِن دس تیروں کو کسی چیز میں ڈال کر ہلایا جاتا تھا اور باری باری دس لوگوں کے نام پر ایک ایک تیر نکالا جاتا تھا، جو لوگ جیتنے والے سات تیروں میں سے ایک تیر پاتے تھے وہ اُونٹ کے گوشت میں سے اپنا حصہ لے جاتے تھے اور جو تین لوگ ہار کی علامت والے تین تیروں کو پاتے تھے ان میں سے ہر ایک اونٹ کی قیمت کا ایک تہائی ادا کرتا تھا اس طرح نہ صرف وہ حصے سے محروم رہتے تھے بلکہ اُلٹا اُن کا نقصان بھی ہو جاتا تھا۔

مولاؑ نے کوفے کے لوگوں کو، جن کی حمایت کی کوئی قدر و قیمت نہ تھی اور اُن کی جنگ بھی برائے نام ہی ہوتی تھی، بلکہ زیادہ تر نقصان دہ ہوتی تھی، اُن تین نقصان دہ تیروں سے تشبیہ دی ہے۔ اور کیا ہی ظریف اور معنی خیز تشبیہ دیتے ہوئے مولائے کائنات فرماتے ہیں:

"وَمَنْ رَمىٰ بِكُمْ فَقَدْ رَمىٰ بِأَفْوَقَ نَاصِلٍ"۔[1]

"جو تمہارے وسیلے سے دشمن پر تیر پھینکنا چاہے وہ اُس شخص جیسا ہے جو بغیر نوک اور پَر والا تیر پھینکتا ہو۔"

پہلے کے تیر انداز، ایسے تیر رکھتے تھے کہ جس کے تین حصے ہوتے تھے، تیر کی لکڑی جو کہ دراصل پورے تیر کو تشکیل دیتی تھی اور تیر کے پچھلے حصے میں پَر ہوا کرتے تھے، جن کے سبب تیر اپنے ہدف کی سمت سیدھا جاتا تھا۔ تیر کی نوک دھات کی بنی ہوتی تھی جس کے باعث تیر اپنے ہدف کے اندر پیوست ہو جاتا تھا۔

ظاہری بات ہے کہ اگر تیر میں دھات والا نوک (پیکان) نہ ہو تو، نہ صرف تیر کی حرکت میں انحراف ظاہر ہوگا، بلکہ اگر ہدف تک پہنچ بھی جائے، تب بھی اُس سے سامنے والے کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا، سوائے اس کے کہ شاید وہ کسی تازیانے کی طرح اُس سے جا کے ٹکرا جائے اور پھر اگر اُس کا آخری حصہ بھی ٹوٹا ہوا ہو تو وہ کمان میں تو لا بھی نہیں جا سکتا اور اگر بالفرض

---

[1]۔ افوق ناصل: لکڑی کا وہ تیر جس کا نہ سر بنا ہوا ہے، نہ آخر سے کٹا ہوا ہے، یہ تیر کسی کام کا میں نہیں آتا۔

www.shiabookspdf.com

ایسی حالت میں اُس کی دھاتی نوک (پیکان) بھی موجود ہو تب بھی اُس سے کوئی کام نہیں لیا جا سکتا اور وہ تیر ہی بے کار ہوتا ہے۔

امامؑ نے اس نکتے میں اس بات پر زور دیا ہے کہ اے کوفے والو! تم لوگ دشمن پر حملہ کرنے کی اصلی طاقت (ایمان، شجاعت، وفاداری اور تقویٰ) سے محروم ہو اور اپنی روزمرہ کی زرق و برق کی زندگی میں ایسے مگن ہو کہ تم نے تمام تر اچھائیوں اور خوبیوں کو گنوا دیا ہے اور بھلا بیٹھے ہو۔

اس مقام پر قابلِ توجہ نکتہ یہ ہے کہ "افوق" کا لفظ "فوق" کے مادّے سے آیا ہے جو کہ تیر کے پچھلے حصّے کو کہا جاتا ہے جس میں ایک جگہ بنی ہوئی ہوتی ہے جو کمان میں لگائی جاتی ہے اور اُسے زور سے پیچھے کھینچا جاتا ہے، اور "ناصل" کا لفظ "نَصلٌ" کے مادّے سے اُس پیکان کے معنیٰ میں ہے جو تیر کے سرے پر نصب کیا جاتا ہے، اور "افوق ناصل" کے لفظ کو اُس موقع پر استعمال کیا جاتا ہے، جہاں نہ تو تیر کا سرا ہوتا ہے اور نہ ہی پچھلا حصّہ ہوتا ہے، جو کہ بالکل بے کار ہوتا ہے، کیوں کہ ان دونوں میں سے ایک چیز کا بھی نہ ہونا تیر کو بے کار بنا دیتا ہے، چہ جائے کہ اُس کے دونوں حصّے ہی ناکارہ ہوں۔

چند نکات

۱۔حق کو لینا چاہیے

جملہ "لَا يُدْرَكُ الْحَقُّ إِلَّا بِالْجِدِّ" میں جو تعبیر استعمال ہوئی ہے، یہ دراصل انسانی زندگی کا ایک بنیادی مسئلہ ہے، اس سے یہ بخوبی سمجھا جا سکتا ہے، لینے والی چیز ہے دینے والی چیز نہیں۔ یعنی ایسے معاشرے میں جہاں لٹیرے اور غارت گر لوگ حاکم ہوں یا حکومت کے حصول کی تگ و دو میں لگے ہوئے ہوں، وہاں ہرگز یہ اُمید نہیں رکھنی چاہیے کہ وہ لوگ بصد شوق و رغبت، مظلوموں اور کمزور عوام کا حق انہیں لوٹا دیں گے، کیوں کہ دراصل اُن کی حکومت اور اقتدار اُن کے ہاتھ آتا ہی تب ہے جب وہ حقوق کو غصب کرتے ہیں اور پھر اگر یہ لوگ حقوق کو لوٹانے لگیں تو یہ بالکل ایسا ہے کہ گویا اُنھوں نے اپنا اقتدار گنوا دیا ہو، اور یہ کام وہ کبھی نہیں کریں گے۔ جب ہی مولاؑ نے دنیا کے ظلم و ستم سہنے والے مظلوم و محروم اور مستضعف لوگوں کو یہ درس دیا ہے کہ وہ آپس میں متحد ہو جائیں اور سعی و کوشش کے ذریعے اپنے حقوق کو طاقت کے زور پر گھمنڈ کے شکار ڈکیتوں اور غلط سیاست کے پیروکاروں سے چھین کر لے لیں اور یقیناً اس راہ میں کامیابی ہوگی۔

کیوں کہ غاصب حضرات کبھی بھی قربانی دینے کو تیار نہیں ہوتے، جب کہ مستضعف اور ستم دیدہ افراد ہر قیمت پر اپنا

www.shiabookspdf.com

حق چھین کر لینے کے لیے تیار ہوتے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ آج کل دنیا میں انسانی حقوق اور محروم کا حق دلانے کے حوالے سے مختلف نعرے لگائے جا رہے ہیں، مگر تجربہ اس بات کا گواہ ہے کہ یہ بھی محض ایک سیاست اور ایک چال ہے تاکہ مظلوم اور محروم شخص اس طرح ان کی حمایت کریں اور پھر جب یہ سیاست باز لوگ کرسی نشین بن جاتے ہیں، تو اُلٹا حقوق کو کھا لیا کرتے ہیں، بجائے دلانے کے غصب کرتے ہیں۔

لہٰذا یہ حقیقت اور قانون کہ حق کو لینا چاہیے کل بھی سچا تھا آج بھی سچا ہے اور ہمیشہ سچا رہے گا۔ پاک دل والے سر بلند اور مومن افراد کبھی ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھتے کہ بے رحم صاحبانِ اقتدار اُن کے تمام سرمائے کو ضائع کر دیں، بلکہ اُن کی نظر میں تلوار چلانا، غاصب ظالموں کے آگے سر تسلیم خم کرنے سے کہیں بہتر ہوتا ہے۔ یہ وہی درس ہے جو امام حسین علیہ السلام نے میدانِ کربلا میں بروز عاشورا دنیا کو اپنے تاریخ ساز جملوں کے ذریعے دیا:

"اَلَا! وَ اِنَّ الدَّعِيَّ بْنَ الدَّعِيِّ قَدْ تَرَكَنِيْ بَيْنَ السِّلَّةِ وَ الذِّلَّةِ! وَ هَيْهَاتَ لَهُ ذٰلِكَ! هَيْهَاتَ مِنِّيَ الذِّلَّةُ! اَبَى اللّٰهُ ذَالِكَ لَنَا وَ رَسُوْلُهُ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ حُلُوْدٌ طَهُرَتْ وَ حُجُوْرٌ طَابَتْ، اَنْ نُؤْثِرَ طَاعَةَ اللِّئَامِ عَلٰى مَصَارِعِ الْكِرَامِ"

"آگاہ ہو جاؤ کہ آلودہ شخص کے آلودہ بیٹے نے مجھے تلوار اور ذلت کے دوراہے پر چھوڑ دیا ہے، ستم ہے کہ میں ذلت کو قبول کر لوں اور وہ اپنے مقصد کو پہنچ جائے، خدا اور اُس کے رسولؐ اور مومنین اور پاک دامن اور نیک لوگ اور پاکیزہ مائیں اس سے بیزار ہیں، کہ بُروں کی اطاعت کو بزرگوں کی قتل گاہ پر ترجیح دیں۔"[1]

یہ جو قرآنی آیات بار بار مومنین کو صبر و استقامت کی جانب دعوت دیتی ہیں درحقیقت اسی لیے ہیں جن میں ارشاد ہوتا ہے:

"اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَ لَمَّا يَأْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ مَسَّتْهُمُ الْبَأْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَ زُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ"[2]

"کیا تم یہ گمان کرتے ہو کہ تم (یونہی بلا آزمائش) جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ تم پر تو ابھی ان لوگوں جیسی حالت (ہی) نہیں بیتی جو تم سے پہلے گزر چکے، انہیں تو طرح طرح کی سختیاں اور تکلیفیں پہنچیں اور انہیں (اس طرح) ہلا ڈالا گیا

---

[1] بحار الانوار، جلد ۴۵، ص ۸۳

[2] سورہ بقرہ، آیت ۲۱۴

www.shiabookspdf.com

کہ (خود) پیغمبر اور ان کے ایمان والے ساتھی (بھی) پکار اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی؟ آگاہ ہو جاؤ کہ بیشک اللہ کی مدد قریب ہے۔"

اسلامی جنگیں جن میں جنگ بدر، اُحد، احزاب، تبوک اور جنگ حنین وغیرہ شامل ہیں، ان کا بغور مطالعہ کرنے سے یہ پتا چلتا ہے کہ رسول اللہؐ کے دور میں مسلمانوں کی یکے بعد دیگرے فتوحات اور کامیابیاں صرف اور صرف جدوجہد، ایثار اور فداکاری کے باعث حاصل ہوئی تھیں۔ یہ بات صحیح ہے کہ رحمت الٰہی ان کے شامل حال تھی، مگر ظاہری طور پر کامیابی کا راز ان کی اپنی جدوجہد تھی۔ یہ تاریخ کا ایک ایسا مستقل قانون ہے جو کہ نہ تو رسول اللہؐ کے ساتھیوں کے لیے مخصوص تھا اور نہ ہی امام حسینؑ کے ساتھیوں سے اور نہ کل سے مخصوص تھا نہ ہی صرف آج کے لیے مخصوص ہے، بلکہ ہمیشہ یہی قانون اصل اور اساس ہے۔

۲۔ وطن کا دفاع

جس قدر انسان امیرالمومنین حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے دور کی تاریخ کا مطالعہ کرے اور اُس وقت کوفہ اور عراق کے لوگوں کی کمزوریوں پر غور کرے تو اس تلخ حقیقت سے واقف ہو جائے گا کہ کس طرح سے ان ذلیل اور نادان افراد نے اتنے بڑے پیشوا کی لاج نہ رکھی اور اپنی بداعمالیوں سے ایسی ہستی کو ہدف تنقید بنا دیا۔

اسی بناء پر امیرالمومنین علیہ السلام انہیں ہر طرح سے کوشش کر کے دشمنوں کے خلاف لڑنے کے لیے آمادہ کرنا چاہتے ہیں، جس طرح سے اوپر بیان کیا گیا کلام امامؑ میں وطن کی محبت کے مسئلے پر زور دیا ہے، فرماتے ہیں:

"اَیَّ دَارٍ بَعْدَ دَارِکُمْ تَمْنَعُوْنَ؟"

"اپنے گھر اور وطن کے بعد کس گھر اور وطن کا دفاع کرنا چاہتے ہو؟"

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ہر شخص اپنے گھر اور وطن سے محبت کرتا ہے اور جب کبھی وہ اپنے وطن کو کسی بڑے خطرے کی زد پر دیکھے تو اُس کا جذبۂ حب الوطنی جوش مارتا ہے، اب چاہے وہ کسی بھی قوم اور مذہب کا پیروکار ہو، چاہے وہ کوئی بھی ہو، وہ اُس کا دفاع کرنے کھڑا ہو جاتا ہے، مگر تم لوگوں میں تو یہ جذبہ بھی نہیں ہے۔

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا وطن کا احترام اس لیے ہے کہ یہ اسلامی ملک ہے، یعنی اسلام کے پیروکاروں کا وطن ہونے کی حیثیت سے محترم ہے یا نہیں، اسلام کے نقطۂ نگاہ میں اوّل تو وطن خود ہی ایک محترم شے ہے اور پھر اگر وہ دارالاسلام ہو تو پھر اُس کی اہمیت اور محبت کرنے کا حق اور بھی زیادہ ہو جاتا ہے۔ ان سوالات کے جوابات آیات وروایات

www.shiabookspdf.com

میں تلاش کیے جاسکتے ہیں، اور عقل بھی اس بات کی تائید کرتی ہے، اس بات کی وضاحتیں تکراراً قرآنی آیات میں نظر آتی ہیں کہ وطن سے باہر نکالنا (ملک بدر کرنا) ایک بے عزتی شمار کی گئی ہے، اس کا مفہوم یہ ہوا کہ وطن بجائے خود اہم چیز ہے، من جملہ سورہ ممتحنہ کی آیت ۸ اور ۹ میں ارشاد ہوتا ہے:

لَا يَنْهَاكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَ تُقْسِطُوْا اِلَيْهِمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ اِنَّمَا يَنْهَاكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ قَاتَلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَ اَخْرَجُوْكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ وَ ظَاهَرُوْا عَلٰى اِخْرَاجِكُمْ اَنْ تَوَلَّوْهُمْ وَ مَنْ يَتَوَلَّهُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ"

"اللہ تمہیں اس بات سے منع نہیں فرماتا کہ جن لوگوں نے تم سے دین (کے بارے) میں جنگ نہیں کی اور نہ تمہیں تمہارے گھروں سے (یعنی وطن سے) نکالا ہے کہ تم ان سے بھلائی کا سلوک کرو اور اُن سے عدل وانصاف کا برتاؤ کرو، بیشک اللہ عدل وانصاف کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے۔ اللہ تو محض تمہیں ایسے لوگوں سے دوستی کرنے سے منع فرماتا ہے جنہوں نے تم سے دین (کے بارے) میں جنگ کی اور تمہیں تمہارے گھروں (یعنی وطن) سے نکالا اور تمہارے باہر نکالے جانے پر (تمہارے دشمنوں کی) مدد کی۔ اور جو شخص اُن سے دوستی کرے گا تو وہی لوگ ظالم ہیں۔"

ان دونوں آیتوں میں خاص طور پر گھر اور وطن سے نکالنے کے مسئلے کو دین کے معاملے میں لڑنے کے بالمقابل رکھا گیا ہے اور اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ان دونوں کی ایک خاص حیثیت ہے، سورۂ مبارکہ بقرہ آیت ۲۴۶ میں بھی یہی بات بنی اسرائیل کے ایک گروہ کی زبان سے نقل کی گئی ہے:

"قَالُوْا وَمَا لَنَآ اَلَّا نُقَاتِلَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَاَبْنَآئِنَا" [1]

"اُن لوگوں نے (اپنے زمانے کے رسول سے) کہا یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ہم اللہ کی راہ میں نہ لڑیں جب کہ ہمیں ہمارے گھروں اور اولادوں سے دور کر دیا گیا ہے (ہمارے شہروں پر دشمن نے قبضہ کر لیا ہے اور ہمارے بچے قیدی بنا لیے گئے ہیں۔"

یہ تعبیر بھی اس بات کی خصوصیت کے ساتھ وضاحت کرتی ہے کہ وہ لوگ آئینِ الٰہی کو حفظ کرنے کے علاوہ اپنے وطن کو بچانے کی خاطر جہاد کے لیے کھڑے ہوئے تھے اور ان کے وقت کے پیغمبرؑ نے بھی اس بات پر کوئی اعتراض نہ کیا، بلکہ عملی طور پر تائید کی۔

[1] سورہ بقرہ، آیت ۲۴۶

www.shiabookspdf.com

اس بارے میں اور بھی آیات موجود ہیں جن کی طرف رجوع کیا جا سکتا ہے، رسول اللہ بھی جس وقت مکے سے مدینے کی جانب ہجرت فرما رہے تھے تو کافی منقلب اور غمگین تھے، یہ دُرست ہے کہ مکے کی اپنی الٰہی اور معنوی حیثیت تھی، مگر رسالت مآبؐ کی اُس شہر سے محبت کرنے کی اور بھی بہت سی وجوہات تھیں، جن میں سے ایک یہ تھی کہ وہ آپؐ کا وطن اور آپؐ کی جائے پیدائش تھی۔ پروردگارِ عالم نے بھی نہایت ہی محبت بھرے انداز میں اپنے حبیبؐ کے غمگین احساسات کی دلجوئی کے لیے فرمایا:

"إِنَّ الَّذِي فَرَضَ عَلَيْكَ الْقُرْآنَ لَرَادُّكَ إِلَىٰ مَعَادٍ"

"جس خدا نے قرآن کو تم پر فرض کیا ہے وہ تمہیں تمہارے وطن ضرور لوٹائے گا۔"[1]

اَساسی طور پر انسان اپنے وطن سے بہت مادّی اور معنوی لگاؤ رکھتا ہے اور اُس کی زندگی کی تاریخ اُسے اور بھی زیادہ اُس کے وطن کے ساتھ جوڑ دیتی ہے، یہی بندھن اُس کے اپنے وطن سے لگاؤ اور محبت کا باعث بن جاتا ہے اور یہی لگاؤ اور محبت اُس کا دفاع کرنے کا جذبہ بھی بیدار کر دیتی ہے۔ مولائے کائنات حضرت علی علیہ السلام کے ایک قولِ مبارک میں ہم پڑھتے ہیں

"عُمِرَتِ الْبُلْدَانُ بِحُبِّ الْأَوْطَانِ"[2]

"تمام شہر، حبِ وطن کے باعث آباد ہوتے ہیں۔"

آپؑ کی ایک اور حدیث میں ہم پڑھتے ہیں:

"مِنْ كَرَمِ الْمَرْءِ بُكَاؤُهُ عَلَىٰ مَا مَضَىٰ مِنْ زَمَانِهِ وَحَنِينُهُ إِلَىٰ أَوْطَانِهِ"

"انسان کی قدر و قیمت کی علامتوں میں سے ایک خاص نشانی ہے کہ وہ اپنے ہاتھ سے نکل جانے والی عمر پر گریہ کرے (کہ اُس میں کوتاہیاں کی ہیں) اور اپنے وطن کی نسبت لگاؤ رکھے۔"[3]

اور ایک معتبر حدیث جو کہ مختلف منابع میں نقل ہوئی ہے کہ ارشاد ہوتا ہے:

"حُبُّ الْوَطَنِ مِنَ الْإِيمَانِ"[4]

"وطن کی محبت، ایمان کی نشانیوں میں سے ہے۔"

---

[1] سورۂ قصص آیت ۸۵

[2] بحار الانوار، جلد ۷۵، ص ۴۵

[3] بحار الانوار، جلد ۷، ص ۲۶۴

[4] سفینۃ البحار، مادّۂ وطن کی ذیل میں ہے۔

www.shiabookspdf.com

جو کچھ بیان ہوا اُس سے یہ نتیجہ ملتا ہے کہ وطن کی محبت وہ اہم موضوع ہے جس کی جڑیں قرآن میں بھی ہیں اور احادیث واقوال میں بھی ہیں اور عقلِ سلیم بھی اسے تسلیم کرتی ہے، مگر اس کا یہ بھی مطلب نہیں کہ انسان اپنے وطن سے اندھی اور جاہلانہ محبت کرے کہ اگر اُسے مثال کے طور پر علمی یا مادّی یا معنوی بُلندیوں کے حصول کے لیے وطن کو چھوڑ کر باہر کہیں جانا ضروری ہو جائے تو وہ تعصب کی بنا پر وطن سے جدا ہونا ہی نہ چاہے، ہر چند کہ اُسے نتیجتاً پسماندگی کا سامنا کرنا پڑے۔

رسالت مآبؐ نے باوجود تمام معنوی لطف و کرمِ خداوندی کے، اپنی جائے پیدائش "مکہ" کو چھوڑ کر اسلام کی بہتر نشر واشاعت کی خاطر مدینے کی جانب ہجرت کی اور ثابت کر دیا کہ وطن میں رہنا ہمیشہ مفاد میں نہیں ہوتا ہے بعض خاص استثنائی حالات میں ہجرت کو قبول کرنا پڑتا ہے۔ اور خاص طور پر یہ بات قابلِ غور ہے کہ رسول اکرمؐ نے فتح مکہ کے بعد بھی اُس جگہ کو اپنے لیے رہائش گاہ نہیں بنایا اور مدینے واپس چلے آئے، کیونکہ وہ اسلام کی مرکزیت کے لیے زیادہ مناسب اور سازگار جگہ تھی۔ اسی لیے حضرت امیرالمؤمنینؑ ایک معروف حدیث جو کہ نہج البلاغہ کلمات قصار میں ہے، فرماتے ہیں:

"لَيْسَ بَلَدٌ بِأَحَقَّ بِكَ مِنْ بَلَدٍ. خَيْرُ الْبِلَادِ مَا حَمَلَكَ"۔[1]

"کوئی شہر تمہارے لیے دوسرے شہر سے زیادہ مناسب اور بہتر نہیں۔"

اور ضرورت کے مطابق وطن سے ہجرت کرنی چاہیے، تمام شہروں میں سب سے بہترین شہر وہ ہے جو تمہیں قبول کرے، یعنی تمہاری ضرورت اور ترقی کے وسائل کو فراہم کرتا ہو۔

یہ نکتہ بھی قابلِ غور ہے کہ اگر مادّی وطن، معنوی وطن کے ساتھ مل جائے اور دارالاسلام کا نام اُس پر صادق آئے تو اُس کی قدر و قیمت اور بھی بڑھ جاتی ہے اور یہی وہ سبب ہے کہ انسان کے تمام تر جذبات اور عشق کے مصادیق اُسے اپنے وطن کا آخری سانس تک دفاع کرنے کے لیے آمادہ کر دیتے ہیں۔

تیسرا حصّہ

أَصْبَحْتُ وَ اللهِ لَا أُصَدِّقُ قَوْلَكُمْ وَ لَا أَطْمَعُ فِي نَصْرِكُمْ وَ لَا أُوعِدُ الْعَدُوَّ بِكُمْ مَا بَالُكُمْ مَا دَوَاؤُكُمْ مَا طِبُّكُمْ الْقَوْمُ رِجَالٌ أَمْثَالُكُمْ أَقَوْلاً بِغَيْرِ عِلْمٍ وَ غَفْلَةً مِنْ غَيْرِ وَرَعٍ وَ طَمَعاً فِي غَيْرِ حَقٍّ.

"خدا کی قسم! .... میں اس موڑ پر کھڑا ہوں کہ اب میں تمہاری باتوں کی تصدیق نہیں کروں گا اور مجھے تمہاری مدد کی کوئی امید نہیں ہے اور دشمن کو تمہارے بل بوتے پر نہ للکاروں گا، تمہارا مسئلہ کیا ہے؟ تمہاری دوا کون سی ہے؟

---

[1] نہج البلاغہ، کلمات قصار ۴۴۲

www.shiabookspdf.com

تمہارا علاج کیسے ہوسکتا ہے؟ یہ شامیوں کا گروہ تمہاری طرح کے لوگوں پر مشتمل ہے (یہ لوگ اس قدر متحد کیوں ہیں اور اپنے ظالم پیشوا کے حکم کے تابع ہیں، مگر تم لوگ اتنے منتشر اور خطا کار ہو؟) کیا آگاہی سے مبرا گفتگو (کسی مشکل کو حل کرتی ہے) اور ایسی غفلت جو تقویٰ سے دور ہو، اور پھر کامیابی کی امید رکھنا، جب کہ تم اس کے لائق نہیں ہو (تمہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچائے گا)"

شرح وتفسیر

تم نے ایسا کام کیا ہے کہ میں تم سے مایوس ہوں

اس خطبے کے آخری حصّے میں جو کہ مولاؑ کے دردناک ترین خطبوں میں سے ایک ہے، مولاؑ ان لوگوں پر سرزنش اور ملامت کے آخری تازیانے برسا رہے ہیں کہ شاید ان کی مرُدہ روحیں متحرک ہو کر ان کشادہ اور وسیع مواقع سے فائدہ اُٹھا کر دشمن کی شیطانی طاقتوں کو توڑ دیں اور مسلمانوں کو ان خون آشام لوگوں کے شر سے بچالیں۔ فرماتے ہیں:

"أَصْبَحْتُ وَاللهِ! لَا أُصَدِّقُ قَوْلَكُمْ، وَلَا أَطْمَعُ فِي نَصْرِكُمْ، وَلَا أُوعِدُ الْعَدُوَّ بِكُمْ"

"خدا کی قسم میں اب اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ تمہاری باتوں کی تصدیق نہیں کروں گا اور تمہاری مدد سے نا اُمید ہوں اور اب میں دشمن کو تمہارے بل بوتے پر نہ للکاروں گا"

یہ بات درست ہے کہ پیشواؤں اور پیروی کرنے والوں کے درمیان اعتماد کا رشتہ ہونا، رہبری کے اہم ترین اُصولوں میں سے ہے اور لوگوں پر اعتماد کرنا اور اُن کی حوصلہ افزائی کرنا، اُن کی خطاؤں کو نظر انداز کر دینا اور ان کی خوبیوں کو بیان کرنا اور غلطیوں کی نشاندہی کرنا گرم جوشی اور کامیابی کا باعث ہوتا ہے۔ مگر بعض اوقات یہ نوبت آجاتی ہے کہ حد سے زیادہ سُستی اور کاہلی، افکار کے انتشار، صفوں کے منتشر ہونے سے اور جہل و نادانی کے سبب رہبر اور پیشوا کی ساری امیدوں پر پانی پھر جاتا ہے اور پھر یہ جذبات اور دلوں کے منجمد ہو جانے کا باعث ہو جاتا ہے اور پھر سوائے سنگین دباؤ کے اُن کی دوبارہ اصلاح کی اور کوئی راہ نہیں بچتی، یا یوں کہا جائے کہ جیسے کہ کوئی شخص ایک ایسا سلا دینے والا خطرناک زہر کھا چکا ہو جو اُس کے لیے جان لیوا ثابت ہو تو اُسے نیند سے جگائے رکھنے کے لیے زوردار تھپڑ مارنے پڑتے ہیں، تا کہ وہ اس نیند سے بیدار ہو جائے جو اُس کی جان کے لیے خطرہ ہے۔

یہ باتیں کوفے کے لوگوں کی حالت کو واضح کرنے کے ساتھ ساتھ امیر المومنین حضرت علیؑ کی تاریخی مشکلات کی

www.shiabookspdf.com

عکاسی بھی کر رہی ہیں، آپ بالکل حق بجانب تھے کہ اُن لوگوں پر عدم اعتماد کا اظہار کریں، کیوں کہ وہ لوگ بارہا اپنے وعدوں سے مکر چکے تھے اور بے وفائی اور عہد شکنی کرتے رہے تھے، وہ لوگ صرف راتوں کو اپنی مخصوص محفلوں میں ہی رجز خوانی کرتے تھے، مگر جس وقت ضرورت ہوتی تھی اُس وقت اپنے گھونسلوں میں چھپے رہتے تھے، پھر اس بات کو آگے بڑھاتے ہوئے حضرت علیؑ گویا ان پر چلّا رہے ہیں، فرماتے ہیں:

"مَا بَالُكُمْ ؟ مَا دَوَاؤُكُمْ ؟ مَا طِبُّكُمْ ؟"

"تمہارا مسئلہ کیا ہے؟ تمہاری دوا کونسی ہے؟ تمہارا علاج کیسے ممکن ہے؟"

"اَلْقَوْمُ رِجَالٌ أَمْثَالُكُمْ "

"شامیوں کا یہ مجمع تم ہی جیسے لوگوں پر مشتمل ہے۔"

(وہ لوگ کیوں اس حد تک متحد ہیں اور اپنے ظالم پیشوا کے حکم کے اس قدر تابع ہیں، مگر تم لوگ اتنے سُست اور منتشر ہو) کیا وہ لوگ کسی اور مٹی کے بنے ہوئے ہیں؟، یا اُن کا نظامِ جسم وروح تم سے مختلف ہے؟ یقیناً ایسا نہیں ہے، اُن میں اور تم میں ایک ہی چیز کا فرق ہے اور وہ ہے اخلاق اور روحانیت کا فرق، وہ لوگ یہ جانتے ہیں کہ میدانِ جنگ کے لیے کس چیز کی ضرورت ہے، مگر تم لوگ نہیں جانتے۔ جبکہ تمہیں اللہ نے بے حساب نعمتوں سے مالا مال کیا ہوا ہے، جیسا کہ ایک عظیم اور قدرت مند پیشوا اللہ نے تمہیں عطا کیا ہے ان کی افرادی قوت اور وسائل کی بھر مار نے تمہیں مرعوب کر دیا ہے، اور تمہیں ذلیل کر دیا۔ افسوس صد افسوس کہ مجھ جیسا رہبر تم جیسوں کو مل گیا۔۔۔! اور مولاؑ سے منسوب دیوان میں ایک شعر میں مولاؑ فرماتے ہیں:

دَوَاؤُكَ فِيْكَ وَ مَا تُبْصِرُ   وَ دَاؤُكَ مِنْكَ وَ مَا تَشْعُرُ

"تمہارا درد تمہاری جان میں ہے اور تم نہیں دیکھتے اور تمہاری دوا بھی تمہارے ہی اندر ہے اور تم نہیں سمجھتے۔"

اس خطبے کے آخر میں مولاؑ بالآخر ان کے مسائل کی نشاندہی کرتے ہوئے تین چیزوں میں ان کا خلاصہ کرتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں:

"أَقَوْلًا بِغَيْرِ عِلْمٍ ؟ وَ غَفْلَةً مِنْ غَيْرِ وَرَعٍ ؟! وَ طَمَعًا فِي غَيْرِ حَقٍّ !؟"

"کیا بغیر آگاہی کے بات کسی مشکل کو حل کر سکتی ہے؟ اور تقویٰ سے دور غفلت تمہیں کسی نتیجے تک پہنچا دے گی؟ اور کامیابی کی اُمید رکھتے ہو جب کہ تم اُس کے لائق نہیں ہو۔"

تم لوگوں کی بدبختی یہیں سے شروع ہوتی ہے کہ تم لوگ بغیر سوچے سمجھے صرف باتیں بناتے رہتے ہو اور تمہاری

www.shiabookspdf.com

آگاہی کی سطح بھی کافی نیچی ہے، تم لوگوں نے تقویٰ کا دامن چھوڑ کر دنیا پرستی کی غفلت کو اپنا لیا ہے، تم لوگ کامیاب لوگوں کا سا انجام چاہتے ہو، جبکہ تم نے اس کے لیے ویسی تیاری نہیں کی ہے، تمہارا اصل درد اور مسئلہ یہی ہے۔ یہ تین خاصیتیں (بغیر عمل کی باتیں اور جہالت سے ملی ہوئی بے تقویٰ حالت اور اُس پر کامیابی کی امید جبکہ اس کے اسباب فراہم نہ کیے ہوں) جس قوم میں بھی دیکھو، اُس قوم میں سوائے بدبختی اور ناکامیوں کے کچھ نظر نہیں آتا۔

نکتہ

ناکامیوں کی اصل وجوہات

بے شک حضرت علی علیہ السلام کے سپاہیوں کے پاس، اتنے قابل اور لائق اور ہر دل عزیز اور جنگی مہارت اور شجاعت رکھنے والے رہبر کے ہوتے ہوئے دشمن پر فتح یاب ہونے کے تمام تر امکانات تھے، مگر افسوس اس بات کا ہے کہ اُن میں کچھ ایسی کمزوریاں تھیں کہ جن کے باعث اُن کی کامیابی کے تمام تر عوامل ضائع ہو گئے اور بے شک یہ بات مسلّم ہے کہ جس کسی قوم میں یہ کمزوریاں پائی جاتی ہوں، وہ بھی کونے والوں سے زیادہ اچھی تاریخ رقم نہیں کرسکتی۔

پچھلے جملوں میں اور بعض اُن جملوں میں جو پچھلے چند مقامات پر گزرے ہیں، اُن میں کچھ کمزوریاں بیان کی گئی ہیں، جن میں سے سب سے پہلی کمزوری، عمل کو چھوڑ کر دعوے کرنا شروع کر دینا ہے، آج کسی محفل یا بیٹھک کی گرما گرمی اور جوش وخروش میں جذباتی ہو کر جنگ اور جہاد کی باتیں کریں، جب کہ اس بارے میں کوئی فیصلہ یا ارادہ ہی نہ کیا ہو، میدانِ جنگ سے پہلے تو جوش مارتے ہوئے شعلہ بیانی اور رجز خوانی کریں مگر ہرگز پہلی صف کے قریب ہی نہ جائیں کہ کہیں دشمن سے لڑنا نہ پڑ جائے، اُصولاً بہت زیادہ دعوے بازی کرنے والے افراد، کمزور اور ضعیف افراد ہوا کرتے ہیں، گویا ان کی تمام تر قوت اور صلاحیت زبان چلانے ہی میں ہوتی ہے، "اَقَوْلًا بِغَيْرِ عِلْمٍ؟" کا جملہ اسی بات کی ترجمانی کر رہا ہے، چاہے ہم علم کو یہاں پر آگاہی کے معنی میں لے لیں، یا عقیدے کے معنی میں، یا عمل کے معنی میں، چونکہ تینوں تفسیریں ایک ہی نتیجہ رکھتی ہے، کیوں کہ کسی بھی چیز کی نسبت آگاہی اور اعتقاد کا ہونا اُس پر عمل کی دعوت دیتا ہے اور ضعف عمل بھی عام طور پر عمیق آگاہی و ادراک کے نہ ہونے یا اُس چیز پر عقیدہ نہ ہونے کے باعث ہوتا ہے۔ جس طرح سے مولا علیؑ کے ایک اور کلام میں ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

www.shiabookspdf.com

"اَلْعِلْمُ مَقْرُوْنٌ بِالْعَمَلِ فَمَنْ عَلِمَ عَمِلَ"[1]

"علم عمل کے ساتھ ہے، جسے کسی چیز کی نسبت علم واعتقاد ہوگا وہ اُس پر عمل کرے گا۔"

دوسری وجہ، غفلت اور ورع کا فقدان ہے، ایک اور تعبیر کے مطابق حقائق پر توجہ نہ کرنا (جو کہ عدم تقویٰ کی وجہ سے ہوتا ہے) اس بات کا سبب ہوتا ہے کہ دشمن بآسانی ایک بڑے مجمع کے درمیان نفوذ کر لیتا ہے، اور بعض اوقات اُن کے بزرگوں کو دنیا کی دولت کے جھانسے میں پھنسا کر خرید لیتا ہے، اور بعض اوقات انہیں کسی مقام کی طمع دے دیتا ہے یا پھر کسی چیز سے خوفزدہ کر دیتا ہے، جبکہ اگر پرہیز گاری اور ہوشیاری ہوتی اور یہ غفلت اور عدم تقویٰ نہ ہوتا تو دشمن کا تیر پتھر پر ٹکرا کر اُسی کی طرف لوٹ جاتا، تیسری وجہ، اُس چیز کی طمع کرنا جس کے لائق نہیں یا دوسری تعبیر کے مطابق اُس کے اسباب فراہم نہیں کیے ہیں۔ ہم یہ جانتے ہیں کہ اِس جہاں میں ہر مقصد تک پہنچنے کے لیے کچھ اسباب کی ضرورت ہوتی ہے، اور علت و معلول کا قدرتی قانون، مرضی الٰہی کے تحت سارے جہاں پر حاکم ہے، جب کہ نادان لوگوں نے ان بندھنوں اور ان نسبتوں کو بھلا کر اپنے مقاصد تک پہنچنے کے لیے خیالات سے دل لگا لیا ہے۔

"طَمَعًا فِيْ غَيْرِ حَقٍّ" کا جملہ اس مفہوم کا ترجمان ہوسکتا ہے، کہ تم لوگ اُس چیز کا لالچ اور طمع کر رہے ہو، جس کا تمہیں حق نہیں ہے، مگر نہج البلاغہ کے بعض مفسرین کہتے ہیں کہ اس جملے سے مراد یہ ہے کہ انہیں یہ لالچ تھا کہ بیت المال سے اُن کو زیادہ حصہ ملے اور اپنے حق سے زیادہ مولا علیؑ سے لے سکیں اور چوں کہ یہ غیر شرعی خواہش پوری نہ ہوئی تو جنگ میں سُستی برتنے لگے۔

یہ طرزِ فکر جو کہ مادیت سے بھرپور ہے، جہاں کہیں بھی ہو، بدبختی اور شکست کا باعث ہے، جس طرح سے غنائم کو جمع کرنے کی طمع جنگ اُحد میں سپاہِ اسلام کی شکست کا باعث بنی۔ بہر حال صرف یہی اُصول لشکرِ کوفہ کی شکست کا باعث نہیں تھا، بلکہ یہ ایک ایسا اُصول ہے جو ہر دور اور ہر زمانے سے جُڑا ہوا ہے۔

یہ آخری جملے، بلکہ اس خطبے کے تمام تر جملے مولا علی علیہ السلام کی لوگوں سے ناراضی اور اندورونی سوز و گداز کی خبر دے رہے ہیں اور اگر تاریخ مدوّن نہ کی گئی ہوتی تب بھی مولاؑ کے یہ جملے آپؑ کے زمانے کے خاص حالات کو واضح کرنے کے لیے کافی ہوتے۔

[1] نہج البلاغہ کلمات قصار، ۳۶۶

www.shiabookspdf.com

www.shiabookspdf.com

تیسواں خطبہ

ومن کلام له علیه السّلام [1]

فِيْ مَعْنٰى قَتْلِ عُثْمَانَ وَهُوَ حُكْمٌ عَلٰى عُثْمَانَ وَعَلَيْهِ وَعَلَى النَّاسِ بِمَا فَعَلُوْا وَبَرَائَةٌ لَهٗ مِنْ دَمِهٖ

یہ خطبہ خلیفۂ ثالث کے قتل کے بارے میں ہے:

اس خطبے میں امام عالی مقامؑ نے وہ گفتارِ دلنشیں ارشاد فرمائی ہے جس میں آپؑ نے خلیفۂ ثالث کے اور اپنے اور لوگوں کے موقف کو اس حادثے کی نسبت نمایاں کیا ہے اور اپنی ذاتِ والا صفات کو خلیفۂ ثالث کے قتل سے طور پر بری الذمہ ٹھہرایا ہے۔

خطبہ ایک نگاہ میں

ہم جانتے ہیں کہ خلیفۂ ثالث کے قتل کے بعد اُن کے قتل کے بارے میں مختلف نظریے ظاہر ہوئے، کچھ لوگوں نے خلیفۂ ثالث کو قصوروار جانا، کیوں کہ انہوں نے اپنی آمریت کے تحت بہت سے اپنوں کو حکومت کے بڑے بڑے عہدوں پر مقرر کر دیا اور بیت المال کے اموال کو اُن کے ہاتھوں میں رکھ دیا، جس سے مسلمانوں نے اُن کے خلاف احتجاج کیا اور قیام

---

[1] نہج البلاغہ کے مصادر میں آیا ہے کہ جو خط امامؑ نے اپنی ظاہری خلافت کے ایام میں تحریر فرمایا تھا، یہ خطبہ اُس کا کچھ حصہ ہے اور جو حوادثِ رسالت مآبؐ کی وفات کے بعد سے اُس خط کے لکھے جانے کے وقت تک رونما ہوئے تھے، آپؑ نے وہ سب اس میں تحریر فرمائے اور حکم فرمایا کہ اُسے لوگوں کے لیے پڑھ کر سنایا جائے۔ یہ احتمال بھی دیا گیا ہے کہ خطبہ ۲۶، ۵۴ اور ۷۸ بھی اسی خط کے کچھ حصے ہوں، اس خطبے کو دوسری کتابوں میں سابقہ بتانے کے لیے رکھا ہے کہ: کتاب "انساب الاشراف" میں کچھ مشابہ تبدیلیوں کے ساتھ ذکر ہوا ہے (مصادر نہج البلاغہ جلد ۱، صفحہ ۴۰۸)۔ یہ احتمال بھی دیا گیا ہے کہ ان کلمات کو امیر المومنین حضرت علیؑ نے مختلف خطبوں کی شکل میں کہا ہے اور پھر اُن سب کو ایک ہی خط میں یکجا کر دیا اور حکم دیا کہ ان کو ایک ساتھ عوام کے سامنے پڑھا جائے تا کہ وہ سب ان حوادث سے آگاہ ہو جائیں۔

www.shiabookspdf.com

کیا، یالم ازکم تنقید کا نشانہ بنایا اور اُن کے معترضین کے بالمقابل کھڑے نہ ہوئے اور عملی طور پر اُن کے قتل پر راضی ہو گئے۔

ایک اور گروہ اس بات کا معتقد تھا کہ خلیفۂ ثالث کو قتل نہیں کیا جانا چاہیے تھا، بلکہ اُنہیں توبہ کرنے کی مہلت دینی چاہیے تھی تاکہ وہ اپنی گزشتہ غلطیوں کا ازالہ کر سکیں اور زیادہ سے زیادہ یہ ہونا چاہیے تھا کہ اُنہیں خلافت سے برطرف کر دیا جاتا، اُن کا قتل ایک ایسی کھلی بدعت تھی جو آئندہ کے لیے بھی بہت سے ایسے جرائم کے سرزد ہونے کی راہیں ہموار کر رہی تھی۔ اور اس کے علاوہ ہم یہ جانتے ہیں کہ اُن کا قتل منافقوں اور فتنہ گروں کے لیے ایک بہانہ بن گیا، تاکہ وہ مسلمانوں کی صفوں میں تفرقہ پیدا کر سکیں (اور اس بارے میں پیش گوئی کی گئی تھی)، اور کچھ گنے چنے ظاہر بین لوگوں کا گروہ ایسا تھا کہ جنہوں نے اپنے آپ کو تیسرے خلیفہ کی زندگی کی تاریخ میں غور و فکر کرنے کے لائق نہ سمجھا اور اُنھوں نے اُنہیں ایک مظلوم اور شہید خلیفہ جانا اور ہر غلط کام سے بری ٹھہرا دیا۔

امامؑ نے ان مختلف اور ایک دوسرے کے برعکس عقائد کے درمیان سے حق کو بیان کیا جو انہی میں کہیں چھپ گیا تھا اور ایک نہایت دقیق اور ظریف انداز میں خلیفۂ ثالث کے قتل سے متعلق مسائل کا تجزیہ کیا:

"لَوْ اَمَرْتُ بِهِ لَكُنْتُ قَاتِلًا اَوْ نَهَيْتُ عَنْهُ لَكُنْتُ نَاصِرًا غَيْرَ اَنَّ مَنْ نَصَرَهُ لَا يَسْتَطِيعُ اَنْ يَقُوْلَ خَذَلَهُ مَنْ اَنَا خَيْرٌ مِنْهُ وَمَنْ خَذَلَهُ لَا يَسْتَطِيعُ اَنْ يَقُوْلَ نَصَرَهُ مَنْ هُوَ خَيْرٌ مِنِّيْ وَ اَنَا جَامِعٌ لَكُمْ اَمْرَهُ اسْتَأْثَرَ فَاَسَاءَ الْاَثَرَةَ وَجَزِعْتُمْ فَاَسَاْتُمُ الْجَزَعَ وَلِلّٰهِ حُكْمٌ وَاقِعٌ فِي الْمُسْتَأْثِرِ وَ الْجَازِعِ."

"اگر میں نے اُس کے قتل کا حکم دیا ہوتا، تو قاتل شمار ہوتا اور اگر میں اس کی روک تھام کرتا تو اُس کا حامی و ناصر شمار ہوتا، (اور میں نہ اُس کا قاتل بننا چاہتا تھا اور نہ ہی اُس کا مددگار) مگر جس نے اُس کا ساتھ دیا ہے وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ جن لوگوں نے اُس کا ساتھ نہیں دیا، میں اُن سے بہتر ہوں، اور جس نے اُس کا ساتھ نہیں دیا وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ جس نے اُس کا ساتھ دیا ہے، وہ مجھ سے بہتر ہے، کیوں کہ بہر حال اُس کی حمایت کرنے والے یقیناً بُرے افراد تھے۔ اور میں اُس کے معاملے کو ایک مختصر عبارت میں تم لوگوں کے لیے خلاصہ کیے دیتا ہوں، اُس نے ظلم و استبداد سے کام لیا اور تم لوگوں کو یہ سب بُرا لگا اور تم نے اس کے ردِّ عمل میں حد سے گزر گئے، جب کہ خدا کا، ظلم و استبداد سے کام لینے والوں اور افراط سے کام لینے والوں کے بارے میں ایک خاص حکم ہے اور سب کے سب اپنے اعمال کی سزا ضرور کاٹیں گے۔"

www.shiabookspdf.com

شرح وتفسیر

خلیفۂ ثالث کے قتل کی وجوہات

جیسا کہ اس خطبے کے آغاز میں ارشاد کیا گیا کہ یہ خطبہ خلیفۂ ثالث کے قتل کے مسئلے اور اُس کے اطراف کے معاملات پر تجزیے پر مبنی ہے۔ہم یہ جانتے ہیں کہ خلیفۂ ثالث کے قتل کی وجوہات اُن کے اپنے اعمال میں پائی جاتی ہیں اور جہاں اسلام میں اس کے بڑے بڑے نقصانات اور مختلف اثرات مرتب ہوئے ،جس سے تاریخ اسلام کا دامن کافی حد تک مٹیالا ہو گیا، تمام محققین کا کہنا ہے کہ خلیفۂ ثالث کا حکومتی معاملات میں غلط فیصلوں سے کام لینا اور حکومتی عمود کو ایک خاندانی رنگت سے رنگ دینا اور بیت المال میں اُن کی اور اُن کے گھر والوں کی حد سے زیادہ حصہ خوری اور اُن کے رشتے داروں کا کمزور لوگوں پر حد درجہ ظلم وجارحیت کا رویہ، یہ سب باتیں ایک بہت بڑی عمومی نفرت اور کراہت کا سبب بنیں۔

یہاں تک کہ پھر چند سو افراد پر مشتمل گروہ نے اُن کے گھر کا محاصرہ کر لیا اور پھر حملہ کر کے انہیں قتل کر ڈالا اور اسلام کی عظیم فوج نے جو کہ فاتح مصر وایران وروم تھی ،اس معاملے پر خاموشی اختیار کر لی ، کیوں کہ وہ لوگ ان کے کاموں سے متنفر تھے، یا پھر انہیں قتل کا مستحق جانتے تھے، مگر اُن کے قتل کے بعد لوگ دو گروہوں میں بٹ گئے ، ایک گروہ (جو کہ شاید اکثریت میں تھا) اُن کے قتل پر راضی تھا یا کم از کم اُس پر خاموش تھا اور دوسرا گروہ وہ تھا جو انہیں مظلوم ٹھہراتا تھا، اس دوران منافقوں نے مسلمانوں کی صفوں میں تفرقہ ایجاد کرنے کے لیے اور خلافت کو جناب امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام سے ہٹانے کے لیے کام شروع کر دیا، جو کہ لوگوں کی اکثریت کے نزدیک قابل اعتماد تھے اور خلیفۂ ثالث کے قتل کے مسئلے کو اپنے ناپاک عزائم تک پہنچنے کے لیے ایک بہانے کے طور پر استعمال کرنے لگے، بلکہ محاوراتی انداز میں کہا جا سکتا ہے، کہ خلیفۂ ثالث کے پیرہن کو لوگوں کے بہکانے کا ایک مضبوط سیاسی ہتکنڈا بنا دیا۔

ظاہر ہے کہ اصحاب امیر المومنینؑ کے درمیان دونوں گروہوں کے افراد موجود تھے۔اگر چہ مورخین کی تصریحات کے مطابق دوسرا گروہ اقلیت میں تھا اور یہ طبعی امر ہے کہ خلیفۂ ثالث کے قتل کے بارے میں یہ گروہ حضرت علی علیہ السلام سے مکرر طور پر استفسار کرتا، تو مولاؑ کو بھی مجبوراً ان سوالات کے ڈھیر کو سمیٹنے کے لیے ایسا جواب دینا پڑا، جس سے تاریخی حقیقتوں سے بھی پردہ اُٹھ جائے۔ مذکورہ خطبہ ایسے سوالات کا ظریف جواب ہے جس میں امامؑ نے تاریخی حقائق سے پردہ اُٹھا کر بہانے بازوں اور فتنہ گروں کو کسی بھی نئی سازش سے روک دیا۔ پہلے فرماتے ہیں:

www.shiabookspdf.com

-لَوْ أَمَرْتُ بِهِ لَكُنْتُ قَاتِلًا، أَوْ نَهَيْتُ عَنْهُ لَكُنْتُ نَاصِرًا-

”اگر میں نے اُس کے قتل کا حکم دیا ہوتا تو میں قاتل شمار کیا جاتا (اور میں یہ ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ خلیفۂ ثالث کا قاتل ٹھہرایا جاؤں) اور اگر اُس کے قتل سے روکتا تو اُس کا (اور اُس کی غلط حرکتوں کا) حامی شمار کیا جاتا (جبکہ میں ہرگز یہ نہ چاہتا تھا کہ اُس کے غلط کاموں کا دفاع کروں)۔“

اس بات کا مفہوم یہ ہے کہ میں اس معاملے میں ہر لحاظ سے غیر جانب دار تھا اور میں نے نہ تو اُس کے خون سے اپنے ہاتھ رنگے ہیں اور نہ ہی اُس کی غلط حرکتوں کا دفاع کیا ہے، کیوں کہ میں دونوں کاموں کو ٹھیک نہیں سمجھتا تھا۔ یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ جملہ کس طرح سے تاریخی حقائق کے ساتھ سازگار ہے؟ کیوں کہ ہم جانتے ہیں اور تقریباً تمام مورخین نے یہی لکھا ہے کہ مولا علی علیہ السلام لوگوں کو خلیفۂ ثالث کے قتل سے منع کرتے تھے اور اپنے بچوں امام حسن اور امام حسین علیہما السلام کو اُن کے گھر کے سامنے بھیجا تا کہ اعتراض کرنے والے وہاں حملہ نہ کردیں اور یہاں تک کہ جب خلیفۂ ثالث پر پانی بند کر دیا گیا تو حضرت علی علیہ السلام نے اُن کے لیے خود پانی بھجوایا، نہج البلاغہ کے مفسرین نے اس سوال کے دو جواب دیے ہیں بعض نے کہا ہے کہ عدم نہی سے مراد، نہی عملی ہے، یعنی میں نے رسمی طور پر تلوار کھینچ کر اُس کا دفاع نہیں کیا اور یہ بات حضرت علی علیہ السلام کی لفظی نہی اور اُن کے بچوں کے وہاں اُس موقع پر موجود ہونے کے منافی بھی نہیں ہے۔

بعض دیگر نے یہ کہا ہے کہ یہ جملہ درحقیقت اس بات کو بیان کر رہا ہے کہ میں نے ہرگز خلیفۂ ثالث کے قتل کا حکم نہیں دیا، اگرچہ میں اُسے اُس کی غلط حرکتوں کی بنا پر کچھ سزاؤں کا مستحق ضرور سمجھتا تھا، اسی لیے آپؑ نے اُن بدتر حالات کی صورت حال کو مزید نہ بگڑنے کے لیے لوگوں کو تحمل اور غصہ نہ کرنے کی دعوت دی، مگر پھر بھی میں نے کوئی ایسا کام ہرگز نہ کیا جو صریحاً خلیفۂ ثالث کی اور اُن کے غلط اعمال کی حمایت شمار ہو، کیوں کہ جس طرح سے اُس کا خون بہانا معاشرے کے لیے کچھ نئی مشکلات کھڑی کر دیتا، اُسی طرح سے اس کی حمایت کرنا یا اُس کے غلط اعمال کی حمایت کرنا بھی معاشرے کے لیے مشکلات کا باعث بنتا۔

لہٰذا میں ہرگز ان دونوں کاموں (یعنی اُس کے قتل کا حکم یا اُس کی حمایت) کو قانونِ الٰہی کے تحت اپنے وظائف کے مطابق نہیں سمجھتا تھا۔

بہر حال امام علی علیہ السلام نے اس گفتار کے ذریعے سے، لوگوں کے اور اپنے لشکر کے درمیان پائے جانے والے ان دونوں گروہوں کے، خلیفۂ ثالث کے قتل کے متعلق اختلافات کے حوالے سے وہ راہ اختیار کر لی، جو اختلاف کو ہوا دینے کا باعث نہ بنے۔ اس کے بعد مزید وضاحت کے لیے امامؑ اضافہ فرماتے ہیں:

www.shiabookspdf.com

"غَيْرَ أَنَّ مَنْ نَصَرَهُ لَا يَسْتَطِيعُ أَنْ يَقُولَ: خَذَلَهُ مَنْ أَنَا خَيْرٌ مِنْهُ"

"سوائے اس کے کہ جس نے اُس کا ساتھ دیا ہے وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ، میں اُن لوگوں سے بہتر ہوں، جنہوں نے اُس کا ساتھ نہیں دیا۔"

"وَمَنْ خَذَلَهُ لَا يَسْتَطِيعُ أَنْ يَقُولَ: نَصَرَهُ مَنْ هُوَ خَيْرٌ مِنِّي"

"اور جس نے اُس کا ساتھ نہیں دیا وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ جس نے اُس کا ساتھ دیا ہے، وہ مجھ سے بہتر تھا۔"

یہ دونوں جملے ایک ہی بات کی جانب متوجّہ کرر ہے ہیں کہ سب اس بات پر متفق تھے کہ اُن حالات میں خلیفۂ ثالث کے حمایت کرنے والے لوگ، بُرے تھے، جب کہ جن لوگوں نے اُس کی حمایت نہیں کی وہ صحابہ کے بزرگوں میں سے تھے جو کہ مہاجرین اور انصار، دونوں گروہوں میں سے تھے۔

وضاحت اس طرح کی جاسکتی ہے کہ تاریخ کے مسلّم قرائن سے پتا چلتا ہے کہ خلیفۂ ثالث کے گھر پر حملے کے وقت اصحابِ رسول اللہؐ اور مہاجرین وانصار کی تقریباً اکثریت نے اُس کی حمایت سے دریغ کیا اور بے شک اگر وہ لوگ خلیفۂ ثالث کے حامی ہوتے تو کسی کی جرأت نہ ہوتی کہ مدینے میں دن دہاڑے کوئی ایسا کام کرے اور اُس کی وجہ یہ تھی کہ سب کے سب خلیفۂ ثالث کے کاموں سے ناخوش تھے۔

اُس دور میں خلیفۂ ثالث کے حامی عام طور پر وہ افراد تھے جو اسلامی معاشرے کے ٹھکرائے ہوئے لوگ شمار ہوتے تھے، اور اُن کی خلیفۂ ثالث کی حمایت محض چند غیر شرعی اور ناجائز مفادات کی بناء پر تھی، جو انہیں اُن سے ملتے تھے، اس لیے یہ بات کافی واضح تھی کہ خلیفۂ ثالث کی حمایت کرنے والوں کا گروہ جو کہ گنے چنے مفاد پرست افراد پر مشتمل تھا جیسے کہ مروان اور اُس جیسے دیگر افراد، وہ بھی ہرگز یہ کہنے کی جرات نہ کرتے تھے کہ مہاجروں اور انصار کی کثیر تعداد پر مشتمل لوگوں سے ہم بہتر ہیں اور یہ بات مسلّم ہے کہ خلیفۂ ثالث کی حمایت ترک کرنے والے لوگ بھی اُس کی حمایت کرنے والوں کو اپنے آپ سے بہتر نہیں سمجھتے تھے، اس بناء پر سب اس بارے میں اتفاقِ رائے رکھتے تھے کہ اُس کی حمایت کرنے والے ہرگز بہترین افراد نہیں ہیں۔ یہ ایک نہایت لطیف تعبیر ہے جو کہ خلیفۂ ثالث کے اعمال سے پردہ اُٹھا سکتی ہے اور یہ دکھا سکتی ہے کہ اُنہوں نے ایسے کام کیے ہیں کہ مسلمانوں کی عمومی نفرت کو اُبھار دیا۔ اُن میں سے اہم ترین، اپنے قرابت داروں میں بیت المال کا بٹوارا اور حکومت اسلامی کے حساس ترین عہدے نااہلوں میں تقسیم کر دینا اور لوگوں میں غیر عادلانہ رویّے سے کام لینا اور مسلمانوں کے مسائل سے غفلت برتنا جیسے اہم مسائل تھے۔

www.shiabookspdf.com

نہج البلاغہ کے بعض شارحین [1] کہتے ہیں کہ امامِ علی علیہ السلام نے یہ جملے اُس شخص کے جواب میں ارشاد فرمائے تھے جس نے آپ کے حضور میں یہ سوال رکھا تھا:

"جنھوں نے خلیفۂ ثالث کا ساتھ نہیں دیا وہ لوگ فتنے کا باعث ہیں، کیوں کہ اگر بزرگ صحابہ اُس کی مدد کرنے کو کھڑے ہو جاتے تو اُمّت کا جاہل طبقہ ہرگز اُس کا خون بہانے کی جرات نہ کرتا، اور اگر واقعاً بزرگ صحابہ اُسے واجب القتل سمجھتے تھے تو انہیں وضاحت کے ساتھ یہ مسئلہ بیان کر دینا چاہیے تھا، تا کہ لوگوں کے درمیان سے شک و شبہات ختم ہو جاتے۔"

حضرت امام علی علیہ السلام سمجھ گئے کہ کہنے والے کا اشارہ خود آپؑ پر ہے، لہٰذا اُس کی اس بات کا جواب ایک ظریف انداز میں بیان فرمایا۔ بہر حال یہ چیز تو واضح ہے کہ اگر امام علی علیہ السلام اس معاملے میں خلیفۂ ثالث کی حمایت کو کھڑے نہیں ہوئے تو آپؑ اپنے اس موقف میں اکیلے نہ تھے، بلکہ تمام بڑے اصحابِ رسولؐ کا موقف بھی یہی تھا تو پھر صرف آپؑ پر ہی کیوں کر اعتراض ہوا؟

خطبے کے آخر میں مولائے کائناتؑ ایک مختصر سے بیان کے ذیل میں خلیفۂ ثالث کے قتل اور اُس کے عوامل و وجوہات پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں:

"وَأَنَا جَامِعٌ لَكُمْ أَمْرَهُ، اسْتَأْثَرَ [2] فَأَسَاءَ الْأَثَرَةَ، وَجَزِعْتُمْ فَأَسَأْتُمُ الْجَزَعَ۔"

"میں خلیفۂ ثالث کے معاملے کو ایک مختصر اور معنی خیز عبارت میں تمہارے لیے خلاصتاً بیان کرتا ہوں، اُس نے ظلم کیے اور بہت زیادہ ظلم و ستم ڈھائے اور تم لوگ اس پر ناراض ہو گئے اور تم نے اُس کا عمل اُس کے قول کے برعکس دیکھا اور حد سے گزر گئے۔"

"وَلِلّٰهِ حُكْمٌ وَاقِعٌ فِي الْمُسْتَأْثِرِ وَالْجَازِعِ۔"

"خدا کا ظالموں اور افراط و تفریط کرنے والوں کے بارے میں ایک مخصوص فیصلہ ہے، جو کہ جاری ہوگا اور (ان میں سے ہر ایک اپنے اعمال کی) سزا دنیا و آخرت میں ضرور پائے گا۔"

عرب کے معروف ادیبوں میں سے ایک کا کہنا ہے کہ امام علی علیہ السلام کی عادت یہ تھی کہ اپنی جامع باتوں کو کم سے کم الفاظ اور زیادہ سے زیادہ معانی سے لبریز انداز میں ارشاد فرماتے تھے، اور یہ خصوصیت درحقیقت امام علی علیہ السلام کے کلام کی

---

[1] شرح نہج البلاغہ، ابن میثم، جلد ۲، صفحہ ۵۷۔

[2] "استأثر" کا لفظ "اثر" کے مادّے سے ہے، اور اس کا مطلب ہے، انحصار طلب کرنا اور قاموس میں اسے ظلم و استبداد کے معنی سے تفسیر کیا گیا ہے اور وہ بھی انحصار طلبی کے معنی میں ہی آتا ہے، ایک ظالم حکومت، ایسی حکومت ہوتی ہے جس میں ایک شخص ہر چیز کو اپنے انحصار میں لے لیتا ہے اور تمام لوگوں کو اپنا نوکر اور غلام بنا لیتا ہے۔

www.shiabookspdf.com

واضح اور منہ بولتی خصوصیات میں سے ہے۔ آپؑ فرماتے ہیں کہ خلیفۂ ثالث بھی غلطی اور خطا کا مرتکب ہوا اور تم لوگ بھی، اُس نے ظلم و جور اور خودسرانہ حکومت کا راستہ اختیار کیا اور اپنے نالائق عزیز و اقارب کو مسلمانوں پر مسلط کر دیا، اور بیت المال کو اُن کے حوالے کر دیا اور وہ لوگ بیت المال کو لوٹنے میں مصروف ہو گئے، اور جب مسلمانوں کے اعتراضات چاروں طرف سے اُٹھنے لگے تو اُس نے اُن آوازوں پر کان نہ دھرے اور نتیجتاً لوگ ناراضی اور غصّے کے ساتھ اُس پر حملہ آور ہو گئے، اور بزرگ اصحاب بشمولیت مہاجرین و انصار نے اُس کی حمایت نہ کی اور اُسے تنہا چھوڑ دیا۔

دوسری جانب مخالفوں اور حملہ آوروں نے بھی حد سے گزرنے کا کام کیا اور بجائے اس کے کہ اُسے حکومت سے برطرف کر دیتے اور معاملات کی باگ ڈور اُس کے ظالم ساتھیوں سے چھین لیتے، اُسے قتل کرنے کا قدم اُٹھالیا، اور پھر ایسا فتنہ رونما ہوا جس نے برسوں تک تاریخِ اسلام کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور منافقین، حکومت کے حصول کا لالچ رکھنے والوں کو خلیفۂ ثالث کے انتقام کے بہانے سے بہت سے خون بہانے کا موقع مل گیا، اس بناء پر دونوں گروہوں نے افراط کا راستہ اختیار کیا اور اسی بناء پر خدا اُن میں سے ہر ایک کو اُن کے اعمال کے مطابق پاداش دے گا۔ حکومتِ خلیفۂ ثالث اور اُس کے ثمرات کے بارے میں بہت سی باتیں کی گئی ہیں مگر مولا علیؑ کے اس کلام نے اپنے اختصار کی نفاست کے ساتھ عادلانہ فیصلے کیے۔

یہ بھی استفادہ ہوتا ہے کہ انسان جب اجتماعی غیر منصفانہ حرکتیں دیکھے تو عمل ضرور دکھائے مگر حد سے نہیں گزرنا چاہیے، کیوں کہ یہ خود ایک نئی غیر منصفانہ حرکت اور ایک نئے فتنے کی جڑ بن جاتی ہے جو کہ پورے معاشرے کو گھیرے میں لے لیتی ہے، اور یوں لوگ ایک بھنور سے نکل کر دوسرے بھنور میں پھنس جاتے ہیں اور ایک کھڈے سے نکل کر ایک کنوئیں میں گر جاتے ہیں، ان جیسے حالات میں اپنے جذبات اور اپنے فیصلوں پر مسلط رہنا چاہیے اور تدبیر کے ساتھ چلنا چاہیے تا کہ ایک بیماری کا علاج، دوسری بیماریوں کا باعث نہ بن جائے، مگر افسوس اس بات کا ہے کہ تاریخ بتاتی ہے کہ ہمیشہ سے ہی یہ افراط و تفریط چلتی چلی آ رہی ہے۔

اس جملے پر توجہ لازم ہے کہ جَزَع کے لفظ کی تعبیر دراصل شدید غم و غصّے سے کی جاتی ہے، ایسا غم و اندوہ جو انسان کو کاموں سے روک لیتا ہے، یہاں پر مقصد یہ ہے کہ لوگ خلیفۂ ثالث اور اُس کے ساتھیوں کے غلط رویّوں سے تنگ آ کر اس قدر ناراض ہو گئے تھے کہ انھوں نے اُس کا بدلہ اور ردِّعمل ایسا دکھایا کہ صدیوں تک تاریخِ اسلام میں اس کے بُرے اثرات قائم رہیں گے۔

www.shiabookspdf.com

ایک نکتہ

خلیفۂ ثالث کا پُرآشوب دور

بے شک خلافتِ خلیفۂ ثالث کا دور، خاص طور پر اُس کے آخری برسوں کا دورانیہ، اسلام کی پہلی صدی میں سب سے طوفانی اور پُرآشوب ترین ادوار میں سے ہے، جن کے بارے میں موزخین نے بڑے پیمانے پر بحث کی ہے، بعض کے مطابق خلیفۂ ثالث کے بارے میں صحیح ترین اخبار وہ خبریں ہیں، جو طبری نے اپنی تاریخ میں ذکر کی ہیں، اُس کے مطالب کا خلاصہ کچھ یوں ہے، خلیفۂ ثالث نے وہ کام انجام دیے جو اسلام میں اُس سے پہلے کبھی نہ ہوئے تھے اور یہ مسلمانوں کے غیظ و غضب کا باعث بنے۔ ان میں سے کچھ کام من جملہ یہ تھے: مسلمانوں کی حکومت کے اہم کاموں اور ذمّے داریوں کو نااہل اور فاسق و بے دین افراد کے سپرد کر دینا اور غنائم کو اُن کے حوالے کر دینا اور ابوذرؓ، عمار یاسرؓ اور عبداللہ ابن مسعودؓ جیسی بڑی شخصیات پر ظلم وستم ڈھانا وغیرہ، اُس نے ولید ابنِ عقبہ کو والی کوفہ بنا دیا جو کہ شراب پیتا تھا اور مستی کی حالت میں لوگوں کے درمیان آجاتا تھا اور اُس نے وہ وہ رسوائیاں کروائیں کہ ایک گروہ نے خلیفۂ ثالث کے سامنے اس کے ثبوت اور گواہ پیش کیے اور اُس کو معزول کرنے کے بعد سعید ابن عاص کو مقرر کر دیا جو کہ غلط افراد میں سے تھا، سعید نے اپنے ناروا اعمال سے لوگوں کے غیظ و غضب کو اُبھارا اور لوگ اُس کی مخالفت کے لیے کھڑے ہو گئے۔

پھر خلیفۂ ثالث نے بجائے اس کے کہ فتنے کی آگ کو بجھائے، یہ حکم صادر کر دیا کہ مخالفین کے پیشواؤں کو شام کی طرف جلاوطن کر دیا جائے، وہ لوگ شام میں امیر شام کے خلاف احتجاج کرنے لگے، تو خلیفۂ ثالث نے مجبور ہو کر انہیں کوفے کی جانب سے واپس بلایا اور پھر انہیں حمص کی جانب جلاوطن کر دیا، نہ صرف کوفے میں بلکہ دیگر علاقوں میں بھی اختلافات پروان چڑھنے لگے، بالآخر اصحابِ رسالت مآبؐ میں سے کچھ افراد نے مل کر کچھ اہم شکایات، عامر ابن قیس کے ذریعے سے خلیفۂ ثالث تک پہنچائیں، عامر ایک پاک طینت اور خدا شناس شخص تھا، مگر خلیفۂ ثالث نے بجائے اس کے کہ خیر خواہی کا شکریہ ادا کرے، اُن کے بھیجے ہوئے پیغام رساں کو ایک نہایت توہین آمیز جواب دے کر واپس بھیج دیا۔

مدینے کے حالات روز بروز بدتر ہوتے چلے جا رہے تھے اور تنقید کی صدائیں بلند تر ہوتی جا رہی تھیں۔ خلیفۂ ثالث مجبور ہو گیا کہ سعید ابن عاص اور امیر شام ابن ابوسفیان اور عمرو عاص کو مشورے کے لیے بلائے اور اُن سے تبادلۂ خیال کرے۔ بعض نے کہا کہ بہتر یہ ہوگا کہ تم لوگوں کو جہاد میں مصروف کر دو تاکہ وہ لوگ ان مسائل کو بھول جائیں اور اُن کا

www.shiabookspdf.com

دھیان بٹ جائے، مگر سعید ابن عاص نے اُسے مخالفین کے پیشواؤں سے انتقام لینے پر اُکسایا اور کہنے لگا کہ: "اگر ان کے رہبروں کو ان سے چھین لو، تو یہ لوگ متفرق ہو جائیں گے، آہستہ آہستہ لوگ خلیفۂ ثالث کی نسبت زیادہ سے زیادہ مخالف ہوتے چلے گئے اور کہنے لگے کہ تم نے بنی اُمیّہ کو ہمارے سر پہ سوار کر دیا، یا تو عدل و انصاف سے کام لو پھر خلافت سے کنارہ کشی اختیار کر لو۔

خلیفۂ ثالث نے جو کسی مضبوط اور پختہ فیصلہ کی قدرت سے محروم ہو چکے تھے، اپنے مشیروں سے (جو سب بنی امیہ سے تھے) مشورہ کیا اور ان سے کہا کہ وہ لوگوں کو جہاد پر آمادہ کریں لیکن معاملات اس حد تک بگڑ چکے تھے کہ یہ تدبیر بھی کام نہ آسکی۔

آخر کار ۳۵ھ میں تمام اہم اسلامی شہروں میں رہنے والے مخالفین نے ایک دوسرے سے خط و کتابت کی اور باہم اس بات کا پختہ عزم کر لیا کہ خلیفۂ ثالث اور ان کے مقرر کردہ عمال کو طاقت کے ذریعے معزول کر دیا جائے۔ اس باہمی مشاورت کے نتیجے میں ایک گروہ مصر سے دوسرا کوفہ سے اور ایک بڑا گروہ بصرے سے بہ عنوانِ زیارت خانۂ کعبہ روانہ ہوا اور مدینے پہنچ گیا اور اہل مدینہ کو اپنے پختہ ارادے سے آگاہ کر دیا، مدینے کے مہاجرین و انصار جو خود ان کے غلط اعمال کی وجہ سے خلیفۂ ثالث سے ناراض تھے، ان کی حمایت میں کھڑے نہیں ہوئے اور خلیفۂ ثالث کے مخالفین با آسانی مدینے میں داخل ہو گئے اور انہوں نے خلیفۂ ثالث کے گھر کا محاصرہ کر لیا، لیکن ان کے باہر آنے جانے پر کوئی پابندی نہیں لگائی گئی۔ خلیفۂ ثالث اس عوامی ہجوم سے سخت وحشت زدہ اور پریشان ہو کر حضرت علی علیہ السلام کے پاس آئے اور ان سے درخواست کی کہ وہ ان مخالفین سے گفت و شنید کریں اور انہیں معزولیِ خلیفہ کے ارادے سے باز رکھیں۔ امامؑ نے پوچھا:

"میں کس شرط پر انہیں راضی کروں؟"

خلیفۂ ثالث نے جواب دیا:

"اس شرط پر کہ آج کے بعد میں تمام کام آپ کے مشورے سے کروں گا۔"

امامؑ نے فرمایا:

"میں نے پہلے بھی کئی مرتبہ تمہیں مشورے دیے ہیں اور نصیحت کی ہے اور تم نے میرے مشورہ پر عمل کرنے کا وعدہ بھی کیا مگر کبھی اسے ایفا نہیں کیا بلکہ مروان، امیر شام اور ان جیسے دوسرے لوگوں کی باتوں پر عمل کرتے رہے۔"

بہر حال امامؑ نے ان کی عرضداشت قبول کر لی اور خلیفۂ ثالث کے مخالفین کے غم و غصے کو دبانے کے لیے مہاجرین اور انصار کے کچھ افراد کے ہمراہ، مخالفوں خصوصاً مصریوں سے جنہیں سب سے زیادہ شکایات تھیں، گفت و شنید کے لیے

www.shiabookspdf.com

تشریف لے گئے، وہ لوگ بھی امامؑ کی یقین دہانی پر مصر واپس جانے پر رضا مند ہو گئے۔ امامؑ نے خلیفۂ ثالث کو بھی نصیحت کی کہ لوگوں کی شکایات کا ازالہ کرو اور پچھلی غلطیوں کی معافی مانگو۔ خلیفۂ ثالث نے مسجدِ نبویؐ میں خطبہ دیا جس میں سب کے سامنے معافی مانگی اور وعدہ کیا کہ تمام لوگوں کی شکایات دور کر دی جائیں گی۔ یہ خطبہ دینے کے بعد جب وہ گھر واپس آئے تو دیکھا کہ مروان اور بنی امیّہ کے کچھ افراد ان کے گھر پر جمع ہیں۔ مروان نے کہا:

"میں کچھ بات کروں یا خاموش رہوں۔"

خلیفۂ ثالث کی زوجہ نے چلّا کر کہا:

"خاموش بیٹھ، خدا کی قسم تو خلیفۂ ثالث کو قتل اور ان کے بچوں کو یتیم کروانا چاہتا ہے، خلیفۂ ثالث نے لوگوں سے وعدہ کیا ہے اسے اپنا وعدہ نبھانا چاہیے۔"

مروان خاموش نہیں ہوا، کہنے لگا:

"تم نے خطبے میں جو کچھ کہا ہے اور جو وعدہ کیا ہے وہ تمہاری خلافت کے حق میں نہیں ہے۔"

خلیفۂ ثالث مروان کی رائے سے متأثر ہو گئے اور اسے لوگوں کو منتشر کرنے کی ذمّے داری سونپ دی۔ لوگ دوبارہ امامؑ کے گھر پہنچے اور تمام ماجرا بیان کیا۔

امامؑ نے فرمایا:

"اگر (ان حالات میں) میں گھر بیٹھ جاتا ہوں تو خلیفۂ ثالث کہہ سکتا ہے کہ مجھے تنہا چھوڑ دیا اور خوار کروا دیا اور اگر اس کی اصلاح کے لیے کوئی مشورہ دوں تو مروان پھر اسے باتوں میں اڑا کر اپنے راستے پر لگا لے گا۔"

اس کے بعد امامؑ پھر خلیفۂ ثالث کے گھر گئے اور فرمایا:

"تم نے پھر اپنا وعدہ پورا نہیں کیا اور مروان کے مشورے پر چلنے لگے جو سراسر دین اور عقل کے خلاف ہیں، میں اب اس مسئلے میں تمہارے پاس دوبارہ کبھی نہیں آؤں گا۔"

مصر سے آنے والے افراد جن کی تعداد دو ہزار سے زیادہ تھی اور امیر المومنینؑ کے حکم کی اطاعت کرتے ہوئے واپس پلٹ گئے تھے اور راستے میں تھے تین روز بعد واپس مدینے آ گئے۔ ان کے پاس ایک خط تھا جو انہوں نے راستے میں خلیفۂ ثالث کے غلام سے چھینا تھا، اس خط میں خلیفۂ ثالث نے مصر کے گورنر کو حکم دیا تھا کہ جو لوگ مدینہ سے واپس آ رہے ہیں ان کے سرکردہ افراد کو پھانسی پر لٹکا دو اور باقی لوگوں کو کوڑے لگاؤ۔

یہ افراد امیر المومنین کے پاس آئے اور تمام ماجرا بیان کیا۔ امامؑ نے خلیفۂ ثالث سے اس تمام معاملے کی وضاحت

www.shiabookspdf.com

طلب کی خلیفۂ ثالث نے اس بات سے انکار کیا کہ انہوں نے ایسا کوئی خط لکھا ہے۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ یہ خط مروان نے تحریر کیا ہے۔ مصریوں نے کہا:

"کیا مروان اتنا طاقتور ہوگیا ہے کہ نہ صرف ایسا حکم لکھ سکے، بلکہ اس پر مہر خلافت بھی لگائے اور خلیفۂ ثالث کے غلام کو بیت المال کے اونٹ پر مصر بھیج سکے۔" خلیفۂ ثالث نے ان تمام معاملات سے لاعلمی کا اظہار کیا۔

اسی گفتگو کے دوران خلیفۂ ثالث کی ہر بات سے لاعلمی کے اظہار پر لوگوں نے برہم ہوکر کہا:

"اگر تم سچ بول رہے ہو تو اس خلافت کے لائق نہیں ہو، کیوں کہ تمہارے اوپر دوسرے لوگ مسلط ہیں اور اگر جھوٹ بول رہے ہو تو بھی مسلمانوں پر خلافت کے حقدار نہیں ہو۔ اس لیے ہر صورت میں تمہیں خلافت سے کنارہ کشی اختیار کرنا ہوگی۔ تم نے کئی بار توبہ کی اور ہر بار پھر گئے، اب یا تو تم خلافت سے علیحدہ ہو جاؤ، ورنہ یا تو ہم تمہیں قتل کر دیں گے یا خود راہِ خدا میں شہید ہو جاؤ گے۔"

خلیفۂ ثالث نے جواب دیا:

"اگر میں قتل ہو جاؤں تو میرے لیے اس سے بہتر ہوگا کہ میں خلافت چھوڑ دوں۔"

اس کے بعد روز بہ روز حالات خلیفۂ ثالث کے خلاف ہوتے چلے گئے۔ امامؑ نے ایک مرتبہ پھر خلیفۂ ثالث سے تقاضا کیا کہ لوگوں کے مسائل کے حل کے لیے کوئی وقت معین کیا جائے تا کہ ان کی شکایات دور ہوسکیں۔ انہوں نے اس کے لیے تین روز کی مہلت طلب کی لیکن درحقیقت وہ پوشیدہ طور پر مخالفوں سے جنگ کے لیے وسائل اکٹھے کر رہے تھے۔ تین دن گزر گئے اور کوئی پیشرفت نہیں ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ خلیفۂ ثالث نے امیر شام کو خط بھیجا تھا کہ وہ فوری طور پر ان کی مدد کے لیے لشکر لے کر مدینہ پہنچ جائے لیکن وہاں سے کوئی لشکر مدد کے لیے نہیں آیا۔

آخر کار غم و غصے سے بھرے ہوئے مخالفین جو بار بار خلیفۂ ثالث کی عہد شکنیوں کو دیکھ چکے تھے، ان کی طرف سے کسی مثبت اقدام سے مایوس ہوگئے۔ اس ناامیدی کی وجہ سے ایک بڑے گروہ نے ان کے گھر پر حملہ کر دیا۔ خلیفۂ ثالث کے حامیوں اور ان کے مخالفین کے درمیان شدید خوں ریزی ہوئی جس میں دونوں اطراف کے کافی افراد ہلاک ہوگئے، بالآخر حملہ آور گھر میں داخل ہوگئے اور انہوں نے خلیفۂ ثالث کو قتل کر دیا۔ [1]

---

[1] تاریخ طبری، جلد ۳، صفحہ ۳۹۰ اور اس کے بعد، ۳۵ھ کے حوادث۔

www.shiabookspdf.com

www.shiabookspdf.com

اکتیسواں خطبہ

"لَمَّا أَنْفَذَ عَبْدَاللهِ بْنَ عَبَّاسٍ إِلَى الزُّبَيْرِ يَسْتَفِيئُهُ إِلَى طَاعَتِهِ قَبْلَ حَرْبِ الْجَمَلِ" [1]

یہ ٹکڑا درحقیقت خطبہ نہیں ہے بلکہ اُس کلام کا حصہ ہے جو مولا علیؑ نے ابن عباسؓ کو جنگ جمل میں، آغازِ جنگ سے قبل اُنہیں زبیر کی جانب بھیجتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا، حضرتؑ نے ان کلماتِ مبارکہ کے ذریعے سے زبیر کو اپنی اطاعت کی دعوت دی اور جیسا کہ آگے آئے گا یہ بات زبیر پر اثر کر گئی اور اُس نے جنگ سے کنارہ کشی کر لی:

لَا تَلْقَيَنَّ طَلْحَةَ فَإِنَّكَ إِنْ تَلْقَهُ تَجِدْهُ كَالثَّوْرِ عَاقِصًا قَرْنَهُ يَرْكَبُ الصَّعْبَ وَ يَقُولُ هُوَ الذَّلُولُ وَلَكِنِ الْقَ الزُّبَيْرَ فَإِنَّهُ أَلْيَنُ عَرِيكَةً فَقُلْ لَهُ يَقُولُ لَكَ ابْنُ خَالِكَ عَرَفْتَنِي بِالْحِجَازِ وَ أَنْكَرْتَنِي بِالْعِرَاقِ فَمَا عَدَا مِمَّا بَدَا.

"طلحہ سے ملاقات مت کرنا کہ اگر تم اُس سے روبرو ہو گئے تو اُسے گویا کسی ایسی گائے کی مانند پاؤ گے جس کے سینگ اُس کے کانوں کے اطراف میں گھومے ہوئے ہیں، (وہ ایک سرکش اور خودسر شخص ہے) وہ ایک سرکش (ہوا و ہوس) سواری پر سوار ہے اور کہتا ہے کہ (میرے پاس ایک اچھی سواری ہے)، وہ اپنی ہوا پرستی کی وجہ سے حق بات کو سننے کے لیے تیار ہی نہیں ہے، لیکن زبیر سے ملو، کیوں کہ اُس کے پاس نرم گوشہ ہے اور وہ حق کو قبول کرنے کی زیادہ آمادگی رکھتا ہے اور اُس

---

[1] مصادر نہج البلاغہ (جلد ۱، صفحہ ۴۱۱) کے بقول، دانشوروں کے ایک گروہ نے جو سیّد رضیؒ سے پہلے کے تھے، انھوں نے امامؑ سے اس کلام کو نقل کیا ہے، من جملہ زبیر ابن بکار نے (ابن ابی الحدید اور جاحظ وغیرہ کے نقل کے مطابق) اور ابن قتیبہ نے عیون الاخبار میں اور ابن عبد ربّہ نے "عقد الفرید" میں نقل کیا ہے اور تعجب خیز بات تو یہ ہے کہ ابن خاکان (جو کہ نہج البلاغہ کی مخالفت کا پرچم لہراتا ہے) نے بھی اس کلام کو "وفیات الاعیان" میں نقل کیا ہے اور اُس کے ٹھیک ہونے کی گواہی بھی دی ہے۔

www.shiabookspdf.com

سے کہو کہ تمہارے ماموں زاد بھائی (حضرت علی علیہ السلام) نے کہا کہ تم نے حجاز میں تو مجھے پہچان لیا مگر عراق میں مجھے پہچاننے سے ہی انکار کر دیا؟ کیا ہوا کہ تم اپنے وعدے سے پلٹ گئے اور کس بات نے تمہیں اُس سے منحرف کر دیا جو تم میرے بارے میں جانتے تھے؟"

شرح و تفسیر

خطا کاروں کی نجات کے لیے کوشش

ہم یہ جانتے ہیں کہ جنگ جمل وہ پہلی جنگ ہے جو حضرت امیر المومنینؑ پر زبردستی مسلط کی گئی، کچھ خلیفۂ ثالث کے مخالفوں اور طرفداروں نے مل کر حضرت عائشہ زوجہ نبیؐ کو اپنے ساتھ کر لیا اور جو عہد انہوں نے حضرت علی علیہ السلام سے کیا ہوا تھا، وہ توڑ دیا اور حکومت کے حصول کے لیے جنگ جمل کی آگ بھڑکا دی۔

بالآخر انہیں شکست کھانی پڑی اور بکھر گئے اور اصلی آگ بھڑکانے والے، یعنی طلحہ و زبیر مارے گئے، تمام تر تاریخی قرینوں سے یہی پتا چلتا ہے کہ نہ صرف جنگ جمل، بلکہ جنگ صفین اور جنگ نہروان میں بھی حضرت علیؑ کی آخری حد تک کوشش یہ ہی تھی کہ مسلمانوں کے درمیان آپس میں کوئی جھگڑا نہ ہو، اور کسی بھی قیمت پر جنگ کی آگ بجھ جائے۔

اوپر کے جملوں سے یہ پتا چلتا ہے کہ حضرت امام علی علیہ السلام نے جنگ کے شروع ہونے سے قبل ابن عباسؓ کی معرفت زُبیر کو ایک پیغام بھجوایا تھا جو کہ جنگ جمل کے دو سرداروں میں سے ایک تھا اور حضرت علی علیہ السلام کا یہ کلام اُس پر موثر ثابت ہوا اور وہ جنگ سے کنارہ کش ہو گیا، اگرچہ وہ بصرے کے بیابانوں میں سے ایک بیابان میں ابن جرموز نامی ایک شخص کے ہاتھوں مارا گیا، اس کلام کے آغاز میں حضرت علی علیہ السلام، ابن عباسؓ کی جانب رُخ کر کے فرما رہے ہیں:

"لَا تَلْقَيَنَّ طَلْحَةَ فَإِنَّكَ إِنْ تَلْقَهُ تَجِدْهُ كَالثَّوْرِ عَاقِصًا[1] قَرْنَهُ"

"طلحہ سے ملاقات مت کرنا، کہ اگر تم اُس سے روبرو ہوئے تو اُسے کسی ایسی گائے کی مانند پاؤ گے جس کے کانوں کے گرد اُس کے سینگ پیچ کھائے ہوئے ہوں (وہ ایک سرکش اور سر پھرا شخص ہے)۔"

"يَرْكَبُ الصَّعْبَ وَيَقُولُ: هُوَ الذَّلُولُ"

"وہ ایسا شخص ہے جو ہوا و ہوس کی سرکش سواری پر سوار ہے اور کہتا ہے کہ میری سواری ایک بہت اچھا راہوار ہے۔" جی

[1] عاقِص- کا لفظ عقص کے مادے سے ہے اور سینگ کی اپنے آپ میں پیچیدگی کے معنی میں آیا ہے۔

www.shiabookspdf.com

ہاں! ہوس پرستی نے اُس کی آنکھوں کو حق بینی کے معاملے میں اندھا اور کانوں کو حقائق کے سننے سے بہرہ کر دیا ہے۔

طلحہ کو ایسی گائے سے تشبیہ دینا جس کے سینگ اُس کے کانوں پر مڑے ہوئے ہوں، گویا اس بات کا اشارہ فرما دیا کہ وہ سرکش شخص ہے یا دوسرے لفظوں میں یہ کہا جائے کہ وہ حق کو قبول کرنے اور سُننے کے لیے کان ہی نہیں رکھتا۔

درحقیقت حضرت امام علی علیہ السلام نے اس جملے سے طلحہ کے بارے میں ایک دقیق اور گہری شناخت رکھنے کا اعلان فرمایا اور اُس کے دل و دماغ میں حق بات کے نفوذ کے عدم امکان کا اظہار فرمایا کہ وہ ہرگز صلح یا جنگ سے کنارہ کشی کے لیے راضی نہیں ہوگا، مگر آپؑ زبیر سے اُمید رکھتے تھے اور بعد کے حوادث سے یہ پتا چلتا ہے کہ آپ کی امید اس کی نسبت غلط نہ تھی۔ فرماتے ہیں:

"وَلٰكِنِ الْقَ الزُّبَيْرَ! فَإِنَّهُ أَلْيَنُ عَرِيكَةً"۔[1]

"لیکن زبیر سے ملو، کیوں کہ وہ نرم گوشہ رکھتا ہے (اور حق کو قبول کر سکتا ہے)"

"أَلْيَنُ عَرِيكَةً" کی تعبیر کا مقصد، اس بات کو دیکھتے ہوئے کہ "عَرِيكَةً" کا لفظ طبیعت اور مزاج کے معنی رکھتا ہے اور "أَلْيَنُ" کا مطلب ہے زیادہ نرم،۔ یہ اشارہ ہے کہ حق کی بات کو ماننے کے لیے اچھے کان رکھتا ہے، یعنی ان باتوں پر کان دھرتا ہے اور حقیقت کو تسلیم کرنے کا مادّہ اُس میں پایا جاتا ہے، خاص طور پر جو باتیں اُس نے رسول خدا سے سنی تھیں، اُن پر اچھا ردّعمل دکھایا جبکہ اُس کے برعکس طلحہ ایک خودسر اور سرکش مزاج کا حامل تھا اور حبِّ جاہ و مقام نے اُس کے کانوں اور آنکھوں کو بند کر دیا تھا۔ اسی لیے تاریخ نویسوں نے لکھا ہے کہ جب زبیر بصرہ میں داخل ہوا اور یہ سمجھ گیا کہ عمارؓ لشکر علی علیہ السلام میں ہے اور اُسے رسول اللہ کی وہ حدیث یاد آ گئی کہ جو آپؐ نے عمارؓ کے بارے میں فرمائی تھی:

"وَيْحَكَ يَا ابْنَ سُمَيَّةَ! تَقْتُلُكَ الْفِئَةُ الْبَاغِيَةُ"۔[2]

"اے عمارؓ تمہیں باغیوں کا گروہ قتل کرے گا۔"

اس کے بعد وہ شدید وحشت اور خوف کا شکار ہو گیا کہ عمارؓ کہیں میدانِ جمل میں شہید نہ ہو جائیں اور زبیر باغی گروہ میں شمار ہو جائے۔

بہر حال مولا علی علیہ السلام نے ابن عباسؓ سے فرمایا:

---

[1] "عریکۃ" دراصل "عرک" کے مادّے سے ہے اور اس کا مطلب ہے کسی چیز کو مکّوں سے مارنا اور میدان جنگ میں لوگ ایک دوسرے پر ہر طرح سے حملہ آور ہوتے ہیں اس لیے اُسے "معرکہ" کہا جاتا ہے۔ "عریکۃ" کا لفظ جیسا اور انسان کے نفس کے معنی میں آیا ہے جو کہ تغیرات اور تحولات کا مرکز ہوتا ہے۔

[2] وقعۃ صفین، ص ۳۲۶

www.shiabookspdf.com

"فَقُلْ لَہٗ یَقُوْلُ لَکَ ابْنُ خَالِکَ عَرَفْتَنِیْ بِالْحِجَازِ وَاَنْکَرْتَنِیْ بِالْعِرَاقِ، فَمَا عَدَا مِمَّا بَدَا؟"

"جب تم زبیر سے ملاقات کروتو اُسے کہنا کہ مولا علیؑ نے فرمایا ہے کہ تم نے حجاز میں مجھے پہچان لیا تھا، مگر عراق میں مجھے پہچاننے سے ہی انکار کر دیا!۔۔۔کیا ہوا کہ تم اپنے عہد و پیمان سے پھر گئے؟ اور کس چیز نے تمہیں اُس سے منحرف کر دیا، جو تم میرے بارے میں جانتے تھے؟"

یہ جملے مولا علی علیہ السلام کے نہایت درخشاں ماضی کے ترجمان ہیں، کہ عصر پیغمبرؐ اور اُس کے بعد بھی سب کے سب اُن کی اچھائیوں اور خصوصیات سے آگاہ تھے اور زبیر بھی جو کہ اصحاب پیغمبرؐ میں سے تھا، بخوبی اُن کے ماضی سے آگاہ تھا، خاص طور پر ایک روایت میں آیا ہے کہ جنگِ جمل کے دن زبیر مولا علی علیہ السلام کے مقابلے پر میدان میں آ گیا، حضرت عائشہ چلائیں کہ "ارے زبیر کی خبر لو! تو آپ سے کہا گیا کہ اُسے کسی بات کا خطرہ نہیں، کیونکہ حضرت علی علیہ السلام نے زرہ نہیں پہنی ہوئی اور زبیر نے زرہ پہنی ہوئی ہے۔"

حضرت علیؑ نے اُس سے فرمایا: "یہ تم نے کیا کیا؟" تو کہنے لگا، میں خلیفۂ ثالث کے خون کا مطالبہ کر رہا ہوں، حضرت نے فرمایا کہ "تم اور طلحہ تو وہ تھے کہ جو خلیفۂ ثالث کے قاتلوں کی رہبری کر رہے تھے اور تمہیں تو چاہیے کہ اپنے آپ کو سب سے پہلے خلیفۂ ثالث کے ورثا کے حوالے کر دو، تا کہ تم سے قصاص لیا جائے۔" پھر فرمایا میں، تمہیں خدا کی قسم دیتا ہوں، کیا تمہیں یاد ہے کہ اُس دن جب تم میرے پاس سے گزر رہے تھے، جبکہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمہارے ہاتھ پر تکیہ کیے ہوئے تھے اور آپؐ قبیلہ بنی عمرو ابن عوف سے آ رہے تھے؟۔۔۔رسول اللہؐ مجھے سلام کرتے ہوئے مسکرائے، میں بھی مسکرایا اور اس کے سوا میں نے کچھ نہ کیا، تم نے کہا، علی ابن ابی طالبؑ ہلکے کاموں سے دست بردار نہیں ہوتے، رسول اللہؐ نے فرمایا: "خاموش ہو جاؤ، علی ہلکے کام کبھی نہیں کرتا، مگر یہ جان لو کہ عنقریب تم اُس سے جنگ کرو گے، جبکہ تم ظالم ہو گے۔" زبیر نے کہا اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ہاں! ایسا ہی ہوا تھا مگر میں روزگار کی تلخیوں کے باعث بھول گیا تھا اور یقیناً میں تم سے اب جنگ نہیں کروں گا، اُس نے کہا اور جنگ سے پیچھے ہٹ گیا اور حضرت عائشہ سے گفتگو کرنے کے بعد میدانِ جنگ سے نکل گیا۔[1]

مذکور جملہ ممکن ہے اس طرح کے مسائل کی طرف بھی اشارہ ہو سکتا ہے، یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ زبیر بھی اُن لوگوں میں سے تھا جو مولا علی علیہ السلام سے عشق کرتے تھے اور حتیٰ کہ سقیفہ کے معاملے میں مولا علی علیہ السلام کے دفاع میں کھڑا ہوا اور تلوار بھی نکال لی، مگر اُس کے مخالفین کھڑے ہوئے اور اُس کی تلوار توڑ دی اور خلیفۂ ثانی کے چھے افراد کی شوریٰ میں بھی زبیر نے مولا علی علیہ السلام کو ہی رائے (ووٹ) دیا۔

[1] شرح نہج البلاغہ، ابن ابی الحدید، جلد ۲، صفحہ ۱۶۷

www.shiabookspdf.com

بہر حال ان مختصر اور دل ہلا دینے والے جملوں نے زبیر کی روح میں اثر دکھایا اور پھر وہ روز بروز اپنی اُس راہ پر شک وتر دید کا شکار ہوتا جاتا تھا، جو اُس نے چنی تھی اور بالآخر وہ لشکر جمل سے جدا ہوگیا اور اپنے الگ راستے پر چل پڑا اور بیابانوں کا راستہ اختیار کیا، اگرچہ بعد میں ایک ظالم (ابن جرموز) کے ہاتھوں مارا گیا اور اتنی فرصت نہ پا سکا، کہ اپنی خطا کی تلافی کر سکے۔

"اِبْنُ خَالِكَ" کی تعبیر، ایک محبت بھری تعبیر ہے جو کہ جذبات اور محبتوں کو اُبھارنے کے لیے حضرت علی علیہ السلام نے استعمال فرمائی، یہ تعبیر دراصل اس لیے بھی تھی کہ زبیر "صَفِیَّہ" کا بیٹا تھا جو حضرت ابوطالب علیہ السلام کی بہن تھیں، لہٰذا زبیر حضرت علی علیہ السلام کا پھوپھی زاد بھائی اور حضرت علی علیہ السلام اُس کے ماموں زاد بھائی شمار ہوتے تھے۔

یہ چھوٹا سا جملہ درحقیقت اُن تمام مطالب کی جانب اشارہ تھا جو رسول اللہؐ نے ساری زندگی میں مولا علی علیہ السلام کے بارے میں ارشاد فرمائے تھے، مگر جاہ طلبی (جو کہ جنگ جمل کی اصل وجہ تھی) نے کسی حجاب کی مانند ان حقائق کو زبیر سے چھپا ئے رکھا تھا اور حضرت علی علیہ السلام نے اس مختصر اور معنی خیز جملے سے اُس حجاب کو اُلٹ کر زبیر کو بیدار کر دیا۔

مرحوم سیّد رضیؒ اس خطبے کے ذیل میں کہتے ہیں:

"مولا علی علیہ السلام وہ سب سے پہلی ہستی ہیں جن سے یہ حسین جملہ "فَمَا عَدَا مِمَّا بَدَا" سنا گیا ہے۔"

یہ ایک چھوٹا سا مگر لطیف، دلچسپ اور معنی خیز جملہ ہے اور اس سے مقصود یہ ہے کہ آخر کون سی چیز اس بات کا سبب بنی کہ تم اُس حقیقت کو جو تم پر آشکار ہوئی تھی، بُھلا بیٹھے اور چشمِ بصیرت کو حقیقت وواقعات کے مقابل بند کر دیا اور جانتے بوجھتے راہِ حق سے منہ موڑ لیا اور باطل کی راہ پر چل پڑے۔[1] اس جملے کا اختصار، خوبصورتی اور معنیٰ خیزی اس حد تک ہے کہ آج ادبیاتِ عرب میں ایک ضرب المثل کی سی حیثیت رکھتا ہے۔

چند نکات

۱۔ مولاؑ کے پیغام پر زبیر کا ردّعمل

بعض روایات میں آیا ہے کہ ابن عباسؓ کہتے ہیں:

[1] "عدا" کا لفظ لوٹانے اور منصرف کرنے کے معنی میں آتا ہے اور اس کا فاعل پوشیدہ ضمیر ہے جو "ما" کی طرف لوٹ رہی ہے اور "مِمَّا" میں "مِن" ایک قوی احتمال کے مطابق "عَن" کے معنی میں استعمال ہوا ہے، اور "بَدَا" کا لفظ "بدو" کے مادّے سے ہے جس کے معنی ظاہر ہونے کے ہیں۔

www.shiabookspdf.com

"جب میں نے مولاؑ کے پیغام کو زبیر تک پہنچایا تو اُس نے جواب دیا کہ علی علیہ السلام سے کہو۔ اِنِّیْ اُرِیْدُ مَاتُرِیْدُ۔ "میں بھی وہی راہ اختیار کرنے کے حق میں ہوں جس کو تم چاہتے ہو۔" [۱] (اس کا مقصد یہ تھا کہ تم حکومت کے حصول کے لیے تگ و دو کر رہے ہو، میں بھی کیوں نہ کروں؟ گویا جاہ طلبی نے اِس حد تک اُس کے دل و دماغ کو اندھا کر دیا تھا کہ وہ یہ سمجھ بیٹھا تھا کہ علیؑ جاہ و منصب کے حصول کے لیے قیام کیے ہوئے ہیں)

ابنِ عباسؓ کہتے ہیں کہ میں، مولا علی علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا اور ساری داستان اُن کے حضور سنا دی۔ مگر جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا، زبیر اپنے ضمیر کے دباؤ کے آگے ٹھہر نہ سکا اور بالآخر اُس کی آنکھوں سے پردے ہٹ گئے اور اُس نے حقائق پر غور کیا، جنگ سے کنارہ کش ہو گیا، اگر چہ جب تک بہت دیر ہو چکی ہوگی۔

۲۔ طلحہ و زبیر کی زندگی کا خلاصہ

طلحہ کا تعلق قُریش سے تھا اُس کا باپ عبید اللہ ابنِ عثمان تھا جو کہ اسلام قبول کرنے میں پیش قدمی کرنے والوں میں سے تھا اور اسلامی جنگوں میں بھی شریک تھا مگر جنگ بدر میں نہ تھا، گویا رسالت مآبؐ کی جانب سے کسی کام کے سلسلے میں شام گیا ہوا تھا، لہٰذا جب لوٹا تو جنگ بدر کے غنائم میں سے اپنا حصہ مانگنے لگا۔ رسولِ خداؐ نے اُس سے فرمایا: لَكَ سَهْمُكَ وَ أَجْرُكَ۔ تمہارے لیے تمہارا حصہ بھی ہے اور اجر بھی ہے۔ کہا جاتا ہے جب طلحہ و زبیر ایمان لائے تو رسولِ خداؐ نے مکہ میں اُن کے درمیان صیغۂ مواخات پڑھا مگر ہجرت کے بعد طلحہ کو ابوایوب کا بھائی بنا دیا۔ اُس کے بیٹے سے نقل کیا گیا ہے کہ رسول اللہؐ نے اُحد کے دِن مجھے۔ طَلْحَةُ الخیر۔ کا خطاب دیا۔ اُس کی اسلامی جنگوں میں رسولِ خداؐ کی حمایت سے متعلق کوئی شک نہیں۔

مگر چونکہ وہ ایک جاہ طلب شخص تھا، بعد رحلتِ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اُس نے اپنا چہرہ بدل لیا اور غلط راہ پر چلنے لگا اور عصر رسول اللہؐ میں بھی گاہے گاہے اُس سے کچھ نامناسب جملے سنے گئے ہیں جیسا کہ "درّ المنثور" کے مطابق طلحہ سے روایت ہے کہ اُس نے کہا: محمدؐ حکم دیتا ہے کہ چچازاد بہنیں ہمارے سامنے حجاب کریں، مگر ہماری عورتوں سے ہماری علیحدگی کے بعد خود شادی کر لیتا ہے، اب تو جب وہ دُنیا سے گزر جائے گا تو ہم اُس کی اَزواج سے شادیاں کر لیں گے، یہی وہ وقت تھا کہ جب ازواجِ رسولؐ سے آپؐ کی رحلت کے بعد شادی کرنے کی حُرمت سے متعلق آیتِ تحریم نازل ہوئی۔ [۲]

فخر رازی اپنی تفسیر میں مندرجہ ذیل آیت کی شانِ کے سلسلے میں فرماتے ہیں کہ لوگوں میں سے ایک شخص، کہا

---

[۱] مصادر نہج البلاغہ، جلد ۱، ص ۴۱۱

[۲] سورۂ اَحزاب، آیت نمبر ۵۳، دُرّ المنثور، جلد ۵ صفحہ ۲۱

www.shiabookspdf.com

جاتا ہے کہ طلحہ تھا جس نے کہا تھا، اگر میں رسولؐ کے بعد زندہ رہا تو میں رسولؐ کی زوجہ عائشہ سے نکاح کرلوں گا۔ اسی موقع پر آیہِ تحریم یعنی رسول اکرمؐ کی ازواج سے آپؐ کی وفات کے بعد نکاح کی حرمت کے لیے نازل ہوئی۔[۱] عمر کی شوریٰ کے قصے میں ہم پڑھتے ہیں کہ اُس نے طلحہ کی طرف رُخ کیا اور کہا: میں بولوں یا نہ بُولوں؟ طلحہ نے کہا: بولو، تم ہرگز کوئی اچھی بات نہیں کرو گے۔ خلیفہِ ثانی نے کہا، رسول اللہؐ دنیا سے چلے گئے جبکہ وہ تمہارے اُس جملے پر سخت غضبناک تھے، جو تم نے آیت حجاب کے نزول کے وقت کہے تھے (وہ مذکورہ جملے جو طلحہ کی زبان سے نکلے تھے)۔[۲] بہر حال وہ اُن لوگوں میں سے تھا جو شدت سے خلیفہِ ثالث کے مخالف تھے۔

اُس نے خلیفہِ ثالث کے خلاف بھی آگ کو بھڑکانے کا کام کیا، اسی دلیل کے تحت مروان نے اُسے خلیفہِ ثالث کے قاتلوں میں سے جانا اور جنگ جمل میں جبکہ دونوں عائشہ کے لشکر میں ہی تھے مروان نے طلحہ کا نشانہ لیا اور ایک تیر سے اُسے مجروح کر دیا اور پھر اُس کے بعد وہ مر گیا۔ مروان نے کہا: میں نے خلیفہِ ثالث کے خون کا انتقام طلحہ سے لے لیا۔ یہی جاہ طلبی اس بات کا سبب بنی کہ وہ اُمیر المومنینؑ کے خلاف جنگ کی آگ کو بھڑکائے، جنگ جمل چھیڑنے اور اس کے باعث مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کے خون بہانے کا بہانہ مل جائے۔ اور بالآخر اپنے ہدف کو بھی نہ پہنچ سکا، جو کہ مقامِ خلافت کا حصول تھا اور جیسا کہ ہم نے بتایا جنگ جمل میں مارا گیا۔ بعض نے تو یہ بھی کہا ہے کہ اُمیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے جو نصیحتیں زبیر کو کی تھیں، اُسی سے مشابہت رکھتی ہوئی کچھ باتیں طلحہ سے بھی کیں اور وہ بھی پشیمان ہوا اور جنگ سے کنارہ کش ہو گیا مگر مروان کے تیر سے مارا گیا۔ مگر مندرجہ ذیل خطبے سے یہ پتا چلتا ہے کہ یہ بات درست نہیں ہے، چونکہ خطبے کا مفہوم یہ بتاتا ہے کہ حضرتؑ اُس کی ہدایت سے نا امید تھے۔[۳]

ایک روایت میں آیا ہے کہ جنگ کے اختتام کے بعد جب مولا علی علیہ السلام اُس کی لاش کے پاس سے گزرے تو فرمایا:

"یہ وہی ہے جس نے میری بیعت شکنی کی اور اُمت اسلامی میں فتنے کی آگ لگائی اور لوگوں کو مجھے اور میرے خاندان کو قتل کرنے پر اُکسایا، اِسے اُٹھاؤ اور بٹھاؤ!"

لوگوں نے حکم کی تعمیل کی۔ اِمام عالی جنابؑ نے اُس کے جنازے کی طرف رُخ کر کے فرمایا:

"طلحہ، میں نے تو اُس بات کو برحق پایا جس کا اللہ نے وعدہ کیا تھا، تم نے کیسا پایا؟"

---

[۱] تفسیر فخر رازی، جلد ۲۵، صفحہ ۲۲۵

[۲] شرح نہج البلاغہ، ابن ابی الحدید، جلد ۱، صفحہ ۱۸۳

[۳] اُسدُ الغابہ، جلد ۳، صفحہ ۵۹

www.shiabookspdf.com

پھر فرمایا:

"اسے لٹادو اور پھر چل پڑے۔"

بعض ساتھیوں نے عرض کی:

"یا امیر المومنینؑ، آپ طلحہ سے اُس کی موت کے بعد گفتگو کر رہے ہیں؟"

تو فرمایا:

"خدا کی قسم اُس نے میری بات سُنی ہے۔ بالکل اُسی طرح کہ جب کفار مکہ کے بے جان جسموں کو جنگ بدر کے بعد ایک کنوئیں میں ڈال دیا گیا تھا، اور اُنہوں نے رسولِ خداؐ کی باتیں سُنی تھی۔"[1]

اس مقام پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ رسول اللہؐ نے بعض اوقات تو طلحہ کی تعریف فرمائی ہے بلکہ بعض کے بقول وہ اُن دس افراد میں سے ہے جنہیں آپؐ نے جنت کی بشارت دی تھی یعنی "عَشَرَۃُ مُبَشَّرَہ" میں سے ہے، تو پھر اُس کے حق میں ایسی باتیں کیوں کر ٹھیک ہوں گی۔ تو ہم جواب یہ دیں گے کہ فرض کر لیتے ہیں کہ یہ چیز صحیح ہے،

مگر ممکن ہے کہ انسان اپنی زندگی کے کسی حصے میں مختلف اچھائیاں اور شائستہ خصوصیات رکھتا ہو اور وہ ایک دن حق کی صف میں کھڑا ہو اور اُس پر جنت بھی واجب ہو جائے اور پھر آنے والے کسی دن وہ اُس حق کی صف سے خارج ہو جائے اور باطل کی صف میں کھڑا ہو جائے اور غضبِ الٰہی کا مستحق ٹھہرے۔

تاریخ اسلام میں ایسے بہت سے چہرے گزرے ہیں کہ جو اپنی زندگی میں ہی چہرہ بدل گئے اور صفِ حق سے باطل کی صفوں میں جا کھڑے ہوئے یا باطل کی صف سے حق کی صفوں میں آ ملے۔ ورنہ کون یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ جس شخص نے اپنے اُس امام اور پیشوا کے خلاف جنگ جمل کی آگ بھڑکائی جس پیشوا کو سب نے رہبری کے لیے قبول کر لیا تھا۔ اور پھر اتنے سارے لوگوں کے خون بہانے کا سبب بھی وہی شخص ہو، کیا وہ ایک اچھا آدمی اور اہل نجات ہو سکتا ہے؟ یہ بات کیسے منطقی ہو سکتی ہے؟ اس بات کی دلیل یہ ہے کہ قرآن مجید کے سورۂ توبہ میں اللہ مہاجرین و انصار اور تابعین کے اسلام قبول کرنے میں پیش قدمی کرنے والوں کو جنّت کا وعدہ دیتا ہے:

"وَ السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ وَ اَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا اَبَدًا ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ"[2]

---

[1] "احتجاج طبرسی"، بہ مطابق نقل "سفینۃ البحار"، مادۂ طلحہ۔

[2] سورۂ توبہ، آیت نمبر ۱۰۰

www.shiabookspdf.com

"اور مہاجرین و انصار میں سے (ایمان کی طرف) سبقت کرنے والے اور وہ لوگ جنہوں نے نیک نیتی سے (قبول ایمان میں) ان کا ساتھ دیا، خدا ان سے راضی اور وہ خدا سے خوش اور ان کے واسطے خدا نے وہ (ہرے بھرے) باغ جن کے نیچے نہریں جاری ہیں تیار کر رکھے ہیں وہ ہمیشہ ابدالآباد تک ان میں رہیں گے یہی تو بڑی کامیابی ہے۔"

یہ آیت تمام مہاجرین و انصار کو شامل کرتی ہے، جبکہ ہم جانتے ہیں کہ اُن میں سے بعض افراد ایسے بھی تھے جیسے کہ عبداللہ ابن ابی سرح [1] اور ثعلبۃ ابن حاطب انصاری [2] جو کہ راہِ راست سے منحرف ہو گئے تھے، اور خدا اور رسولؐ کے غضب کا نشانہ بن گئے۔ جبکہ یہ لوگ شروع میں تو اصحاب پیغمبرؐ میں اور مہاجرین و انصار کی صفوں میں شمار ہوتے تھے اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ بہت سے مُنافق لوگ بھی اصحاب میں سے تھے، جن کے بارے میں قرآن کے شدید ترین جملے موجود ہیں۔ اس طرح سے اس بات میں کوئی شک نہیں کہ تمام اصحاب رسالت مآبؐ کی زندگی کو شروع سے آخر تک پرکھنے کے بعد ہی اُن کے بارے میں فیصلہ کیا جا سکتا ہے، ورنہ ایسے تناقضات کا شکار ہو جائیں گے کہ جن کا کوئی جواب تک نہ مل سکے گا۔

لیکن زبیر

زبیر، عوام کا بیٹا تھا اور اُس کی ماں صفیہ رسول اللہؐ کی پھوپھی تھیں۔ اُس نے (کم و بیش) پندرہ سال کی عُمر میں اسلام قبول کیا اور شاید اسلام سب سے پہلے قبول کرنے والے افراد میں سے چوتھا یا پانچواں شخص تھا۔ وہ حبش کے مہاجرین میں سے تھا اور پھر مدینہ آیا اور رسول اللہؐ نے اُس کا عقدِ اخوت عبداللہ ابن مسعودؓ کے ساتھ جاری فرمایا۔ وہ اسلامی جنگوں میں بہت نمایاں رہا اور جنگ بدر و اُحد و خندق اور خیبر و حنین میں شریک تھا اور رسول خداؐ سے اُس کے بارے میں اچھے کلمات نقل کیے گئے ہیں۔ وہ عُمر کی چھ افراد پر مشتمل شوریٰ میں سے تھا، اس نے مولا علیؑ کو ووٹ دیا، مگر طلحہ نے آپؑ کے حق میں رائے نہیں دی۔

افسوس کی بات یہ ہے کہ وہ بھی آگے چل کر جاہ طلبی کے زیر اثر یا پھر طلحہ کی باتوں میں آ کر حق کے راستے سے منحرف ہو گیا اور مقام خلافت کو پا لینے یا کسی دوسرے عہدے کے حصول کے لیے طلحہ کے ساتھ مل گیا اور جنگ کی وہ آگ لگائی کہ جس میں ہزاروں افراد جل گئے اور مسلمانوں کے درمیان ایک بڑی دراڑ پڑ گئی۔ اُس نے مولا علی علیہ السلام سے کیا ہوا عہد و پیمان اور بیعت توڑ دی اور نفس کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیا، مگر مورخین کے کہنے کے مطابق جنگ

[1] تفسیر دُر منثور میں سورۂ انعام آیت نمبر ۹۳ میں اُس کی شدید مذمت کی ہے اُسدُ الغابۃ میں بھی اس نکتے کے ذکر کے بعد کہ وہ وحی کے کاتبوں میں سے تھا، وضاحت کی گئی ہے کہ وہ مُرتد ہو گیا اور رسول اللہؐ نے اُس کے قتل کا حکم جاری فرمایا۔
[2] کتاب اسد الغابۃ فی معرفۃ الصحابۃ

www.shiabookspdf.com

جمل کے میدان میں جنگ کے شروع ہونے سے پہلے ہی حضرتؑ کی نصیحت کے زیر اثر اپنی غلطی کا اعتراف کرلیا اور جنگ سے کنارہ کش ہوکر گردونواح کے بیابانوں میں سے ایک "وَادِي السِّبَاع" نامی بیابان کی طرف نکل پڑا اور نماز اور توبہ میں مصروف ہوگیا۔ ابنِ جرموز نامی ایک شخص نے اِس گمان سے کہ اس کا قتل کرنا مولا علیؑ کی خوشنودی کا باعث ہوگا، اور کچھ تحفہ مل جائے گا، نماز کی حالت میں اُس کے پاس جاکے اُسے قتل کردیا اور اُس کی تلوار اور انگوٹھی مولا علی علیہ السلام کے پاس لے کر پہنچا، حضرتؑ اُس سے شدید ناراض ہوئے اور زبیر کی تلوار کے بارے میں ایک اہم جملہ ارشاد فرمایا:

"هٰذَا السَّيْفُ طَالَمَا فَرَّجَ الْكَرْبَ عَنْ وَجْهِ رَسُولِ اللهِ"

"یہ وہ تلوار ہے جس نے بار بار رسولِ خداؐ کے چہرۂ مبارک سے پریشانی کو برطرف کیا ہے۔"

بعض نے کہا ہے کہ حضرتؑ نے ابن جُرمُوز کو ملاقات کی اجازت نہ دی اور جو شخص اجازت لینے اُن کے پاس آیا، اُسے یہ کہلوا کے بھیج دیا:

"بَشِّرْ قَاتِلَ ابْنِ صَفِيَّةَ بِالنَّارِ"

"صفیہ کے بیٹے کے قاتل کو جہنم کی بشارت دے دو۔"

بعض نے کہا ہے کہ ابن جرموز نے یہ کلام سننے کے بعد شدتِ غم سے خودکشی کرلی۔ بعض تاریخی اَسناد میں اِس بات کی بخوبی وضاحت ہوئی ہے کہ طلحہ وزبیر نے مُعاویہ کے کہنے پر یہ اِقدامات کیے تھے۔ [1]

اوپر بیان کی ہوئی سرگزشت اور طلحہ وزبیر کے حالاتِ زندگی کے خلاصے پر ایک سرسری نگاہ ڈالنے سے، علاوہ اس کے کہ یہ بحث ہمارے موضوع کی تکمیل اور نتیجے تک پہنچنے میں مدد کرتی ہے، ساتھ ہی ایک درسِ عبرت ہے سب کے لیے کہ ایک ایسا شخص جس نے اپنی ساری زندگی حق کی راہ میں گزاری اور مجاہدوں میں شریک رہا، معنوی تحائف بھی حاصل کیے اور تاریخ میں اپنا نام نیکوں کی فہرست میں رقم کروادیا مگر اُس کے بعد عُمر کے آخری حصے میں حُبّ دُنیا اور جاہ طلبی اور مال یا مقام کے عشق میں اپنے آپ کو ایک دردناک سرنوشت کے حوالے کردیا جس پر سب ہی کو افسوس ہے۔

"اَللّٰهُمَّ! اجْعَلْ عَاقِبَةَ أَمْرِنَا خَيْرًا"

۳۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لیے لازم شرائط

اُوپر کی گفتگو میں اَمر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی شرائط میں سے ایک اہم شرط کا ذکر ہوا جو کہ تاثیر کے امکان کا

[1] اسد الغابۃ، جلد ۲، ص ۱۹۶؛ سفینۃ البحار، شرح نہج البلاغۃ ابن ابی الحدید، جلد ۱، ص ۲۳۱۔

www.shiabookspdf.com

موجود ہونا ہے۔ حضرتؑ فرماتے ہیں:

"طلحہ سے نہ ملنا کہ وہ ایک سرکش اور نا قابلِ نفوذ شخص ہے، مگر زبیر سے ملو کہ وہ ایک نرم مزاج اور نفوذ پذیر شخصیت کا حامل ہے۔"

ظاہر ہے کہ انسان کی طاقت جس قدر بھی ہو وہ محدود ہوتی ہے اور اس طاقت کو ایسی جگہ پر خرچ ہونا چاہیے جہاں پر اَثر کا اِحتمال ہو۔ جہاں تاثیر کا احتمال ہی نہ ہو وہاں اِن طاقتوں اور صلاحیتوں کو ضائع نہیں کرنا چاہیے، اور محض پانی پر لکیر نہیں کھینچنا چاہیے اور جب اَثر کا اِحتمال ہو اُس وقت بھی یقین ہونے کے انتظار میں نہیں رہنا چاہیے کہ جب اثر ہونے کا یقین ہوگا تب ہی قدم اُٹھائیں گے۔ ہرگز ایسا نہیں کرنا چاہیے اَثر کا علم ہونا شرط ضرور ہے مگر یقین کا حصول کرنا ضروری نہیں۔

جب یہ شرط، دوسری شرائط کے ساتھ مل جائے، جیسے معروف و منکر کی شناخت اور خطرہ نہ ہونا وغیرہ تو اَمر بالمعروف اور نہی عَن المنکر کا وظیفہ حتمی ہو جاتا ہے۔

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ بہت سے اِنسان حیوانی خصلتیں اور شباہتیں رکھتے ہیں۔ بعض لوگ لُومڑی کی طرح ہیں، بہت سے بھیڑیے کی طرح درندے، بعض افراد شیر کی طرح شُجاع ہیں اور بعض حضرات خنزیر کی طرح شہوت رانی اور شکم پرستی کرتے رہتے ہیں اور بہت سے لوگ گایوں کی طرح ناداں ہیں اور۔۔۔۔ اور مولاؑ نے اپنے کلام میں طلحہ کو اُس سرکش گائے سے تشبیہ دی ہے جو کہ حق کے سامنے سرِ تسلیم خم نہیں کرتی اور حقائق کی تشخیص میں خطا کر بیٹھتی ہے اور جب مشکل کاموں سے روبرو ہوتی ہے تو اُنہیں آسان سمجھتی ہے اور بالآخر شکست کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

www.shiabookspdf.com

www.shiabookspdf.com

بتیسواں خطبہ

"وَفِيهَا يَصِفُ زَمَانَهُ بِالْجَوْرِ، وَيَقْسِمُ النَّاسَ فِيهِ خَمْسَةَ أَصْنَافٍ، ثُمَّ يَزْهَدُ فِي الدُّنْيَا." [1]

اس خطبے میں آپؑ نے دُنیا کی ستمگری کا ذکر فرمایا ہے اور لوگوں کو چار گروہوں میں تقسیم فرمایا ہے اور اس میں زُہد کے بارے میں بھی گفتگو ہوئی ہے۔

خطبہ، ایک نگاہ میں

یہ خطبہ چار حصوں پر مشتمل ہے

پہلا حصہ، مولاؑ کے دور میں معاشرے کی افسوس ناک حالت اور نیک اور پاک و پاکیزہ دِل رکھنے والوں کے لیے پیش آنے والی مشکلات سے عبارت ہے۔ دوسرے حصے میں مولاؑ اُس زمانے کے لوگوں کو (بلکہ قوی اِحتمال کے مطابق ہر دور کے لوگوں کو) چار گروہوں میں تقسیم کرتے ہیں:۔

(الف) وہ گروہ جو قُدرت نہ رکھنے کی وجہ سے فساد نہیں کرتا۔ (درحقیقت اِس نہ کرپانے کے غم میں افسردہ ہے)

(ب) وہ گروہ جو کہ قُدرت بھی رکھتا ہے اور اپنی قُدرت کے بل بوتے پر فساد برپا کرتا ہے اور دنیوی مال و مقام

---

[1] محمد ابن طلحہ شافعی نے کتاب "مطالب السئول" میں اس خطبے کو نقل کیا ہے اور اضافہ کرتے ہیں کہ امامِ عالی مقامؑ نے اس خطبے کو مسجد کوفہ میں لوگوں کے ایک گروہ کے سامنے ارشاد فرمایا اور جیسا کہ انہوں نے خطبے کے ارشاد کیے جانے کی جگہ بھی بتائی تو معلوم ہوتا ہے کہ اِن کے پاس نہج البلاغہ کے علاوہ بھی اور کوئی سند موجود ہے کیونکہ نہج البلاغہ میں اِس خطبے کے محلِ ارشاد کا ذکر نہیں ہوا ہے۔ نیز جاحظ نے البیان والتبیین میں اس کا ذکر کیا ہے، ہرچند کے آغاز میں غلطی سے اُسے امیرِ شام سے نسبت دے دی ہے مگر آخر میں یہ اعتراف کرتا ہے کہ اِس کی امیرِ شام کے لحنِ گفتگو سے کوئی شباہت نہیں ہے بلکہ یہ مولا علی ابن ابی طالبؑ کے کلام اور لحنِ سخن سے ہم آہنگ ہے۔ (مصادر نہج البلاغہ جلد ا صفحہ ۴۱۷)

www.shiabookspdf.com

تک رسائی کے لیے اُس قدرت کا بھرپور فائدہ اُٹھاتا ہے۔

(ج) وہ گروہ جو بظاہر تو اعمالِ الٰہی اور اُخروی انجام دیتا ہے، مگر درحقیقت اُس کے اعمال کی غرض دُنیا ہوتی ہے، نہ کہ آخرت۔

(د) آخری گروہ ایسا ہے جس کے پاس قدرت نہیں ہے اس لیے وہ زُہد وقناعت کا مظاہرہ کرتا ہے، جبکہ وہ نہ زاہد ہے اور نہ ہی قناعت کرنے والا۔

امامؑ نے ان چاروں گروہوں میں سے جو کہ ہر معاشرے میں ہوتے ہیں، ایک ایک گروہ کی خصوصیات کو بیان کیا ہے۔

تیسرے حصے میں اُس گروہ سے متعلق گفتگو کی گئی ہے جسے مولاؑ نے جُداگانہ طور پر ذکر کیا ہے۔ ایسے شریف اور پاک طینت لوگ جو خدا سے لو لگائے ہوئے ہیں اور اُسی کی راہ میں گامزن ہیں، مولاؑ نے اُنہیں بھی چند گروہوں میں تقسیم فرمایا ہے اور اِن میں سے ہر ایک گروہ کی خصوصیات کی بھی دقیق طور پر تشریح فرمائی ہے۔

چوتھا حصہ جو کہ خطبے کا آخری حصہ ہے، اُس میں حضرتؑ نے لوگوں کو زہد اور دنیا سے بے اِعتنائی کی جانب دعوت دی ہے دنیا سے عشق ہی تمام تر گناہوں، بُرائیوں اور بدبختیوں کا سرچشمہ ہے اور اپنے مختصر جملے میں ہی گفتگو کا حق ادا کر دیا ہے۔

پہلا حصہ

اَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا قَدْ اَصْبَحْنَا فِی دَهْرٍ عَنُودٍ وَ زَمَنٍ كَنُودٍ يُعَدُّ فِيهِ الْمُحْسِنُ مُسِيئًا وَ يَزْدَادُ الظَّالِمُ فِيهِ عُتُوًّا لَا نَنْتَفِعُ بِمَا عَلِمْنَا وَلَا نَسْأَلُ عَمَّا جَهِلْنَا وَلَا نَتَخَوَّفُ قَارِعَةً حَتّٰى تَحُلَّ بِنَا.

"اے لوگو! ہم ایک کینہ پرور اور کفرانِ نعمت سے بھرپور دور میں موجود ہیں کہ جس میں نیک آدمی بدکردار شمار ہوتا ہے اور ظالموں کے ظلم میں مسلسل اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔"

جو کچھ ہم جانتے ہیں اُس سے اِستفادہ نہیں کرتے اور جو چیز ہم نہیں جانتے اُس کے بارے میں سوال نہیں کرتے اور کھڑکھڑانے والے حادثات سے ہم اُس وقت تک نہیں ڈرتے جب تک وہ ہم پر آنہ جائیں۔

www.shiabookspdf.com

شرح وتفسیر

ہم اُس دور میں ہیں کہ جس میں اِہمیتوں کا معیار دگرگوں ہے

امامؑ نے اس گفتگو کے آغاز میں عوام النّاس کو گفتگو کا محور قرار دیا ہے۔ سب سے پہلے اپنے زمانے کی خرابی پر بات کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"أَيُّهَا النَّاسُ! إِنَّا قَدْ أَصْبَحْنَا فِي دَهْرٍ عَنُودٍ وَزَمَنٍ كَنُودٍ"

"اے لوگو! ہم ایک کینہ پرور اور کُفرانِ نعمت سے بھرپور دور میں موجود ہیں۔"

ظاہری بات ہے کہ زمانے سے مُراد روز وشب اور ماہ وسَال تو نہیں ہیں۔ کیونکہ یہ چیزیں کوئی اَچھائی یا بُرائی اور کفرانِ نعمت اور کینہ پروری تو رکھنے سے رہیں۔ بلکہ یہ زمانے کے لوگ ہوتے ہیں جو اپنے دور اور زمانے کو ایسا رنگ دے دیتے ہیں، اور جہاں کہیں بھی زمانے کی اَچھائی یا بُرائی کی بات ہوتی ہے تو اِس کا مقصد یہی ہوتا ہے ورنہ، نہ تو چاند اور سورج کی تابش میں کوئی تغیّر ظاہر ہوا ہے اور نہ ہی چاند کی سورج کے گرد گردش میں کوئی فرق نمایاں ہوا ہے، بارش بھی اپنی نہج پر بَرس رہی ہے اور زمین بھی اپنی برکات سے جہانِ انسانیت کو نواز رہی ہے۔ یہ ایک زمانے کے لوگوں کے بدنما چہرے اور اُن کے سیاہ اعمال ہیں، جو زمانے کے چہرے کو بدنُما بنا دیتے ہیں۔

امامؑ ایک ایسے دور میں رہتے تھے کہ سوائے کچھ گنے چنے افراد کے اور کوئی بھی آپؑ کی رُوح اور اَفکار کی بُلندی اور اِنسانی اَقدار کی رہنمائی اور آپ کی قوتِ اِصلاح کو درک نہیں کرتا تھا اور فتوحاتِ اسلامی کے باعث مُلکِ اِسلام میں ڈھیروں ڈھیر درہم ودینار کی چکا چوند اور دُنیاوی زرق برق اور تجمّل پرستی کے مقابلے اور مال جمع کرنے کی حرص وہوس میں گرفتار تھے یا پھر کسی مقام ومنصب کے حصول کی غفلت میں پھنسے ہوئے تھے اور کمالِ افسوس ہے کہ دُنیا کے بہت سے مصلحین کا بھی لگ بھگ یہی شکوہ اپنے زمانے کے متعلق رہا ہے۔

اس کے بعد حضرتؑ نے اُس زمانے کے لوگوں کی کچھ خصوصیات کا ذکر فرمایا ہے اور یوں پانچ نکات کی جانب اِشارہ فرمایا ہے۔ پہلے اور دوسرے جملے میں فرماتے ہیں:

"يُعَدُّ فِيهِ الْمُحْسِنُ مُسِيئاً وَيَزْدَادُ الظَّالِمُ فِيهِ عُتُوّاً"

"ایسا زمانہ ہے کہ جس میں نیک شخص بدکار اور گناہ گار شمار کیا جاتا ہے اور ظالموں کا طغیان بڑھتا چلا جا رہا ہے۔"

www.shiabookspdf.com

کیا واقعاً ایسا ممکن ہے کہ کسی دور میں نیک شخص پر گناہ گاری کی تہمت لگائی جائے اور ستمگر حضرات کو شاباشی دی جائے؟

جی ہاں، اس طرح کے معاملات کو انسانی معاشرے میں ایک ہی چیز پیدا کرتی ہے اور وہ ہے اہمیتوں کے معیار کا بگڑ جانا۔ جہاں مال، شخصیت اور قدرت کو اہمیت کا معیار سمجھا جاتا ہے، اِس نکتے پر غور کیے بغیر کہ آخر اُس کی آمدنی کیسی ہے اور اس کے ذرائع کیا ہیں، تو ایسی صورت میں ظالمین اور غارتگر افراد اُس معاشرے کی صاحبانِ اہمیت میں شمار ہو جاتے ہیں کیونکہ اُن کے پاس مال بہت ہوتا ہے، اور دوسری طرف وہ نیک شخص جو اپنے شرعی طریقے سے کمائے ہوئے حلال اور پاک مال کو جب محروم لوگوں کی خدمت میں خرچ کر دیتا ہے، وہ ایک نادان اور بیوقوف آدمی شمار کیا جاتا ہے۔ توجہ رہے کہ قرآن مجید میں بھی کئی مقامات پر بہت سے معاشروں کے فساد کی وجہ، اُن میں اہمیتوں کے نظام کا بگڑ جانا بتایا گیا ہے۔ حضرت لُوط علیہ السلام کی قوم کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ لوگ ایک دوسرے سے یہ کہہ رہے تھے:

"فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوْۤا اَخْرِجُوْۤا اٰلَ لُوْطٍ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ ۚ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ"۔[1]

"تو ان کی قوم کا جواب اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ وہ کہنے لگے: تم لوط کے گھر والوں کو اپنی بستی سے نکال دو یہ بڑے پاک باز بنتے ہیں۔"

حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے ظالم بھی اُن پاک دِل جوانوں کو جو آپؑ پر ایمان لا چکے تھے، اَراذِل یعنی نیچ ذات کے اور سادہ لوح اور خُودسر کہتے تھے اور اُن کی نظر میں اِن لوگوں کی دوسروں پر کوئی فضیلت نہیں تھی، کہنے لگے:

"فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ ۚ وَمَا نَرٰى لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍۢ بَلْ نَظُنُّكُمْ كٰذِبِيْنَ"۔[2]

"ہم تمہیں سوائے اپنی طرح کے ایک بشر کے اور کچھ نہیں جانتے، اور جو لوگ تمہاری پیروی کرتے ہیں اُنہیں (بھی) ہم محض نچلے طبقے کے سادہ لوح افراد میں سے شمار کرتے ہیں اور تمہارے لیے ہم اپنی نسبت کسی فضیلت کے بھی قائل نہیں ہیں، بلکہ ہم تو تم لوگوں کو جھوٹا تصور کرتے ہیں۔"

جی ہاں! جب زمانے کے لوگ فاسد ہو جائیں اور ظلم و ستم بڑھنے لگیں تو معاشرے کا چہرہ ہی بدل جاتا ہو گا اور جن چیزوں کو اہمیت نہیں دینی چاہیے وہ اُن چیزوں کی جگہ لے لیں گی جنہیں اہمیت ملنے کا حق ہے۔ اور ظالم اپنی ہٹ دھرمی پر

---

[1] سورۂ نمل، آیت نمبر ۵۶۔

[2] سورۂ ہود، آیت نمبر ۲۷۔

www.shiabookspdf.com

مزید اکڑنے لگے گا اور نیک حضرات مجرم شمار کیے جائیں گے اور معاشرے کے حساس مراکز سے دور ہو جائیں گے۔ امامؑ نے اِس کلام کو تسلسل دیتے ہوئے فرمایا ہے:

"لَا نَنْتَفِعُ بِمَا عَلِمْنَا، وَلَا نَسْأَلُ عَمَّا جَهِلْنَا"

"(ایسا اس لیے ہوتا ہے کہ) ہم جو جانتے ہیں اُس سے فائدہ نہیں اُٹھاتے اور جو نہیں جانتے اُس کے بارے میں کسی سے پوچھتے بھی نہیں ہیں۔"

درحقیقت یہ وہ بدترین حالت ہے کہ جس میں ایک فرد یا ایک پورا معاشرہ گرفتار ہو جاتا ہے، یعنی نہ تو اپنے علم و آگاہی سے مشکلات کے حل کے لیے استفادہ کرتا ہے اور نہ ہی اپنے جہل و نادانی کو دور کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اِن دونوں چیزوں کا حاصل سوائے جہل و جرائم کے سیاہ دلدل میں ڈوبتے چلے جانے کے اور کچھ نہیں۔

اور یہی حال اُن لوگوں کا ہے جو معاشرے کے فسادات کے مقابلے میں غیر ذمّے داری کا مظاہرہ کرتے ہیں اور اپنے لیے تو کسی چیز کو بھی فرض اور وظیفے کے طور پر قبول ہی نہیں کرتے، اَب چاہے یہ اِنکار، اِصلاح سے نااُمید ہونے کی وجہ سے ہو یا پھر خود بھی اُنہی فسادات اور قساوتوں میں گھر جانے کی وجہ سے ہو۔ پھر حضرتؑ فرماتے ہیں:

"وَلَا نَتَخَوَّفُ قَارِعَةً حَتَّى تَحُلَّ بِنَا"

"(اِسی وجہ سے) ہم کھڑکھڑانے والے حادثات اور فتنوں سے اُس وقت تک نہیں گھبراتے جب تک کہ وہ ہم پر نہ آجائیں۔"

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ امامِ عالی مقامؑ نے اِن آخری جملوں میں مُتَكَلِّم مَعَ الْغَيْر کا لفظ استعمال کیا یعنی "ہم" کے لفظ کے ذریعے گفتگو فرمائی ہے اور اِس کے دائرے میں خود سمیت تمام لوگوں کو شامل کرتے ہوئے گفتگو کر رہے ہیں، جبکہ یقیناً اور قطعاً آپؑ جیسے پاک اور آگاہ اِنسان سے جو کہ خود سراپا تقویٰ ہیں، یہ اُمور بعید ہیں۔

ممکن ہے کہ یہ تعبیر اس لیے آپؑ نے استعمال فرمائی ہو تا کہ ان کی اندرونی کمزوریاں پروان نہ چڑھیں اور وہ لوگ اپنے آپ کو اِن اُمور میں ذمّے دار جانیں۔

www.shiabookspdf.com

چند نکات

۱۔ زمانے کے فاسد ہو جانے سے کیا مراد ہے؟

جیسا کہ اوپر اشارہ ہوا، دَور اور زمانے سے مُراد چاند اور سورج کی گردش کی پیمائش یا زمین کے اپنے گرد اور سورج کے گرد حرکت ہے اِن میں اصلاح یا فساد کا کوئی پہلو نہیں۔ تمام زمانے ذاتی طور پر یکساں ہیں، درحقیقت یہ کہ جو زمانے کے افراد اور حوادث ہیں جو زمانے کے رنگ ڈھنگ کو بدل دیتے ہیں اور یہ مختلف قسم کے حادثات اور زمانے کو حسین یا بدصورت بنا دیتے ہیں اور زندگی کو تلخ یا شیریں بنا دیتے ہیں، لہٰذا جب کبھی یہ کہا جائے کہ زمانہ خراب ہو گیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہمارے زمانے کے لوگ خَراب اور فاسد ہو گئے ہیں۔ یہ بات مکان (جگہ) کے لیے بھی اسی طرح سے ہے، یعنی جب یہ کہا جائے کہ فلاں شہر یا فلاں ملک خَراب ہو گیا ہے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہاں کے لوگ خراب ہو گئے ہیں۔

بہت سے لوگ اِن تعبیرات سے غلط استفادہ کرتے ہیں اور زمانے یا جگہ کی خرابی کو اپنے بگڑنے کا بہانہ بنا لیتے ہیں۔ جب کہا جاتا ہے کہ آخر کیوں ایسی گندگیوں میں تم اور تمہارا گھرانہ گرفتار ہے؟ تو کہتے ہیں کیا کریں، زمانہ خراب ہے، ہمارا شہر اور علاقہ خراب ہے!، جب کہ اُس کے بگاڑ کی وجہ وہ خود اور اُن جیسے دوسرے اَفراد ہوتے ہیں، شہر و دیار یا زمانہ نہیں۔

یہ بات اُن اشعار میں خوب اچھی طرح سے وضاحت کے ساتھ بیان کی گئی ہے جنہیں حضرت عبدالمطلبؑ، جدّ رسول اللہؐ سے نسبت دی گئی ہے:

وَ يُعِيبُ النَّاسُ كُلُّهُمُ زَمَاناً　　　وَ مَا لِزَمَانِنَا عَيْبٌ سِوَانَا
نُعِيبُ زَمَانَنَا وَالْعَيْبُ فِيْنَا　　　وَلَوْ نَطَقَ الزَّمَانُ بِنَا هَجَانَا
وَ إِنَّ الذِّئْبَ يَتْرُكُ لَحْمَ ذِئْبٍ　　　وَيَأْكُلُ بَعْضُنَا بَعْضًا عَيَانًا

"لوگوں میں سے ہر ایک شخص اپنے زمانے کو معیوب دِکھاتا ہے، جبکہ ہمارا زمانہ ہمارے سوا کوئی عیب نہیں رکھتا۔ ہم اپنے زمانے پر اُنگلی اُٹھاتے ہیں، جب کہ عیب خود ہمارے اَندر ہے اور اگر زمانے کو زباں مل جائے تو وہ ہمارا ہی مذاق اڑائے گا۔ (اِس بات کی گواہی یوں دی ہے کہ) بھیڑیا کبھی بھیڑیے کا گوشت نہیں کھاتا، مگر ہم لوگ ایک دوسرے کا گوشت کھاتے ہیں۔ [1]

[1] عیون اخبار الرضا" بحارالانوار سے نقل ہوا، جلد ۴۹، ص ۱۱۱

www.shiabookspdf.com

ظاہر ہے کہ زمانے کی خرابی تب تک ختم نہیں ہوسکتی، جب تک کہ زمانے کے لوگ نہ بدل جائیں۔اور لطفِ الٰہی بھی اُن کے شاملِ حال نہیں ہوتا، سوائے اِس کے کہ وہ خود اپنے حال پر رحم کھائیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اصل قصوروار خود انسان ہی ہوتے ہیں۔

"إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنْفُسِهِمْ." [1]

"بیشک اللہ کسی قوم کی حالت کو نہیں بدلتا یہاں تک کہ وہ لوگ اپنے آپ میں خود تبدیلی پیدا کر ڈالیں۔"

۲۔ اہمیتوں کا معیار دگرگوں ہونے کا نتیجہ

ایک ایسا اہم مسئلہ جو کہ انسانی معاشرے کی تقدیر پر اثر انداز ہوتا ہے، مگر بہت سے لوگ اس سے غافل ہیں وہ ہے اہمیتوں کے معیار کا مسئلہ۔ ہم اس کی وضاحت یوں کرتے ہیں کہ ہر معاشرے کی حرکت کا راستہ اُن قدروں اور اہمیتوں کی جانب ہوا کرتا ہے جنھیں اُس معاشرے میں بڑی اہمیتوں کے حوالے سے پہچانا جاتا ہے۔ اب اگر جن چیزوں کو اہمیت نہیں دینی چاہیے وہ چیزیں کسی بھی وجہ سے اُن چیزوں کی جگہ لے لیں جنھیں اہمیت دینی چاہیے تو نتیجتاً پورا معاشرہ اُسی طرف چل پڑتا ہے جسے اہمیت نہیں دینی چاہیے تھی۔ یہ جو ہم کہتے ہیں کہ پورا معاشرہ، تو اس سے مقصد یہ ہے کہ معاشرے کے زیادہ تر افراد کا اُس طرف چل پڑنا، جیسا کہ کسی بڑی سی نہر کی سطح پر کچھ پتے پڑے ہوئے ہوں اور اُس پانی کے ہمراہ حرکت کی حالت میں ہوں، ورنہ ہمیشہ ہر معاشرے میں مؤمن اور اہلِ فکر و تدبر حضرات رہے ہیں جنھوں نے ایسے فاسد اور غلط معاملات کا مقابلہ کیا اور اکثر ان معاشروں کے راستوں کو ہی بدل ڈالا اور غلط راہ سے صحیح راہ پر لے آئے۔

لہٰذا اگر کسی معاشرے میں سب سے زیادہ اہمیت پیسے کو دی جاتی ہو تو ظاہری بات ہے کہ اُس معاشرے کے زیادہ تر افراد حلال و حرام میں فرق کیے بغیر صرف دولت اور پیسا جمع کرنے میں لگ جائیں گے۔ اُصولاً انسان شخصیت کا طالب ہے اور اُس کے حصول کے لیے کافی کوششیں کرتا ہے، اب اگر کسی معاشرے نے اِس انسان کو ایک بڑی شخصیت اور جھوٹے کردار کا نمونہ عمل اہمیتوں کے معیار کے تناظر میں قرار دے دیا تو وہ اُسی جانب چل پڑے گا زیادہ تر نوجوان، نام کی تلاش میں ہیں اور ہیروز کو پسند کرتے ہیں۔ اگر معاشرے کے ہیرو و مثال کے طور پر ہنر پیشہ افراد ہوں یا ورزش اور کھیل کود کے میدان میں ہیرو ہوں تو جائے تعجب نہیں ہے کہ نوجوان طبقے کے افراد ہر چیز میں حتیٰ کہ کپڑوں میں اور رنگ ڈھنگ میں یہاں تک چلنے پھرنے کے انداز میں بھی اُنہی کی تقلید کرنے لگیں اور اگر علما اور دانشوروں کا طبقہ ہیرو اور آئیڈیل (Ideal) شمار کیا

---

[1] سورۂ رعد، آیت ۱۱

www.shiabookspdf.com

جائے تو عوام کا رجحان بھی علم و دانش کی جانب بڑھ جائے گا۔ ایک مشہور قصہ عالم بزرگ شیخ بہائی علیہ الرحمہ سے نقل ہوا ہے کہ انہیں اُن کی کثیر علمی خدمات کے باعث نذرانے کے طور پر شاہ عباس صفوی کی جانب سے کچھ تحائف دیے جانے تھے، چنانچہ شیخ نے یہ پیش کش کی کہ اُن کا تحفہ یہ ہونا چاہیے کہ وہ بادشاہ کی مخصوص سواری پر بیٹھیں اور بادشاہ اُن کی رکاب میں پیدل چلے، کچھ گلیوں اور سڑکوں کی مسافت اِسی انداز میں عوام الناس کی نظروں کے سامنے طے کریں۔ درحقیقت وہ اپنے اِس عمل سے لوگوں کو یہ دکھانا چاہتے تھے کہ قدروں اور اہمیتوں کا نظام، علم و دانش کی رکاب کا خدمت گزار ہے۔ کہتے ہیں کہ اس واقعے کے بعد سے نوجوانوں کا مدارس اور اسکولوں کی جانب رجحان پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گیا۔ قبل از اسلام معاشرتی نظام کی اہمیت اس جملے کی مصداق تھی:

"بِأَرْضٍ عَالِمُهَا مُلْجَمٌ وَ جَاهِلُهَا مُكْرَمٌ"

"ایسی سرزمین میں رہتے تھے کہ جس کا عالم جبراً منہ بند کیے بیٹھا ہوتا تھا اور اُس کے جاہل افراد حاکم ہوتے تھے۔"[1]

وہ معاشرہ ابوجہل اور ابوسفیان جیسے ہیروز کی پرورش کرتا تھا، مگر جب اہمیتوں اور اخلاقی قدروں کا معیار و محور اسلام اور قرآن کے حکم کے مطابق تقویٰ قرار پایا اور قرآن نے آواز دی: "إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللهِ أَتْقَاكُمْ" اور یہ آواز ہر سو پھیل گئی تو وہ جھوٹے کردار اور وہ باطل ہیروز گویا ایسے ہوگئے کہ جیسے گرمیوں میں برف پگھل جاتی ہے اور پھر اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ اُن کی جگہ ابوذرؓ جیسے کرداروں نے لے لی۔

افسوس کی بات تو یہ ہے کہ خلفاء کے دور میں اسلام کا اہمیتوں کا نظام ہار گیا اور جاہلیت کی اُرزشوں نے از سرِ نو جگہ بنالی اور یوں عَمرو عاص اور اَبوموسیٰ اَشعری جیسے کرداروں نے مالک اشترؓ اور اَبوذرؓ و عمار یاسرؓ جیسے کرداروں کی جگہ لے لی اور یہی وہ المیہ ہے جس نے اِمامؑ کو شدید تکلیف دی۔ حضرتؑ کے دُکھڑوں کا ایک سبب یہ ہے کہ نیک کردار شخص کو بدکار شمار کیا جاتا تھا اور ظالم اور ستم پیشہ افراد میدان کے سُورما ہوتے تھے اور رُوز بروز اُن کے مظالم بڑھتے چلے جارہے تھے۔ امامِ فلک جناب کا نہج البلاغہ میں ذکر شدہ ان تمام تر بیانات اور خطبوں کے اِرشادات سے مقصد صرف یہی تھا کہ رسُولِ اکرمؐ کے دور کا سارا نظامِ اقدار، اہمیت اور معیارِ اہمیت بحال ہوجائے اور برقرار رہے، ہرچند کہ آپؑ کے اور اِس مقصد کے درمیان شہادت حائل ہوگئی۔

دوسرا حصہ

[1] نہج البلاغہ، خطبہ دوم

www.shiabookspdf.com

وَالنَّاسُ عَلَى أَرْبَعَةِ أَصْنَافٍ مِنْهُمْ مَنْ لَا يَمْنَعُهُ الْفَسَادَ فِي الْأَرْضِ إِلَّا مَهَانَةُ نَفْسِهِ وَكَلَالَةُ حَدِّهِ وَنَضِيضُ وَفْرِهِ وَمِنْهُمُ الْمُصْلِتُ لِسَيْفِهِ وَالْمُعْلِنُ بِشَرِّهِ وَالْمُجْلِبُ بِخَيْلِهِ وَرَجِلِهِ قَدْ أَشْرَطَ نَفْسَهُ وَأَوْبَقَ دِينَهُ لِحُطَامٍ يَنْتَهِزُهُ أَوْ مِقْنَبٍ يَقُودُهُ أَوْ مِنْبَرٍ يَفْرَعُهُ وَلَبِئْسَ الْمَتْجَرُ أَنْ تَرَى الدُّنْيَا لِنَفْسِكَ ثَمَناً وَمِمَّا لَكَ عِنْدَ اللهِ عِوَضاً وَمِنْهُمْ مَنْ يَطْلُبُ الدُّنْيَا بِعَمَلِ الْآخِرَةِ وَلَا يَطْلُبُ الْآخِرَةَ بِعَمَلِ الدُّنْيَا قَدْ طَامَنَ مِنْ شَخْصِهِ وَقَارَبَ مِنْ خَطْوِهِ وَشَمَّرَ مِنْ ثَوْبِهِ وَزَخْرَفَ مِنْ نَفْسِهِ لِلْأَمَانَةِ وَاتَّخَذَ سِتْرَ اللهِ ذَرِيعَةً إِلَى الْمَعْصِيَةِ وَمِنْهُمْ مَنْ أَبْعَدَهُ عَنْ طَلَبِ الْمُلْكِ ضُئُولَةُ نَفْسِهِ وَانْقِطَاعُ سَبَبِهِ فَقَصَرَتْهُ الْحَالُ عَلَى حَالِهِ فَتَحَلَّى بِاسْمِ الْقَنَاعَةِ وَتَزَيَّنَ بِلِبَاسِ أَهْلِ الزَّهَادَةِ وَلَيْسَ مِنْ ذَلِكَ فِي مَرَاحٍ وَلَا مَغْدًى.

"اور فاسد لوگ چار قسم کے ہیں: ایک گروہ ایسا ہے کہ اگر وہ فساد سے اپنے ہاتھوں کو آلودہ نہیں کر رہا، تو صرف اس لیے کہ اُن لوگوں کی رُوح ناتواں اور اُن کی تلوار کند ہے۔ (جی ہاں، وہ لوگ فساد کرنے کے معاملے میں بڑے پائے کے تیراک ہیں، مگر انہیں تیرنے کے لیے سمندر جو نہیں ملتا!!) دوسرا گروہ وہ لوگ ہیں جن کی تلواریں کھنچی ہوئی ہیں اور اُنہوں نے اپنی شرانگیزی اور فساد طلبی کو آشکار کیا ہوا ہے اور اپنے سواروں اور پیادوں کے لشکر کو اس کام کے لیے چارسُو پھیلایا ہوا ہے۔ اُنہوں نے اپنے باطن کو ظلم و فساد کے لیے تیار کر رکھا ہے اور اپنے دین کو تباہ کر ڈالا ہے۔ اُن کا ہدف یہ ہے کہ مالِ دُنیا سے کچھ حاصل کر سکیں یا کسی گروہ کی سرداری پالیں یا کسی منبر پر چڑھ جائیں۔ (اور لوگوں کی پیشوائی کا لبادہ اوڑھ لیں اور اُن کے لیے جھوٹے خطبے پڑھ لیں)۔ (اے فسادی اور طغیان گر انسان) تو نے اپنے لیے کتنی بری تجارت کو چُن لیا ہے۔ دُنیا کو اپنا مُعاوضہ اور قیمت سمجھ بیٹھے ہو اور اُسے اپنی اُس اُجر و پاداش کے بدلے مول لیا ہے، جسے خدا نے تیرے لیے مقرر فرمایا ہے۔

ایک اور گروہ وہ لوگ ہیں جو دُنیا کو آخرت کے کاموں کے بدلے طلب کرتے ہیں بجائے اس کے کہ وہ آخرت کو دنیا کے عمل سے طلب کرتے۔ وہ لوگ ریاکاری کر کے اپنے دین کو دنیا کے بدلے بیچ دیتے ہیں اور جسے حاصل نہ کر سکے اُسے وہ ظلم و جور سے حاصل کر لیتے ہیں، وہ دھوکے سے طلب کرتے ہیں اور اس ہدف تک پہنچنے کے لیے اپنے آپ کو مُتواضع ظاہر کرتے ہیں۔ چھوٹے قدم اُٹھاتے ہیں اور اپنے دامن کو (ظاہراً دنیا کی آلودگی سے بچانے کے لیے) سمیٹ لیتے ہیں اور اپنے آپ کو اَمانت داروں کے سے زیور سے آراستہ کر دیتے ہیں۔ اور (ایک جملے میں) خدا کی سَتّاریت کو اپنے معاصی کا وسیلہ قرار دیتے ہیں۔"

www.shiabookspdf.com

اور چوتھا گروہ اُن لوگوں کا ہے جن کی حقارت اور ناتوانی اور ضروری وسائل کے نہ ہونے، نے انہیں جاہ و مقام تک پہنچنے سے روکا ہوا ہے، جبکہ فساد کے معاملے میں وہ دیگر مفسدوں سے کچھ کم نہیں ہیں، لیکن وہ اِس حقیقت کا ہرگز اِعتراف ہی نہیں کرتے، بلکہ اپنے آپ کو قناعت کے زیور سے آراستہ کیے بیٹھے ہیں اور زاہدوں کا لباس پہن رکھا ہے، جبکہ وہ کسی بھی وقت نہ دِن میں اور نہ ہی رات میں، پارسا لوگوں کی صف میں تھے ہی نہیں۔ (یہ چار گروہ سب کے سب فسادی ہیں اور سب ہی خطرناک ہیں، ہر چند یہ لوگ مختلف چہروں میں ظاہر ہوتے ہیں)

شرح وتفسیر

لوگوں کے چار گروہ ہیں

خطبے کے اس حصے میں امام عالی مقام نے دُنیا طلب اَفراد کی ایک دقیق تقسیم فرما کر انہیں چار گروہوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ حضرتؑ کی یہ تقسیم نہ صرف یہ کہ اُس دور میں صادق آتی تھی، بلکہ ہر دور میں صادق آتی ہے۔ آغازِ سخن میں فرماتے ہیں:

"فَالنَّاسُ عَلَى أَرْبَعَةِ أَصْنَافٍ"

"لوگ چار قسم کے گروہوں پر مشتمل ہیں۔"

"مِنْهُمْ مَنْ لَا يَمْنَعُهُ الْفَسَادَ فِي الْأَرْضِ إِلَّا مَهَانَةُ نَفْسِهِ، وَ كَلَالَةُ [1] حَدِّهِ، وَ نَضِيضُ [2] وَفْرِهِ"

"ان میں سے ایک گروہ ایسا ہے کہ اگر وہ لوگ فساد نہیں کر رہے تو وہ اِس لیے کہ اُن کی رُوح ناتواں اور اُن کی تلواریں کند اور اُن کا مال تھوڑا ہے۔"

ایک مشہور تعبیر کے مطابق انہیں تیرنے کو پانی میسر نہیں، ورنہ یہ لوگ فساد کے دریا کے ماہر ترین تیراک ہیں۔

در حقیقت یہ لوگ اسباب کی کمی کے غم میں افسردہ ہیں، ورنہ ان کے وجود، اندرونی طور پر شر و فساد اور ظلم و تباہی سے مالا مال ہیں۔ ظاہری بات ہے کہ ایسے اَفراد اپنے اندرونی شر کو ظاہر کرنے کے لیے کسی کارآمد موقع کی تلاش میں ہوتے ہیں۔ بنابرایں کبھی اُن کے پُر سکون اور بے ضرر ظاہر کے دھوکے میں نہیں آنا چاہیے۔ معاشرے کے الٰہی رہبروں کو اُن کی شناخت کر لینے کے بعد، اُن پر دھیان رکھنا چاہیے، کہ کہیں انہیں فساد کے مواقع نہ مل جائیں، کیونکہ ممکن ہے کہ اُن کی شرانگیزیاں،

---

[1] "كَلَالَة" کا لفظ "ضَلَالَة" کے وزن پر ہے اور کند ہونے کے معنی رکھتا ہے، لہٰذا کند تلوار کو کلول کہا جاتا ہے۔

[2] "نَضِيض" کا لفظ کم اور ناچیز کے معنی میں آتا ہے، اِسی لیے اُس کم پانی کو "نضیض" کہتے ہیں جو تھوڑا تھوڑا کر کے جمع ہوتا ہے۔

www.shiabookspdf.com

معاشرے کے بڑے فسادات کا باعث بن جائیں۔ قرآن مجید اِس گروہ کی جانب اشارہ کر رہا ہے:

"وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ يُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِيْ قَلْبِهٖ وَ هُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ وَ اِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَ يُهْلِكَ الْحَرْثَ وَ النَّسْلَ وَ اللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ"

"لوگوں میں سے کچھ ایسے بھی ہیں کہ جن کی گفتار دُنیا کی زندگی میں تمہارے لیے تعجب خیز ہوگی (وہ بظاہر محبت کا ظہار کرتے ہیں) اور خدا کو اُس پر گواہ بناتے ہیں جو اُن کے دلوں میں ہے۔ یہ ایسی صورت میں ہے کہ وہ خود شدید ترین دُشمنوں میں سے ہیں (اُس کی نشانی یہ ہے کہ) جب وہ کسی اِقتدار تک پہنچ جاتے ہیں تو زمین میں فساد برپا کرنے کی کوششیں کرتے ہیں اور کھیتوں اور چوپایوں کو نیست و نابود کر دیتے ہیں اور خدا فساد کو پسند نہیں کرتا۔"[1]

پھر حضرت دوسرے گروہ کی صفات اور اُن کے اہداف اور انجام کا تذکرہ فرماتے ہیں:

"وَمِنْهُمُ الْمُصْلِتُ[2] لِسَيْفِهٖ وَالْمُعْلِنُ بِشَرِّهٖ وَالْمُجْلِبُ بِخَيْلِهٖ وَرَجِلِهٖ"

"دوسرا گروہ اُن اَفراد سے عبارت ہے جن کی تلواریں کھنچی ہوئی ہیں اور اُنہوں نے اپنی شرانگیزی اور فساد طلبی کو آشکار کیا ہوا ہے اور اُنہوں نے اپنے لشکر فساد کے سواروں اور پیادوں کو (اِس مقصد کے لیے) جمع کر کے چارسو پھیلایا ہوا ہے۔"

"قَدْ أَشْرَطَ[3] نَفْسَهٗ وَأَوْبَقَ[4] دِيْنَهٗ"

"اُنہوں نے اپنے باطن کو ظلم و فساد کے لیے آمادہ کر دیا ہے اور اپنے دین کو تباہ کر ڈالا ہے۔"

مگر اُن کا ہدف کیا ہے؟ اُن کا مقصد اور ہدف وہی ہے جس کی جانب امامؑ نے اشارہ فرمایا ہے:

---

[1] سورۂ بقرہ، آیت نمبر ۲۰۴۔۲۰۵

[2] "مُصْلِتْ" کا لفظ "صلت" کے مادّے سے ہے اور کسی چیز کے ظاہر ہونے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور سیف صلت سے مُراد ہے کھنچی ہوئی اور صیقل شدہ تلوار اور مُصْلِتْ اُس شخص کو کہتے ہیں جو اپنی تلوار کو کھینچے ہوئے ہو۔

[3] "اشرط" کا لفظ "شرط" کے مادّے سے ہے اور علامت کے معنی میں ہے اور اوپر کی عبارت اِس حقیقت کو بیان کرنے والی ہے کہ اس نے اپنے آپ کو فساد و ہلاکت کے لیے آمادہ کیا ہوا ہے اور گویا اُس نے اپنے اِس مقصد کے لیے علامت واضح کر دی ہے۔

[4] "اوبق" کا لفظ "وبق" کے مادّے سے ہے اور ہلاکت کے معنی رکھتا ہے۔ اس بنا پر "أَوْبَقَ" کا مطلب ہلاک کیا ہے۔

www.shiabookspdf.com

"بِحُطَامٍ[1] يَنْتَهِزُهُ[2]، أَوْ مِقْنَبٍ[3] يَقُودُهُ، أَوْ مِنْبَرٍ يَفْرَعُهُ[4]۔"

"(اُن کا ہدف یہ ہے کہ) دُنیا کے مال میں سے کچھ حاصل کرلیں یا کسی گروہ کی فرمانروائی کرسکیں یا کسی منبر پر بیٹھ جائیں۔" (اورلوگوں کی پیشوائی کالباس پہن کراُن کے لیے جھوٹے خطبے پڑھیں)

اور یوں مولائے کائنات اِن مختصر جملوں کے ذریعے اُن کے ظاہری اعمال کوبھی بیان فرماتے ہیں اوراُن کے باطنی فساداوراُن کے پست اور بُرے اہداف کی بھی نشاندہی فرمارہے ہیں۔درحقیقت ایسے لوگ اپنی تمام ترکوششوں کو اِس پر صرف کرتے ہیں کہ وہ قارون یافرعون یاسامری بن سکیں۔

جنگ جمل وجنگ صفین کی آگ بھڑکانے والے افراداس گروہ کی زندہ مثال ہیں۔بعض نے مال کے لیے،بعض نے مقام وقدرت کے حصول کے لیےاوربعض نے مقامِ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر قبضہ کرنے کے لیےاتنے شروفساداورتباہی میں ہاتھ میلے کرلیے۔

پھرامامؑ نے ان کے انجام کے نکتے پراشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

"وَلَبِئْسَ الْمَتْجَرُ أَنْ تَرَى الدُّنْيَا لِنَفْسِكَ ثَمَناً، وَمِمَّا لَكَ عِنْدَ اللهِ عِوَضاً!"

"کتنی بُری تجارت ہے یہ جوتونے اپنے لیے کی ہے دُنیا کواپنی قیمت سمجھتے ہواوراسے اپنی اُس جزا کے بدلے بیچ دیتے ہو۔" (جس کا خدانےتم سے وعدہ کیا ہے)

ظاہری بات ہے کہ یہ اہل شروفساد کے گروہ جومال ومقام کے حصول کے لیے ہاتھ پاؤں مارتے ہیں،نہ قانونِ خدا کوسہی طور پرجانتے ہیں اورنہ ہی اپنے ضمیر کی آواز پرکان دھرتے ہیں اورنہ ہی عقل کے فرامین کے آگے تسلیم ہوتے ہیں۔وہ لوگ اِن گرانقدرسرمایوں کا بخس اورتھوڑی رقم سے تبادلہ کرتے ہیں اوراپنے دین وایمان کواس دنیا کی نہ رہنے والی متاع کے بدلے بیچ دیتے ہیں،جیسا کہ قرآن ایسےلوگوں کے بارے میں مثال دیتاہے:

---

[1] "حُطام" کالفظ غلا کے وزن پر ہےاورٹوٹے ہوئے اور بےاَرزش کے معنی رکھتاہےاوردُنیا کے مال ومتاع کواُن کے بےاَرزش ہونے کی خاطر حُطام دنیا کہاجاتاہے۔

[2] "ینتھز" کالفظ نھز کے مادّے سے ہےاورکسی کام کے انجام دینے کے لیے کی جانی والی حرکت کے معنی میں آتاہےاوریہاں کسی غنیمت کے حصول کے لیے کی جانے والی حرکت کے معنی میں استعمال ہواہے۔

[3] "مِقْنَب" کالفظ مِنبر کے وزن پر ہےاوردراصل گھوڑوں کے ریوڑ کے معنی میں ہے،اوراوپر کے خطبے میں لوگوں کے گروہ کے معنی میں آیاہے۔شاید مقنب کی تعبیر سےمُراداُس گروہ کی بےخبری ہو۔

[4] "یفرع" کالفظ "فرع" کے مادّے سے ہےاورکسی شئی کے بالائی حصّے کے معنی رکھتاہے۔اوراوپر کی عبارت میں منبر کےاوپر چڑھنے اورعوام کے مُخل ارشاد پرلگانے کے معنی میں آیاہے۔

www.shiabookspdf.com

"أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَىٰ فَمَا رَبِحَت تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ." [۱]

"یہ وہ لوگ ہیں کہ جنہوں نے ہدایت کو گمراہی کے بدلے بیچ ڈالا اور اُن کی یہ تجارت اُنہیں کوئی نفع نہ دے سکی اور انہوں نے ہدایت نہیں پائی۔"

یہ سب ایسی صورت میں ہوا ہے کہ انسان کے وجود کے سرمائے اِس قدر گراں قیمت تھے کہ اگر اُنہیں سوائے رضائے اِلٰہی اور بہشت جاوداں کے اور کسی بھی شے کے بدلے بیچا جاتا تو یقیناً خسارہ ہی ہوتا، جیسا کہ قرآن نے خود مولائے کائناتؑ کی شان میں فرمایا ہے:

"وَمِنَ النَّاسِ مَن يَشْرِي نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ وَاللَّهُ رَءُوفٌ بِالْعِبَادِ." [۲]

"لوگوں میں بہت سے (ایماندار اور فداکار افراد) ایسے ہیں جو (جیسے کہ لَيْلَةُ الْمَبِيت میں علیؑ نے) اپنی جان کو خدا کی خوشنودی کے لیے بیچ دیتے ہیں اور خدا اپنے بندوں کے ساتھ مہربان ہے۔"

حضرتؑ کے کلماتِ قصار میں سے ایک میں پڑھتے ہیں کہ آپؑ نے فرمایا:

"إِنَّهُ لَيْسَ لِأَنْفُسِكُمْ ثَمَنٌ إِلَّا الْجَنَّةَ فَلَا تَبِيعُوهَا إِلَّا بِهَا." [۳]

"بے شک تمہاری جانوں کی قیمت سوائے جنت کے اور کچھ نہیں، پس اِنہیں اُس سے کم قیمت میں نہ بیچنا۔"

پھر حضرت تیسرے گروہ (جو کہ دھوکے بازوں کا گروہ ہے) اور اُن کی صفات کو نہایت دقیق انداز میں بیان فرماتے ہیں:

"وَمِنْهُمْ مَنْ يَطْلُبُ الدُّنْيَا بِعَمَلِ الْآخِرَةِ وَلَا يَطْلُبُ الْآخِرَةَ بِعَمَلِ الدُّنْيَا."

"لوگوں کا ایک اور گروہ وہ لوگ ہیں کہ جو اعمالِ آخرت کے بدلے دُنیا کا مطالبہ کرتے ہیں اور آخرت کو دُنیا میں کیے گئے اعمال کے بدلے میں طلب نہیں کرتے۔"

درحقیقت اُن کا ہدف بھی وہی ہوتا ہے جو دوسرے گروہ کا تھا۔ صرف فرق یہ ہے کہ وہ لوگ دُنیا کے بے اَرزش مال و متاع کو زور زبردستی اور ظلم و جُور سے حاصل کرتے ہیں اور یہ لوگ ڈرامے بازی خودنمائی اور فریب کے ذریعے سے حاصل کرتے ہیں۔

---

[۱] سورۂ بقرہ، آیت نمبر ۱۶

[۲] سورۂ بقرہ، آیت نمبر ۲۰۷

[۳] غرر الحکم، فصل ۶، حکمت ۱۴

www.shiabookspdf.com

اگر چہ یہ دونوں گروہ گمراہ ظالم اور دُنیا پرست ہیں، مگر شاید اس گروہ کی حالت پچھلے گروہ حال سے کچھ جہات سے بدتر ہو، کیونکہ انہوں نے اِلٰہی دین کو اپنی دنیا کا سرمایہ بنالیا ہے اور اپنے اِس عمل سے لوگوں کی دُنیا کو بھی خراب کرتے ہیں اور دین کو بھی پھر حضرتؑ اِن کے حالات کی تشبیہ فرماتے ہیں، جسے آپؑ نے پانچ جملوں میں بیان فرمایا ہے:

" قَدْ طَامَنَ[1] مِنْ شَخْصِهِ، وَ قَارَبَ مِنْ خَطْوِهِ، وَ شَمَّرَ[2] مِنْ ثَوْبِهِ، وَ زَخْرَفَ مِنْ نَفْسِهِ لِلْاَمَانَةِ، وَ اتَّخَذَ سِتْرَ اللهِ ذَرِيعَةً إِلَى الْمَعْصِيَةِ۔"

"اپنے آپ کو تواضع کرنے والا ظاہر کرتے ہیں، چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتے ہیں، (اور یوں اپنے آپ کو باوقار ظاہر کرتے ہیں) اور اپنا دامن (ظاہراً دُنیا کی آلودگیوں سے بچانے کے لیے) سمیٹتے ہیں اور اپنے آپ کو اَمانت داروں کے زیور سے آراستہ کرتے ہیں (اور ایک جملے میں) خدا کی ستاریت کو معصیت کا وسیلہ قرار دیتے ہیں۔"

جی ہاں، ایک متواضع انداز اور ایک جھوٹا وقار اور اطمینان وسکون رکھتا ہے اور دُنیا سے اور جو کچھ دنیا میں ہے اس سے ظاہراً بے اعتنائی دکھاتا ہے، اپنے آپ کو صالحین کا رنگ دے رکھا ہے اور خدا کے سَتَّارُ الْعُيُوبْ ہونے کا غلط فائدہ اُٹھاتا ہے اور معاصی اور نافرمانیوں کی راہ میں قدم اُٹھاتا رہتا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ گروہ ظاہراً خدا اور روزِ قیامت پر ایمان بھی رکھتا ہو، مگر یقیناً اِن دو اہم اصلوں پر ایمان، ان کے وجود کی گہرائیوں میں نفوذ نہ کر پایا ہوگا۔ ورنہ یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ لوگ اس قدر قیمتی دولت کو اتنی ہلکی اور بے قیمت چیز کے بدلے بیچ دیں؟ اس وجہ سے اَحادیث میں آیا ہے کہ ریا کاروں کو قیامت کے دِن (جب پردے اُٹھا دیے جائیں گے اور اصلی چہرے سامنے آجائیں گے) اُنہیں (اے کافر! اے فاجر! اے عہد شکن! اے خسارہ اُٹھانے والے) کے ناموں سے پُکارا جائے گا۔ اور اُنہیں کہا جائے گا:

" حَبِطَ عَمَلُكَ وَ بَطَلَ أَجْرُكَ فَلَا خَلَاصَ لَكَ الْيَوْمَ فَالْتَمِسْ أَجْرَكَ مِمَّنْ كُنْتَ تَعْمَلُ لَهُ "

"تمہارے اعمال برباد ہوگئے اور تمہارا اجر وثواب کچھ نہیں اور آج تمہارے لیے کوئی راہِ نجات باقی نہیں رہی۔ جاؤ اپنے اعمال کا اُجر اُس سے لو، جس کے لیے تم یہ اعمال بجالاتے تھے۔"[3]

بے شک یہ گروہ، دوسرے گروہوں کی طرح صرف مولا علیؑ کے دور میں ہی نہ تھا، بلکہ ہمیشہ اور ہر معاشرے میں تھا اور ہے اور اِس گروہ سے لوگوں کے دین ودُنیا کو، دوسرے گروہوں کی نسبت زیادہ خطرہ درپیش ہے۔ اِسی لیے حق کی پیروی

---

[1] "طَامَنَ" اور اطمینان ایک ہی مادّے سے ہیں اور دراصل آرام وسکون کے معنی میں ہیں اور اوپر کی عبارت میں ظاہری تواضع اور وقار کے معنی میں آیا ہے۔

[2] "شَمَّرَ" کا لفظ "شمر" کے مادے سے اور جمع کرنے اور سمیٹنے کے معنی میں ہے۔

[3] وسائل الشیعۃ۔ جلد ۱، صفحہ ۵۱

www.shiabookspdf.com

کرنے والوں کو اِن سے ہوشیار رہنا چاہیے اور اُن کے جال میں پھنسنا نہیں چاہیے۔

خوشی کی بات تو یہ ہے کہ ان جیسے لوگوں میں سے بہت سے اَفراد عملی طور پر اپنے آپ کو رسوا کر دیتے ہیں اور جب دین اور دُنیا کے دوراہے پر پہنچتے ہیں تو فوراً دنیا کو اختیار کر لیتے ہیں اور خدا کے دین سے دور ہو جاتے ہیں اور مخلوق کی رضا حاصل کرنے کے لیے خداوند عالم کی ناراضی اور غضب مول لیتے ہیں، تا کہ دُنیا سے کچھ وقتی فائدہ اُٹھا سکیں۔ اُن کے افکار محدود، ہمتیں کم، روح آلودہ اور باطن پلید ہوتا ہے اور ہمیشہ شخصیت کی دورُوئی اور نفاق کے حامل ہوتے ہیں۔

اس موضوع کو آگے بڑھاتے ہوئے مولاؑ چوتھے گروہ کی جانب قدم بڑھاتے ہیں، جو کہ وہی جھوٹے زہد و پارسائی کا ڈرامہ رچانے والوں کا گروہ ہے اور فرماتے ہیں:

"وَمِنْهُمْ مَنْ أَقْعَدَهُ عَنْ طَلَبِ الْمُلْكِ ضُؤُولَةُ [۱] نَفْسِهِ، وَانْقِطَاعُ سَبَبِهِ فَقَصَرَتْهُ الْحَالُ عَلَى حَالِهِ، فَتَحَلَّى بِاسْمِ الْقَنَاعَةِ، وَتَزَيَّنَ بِلِبَاسِ أَهْلِ الزَّهَادَةِ، وَلَيْسَ مِنْ ذٰلِكَ فِي مَرَاحٍ [۲] وَلَا مَغْدًى." [۳]

"اُن میں سے ایک گروہ ایسا ہے کہ جنہیں حقارت، ناتوانی اور ضروری وسائل کے نہ ہونے نے بلند مرتبہ و مقام تک پہنچنے سے روک دیا ہے۔ (جبکہ وہ دوسرے فاسدوں اور مفسدوں سے کچھ کم نہیں ہیں، مگر ہرگز اپنی اس ناتوانی اور اندرونی ضعف کا اعتراف نہیں کرتے) انہوں نے خود کو قناعت کے زیور سے آراستہ کیا ہوا ہے اور اہل زہد کا لباس زیب تن کیا ہوا ہے، جبکہ وہ لوگ کبھی بھی نہ دن میں اور نہ ہی رات میں سچے اور پارسا افراد کی صف میں تھے۔"

دوسرے لفظوں میں یوں کہیں کہ وہ لوگ ایسے ضعیف اور کمزور افراد ہیں جو اپنی ناتوانی کو زہد و قناعت کے جھوٹے پردے سے چھپاتے ہیں اور اپنے نقطۂ ضعف کو نقطۂ قوت کے عنوان سے دِکھاتے ہیں، جبکہ اُنہوں نے پارسائی اور قناعت کی بُو بھی نہیں پائی ہے اور اپنے باطن میں نہایت دنیا پرست اور شکست کھائے ہوئے ہیں۔ البتہ یہ گروہ دو اقسام پر مشتمل ہے۔ کبھی تو لوگوں کو فریب دینے کے لیے اور اپنے آپ کو بھی دھوکا دے بیٹھتے ہیں اور رفتہ رفتہ یہ یقین بھی کر لیتے ہیں کہ ہاں وہ پارسا اور زاہد ہیں، نہ کہ ضعیف و ناتواں۔

مَراح اور مغدی کے الفاظ بہت سے اَرباب لغت اور مفسرین نہج البلاغہ کے بقول، اسم مکان ہیں اور چوپایوں کے شب و روز گزارنے کی جگہ کے معنی میں ہیں، مگر بعض حضرات اِن دونوں کو اسم زمان کہتے ہیں اور شب و روز میں آمد و رفت

---

[۱] "ضُؤُوْلَة" کا لفظ ضعف و ناتوانی کے معنی میں آیا ہے۔

[۲] "مراح" کا لفظ روح کے مادے سے ہے اور اس کا مطلب آمد و رفت کی جگہ یا آمد و رفت کا وقت ہے۔

[۳] "مغدی" کا لفظ "غدو" کے مادے سے ہے اور اس کا مطلب ہے وہ جگہ اور وہ وقت کہ جب اور جہاں سے صبح کو چوپائے باہر جاتے ہیں۔ اور بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ مغدی سے مراد دن میں جانوروں کی جگہ کو کہتے ہیں، جس کے بالمقابل مراح کا لفظ ہے یعنی جانوروں کی رات کو سونے کی جگہ۔

www.shiabookspdf.com

کے وقت کے معنی مراد لیتے ہیں۔ بہرصورت اِن لوگوں کے حال کو بیان کرنے کے لیے اِن لفظوں کا چناؤ، اُن کی حماقت کی جانب ایک لطیف اشارہ ہے۔ وہ لوگ کمزوریوں کو اپنی اور دوسروں کی نظروں میں قوت اور قدرت دکھا رہے ہیں اور دنیا پرستی کو زُہد و پارسائی کے طور پر دکھا رہے ہیں۔

چوتھے اور پہلے گروہ کے درمیان ایک زاویے کے مطابق اور چوتھے اور تیسرے گروہ کے درمیان دوسرے زاویے سے کیا فرق ہے، اِس پر مختلف باتیں ہیں۔ جو سب سے زیادہ مناسب نظر آتی ہے وہ یہ کہ پہلا گروہ ایسے دُنیا پرست افراد کا گروہ ہے جو ضعف و ناتوانی اور ناکافی وسائل کے باعث گوشہ نشینی اختیار کیے بیٹھے ہیں اور کسی جاہ و منزلت کے پیچھے نہیں جاتے، لیکن وہ اِس بات پر مصر بھی نہیں ہیں کہ اپنی کمزوریوں کو قوت بنا کر جھوٹا ڈرامہ رچائیں، جبکہ چوتھا گروہ اپنی اس ناتوانی اور کمزوری کو معاشرے میں عزّت و شرف کمانے کا ذریعہ بنا کے اِس کمزوری کو زُھد اور قناعت کی صورت میں دکھاتا ہے اور پرسکون اور قناعت کی زندگی بسر کرنے کو ایسا خزانہ کہتا ہے کہ جو سلاطین کے لیے تلوار کے زور پر بھی میسر نہیں ہے۔ مگر چوتھے گروہ اور تیسرے گروہ کے درمیان یہ فرق ہے کہ تیسرا گروہ ریاکاری کے ذریعے سے اپنے آپ کو کسی نہ کسی مقام تک پہنچا لیتا ہے اور دھوکے بازی کے ذریعے سے اپنے غیر شرعی مقاصد کو پالیتا ہے اور دوسری تعبیر کے مطابق مالِ دُنیا سے جس چیز کو ظالم اور سفاک حضرات اپنے ظلم و جور کے زور پر حاصل کر لیتے ہیں، یہ لوگ اُن چیزوں کو ریاکاری اور دھوکے کے ذریعے حاصل کر لیتے ہیں۔ اپنے دین کو دنیا کے بدلے بیچ دیتے ہیں اور مال و متاعِ دُنیا کو دین فروشی کی قیمت پر حاصل کر لیتے ہیں، جبکہ چوتھا گروہ، کسی بھی جاہ و مقام پر فائز نہیں ہوتا! مگر اُنہوں نے اپنے آپ کو یہ تسلی دے رکھی ہے کہ لوگ انہیں قناعت کرنے والوں اور زاہدوں میں سے شمار کرتے ہیں۔

البتہ پہلے گروہ اور چوتھے گروہ میں ایک چیز مشترک اور ملتی جلتی پائی جاتی ہے اور وہ یہ کہ اگر ظلم و فساد کے لیے کوئی میدان اُنہیں مل جائے تو یہ دوسرے دو گروہوں سے کچھ کم بھی نہیں ہیں۔

نکتہ

یہ چاروں خطرناک گروہ ہر معاشرے میں پائے جاتے ہیں

امام عالی مقامؑ نے ان چار گروہوں کے متعلق مندرجہ بالا بیان میں ایسی دادِ سخن دی ہے جو حق پر مبنی ہے اور ولایت کی سچی پیروی کرنے والوں کو اِن چار گروہوں (بے دست و پا مفسدین، جابر ظالمین، ریاکاری کرنے والے دُنیا پرست،

www.shiabookspdf.com

جھوٹے زاہد حضرات) کی جانب سے اُن کی طرف اور انسانی معاشرے کی طرف توجہ دلائی اور اُن میں سے ہر ایک کی نشانیاں بھی گنوائی ہیں اور اُن کی رُوحانی اور جسمانی خصوصیات کا ذکر فرمایا ہے تاکہ یہ افراد اور گروہ اِن علامات سے پہچانے جائیں اور اہلِ ایمان اُن کے جال میں گرفتار نہ ہوجائیں۔

یہ چاروں گروہ، تباہی، فاسد عقائد، دُنیا و مافیہا اور جاہ و مقام کی خواہش کے معاملے میں مشترک ہیں۔ اُن میں موجود فرق صرف اُن کے بچھائے ہوئے جال اور اُن کے اَسبابِ شر و فساد کے فراہم ہونے اور اس مقصد تک پہنچنے کے مقدمات کی کیفیت کے گرد و نواح میں ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہیے کہ اِن چار گروہوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے: ایک حصہ اُن گروہوں پر مشتمل ہے کہ جو اپنے غیر شرعی مقاصد کو پہنچ جاتے ہیں، بس فرق یہ ہے کہ ان میں سے کچھ زور زبردستی سے اور کچھ دھوکے بازی کے ذریعے اور کچھ ریاکاری کے ذریعے سے پہنچتے ہیں۔

مگر دوسرا حصہ اپنے مقاصد یعنی دُنیا و مال و مقام دُنیا تک نہیں پہنچ پاتے بس فرق یہ ہے کہ ان میں سے کچھ افراد اِس ناکامی کے چہرے پر زُہد و قناعت کی نقاب ڈال دیتے ہیں اور کچھ دوسرے افراد ہیں جو اِس طرح کا کوئی اِقدام بھی نہیں کرتے۔

اگر تاریخ کا بغور جائزہ لیں تو ہمیں نظر آئے گا کہ ہر دَور اور ہر زمانے میں یہ چاروں گروہ موجود تھے اور ہیں، ہر چند کہ اِنسانی معاشروں کی پیشرفت کے ساتھ ساتھ اِن کے جال اور چالوں میں پیچ و خم آتے رہیں گے۔ افسوس کی بات تو یہ ہے کہ اسلامی معاشرہ بھی اِس بات سے مستثنیٰ نہیں ہے اور اِن چار گروہوں کی تباہی کی آگ میں جل رہا ہے اور جو لوگ اِن سے آگاہ نہیں وہ آج اِن کے جال میں پھنسے ہوئے ہیں اور فریاد کر رہے ہیں۔

اگر حق کی پیروی کرنے والے مولائے کائنات کے اِس مقام پر دیے گئے تذکرات کو دقیق انداز میں سمجھیں اور پرکھیں اور ضروری آگاہی کو معاشرے کے پاک دل افراد کے سپرد کریں اور ان چاروں گروہوں کی سازشوں کو سرِعام آشکار کرنے کی مد میں اپنی تمام تر کوششیں صرف کریں تو یقیناً اُن کا خطرہ خاطر خواہ حد تک کم ہوجائے گا۔

تیسرا حصہ

وَبَقِيَ رِجَالٌ غَضَّ اَبْصَارَهُمْ ذِكْرُ الْمَرْجِعِ وَاَرَاقَ دُمُوعَهُمْ خَوْفُ الْمَحْشَرِ فَهُمْ بَيْنَ شَرِيدٍ نَادٍّ وَخَائِفٍ مَقْمُوعٍ وَسَاكِتٍ مَكْعُومٍ وَدَاعٍ مُخْلِصٍ وَثَكْلَانَ مُوجَعٍ قَدْ اَخْمَلَتْهُمُ التَّقِيَّةُ وَشَمِلَتْهُمُ الذِّلَّةُ فَهُمْ فِي بَحْرٍ اُجَاجٍ اَفْوَاهُهُمْ ضَامِزَةٌ وَقُلُوبُهُمْ قَرِحَةٌ قَدْ وَعَظُوا حَتَّى مَلُّوا وَقُهِرُوا حَتَّى ذَلُّوا وَ

www.shiabookspdf.com

قُتِلُوْا حَتّٰى قَلُّوْا.

"(اس بیچ میں) ایک ایسا گروہ باقی رہ گیا ہے کہ قیامت کی یاد نے جن کی آنکھوں کو جھکا رکھا ہے اور محشر کے خوف سے اُن کے آنسو جاری ہیں۔ وہ لوگ (حق گوئی اور حق جوئی) کی وجہ سے یا تو معاشرے سے نکال دیے گئے ہیں، یا پھر خوف کے مارے تنہائی اور گوشہ نشینی اختیار کر بیٹھے ہیں اور اُنہوں نے اپنے منہ پر خاموشی کی مہر لگا دی ہے (کیونکہ اُنہیں حق کو درک کرنے کے لیے کوئی سننے والے کان اور بیدار دل نہیں ملتے) یا مخلصانہ طور پر (بعض دلوں میں اثر ہو جانے کی اُمید پر) خدا کی جانب بلاتے ہیں، یا پھر روتی ہوئی آنکھوں اور درد سے تڑپتے ہوئے دِل سے (اُن فساد سے بھر پور مناظر کو جنھیں یہ بدلنے پر قادر نہیں ہیں) دیکھتے ہیں۔ تقیے نے اُنہیں گوشہ نشین بنا دیا اور خاص و عام کے ذہنوں سے بُھلا دیا، (یار و یاور کے نہ ہونے کی وجہ سے) ناتوانی اور ذِلّت نے اُن کے وجود کا اِحاطہ کر لیا۔ وہ لوگ گویا کسی ایسے شخص کی مانند ہیں کہ جو نمک کے دریا میں گر گیا ہو کہ وہ جتنی بھی حرکت کرے، اُس کی جلن کا باعث ہو گا اُن کے منہ بند اور دل مجروح ہیں۔ اُنہوں نے اِس قدر نصیحت کی ہے کہ وہ تھک گئے ہیں اور اِن پر اتنا دباؤ ڈالا گیا ہے کہ وہ ناتواں ہو گئے ہیں اور (اس لڑائی کے میدان میں) اُنہوں نے اتنے مقتول دیے ہیں کہ اُن کی تعداد گھٹ گئی ہے۔"

شرح وتفسیر

پانچواں گروہ: الٰہی بندے

مولاؑ نے دُنیا پرست گنہگاروں کے چار قسم کے گروہوں کے ذکر کے بعد ایک پانچویں گروہ کا تذکرہ فرمایا ہے کہ جو اولیاء اللہ اور حق کے سپاہیوں اور اللہ کے لیے جینے والے مَردوں کا گروہ ہے، جو کہ سب سے افضل اور ممتاز افراد ہیں اور جو اُن معاشروں میں دُھتکار دیے جاتے ہیں جہاں پچھلے چار گروہوں نے اپنی سازشوں کے جال پھیلائے ہوئے ہیں۔

حضرتؑ اُن کے مقام کی عظمت کی خاطر اُنہیں رِجال کے لفظ کے ساتھ ذکر فرما رہے ہیں، جب کہ پچھلے چار گروہوں کا ناس کے لفظ سے تذکرہ کیا ہے۔ امام ان افراد کو ایک ترقی یافتہ اِلٰہی معاشرے کا محور جانتے ہیں اور اپنے ساتھیوں کو اِس جانب تشویق دلا رہے ہیں کہ اِن افراد کے زُمرے میں شامل ہو جائیں۔ حضرتؑ پہلے تو اُن کی توصیف میں فرماتے ہیں:

"وَبَقِيَ رِجَالٌ غَضَّ أَبْصَارَهُمْ ذِكْرُ الْمَرْجِعِ وَأَرَاقَ دُمُوعَهُمْ خَوْفُ الْمَحْشَرِ"

www.shiabookspdf.com

" (اس درمیان) ایک ایسا گروہ باقی رہ گیا ہے کہ قیامت کی یاد نے اُن کی نظروں کو جھکائے رکھا ہے اور محشر کی عدالت کے خوف نے اُن کے آنسو جاری کر دیے ہیں"

یہاں پر غَضَّ أَبْصَارَهُم کی تعبیر سے مراد اس کے لفظی معنی، یعنی آنکھ بند کر لینا نہیں ہے بلکہ نظروں کو جھکا لینا اور نگاہوں کی مراقبت مراد ہے وہ حالت جو کہ کچھ وحشت ناک مناظر دیکھنے کے بعد اِنسان پر طاری ہو جاتی ہے، ایسے کہ پھر انسان دوبارہ اُس خوفناک منظر کو دیکھنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔

اِس طرح سے اُن لوگوں کی پہلی توصیف یہ ہے کہ وہ خدا اور روزِ قیامت کے حوالے سے احساس ذمے داری رکھتے ہیں، ایک ایسا طاقت ور احساس جو کہ دل کو ہلا دیتا ہے اور آنسوؤں کو جاری کر دیتا ہے۔

بہ تحقیق جو لوگ اُس دن سے اور روزِ قیامت پر قوی ایمان رکھتے ہیں، وہ کسی چیز کو اُس سے زیادہ وحشت ناک نہیں دیکھتے، جس دن پردے ہٹ جائیں گے اور تمام راز آشکار ہو جائیں گے اور انسان کی تمام عمر کے اعمال لوگوں کے سامنے تولے جائیں گے۔

نہج البلاغہ کے بعض شارحین [۱] کا کہنا ہے کہ اوپر کے جملے میں مَرجِع کے لفظ سے مراد قبر اور محشر سے مراد قیامت ہے، مگر اس بات کو دیکھتے ہوئے کہ قرآنی تعبیرات میں یہ دونوں الفاظ، قیامت کے معنی میں استعمال ہوئے ہیں، یہ پتا چلتا ہے کہ یہ الفاظ کا فرق اس لیے ہے کہ ایک لفظ دو دفعہ تکرار نہ ہو نہ یہ کہ معنی میں فرق کے لیے تکرار ہوا ہو۔ دَرحقیقت یہ تعبیرات اِس آیتِ مبارکہ سے اقتباس شدہ ہیں:

"رِجَالٌ ۙ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ ۙ يَخَافُوْنَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيْهِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ ۝"

"وہ لوگ کہ جنہیں کوئی بھی تجارت نماز قائم کرنے اور زکوۃ ادا کرنے سے غافل نہیں کرتی، وہ لوگ اُس دن سے ڈرتے ہیں کہ جس میں دِل اور آنکھیں منقلب ہو جائیں گی۔" [۲]

پھر حضرتؑ اِس گروہ کے الگ الگ انجام پر گفتگو فرما رہے ہے جو کہ اُنہی معاشروں میں رہتے ہوئے ہوگی، جن میں مذکورہ پچھلے چار گروہ حاکم ہیں۔ اُن میں سے ہر ایک اِن پانچ انجاموں میں سے ایک سے دوچار ہوگا:

---

[۱] فی ظلال نہج البلاغہ، اس جملے کے ذیل میں۔

[۲] سورۂ نور، آیت ۳۸

www.shiabookspdf.com

"فَهُمْ بَيْنَ شَرِيدٍ [۱] وَ خَائِفٍ مَقْمُوعٍ [۲] وَ سَاكِتٍ مَكْعُومٍ [۳] وَدَاعٍ مُخْلِصٍ وَثَكْلَانَ [۴] مُوجَعٍ"

"وہ لوگ حق گوئی اور حق جوئی کی وجہ سے یا تو معاشرے سے نکال دیئے گئے ہیں، یا پھر خوفزدہ ہو کر گوشہ نشینی اختیار کر بیٹھے ہیں اور خاموش ہیں اور اپنے مُنہ پر سکوت کی مہر لگا چکے ہیں، کیونکہ اُنہیں کوئی ایسا بیدار دِل یا سننے والے کان نہیں ملتے جو اُن کے پکارنے پر لبیک کہیں، یا مخلصانہ طور پر (بعض دِلوں میں تاثیر کی اُمید پر) خدا کی طرف بُلاتے ہیں یا پھر روتی ہوئی آنکھوں اور پُردرد دل کے ساتھ ان فساد سے بھرپور مناظر کو دیکھتے ہیں، جنہیں بدلنے پر یہ قادر نہیں ہیں۔"

اس بات کے پیش نظر، کہ "شَرِید" بھاگے ہوئے اور آوارۂ دیار شخص کے لیے استعمال ہوتا ہے اور "نَادّ" کا لفظ "نَدّ" کے مادّے سے ہے اور کسی گروہ سے بھاگ جانے اور تنہائی اور انفرادیت کو اپنانے کے معنی میں آیا ہے۔ [۵] لہٰذا اوپر کے جملے اس مقصد کی جانب رہنمائی کر رہے ہیں کہ یہ لوگ معاشرے اور دِیار سے نکال دیئے جانے کے بعد اور آوارۂ وطن ہونے کے بعد بھی ایک دوسرے کے ساتھ نہیں ہیں، بلکہ ہر ایک کو ایک گوشے میں پھینک دیا گیا ہے، کیونکہ دنیا پرست لوگ اِن جیسے رجال اللہ کے آپس میں ملنے سے شدید ڈرتے ہیں۔

اور "خَائِفٍ مَقْمُوعٍ" کی تعبیر اِس بات کو دیکھتے ہوئے کہ "مقموع" کا لفظ "قمع" کے مادّے سے آیا ہے اور اس کا مطلب ہے قہر و غلبہ، یا جڑ سے اُکھاڑ دینا۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ دُنیا پرستوں کا حاکم طبقہ صرف اسی بات پر اکتفا نہیں کرتا کہ اُنہیں دھمکا دیا جائے، بلکہ اُن کی کوشش یہی رہتی ہے کہ ان پر مستقل دباؤ ڈالتے رہیں یا اِن کی جڑوں کو اُکھاڑ پھینکیں۔

"سَاكِتٍ مَكْعُومٍ" کی تعبیر، اِس بات کے پیش نظر کہ "مَكْعُوم" کا لفظ "کعم" کے مادّے سے ہے اور کَعْب کے وزن پر ہے، اِس کا مطلب اُونٹ کا منہ بند کر دینا ہے، اس بات کی طرف اِشارہ کر رہا ہے کہ یہ ظالم اور ستم پیشہ

---

[۱] "شرید" کا لفظ شرد کے مادّے سے آیا ہے اور اس کا مطلب ہے اونٹ کا بھاگ جانا اور پھر یہ لفظ اُن تمام لوگوں کے لیے استعمال ہونے لگا جو کسی قوم سے فرار کر گئے ہوں۔

[۲] "مقموع" کا لفظ قمع کے مادّے سے ہے اور مقہور و مغلوب کے معنی رکھتا ہے اور کبھی کبھار جڑیں کاٹ دینے کے معنی میں بھی آتا ہے۔

[۳] "مکعوم" کا لفظ "کعم" کے مادے سے ہے اور اونٹ کا منہ بند کرنے کے معنی میں آیا ہے۔ بعد میں یہ لفظ عام ہو گیا اور ہر اس شخص کو مکعوم کہا جاتا ہے جسے دلیل کے ذریعے خاموش کر دیا جائے۔

[۴] "ثکلان" اصل میں عزیزوں کے کھو دینے کے معنی میں استعمال ہوا کرتا ہے، اور کیونکہ ایسی حالت میں انسان سوگوار اور عزادار ہو جاتا ہے، لہٰذا ثکلان کا لفظ رونے والے اور سوگوار شخص کے لیے استعمال ہوا ہے۔

[۵] شرح نہج البلاغہ محمد عبدہ اور شرح علامہ خُوئی اور شرح ابن ابی الحدید کی مندرجہ ذیل جملے کی بحث میں۔

www.shiabookspdf.com

افراد، ہرگز اِس گروہ کے خاموش ہونے پر فاتح نہیں ہیں، بلکہ اُن کی کوشش یہ ہے کہ اُن کے منہ بند کر کے اُن پر مہر لگا دیں۔

"دَاعٍ مُخْلِصٍ" کی تعبیر سے مُراد اِس بات کی وضاحت ہے کہ اِن لوگوں کا عوام کو خدا کی طرف پکارنا کسی جاہ و منزلت یا دولت و اقتدار کا حصول نہیں ہے، بلکہ ان کی طلب سوائے رضائے الٰہی کے اور کچھ نہیں ہے۔

اِس جملے کی تفسیر میں ایک اور احتمال بھی دیا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ "دَاعٍ مُخْلِصٍ" سے مراد وہ شخص ہے جو خلوص کے ساتھ بارگاہِ الٰہی میں معاشرے کی فلاح و بہبود کے لیے مستقل دعا کر رہا ہے، بالآخر "ثَكْلَانَ مُوجَعٍ" کی تعبیر سے مُراد، اِس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ "ثَكْلَانَ" کا مطلب مصیبت زدہ انسان ہے اور "مُوْجَعٍ" کا مطلب ہے وہ شخص جو تکلیف میں ہو، یہ ہے کہ وہ لوگ صرف ظاہر میں نہیں رو رہے، بلکہ وہ اَندر سے بھی جل رہے ہیں اور درد سہہ رہے ہیں۔

پھر حضرتؑ اِس گروہ کے کچھ اور اوصاف کے بیان میں لب کشا ہوئے ہیں اور نہایت مختصر اور معانی سے لبریز اور تاسف انگیز عبارات میں اِس جیسے معاشرے میں اِن لوگوں کے حالات کی تشریح فرماتے ہیں:

"قَدْ أَخْمَلَتْهُمُ [1] التَّقِيَّةُ"

"تقیے نے اُنہیں بھلا دیا ہے۔"

اگرچہ وہ لوگ مجاہد اور دلیر ہیں، مگر جہاں چلّانے کا کوئی اثر نہیں سوائے طاقتوں کے گنوانے کے، تو ایسی صورت میں تقیّے کا سہارا لینے کے علاوہ اور کوئی چارۂ کار نہیں ہوتا۔ ایسا تقیہ جس نے بالآخر اُنہیں گویا بھلا دیا اور دشمنوں کی نظر میں ڈرپوک اور دوستوں کی نظر میں بیہودہ اور بے حیثیت بنا دیا، جبکہ اُن کا لڑنا اور اِن جیسے خاص حالات میں تقیہ کرنا، دونوں ہی ان کا فریضہ ہے۔

پھر حضرتؑ فرماتے ہیں:

"وَشَمِلَتْهُمُ الذِّلَّةُ"

"(کسی ساتھی اور مددگار کے نہ ہونے کے باعث ناتوانی) ذلّت نے اِن کے وجود کو گھیر لیا ہے۔"

وہ لوگ خدا کی بارگاہ میں اور بذاتِ خود نہایت عزیز ہیں، مگر اُس معاشرے نے اِنہیں ضعف و ذلّت کی چوکھٹ پر کھڑا کر دیا ہے، جس میں قدریں تہہ و بالا ہو چکی ہیں۔

حضرتؑ اُن کے حال کو یوں بیان کرتے ہیں:

---

[1] "أَخْمَلَ" کا لفظ "خَمل" کے مادّے سے ہے اور ضعف اور چھپنے اور بھلا دیے جانے کے معنی رکھتا ہے۔

www.shiabookspdf.com

"هُمْ فِي بَحْرٍ أُجَاجٍ" [۱]

"وہ لوگ اُن افراد کی مانند ہیں جو نمک کے دریا میں گر گئے ہوں۔" (کہ جس میں ہلکی سی حرکت بھی اُن کی جلن اور سوزش اور مزید تکلیف کا باعث ہے)

ظاہر ہے کہ جو شخص کسی ایسے دریا میں غوطہ زن ہو اُس کا تمام وجود جلتا ہے اور چاہے جتنا بھی پیاسا ہو جائے، اُس کے پاس پینے کے لیے پانی بھی نہیں ہوتا کہ پی سکے، پس وہ اندر اور باہر دونوں طرف سے جل رہا ہوتا ہے۔ اُن اولیاء اللہ اور صالحین کا یہی حال ہے جو فساد سے بھرے ہوئے ایسے معاشروں میں گرفتار ہو جاتے ہیں جہاں جابر اور ظالم افراد حاکم ہوتے ہیں اور ایسے میں اِن اَولیاء کو کوئی ہمدم اور ساتھی بھی نہیں ملتا جس کے ساتھ مل کر وہ قیام کر سکیں یا چلّا سکیں۔

اِس بات کو آگے بڑھاتے ہوئے مولاؑ فرماتے ہیں:

"أَفْوَاهُهُمْ ضَامِزَةٌ [۲] وَقُلُوبُهُمْ قَرِحَةٌ"

"اُن کے منہ بند ہیں اور دِل مجروح ہیں۔"

بے حس افراد ایسے معاشروں میں ہرگز پریشان نہیں ہوتے، ہاں اُن کی ایک اہم پریشانی ضرور ہوتی ہے اور وہ اُن کے ذاتی مفادات ہوتے ہیں، مگر پاک مجاہد اور صالح افراد کہ جن کے منہ زبردستی بند کر دیے جاتے ہیں، وہ مستقل اَندر سے کُڑھتے ہیں اور اُن کے دِل زخموں سے چور ہوتے ہیں۔ نہج البلاغہ کے بعض شارحین نے "قُلُوبُهُمْ قَرِحَةٌ" کے لفظ سے خوفِ خدا سے مُراد لیے ہیں، [۳] جب کہ کلام کے قرینے سے یہ بات صاف معلوم ہے کہ یہ قلبی اور رُوحی گھاؤ اُس فساد کی خاطر ہیں جس کے خاتمے کی اِن کے پاس قُدرت نہیں ہے، اور اِسی بات پر یہ لوگ گھٹ رہے ہیں۔

ممکن ہے کہ بعض لوگ یہ گمان کریں کہ اِن کی یہ ناتوانی، ضعف اور تقیہ و خاموشی خود اِن کے اپنے کاموں اور غلطیوں کا نتیجہ ہے اور اِن کی غلطی یہ ہے کہ انہوں نے بروقت قیام نہ کیا اور آواز نہ اُٹھائی، لہٰذا امام بندہ شناس نے اِس کلام کے ذیل میں چند جملوں کے ذریعے اِس غلط فہمی کے اِمکان کو مکمل طور پر رفع فرما دیا۔

مولاؑ اِرشاد فرماتے ہیں:

"قَدْ وَعَظُوا حَتَّى مَلُّوا وَقُهِرُوا حَتَّى ذَلُّوا، وَقُتِلُوا حَتَّى قَلُّوا"

---

[۱] "أُجَاج" کا لفظ "اجج" کے مادّے سے ہے اور تلخ اور کھارا ہو جانے کے معنی میں آیا ہے۔

[۲] "ضامزة" کا لفظ "ضمر" کے مادّے سے ہے اور بات چیت سے پرہیز کرنے کے معنی میں ہے۔

[۳] شرح نہج البلاغہ، ابن میثم اور شرح نہج البلاغہ، علامہ خوئی اور فی ظلال محمد جواد مُغنیہ میں اِس عبارت کے ذیل میں۔

www.shiabookspdf.com

"وہ لوگ (پند و نصیحت کے میدان میں) اتنی نصیحتیں کر چکے ہیں کہ تھک گئے ہیں اور اس قدر دباؤ میں ہیں کہ کمزور اور ناتواں ہو گئے ہیں اور لڑائی کے میدان میں انہوں نے اِتنے مقتول دیئے ہیں کہ ان کی تعداد خاصی کم ہو گئی ہے۔"

جی ہاں! اُنہوں نے جہاد کی تمام تر شاخوں کا تجربہ کر لیا اور ہر حربے کو آزما کر دیکھ لیا ہے، دل سے چلا چکے ہیں، منطقی بیانات کے ذریعے وعظ و نصیحت بھی کر چکے ہیں اور مسلح لڑائیوں میں انہوں نے کئی قربانیاں دی ہیں، یہاں تک کہ اپنے بہت سے لوگوں کو گنوا چکے ہیں، کیونکہ ان کے پاس ساتھیوں اور ہمنواؤں کی نایابی تھی اور ان کے اور ان کے حریفِ مقابل کے درمیان کسی طور قوتوں کا توازن برقرار نہ تھا۔ جہاں تک انہیں جیت کی اُمید تھی اور فساد کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کا اِحتمال بھی تھا، وہاں تک یہ لڑے ہیں اور جو تھوڑے بہت رہ گئے اُنہوں نے تقیے کی پناہ لے لی۔

-قُتِلُوْا حَتّٰى قَلُّوْا- کا جملہ یہ معنی نہیں رکھتا کہ وہ سب کے سب مارے گئے، یہاں تک کہ کم ہو گئے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اُن میں سے ایک گروہ شہید ہو گیا اور ایک قلیل سی تعداد پر مشتمل گروہ باقی رہ گیا ہے۔ یہ جملہ جُز کو کُل سے نسبت دینے والی جگہوں میں سے ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اِن گروہوں کی تقسیم بندی کس زمانے سے مربُوط ہے، جبکہ امامؑ نہایت اقتدار اور قوت کے ساتھ اپنے معاشرے پر حکومت فرما رہے تھے؟

اِس سوال کا جواب مولاؑ کے دور کی تاریخ کے مطالعے سے روشن ہو جاتا ہے اور اُن بزرگوار کے کلمات میں بھی آیا ہے کہ معاشرے کا فساد اس حد تک بڑھ گیا تھا کہ نورِ حکومت (امامؑ) کی روشنی فقط کوفہ اور اُس کے گرد و نواح پر ہی محدود ہو کر رہ گئی تھی، اور شام و مصر اور دیگر ایسے علاقوں میں اہلِ شر و فساد اور ظالمین نے ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر اتحاد کر لیا تھا اور معاشرے کے صالح افراد کو معاشرے سے باہر نکال دیا تھا۔

چوتھا حصہ

فَلْتَكُنِ الدُّنْيَا فِيْ اَعْيُنِكُمْ اَصْغَرَ مِنْ حُثَالَةِ الْقَرَظِ وَ قُرَاضَةِ الْجَلَمِ وَ اتَّعِظُوْا بِمَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ قَبْلَ اَنْ يَتَّعِظَ بِكُمْ مَنْ بَعْدَكُمْ وَ ارْفُضُوْهَا ذَمِيْمَةً فَاِنَّهَا قَدْ رَفَضَتْ مَنْ كَانَ اَشْغَفَ بِهَا مِنْكُمْ.

"دنیا تمہاری نظروں میں درختوں کے سوکھے اور مُرجھائے ہوئے پتّوں کی مانند ہونی چاہیے جنہیں دباغی کے لیے استعمال کیا جاتا ہے (جو کہ نہایت بدبُودار اور متعفن اور بے قدر ہوتے ہیں) یا جانوروں کی کھال اور اُون سے بھی زیادہ بے

www.shiabookspdf.com

ارزش ہونی چاہیے کہ جسے وہ زمین پر اُتار کے پھینک دیتے ہیں اور کوئی اس پر توجہ نہیں دیتا اور جو لوگ تم سے پہلے تھے، اُن سے عبرت اور نصیحت لو، قبل اِس کے کہ تمہارے بعد آنے والے تم سے عبرت لیں اور اِس پست اور گری ہوئی دنیا کو چھوڑ دو کیوں کہ جو لوگ تم سے بھی زیادہ اِس کے چاہنے والے تھے، اِس نے اُن کو بھی چھوڑ دیا۔" (اور اِس نے اپنے عاشقوں سے تھوڑی سی بھی وفا نہ کی)

شرح و تفسیر

اپنے سے پہلے لوگوں سے عبرت لو

خطبے کے اس حصّے میں جو کہ خطبے کا آخری حصہ ہے، مولاؑ نہایت مختصر اور معنی خیز جملوں میں ایک آخری نتیجے کے طور پر، اُن پانچ گروہوں کے ذکر کے بعد دُنیا میں زُہد و تقویٰ کی جانب بلا رہے ہیں اور در حقیقت اِس بات پر تاکید فرما رہے ہیں کہ اوپر بیان کیے گئے چار گروہوں کی بدبختی کی اصل وجہ ان کی دنیا پرستی اور دنیا سے بے حساب لگاؤ ہے۔ حضرتؑ پہلے جملے میں فرماتے ہیں:

"فَلْتَكُنِ الدُّنْيَا فِي أَعْيُنِكُمْ أَصْغَرَ مِنْ حُثَالَةِ [۱] الْقَرَظِ وَقُرَاضَةِ [۲] الْجَلَمِ." [۳]

"دنیا کو تمہاری نظروں میں درختوں کے اُس چھال اور کھال سے بھی زیادہ بے وقعت ہونا چاہیے کہ جس کو دباغی میں اِستعمال کیا جاتا ہے (جو کہ بہت بدبودار اور متعفن ہوتا ہے) یا جانوروں کی اُون کو کاٹنے کے بعد اُس کے بچ جانے والے حصوں سے بھی حقیر تر ہونا چاہیے کہ جو زمین پر گر جاتے ہیں اور کوئی بھی انہیں اہمیت نہیں دیتا۔"

اُوپر دی گئی تشبیہات بہت جچی تلی اور دلچسپ ہیں، "قرظ" کا لفظ مرض کے وزن پر ہے اس کا مطلب ہے درختوں کے وہ پتے، جنہیں جانوروں کی کھالوں کی دِباغی کے لیے استعمال کیا جاتا ہے تاکہ کھال کو مزید مضبوط اور زیادہ سے زیادہ استعمال کے لائق بنایا جاسکے۔ ظاہری بات ہے کہ جو پتے اس کام میں استعمال کر کے کچرے میں پھینک دیے جاتے ہیں، وہ

---

[۱] "حُثالَة" کا لفظ "ثُفالہ" کا ہم وزن ہے۔ دراصل بری اور بے قدر اشیاء کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اور اسی لیے تیل کے باقی ماندہ اجزاء اور اُس جیسی دوسری چیزوں کو جو بے قدر اور بے حیثیت ہوتی ہیں اُنہیں حثالہ کہا جاتا ہے۔

[۲] "قراضة" کا لفظ "قرض" کے مادّے سے ہے اور کسی چیز کے کاٹنے چھٹنے کے معنی میں آتا ہے اور قراضہ اُن چھوٹے ٹکڑوں کو کہا جاتا ہے کہ جو قینچی کی دُم کی طرف سے گرتے ہیں، اور قینچی پر مقراض کے لفظ کا اطلاق بھی اسی حوالے سے ہے۔

[۳] "جَلَم" کا لفظ قلم کے وزن پر ہے اور قینچی کے معنی میں آتا ہے۔

www.shiabookspdf.com

بہت آلودہ، بدبُودار اور نفرت انگیز ہوتے ہیں اور جب جانوروں کی کھال کو کاٹا جاتا ہے تو کچھ ایسے چھوٹے ٹکڑے زمین پر گرتے ہیں جو کسی بھی کام کے نہیں ہوتے۔ اس بنا پر یہ پتا چلتا ہے کہ پہلی تشبیہ میں نفرت انگیز ہونا اور دوسری تشبیہ میں بے قدر ہونا چھپا ہوا ہے، اور امامؑ فرماتے ہیں کہ دُنیا کو تمہاری نظروں میں اِن گری ہوئی حقیر ترین چیزوں سے بھی کمتر ہونا چاہیے، وہی دُنیا کے جس کے اموال سے عشق طغیان گر قارُونوں کو پیدا کر دیتا ہے، اور اس کے مقامات سے عشق، ظالموں کو وجود میں لاتا ہے اور اُس کی محبت ہر بُرائی کی جڑ ہے اور یہ وہ آسان ترین تعبیر اور جملے ہیں، جو اس بارے میں کہے جاسکتے ہیں۔ یہ ایک طرف اور دوسری جانب یہ کہ دوسرے جملے میں دُنیا کے جلدی گزر جانے اور اُس کے انجام کی طرف اشارہ ہو رہا ہے:

"وَاتَّعِظُوا بِمَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ قَبْلَ أَنْ يَتَّعِظَ بِكُمْ مَنْ بَعْدَكُمْ"

"جو لوگ تم لوگوں سے پہلے جیتے تھے اُن سے سبق سیکھو (عبرت لو) اس سے پہلے کہ تمہارے بعد آنے والے تم سے عبرت لیں۔"

اُن (پہلے والے) لوگوں نے مال اکٹھا کیا، ڈھیر لگا دیے اور چلے گئے، اُن کے ویران شدہ محل اور اُن کے تاراج شدہ مُلک اور اُن کی برباد شدہ قدرت کہ جس کی باقیات اِس دنیا کے گوشے گوشے میں بکھری پڑی ہیں۔ اُن سب سے عبرت حاصل کرو اور اگر اس سبق سے تم نے کوئی ضروری فائدہ نہ اُٹھایا تو تمہارا مقدر بھی ایسا ہی ہوگا اور تمہاری زندگی بھی دوسروں کے لیے عبرت بن جائے گی۔

قرآن مجید نے بار ہا لوگوں کو پچھلے لوگوں سے عبرت حاصل کرنے کی دعوت دی ہے اور یہ ہر دور کے لوگوں کو بیدار کرنے والے دروس میں سے ایک بہترین درس اور سبق ہے۔ فرعون اور فرعونیوں کے بارے میں قرآن کی ہلا دینے والی تعبیرات ہیں کہ جنہیں بنی اسرائیل کو بیدار کرنے کے لیے بیان کیا گیا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

"كَمْ تَرَكُوا مِنْ جَنَّاتٍ وَعُيُونٍ وَزُرُوعٍ وَمَقَامٍ كَرِيمٍ وَنَعْمَةٍ كَانُوا فِيهَا فَاكِهِينَ كَذَٰلِكَ وَأَوْرَثْنَاهَا قَوْمًا آخَرِينَ فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَاءُ وَالْأَرْضُ وَمَا كَانُوا مُنْظَرِينَ" [1]

"کتنے باغات اور چشمے اور زراعتیں اور حسین وجمیل اور بیش بہا محل انہوں نے چھوڑے اور کتنی نعمتیں چھوڑیں کہ جن میں وہ غرق تھے۔ ہاں، اسی طرح کا اُن کا ماجرا تھا اور ہم نے یہ سب کچھ دوسری قوموں کی میراث بنا دیا، نہ آسمان اُن کے حال پر رویا اور نہ ہی زمین روئی اور نہ ہی زمین وآسمان والے اور نہ ہی (انجام کے وقت) ہم نے اُنہیں کوئی مہلت دی۔"

مگر افسوس صد افسوس کہ بنی اِسرائیل نے بھی اِن باتوں سے کوئی سبق نہ لیا اور پھر اُن کی سرنوشت بھی دوسری

[1] سورۂ دُخان، آیات ۲۵ سے ۲۹

www.shiabookspdf.com

قوموں کے لیے درسِ عبرت بن کر رہ گئی۔

تیسرے جملے میں حضرتؑ دنیا کی بے وفائی کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں:

"وَارْفُضُوهَا ذَمِيمَةً، فَإِنَّهَا قَدْ رَفَضَتْ مَنْ كَانَ أَشْغَفَ[1] بِهَا مِنْكُمْ."

"اِس پست اور حقیر دنیا کو چھوڑ دو، کیونکہ اس نے اُن لوگوں کو بھی چھوڑ دیا جو اِس کی نسبت تم سے زیادہ شیدائی تھے۔" (اور اس نے اپنے عاشقوں اور چاہنے والوں کے ساتھ کم ترین وَفا بھی نہیں نبھائی اور اُن کی حُرمت کا بھی خیال نہیں کیا)

اس ترتیب سے اس عظیم معلّم اخلاق وانسانیت نے ان تین جملوں میں دنیا کی بے وقعتی، ناپائیداری اور اس کی اہل دنیا سے بے وفائی پر گفتگو کی ہے اور اس کے ہر پہلو کو بخوبی واضح کر دیا ہے۔

ظاہر ہے کہ اس تمام کلام امامؑ میں جہاں دنیا کی برائی کی گئی ہے وہاں مراد وہ مادّی اور دنیاوی دولت وثروت ہے جو معصیت، ظلم وطغیان، اَنا رکی اور ناجائز طریقے سے حاصل کی جائے نہ کہ وہ مال اور متاع جو جائز اور حلال طریقے سے حاصل کیا جائے تا کہ اطاعت خداوندی میں اس کی راہ میں خرچ کیا جا سکے جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

چیست دنیا؟ از خدا غافل شدن
نے طلا و نقره و فرزند وزن

مفہوم: دنیا پرستی کیا ہے؟ یہ خدا سے غافل ہو جانا ہے۔ ورنہ سونے چاندی یا بیوی اور اولاد کی محبت دنیا پرستی نہیں۔

کلام سیّد رضیؒ

اس خطبے کے آخر میں مرحوم سیّد رضیؒ فرماتے ہیں:

"بعض ناواقف اور بے خبر لوگ اس خطبے کو امیر شام کی طرف منسوب کرتے ہیں لیکن بلا شک وشبہ یہ خطبہ امیر المومنین علیہ السلام ہی کا کلام ہے کیونکہ یہ طرزِ کلام آپ کے دوسرے فصیح وبلیغ کلام اور آپ کی باعظمت روحانیت سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہے۔ امیر شام کو یہ طرزِ کلام کہاں حاصل ہو سکتا ہے۔ سونے کو خاک سے کیا نسبت ہو سکتی ہے اور آب کوثر کو حمیم سے کیا نسبت!

---

[1] "اَشْغَف" کا لفظ دراصل قلب کے اوپر کی گرہ یا قلب کے اُوپر کی کھال) کو کہا جاتا ہے جو کسی غلاف کی مانند اُسے چاروں طرف سے اپنے آپ میں چھپائے ہوئے ہوتی ہے۔ یہ لفظ اُس دل سوز عشق کے معاملے میں استعمال ہوتا ہے کہ جو پورے قلب کو گھیرے ہوئے ہوتا ہے اور دل کی گہرائیوں میں جا گزیں ہوتا ہے۔

www.shiabookspdf.com

اس کی ایک اور دلیل عمرو بن بحر جاحظ کا کلام ہے جو خود ایک زبردست ماہر ادب اور بلند پایہ نقاد ہے۔ وہ اپنی کتاب "البیان والتبیین" میں اس خطبے کو نقل کرنے کے بعد کہتا ہے کہ کچھ لوگ اس کو امیر شام کی طرف نسبت دیتے ہیں اور وہ خود بھی ابتداً یہی رائے رکھتا تھا مگر پھر رائے تبدیل کر لی اور یہ اعتراف کرنا پڑا کہ یہ خطبہ کلام امام ہی ہے، کیونکہ اس کی گفتگو کی روش اور انسانی گروہوں کی تقسیم اور غلبہ ذلّت، تقیہ اور خوف کی حالتوں میں ان کی کیفیات کا بیان یہ سب امامؑ ہی کے لیے ممکن ہے۔ آخر میں وہ کہتا ہے "کسی وقت اور کسی موقع پر ہم نے دیکھا کہ امیر شام نے زہد و تقویٰ کے سلسلے میں ایک بھی جملہ کہا ہو یا واقعی بندگان خدا سے راہ ورسم اختیار کی ہو۔"

نکتہ

دنیا اولیاء اللہ کی نگاہ میں

جو کچھ مندرجہ بالا خطبے میں انسانوں کے پانچ گروہوں کے بارے میں کہا گیا، جو حضرتؑ کے دور میں موجود تھے (لاچار دنیا پرست، ظالم طاقتور، دین کو دنیا کے بدلے بیچنے والے ریاکار، دھوکے باز اور مصنوعی زاہد) یہ صرف آپؑ ہی کے دور اور زمانے میں منحصر نہیں تھا، بلکہ آپؑ کے بعد کل بھی اور آج بھی بیشتر انسانی معاشروں میں یہ تمام گروہ موجود رہے ہیں اور انسانی معاشروں کی تمام تر مشکلات انہی پہلے مذکورہ چار گروہوں کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ تاریخ کے طویل عرصے میں ان چاروں گروہوں نے بے حد وحساب درد ورنج پیدا کیا ہے، شدید خوں ریزی کی ہے، مظلوموں کا حق چھینا ہے اور فسادات کا جال پھیلایا ہے۔ دین دار اور مردانِ حق جس حد تک ان کی طاقت ہوتی ان کا مقابلہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن بہر حال دنیا ان مذکورہ چاروں گروہوں کے افراد سے بھی کبھی وفا نہیں کرتی اور بہت کم عرصہ میں ان کی زندگی پریشانیوں اور پیچیدگیوں کا شکار ہو جاتی ہے اور وہ بالآخر تمام مال و دولت اور ہر شے کو چھوڑ کر اس دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں اور ان کی زندگی کی داستان بعد میں آنے والوں کے لیے باعث عبرت بن جاتی ہے۔

امامؑ نے ان پانچوں گروہوں کی نشانیاں اور ان کے اہداف کا الگ الگ تفصیلی تذکرہ کیا ہے جو بہت گہرا، پر معنی اور ان کی شناخت کے لیے بہترین رہبر اور رہنما ہے۔

جہاں تک پہلے چار گروہوں کی خلاف ورزیوں اور جرائم کا تعلق ہے تو یہ بات معلوم ہے کہ اس کی بنیادی وجہ دنیا داری اور دنیا پرستی ہے، تو حضرتؑ نے اسی عنوان سے خطبے کے آخر میں چند پُر اثر جملوں کے ذریعے سے دُنیا پرستی کی رُوح کو

www.shiabookspdf.com

دلوں میں ہی کچل دیا۔سب سے پہلے تو دُنیا کو اس قدر بے قیمت شمار کررہے ہیں کہ اسے اُن سڑے ہوئے پتوں سے بھی گرا ہوا شمار کررہے ہیں جنہیں چرم سازی کے وقت جانوروں کی کھال کو گھسنے اور مضبوط کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اور پھر پھینک دیا جاتا ہے۔پھر دنیا کے ناپائیدار اور اس کے زُود گذر یعنی جلدی گزرنے کی جانب اشارہ کرتے ہیں اور پچھلے لوگوں کی تاریخ اور اُن کے باقی ماندہ ویرانوں سے عبرت لینے کی طرف اشارہ فرمایا، جسے ایک واضح سند کے عنوان کے طور پر پیش کیا ہے اور بالآخر دنیا کی بے وفائی کے بارے میں ذکر فرماتے ہیں تاکہ اس کے دلدادہ حضرات ہوشیار ہوجائیں کہ یہاں کچھ بھی نہیں ہے، ایک حدیث میں ہے کہ رسولِ اکرمؐ ایک جانور کی سڑی ہوئی لاش کے پاس سے گزر رہے تھے کہ جو سڑک کی ایک جانب پڑی ہوئی تھی۔آپؐ نے اُس پر اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: "أَتَرَوْنَ هٰذِهٖ هَيِّنَةً عَلٰى أَهْلِهَا؛ فَوَاللهِ! اَلدُّنْيَا أَهْوَنُ عَلَى اللهِ مِنْ هٰذِهٖ عَلٰى أَهْلِهَا"۔ "کیا تم دیکھ رہے ہو کہ یہ لاشہ اِس کے وارثوں کے قریب کتنا بے قیمت ہے؟ خدا کی قسم! دنیا خدا کی نظر میں دُنیا کی بے قیمتی دُنیاداروں کی نسبت، کہیں زیادہ ہے۔"

پھر حضرتؑ اِس حدیث کو آگے بڑھاتے ہوئے چند اہم نکات کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور فرماتے ہیں:

"اَلدُّنْيَا دَارُ مَنْ لَا دَارَ لَهٗ وَمَالُ مَنْ لَا مَالَ لَهٗ وَلَهَا يَجْمَعُ مَنْ لَا عَقْلَ لَهٗ وَ شَهَوَاتِهَا يَطْلُبُ مَنْ لَا فَهْمَ لَهٗ وَعَلَيْهَا يُعَادِيْ مَنْ لَا عِلْمَ لَهٗ وَعَلَيْهَا يَحْسُدُ مَنْ لَا فِقْهَ لَهٗ وَلَهَا يَسْعٰى مَنْ لَا يَقِيْنَ لَهٗ"

"دنیا (درحقیقت) اُس کا گھر ہے جس کے پاس کوئی گھر نہیں اور اُس کا مال ہے جس کا کوئی مال ہی نہیں۔صرف وہی دُنیا کو بٹورنے میں مصروف ہوگا جو عقل نہیں رکھتا، اور جس کے پاس شعور نہیں ہے صرف وہی اِس میں شہوت رانی کرے گا، اور صرف وہ افراد جو غیر آگاہ ہیں وہی دنیا کی خاطر جھگڑیں گے اور صرف نافہم افراد ہی اِس دنیا کی خاطر دوسروں سے حسد کریں گے اور صرف جو لوگ ایمان اور یقین نہیں رکھتے، وہی مسلسل دُنیا کے لیے جدوجہد میں مصروف رہیں گے۔"[1]

ایک حدیث میں آیا ہے کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام نے مکاشفہ کی حالت میں دُنیا کو ایک بوڑھی اور بغیر دانتوں کی عورت کی شکل میں دیکھا کہ جس کے تن پر ہر قسم کی زینتیں تھیں، پوچھا:

"تو نے اب تک کتنے شوہر اختیار کیے ہیں؟"

تو اُس نے کہا:

"وہ گنتی میں گنے ہی نہیں جاسکتے"

حضرت عیسٰیؑ نے پوچھا:

[1] بحارالانوار، جلد ۷۰، صفحہ ۱۲۲

www.shiabookspdf.com

"وہ سب مر گئے یا اُنہوں نے تجھے طلاق دے دی؟"

تو کہنے لگی:

نہیں، میں نے اُن سب کو مار دیا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا:

"تیرے باقی ماندہ شوہروں کے حال پر وائے (افسوس) ہو، آخر وہ تیرے پچھلے شوہروں سے درس عبرت کیوں حاصل نہیں کرتے۔"[1]

[1] منہاج البراعۃ، جلد ۴، صفحہ ۵۸، بحار الانوار جلد ۱۴، ص ۳۲۸

www.shiabookspdf.com

www.shiabookspdf.com

تینتیسواں خطبہ

و من خطبة له علیه السّلام [1]

عِنۡدَ خُرُوۡجِهٖ لِقِتَالِ أَهۡلِ الۡبَصۡرَةِ وَ فِيۡهَا حِكۡمَةُ مَبۡعَثِ الرُّسُلِ ثُمَّ يَذۡكُرُ فَضۡلَهٗ وَ يَذُمُّ الۡخَارِجِيۡنَ.

---

[1] سیّد رضیؒ نے اس خطبے کو نہج البلاغہ میں دو جگہ ذکر کیا ہے، ایک اس جگہ پر اور دوسرا خطبہ نمبر ۱۰۴ میں اور وہاں یوں کہتے ہیں کہ اس خطبے کا کچھ حصّہ پہلے بھی آ چکا ہے، (اسی ۳۳ ویں خطبے کی جانب اشارہ ہے) مگر کیوں کہ میں نے اس روایت کو پچھلی روایت سے مختلف پایا تو میں نے دیکھا کہ اُس کی نسبت کچھ کمی بیشی بھی ہے تو میں نے یہ لازم جانا کہ اُس کے کھوج میں لگ جاؤں۔

نہج البلاغہ کے مصادر کی کتاب لکھنے والے نے کہا ہے، یہاں یہ بات مزید واضح ہو جاتی ہے کہ سیّد رضیؒ کس حد تک امیرالمومنینؑ کے کلام کو نقل کرنے میں احتیاط برتتے تھے، یہاں تک کہ دو ایک جیسی روایات کو ایک ساتھ نہیں ملاتے تھے (یہ تھی سیّد رضیؒ کی سیرت اور وہ مولاؑ کے ہر کلام کو نقل کرنے میں نہایت دقت اور باریک بینی و احتیاط سے کام لیتے تھے)

پھر اضافہ کرتے ہیں۔ شیخ مفیدؒ کی کتاب ارشاد میں جو روایت ہے اُس سے پتا چلتا ہے کہ امامؑ نے اس خطبے کو ربذہ میں ارشاد فرمایا ہے، بیت اللہ کے زائرین کا ایک گروہ وہاں رُکا ہوا تھا اور جب اُنھیں امامؑ کے اُس مقام پر ہونے کا پتا چلا تو وہ سب وہاں جمع ہو گئے تا کہ اُن کے کلام کو سُن سکیں اور استفادہ کریں، جبکہ ابھی امامؑ اپنے خیمے سے باہر نہیں آئے تھے۔ ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ مولاؑ ایک چپل کو سی رہے تھے، میں نے عرض کیا، ہمیں ان معاملات کی اصلاح کی اس سے کہیں زیادہ ضرورت ہے جو آپ ابھی انجام دے رہے ہیں، امامؑ نے مجھے کوئی جواب نہ دیا، یہاں تک کہ اپنی چپل کی سلائی سے فارغ ہو گئے، اور سلائی شدہ چپل کو دوسری چپل کے ساتھ رکھ دیا اور فرمایا "اے ابن عباس، اس کے دام لگاؤ میں نے عرض کی، اس کی کوئی قیمت نہیں، فرمایا جو بھی ہے بتا دو، میں نے عرض کیا ایک درہم سے بھی کمتر ہے، امام فرمانے لگے، خدا کی قسم! یہ کم قیمت چیزیں میرے لیے تم پر حکومت کرنے سے کہیں بہتر ہیں سوائے، اس کے کہ میں کسی حق کو ادا کر سکوں یا کسی باطل کو دفع کروں۔" میں نے عرض کیا خانہ کعبہ کے زوار آئے ہیں تا کہ آپ کے کلام سے مستفید ہو سکیں۔ کیا آپؑ اجازت دیتے ہیں کہ میں اُن کے لیے کوئی خطبہ دے دوں، اگر اچھا ہوا تو آپ کے حساب میں اور اگر بُرا ہوا تو میرے حساب میں رہے؟ آپؑ نے فرمایا: "نہیں میں خود اُن سے کلام کروں گا، پھر باہر آئے اور اُن کے لیے یہ خطبہ کہا (مصادر نہج البلاغہ، جلد ۱، صفحات ۳۲۱، ۳۲۲) بہر حال مستدرک اور مدارک نہج البلاغہ کے مطابق، شیخ مفید نے اس خطبے کو کتاب ارشاد میں ذکر کیا ہے (مستدرک صفحہ ۲۴۲)۔

www.shiabookspdf.com

قَالَ عَبْدُاللّٰهِ بْنُ عَبَّاسٍ: دَخَلْتُ عَلٰى اَمِيْرِ الْمُؤْمِنِيْنَ علیہ السلام بِذِيْ قَارٍ وَهُوَ يَخْصِفُ [1] نَعْلَهُ فَقَالَ لِيْ: مَا قِيْمَةُ هٰذَا النَّعْلِ؟. فَقُلْتُ: لَا قِيْمَةَ لَهَا! فَقَالَ علیہ السلام: وَاللّٰهِ! لَهِيَ أَحَبُّ إِلَيَّ مِنْ إِمْرَتِكُمْ [2] إِلَّا أَنْ أُقِيْمَ حَقًّا أَوْ أَدْفَعَ بَاطِلًا. ثُمَّ خَرَجَ فَخَطَبَ النَّاسَ فَقَالَ:

"مولا علی علیہ السلام نے اِس خطبے کو اہل بصرہ سے جنگ کرنے کے لیے جاتے وقت ارشاد فرمایا تھا اور اس میں انبیائے کرامؑ کی بعثت کا فلسفہ اور پھر اپنے فضائل شمار کروائے ہیں اور جن لوگوں نے آپ کے خلاف قیام کیا تھا، انہیں بُرا بتایا ہے۔

ابنِ عباسؓ کہتے ہیں میں "ذی قار" (بصرہ کے نزدیک کوئی شہر) میں مولا علی علیہ السلام سے ملا تو امامؑ اپنی چپل کو جوڑنے میں مصروف تھے، اُسی حالت میں میری جانب رُخ کر کے فرمایا "اس چپل کی کیا قیمت ہے؟ میں نے کہا، اس کی قیمت نہیں ہے (بہت ہی کم قیمت ہے)، فرمایا، خدا کی قسم! یہی بے قیمت چپل میرے لیے تم پر حکومت کرنے سے بہتر ہے، سوائے اس کے کہ میں اِس حکومت کے ذریعے کسی حق کو پہنچاؤں یا کسی باطل کو دفع کر دوں، کہیں یہ مت سوچنا کہ بصرے کے فتنہ گروں کو دَفع کرنے کے لیے اقدامات کیے ہیں، وہ تم پر حکومت کی جڑوں کو مضبوط کرنے کے لیے نہیں ہیں۔ پھر مولاؑ خیمے سے باہر آئے اور لوگوں کو مخاطب کر کے فرمایا۔۔۔"

خطبہ، ایک نگاہ میں

حضرتؑ نے اس خطبے کو اُن حالات میں ارشاد فرمایا ہے کہ جب آپؑ نے اپنے ساتھیوں کو، بصرہ میں طلحہ و زبیر کی بھڑکائی ہوئی فتنے کی آگ کو بجھانے کے لیے آمادہ جنگ کیا ہوا تھا۔

ایک طرف مولاؑ نے اس خطبے سے پہلے ابن عباسؓ سے وہ تاریخی اور ہرگز فراموش نہ ہونے والے جملے ارشاد فرمائے، جو کہ جو امامؑ کی بُلند روح اور مقامِ بے مثال اور عرفان و معرفت کی حکایت بیان کر رہے ہیں، فرماتے ہیں کہ تم لوگوں پر حکومت میری اس پھٹی ہوئی اور جوڑوں سے بھری ہوئی چپل سے بھی کم قیمت ہوگی اگر میں مقام اور حکومت سے عشق و رغبت رکھتا ہوں، لیکن اگر حق کو اس کے مقام تک پہنچانے کے لیے اور باطل کو دفع کرنے اور معاشرے کو سعادت و کمال کی جانب متوجّہ کرنے کے لیے ہو تو پھر میرا مطلوب اور محبوب ہدف ہے۔ پھر لوگوں کے افکار کو اپنے ساتھ دفعتاً زمانۂ جاہلیت اور زمانِ قبل رسالت مآبؐ کی جانب لے جاتے ہیں۔ اور بتاتے ہیں کہ لوگوں نے دوبارہ انہی جاہلیت کے دور کی روشوں کو زندہ کر دیا

---

[1] "یخصف" کا لفظ "خصف" کے مادے سے ہے اور اس کا مطلب ہے کسی چیز کے ٹکڑوں کو سینا، جوڑنا یا چپکانا۔

[2] "إِمْرَةٌ" "فِطْرَةٌ" کے وزن پر ہے، اور حکومت کے معنی میں آتا ہے۔

www.shiabookspdf.com

ہے اور مجھے بھی رسالت مآبؐ کی راہ ہی پر ہی چلتے رہنا ہے، اور اُسی انداز میں زمانہ جاہلیت کے افکار کو مٹا کر باطل کو چیر کر اُس میں سے حق کو نکالنا ہوگا۔ اس خطبے کے ایک اور حصے میں قریش کے اُن لوگوں کو سرزنش فرمائی ہے، جو جنگ جمل کے سرغنوں میں سے تھے اور یہ واضح فرمارہے ہیں کہ جنگ کے شعلوں کو بھڑکانے والوں کا سوائے حسد و کینہ اور دنیا پرستی کے علاوہ اور کوئی مقصد نہیں تھا۔

پہلا حصہ

إِنَّ اللهَ بَعَثَ مُحَمَّداً صلى الله عليه وآله وَلَيْسَ أَحَدٌ مِنَ الْعَرَبِ يَقْرَأُ كِتَاباً وَلَا يَدَّعِي نُبُوَّةً فَسَاقَ النَّاسَ حَتَّى بَوَّأَهُمْ مَحَلَّتَهُمْ وَبَلَّغَهُمْ مَنْجَاتَهُمْ فَاسْتَقَامَتْ قَنَاتُهُمْ وَاطْمَأَنَّتْ صَفَاتُهُمْ.

أَمَا وَاللهِ إِنْ كُنْتُ لَفِي سَاقَتِهَا حَتَّى تَوَلَّتْ بِحَذَافِيرِهَا مَا عَجَزْتُ وَلَا جَبُنْتُ وَإِنَّ مَسِيرِي هَذَا لِمِثْلِهَا فَلَأَنْقُبَنَّ الْبَاطِلَ حَتَّى يَخْرُجَ الْحَقُّ مِنْ جَنْبِهِ.

”خدا نے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اُس وقت مبعوث فرمایا کہ جب عرب میں کوئی آسمانی کتاب نہیں پڑھی جاتی تھی اور نہ ہی کوئی نبوّت کا دعویدار پایا جاتا تھا (وہ لوگ انبیاءؑ کی دعوت حق اور آسمانی کُتب سے محروم رہ گئے تھے) آپؐ لوگوں کو اُن کی منزل سعادت کی سرحد تک خود (ہاتھ پکڑ کر) لے کے چلے اور منزلِ نجات تک انہیں پہنچا دیا، (یہاں تک کے) اُن لوگوں کے نیزے بالکل سیدھے اور (صحیح سمت کی جانب) استوار ہوگئے اور انھوں نے اپنے قدم جما لیے (اُن کی قدرت بڑھ گئی اور دشمنوں نے اُن کے آگے سرِ تسلیم خم کردیا) خدا کی قسم! میں اس لشکر کے پیچھے چل رہا تھا اور انہیں آگے بڑھتے رہنے کو کہتا رہتا تھا، یہاں تک کہ باطل کے طرفداروں کا گروہ پوری طرح سے پیچھے ہٹ گیا (اور حق ظاہر ہوگیا اور جیت گیا) میں اس ذمّے داری کی انجام دہی میں ہرگز کمزوری اور ناتوانی کا شکار نہ ہوا اور ڈر و خوف کو اپنے پاس آنے نہ دیا اور اس وقت بھی (جنگ جمل کی طرف جانے میں) میرا راستہ اُسی ہدف کی جانب ہے۔ خدا کی قسم میں باطل کو چیر کے رکھ دوں گا، تاکہ اُس کے درمیان میں سے حق نکل آئے۔“

www.shiabookspdf.com

شرح وتفسیر

میں باطل کو چیر دوں گا

مولا علی علیہ السلام نے اس خطبے کے آغاز میں جیسا کہ بتایا جا چکا ہے، دورِ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور جزیرۂ عرب میں انقلابِ اسلامی کے ظہور کی جانب اشارہ فرمایا ہے، اور یہ دکھایا ہے کہ زمانہ جاہلیت میں لوگ کیسے جیتے تھے اور کیا حالات تھے اور پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں کس شرف وسعادت سے آشنا فرمایا، ارشاد فرماتے ہیں:

"إِنَّ اللهَ بَعَثَ مُحَمَّداً صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وَلَيْسَ أَحَدٌ مِنَ الْعَرَبِ يَقْرَأُ كِتَاباً وَلَا يَدَّعِي نُبُوَّةً"

"اللہ نے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اُس وقت مبعوث فرمایا کہ جس وقت عرب میں کوئی بھی آسمانی کتاب نہیں پڑھی جاتی تھی اور نہ ہی کوئی نبوت کا دعویدار تھا (وہ سب انبیاءؑ دعوتِ حق سے دور اور آسمانی کُتب سے محروم تھے اور شرک وکفر کے بھنور میں غوطہ زن تھے)"

نہج البلاغہ کے بعض مفسرین نے یہاں پر یہ سوال اُٹھایا ہے کہ یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ عرب میں سے کوئی ایک بھی آسمانی کتاب نہیں رکھتا تھا اور نہ ہی خدا کے پیغمبروں میں سے کسی پیغمبر کا پیرو تھا، جبکہ ہم یہ جانتے ہیں کہ یہودیوں اور عیسائیوں کی ایک قابل ذکر تعداد وہاں رہتی تھی اور توریت وانجیل نامی دو کُتب اُن کے پاس تھیں؟ پھر اس سوال کے جواب میں خود ہی توریت اور انجیل کی تحریف کی جانب اشارہ کرتے ہیں، لہٰذا جو کتاب اُن کے درمیان تھی وہ اصلی اور سچی کتاب نہیں تھی اور اُن کی حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیروی کرنا بھی کوئی سچی پیروی کرنا نہیں تھا، پھر یہ آیت بطور ثبوت پیش کی گئی ہے:

"شَیْءٍ ۚ قُلْ مَنْ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ الَّذِیْ جَآءَ بِهٖ مُوْسٰی نُوْرًا وَّهُدًی لِّلنَّاسِ تَجْعَلُوْنَهٗ قَرَاطِیْسَ تُبْدُوْنَهَا وَتُخْفُوْنَ كَثِیْرًا"

"کہو (کہ) کس نے وہ کتاب نازل کی جو موسیٰ لے کر آئے، وہ کتاب جو لوگوں کے لیے نورِ ہدایت تھی؟ (کیا تم یہودیوں نے) اُسے تم نے منتشر کر دیا، ایک حصہ (جو کہ تمہارے لیے مفید ہے) آشکار کرتے ہو اور بہت سے (اُن) حصوں کو (جو تمہارے ہوا وہوسِ نفسانی کے خلاف ہیں) چھپا لیتے ہو؟"[1]

[1] سورۂ انعام، آیت ۹۱

www.shiabookspdf.com

یہ احتمال بھی دیا گیا ہے کہ یہاں پر عرب سے مراد ان کی اکثریت ہے جو کہ مشرک اور بت پرست تھی۔ ایک تیسرا جواب بھی اس سوال کا دیا جاسکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ یہودی قومیں، جزیرۃ العرب کے اصل اور ہمیشہ سے رہنے والی رہائشی نہ تھیں بلکہ تاریخوں کی گواہیوں کے مطابق یہ ملتا ہے کہ جب انہوں نے آخری پیغمبرؐ کے ظہور کی اُن نشانیوں کے مطابق جو اُنہوں نے اپنی کتابوں میں پڑھی تھیں، جب وہ علامات ظاہر ہونے لگیں تو وہ لوگ اس جگہ آکر بسنے اور رہنے لگے تاکہ اُن کے ظہور کے شاہد بن سکیں۔ ہر چند یہ کہ بعد میں اُنہوں نے اپنے منافع کو خطرے میں پایا تو نفاق وعداوت کی راہ پر نکل پڑے اور عیسائی حضرات بھی قوی احتمال کے تحت زیادہ تر مہاجرین تھے اور ساتھ ہی بہت اقلیت میں تھے۔

بہرحال حضرت امام علی علیہ السلام اس کلام میں زمانۂ جاہلیت کے لوگوں کا تذکرہ فرمارہے ہیں جو کہ سرچشمۂ وحی ونبوّت سے دور تھے اور یہی ایک نکتہ اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ لوگ کس حد تک شرک وکفر کے بھنور میں پھنسے ہوئے تھے اور فساد کی آگ کے شعلوں میں جل رہے تھے، پھر اُس کے بعد حضرتؑ یہ بتارہے ہیں کہ یہ لوگ آج اسلام کے طلوع کی کرنوں اور وحی ونبوّت کے انوار کی روشنی میں کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔ فرماتے ہیں:

«فَسَاقَ النَّاسَ حَتّٰى بَوَّأَهُمْ مَحَلَّتَهُمْ وَبَلَّغَهُمْ مَنْجَاتَهُمْ» [۱]

"آپ لوگوں کو اُن کی منزل سعادت کی سرحد تک خود (ہاتھ پکڑ کر) لے کے چلے اور نجات کی منزل تک پہنچادیا۔"

سرکارؐ نے نہ صرف لوگوں کو شرک وکفر اور اعتقاداتی انحرافات سے رہائی دلائی اور اخلاقی فساد اور ظلم وبے عدالتی کا اُن کے درمیان سے خاتمہ کردیا، بلکہ انہیں ایک نئی قوت، حکومت، قُدرت اور ایک نیا تمدن بخشا، اسی لیے حضرتؑ اس کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے فرماتے ہیں:

«فَاسْتَقَامَتْ قَنَاتُهُمْ [۲] وَاطْمَأَنَّتْ صَفَاتُهُمْ» [۳]

"اُن کے نیزے بالکل سیدھے اور (صحیح سمت کی جانب) اُستوار ہوگئے اور اُنھوں نے اپنے قدم جمالیے۔"

اور اس طرح سے وہ لوگ معنوی کامیابی سے بھی ہم کنار ہوگئے اور مادّی قدرتوں اور نعمتوں سے بھی سرفراز ہوگئے

---

[۱] «بَوَّأَ» کا لفظ "بوء" کے مادّے سے ہے اور دراصل یہ کسی جگہ کے ہموار ہونے کے معنی میں آتا ہے اس کے بالمقابل "نَبْوَة" جو غیر ہموار ہونے کے معنی میں آتا ہے۔ اس جملے میں یہ لفظ موجودہ کیفیت، حالت کو سیدھا اور منظم کرنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

[۲] «قنات» کا لفظ «قنو» کے مادّے سے ہے۔ اصل میں درخت کی شاخ کے معنی میں ہے اور نیزے کو درختوں کی شاخوں کے مشابہ ہونے کی خاطر قنات کہتے ہیں اور پانی کے لیے جو مخصوص طرح کی کھدائی کی جاتی ہے جسے کاریز کہا جاتا ہے، اُن کو بھی سیدھے اور کھری صورت میں ہونے کی خاطر قنات کہا جاتا ہے۔

[۳] «صفات»، بڑا سیدھا اور چوڑا پتھر ہوتا ہے۔

www.shiabookspdf.com

اور یہ سب رسول اکرمؐ کے قیام اور نزولِ قرآن مجید کی برکتوں میں سے تھا۔

"محلتھم" کی تعبیر سے مراد وہ شائستہ جگہ ہے کہ ایک بافضیلت انسان کا وہاں پہنچنا اُس کا حق ہوتا ہے اور "منجاتھم" کا لفظ اُس نقطۂ نجات کا ترجمان ہے کہ جہاں کسی بھی طرح کا خوف، وحشت اور ڈر نہیں ہوتا اور وہ نجات و رستگاری کا ضامن ہوتا ہے۔

"فَاسْتَقَامَتْ قَنَاتُهُمْ" کی تعبیر اس بات کے پیشِ نظر کہ "اِسْتِقَامَتْ" کا لفظ سچائی اور ثابت قدمی کے معنی رکھتا ہے اور "قناۃ" سے مراد نیزہ ہے، اس سے کہ دشمن پر قوت وقدرت اور غلبہ وفتح کی جانب اشارہ ہے۔

نہج البلاغہ کے بعض شارحین کے مطابق یہاں پر استقامت سے مراد نیزوں کا سیدھا ہونا ہے اور درحقیقت اس تعبیر سے مراد سرکاری معاملات اور حکومت کا اور معاشرے کا نظم وضبط اور قوت واقتدار ہے۔ مگر اس بات کے پیش نظر کہ نیزہ عام طور پر سیدھا اور کھڑا ہوتا ہے اور اگر ٹیڑھا ہو جائے تو ٹوٹ جاتا ہے اور سیدھا کرنے کے قابل نہیں ہوتا۔ کیوں اُسے لکڑی سے بنایا جاتا تھا، لوہے وغیرہ سے نہیں۔ ممکن ہے یہ تعبیر سکون واطمینان کی جانب اشارہ ہو، کیوں کہ فوجیوں کا یہ معمول ہوتا تھا کہ وہ لوگ دشمن کی جانب سے جب مطمئن اور پُرسکون ہوا کرتے تھے تو وہ اپنے نیزے کے سرے کو زمین میں پیوست کر دیتے تھے اور اُلٹی کیفیت میں وہ نیزہ سیدھا کھڑا ہوتا تھا اور نیزے کا ایسا ہونا اس بات کی علامت تھا کہ وہ دشمن کے حملے سے بے خوف ہیں اور آسودہ خاطر ہیں۔

"وَاطْمَأَنَّتْ صَفَاتُهُمْ" کی تعبیر، اس بات کے پیش نظر کہ صفات سے مراد بڑا، مضبوط اور چوڑا پتھر ہے، اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ ظہورِ اسلام اور قیامِ رسول اللہؐ کے وقت اُن کی حیثیت مضبوط اور مطمئن تھی اور اُن کی فردی اور اجتماعی حیثیت مستقر اور ثابت ہوگئی تھی۔ جن بیابانوں میں عربوں کی آمد ورفت ہوا کرتی تھی، وہ زیادہ تر نرم اور متحرک ریت پر مشتمل تھے اور اُن پر سے گزرنا اور چلنا، یہاں تک کہ صرف کھڑے رہنا بھی بہت دشوار ہوتا تھا، مگر جب وہ لوگ بڑے مضبوط اور سیدھے پتھروں پر ہوتے تو اُن کی نشست وبرخاست بھی پُرسکون ہوتی تھی اور چلنا پھرنا بھی آسان ہوتا تھا۔

پھر مولاؑ اس بات کے اگلے حصے میں اضافہ فرماتے ہیں:

www.shiabookspdf.com

"أَمَا وَاللهِ إِنْ كُنْتُ لَفِي سَاقَتِهَا[1] حَتَّى تَوَلَّتْ بِحَذَافِيرِهَا"[2]

"خدا کی قسم میں اس لشکر کے پیچھے پیچھے چلتا تھا اور انہیں آگے بڑھتے رہنے پر اُکساتا رہتا تھا یہاں تک کہ باطل گروہ مکمل طور پر پیچھے ہٹ گیا۔ (اور حق ظاہر ہوگیا اور کامیاب ہوگیا)"

جن مواقع پر لشکر والے نئے ہوتے ہیں یا دشمن طاقتور اور قوی ہوتا ہے اور اپنے لشکر کے پیچھے ہٹ جانے کا اندیشہ ہوتا ہے، تو لشکر کا سالار اپنے بعض شجاع اور آگاہ سرداروں اور معاونوں کو لشکر کے پچھلے حصّے میں رکھتا ہے، تاکہ وہ ان لشکر والوں کو آگے بڑھنے کی تشویق دیں اور آگے بڑھتے رہنے کی تاکید کرتے رہیں اور اُن کے پشت دکھا کے بھاگ جانے کے احتمال کی روک تھام ہوسکے۔ درحقیقت اہم لشکروں کی مثال ناقے (اونٹ) کی سواری کی مانند ہوتی ہے، جس کی مشکل گزرگاہوں میں آگے سے لگام پکڑ کے کھینچنا بھی ضروری ہے اور پیچھے سے بھی، ایک شخص کو چاہیے کہ وہ اُسے آگے بڑھاتا رہے تاکہ اُس مشکل گزرگاہ سے با آسانی اور سلامتی کے ساتھ گزر سکیں، گویا مولاؑ کا سخن اسی بات کی نشاندہی کر رہا ہے، کہ رسالت مآبؐ نے یہ ذمّے داری میرے ہی کاندھوں پر ڈالی تھی کہ میں اسلام کے اس نو وارد اور ناتجربے کار لشکر کو اُن مشکلات اور خطروں کے ڈھیر کے مدِمقابل آگے بڑھاتا رہوں، یا اس بات کو واضح کرنا چاہتے ہوں کہ میں اور رسول اللہﷺ لشکر کے پچھلے (آخری) حصّے میں ہوتے تھے اور اُسے آگے بڑھاتے رہتے تھے "فساق الناس" کے قرینے کے مطابق۔ بہرحال یہ تمام گفتگو عصرِ قیامِ پیغمبرؐ اور امامؑ کے اُس اہم کردار کی طرف اشارہ ہے جو انہوں نے لشکرِ اسلام کی فتح کے سلسلے میں ادا کیا۔

اور مولاؑ اس بات کو ثابت کرنے کے لیے کہ آپ نے اپنی ذمّے داری بخوبی انجام دی، فرماتے ہیں:

"میں اس ذمّے داری کے ادا کرنے میں نہ کبھی کمزور پڑا اور نہ کبھی خوفزدہ ہوا۔"

ظاہر ہے کہ پیچھے رہ جانے کی وجہ یا تو کمزوری اور ناتوانی ہوتی ہے یا بزدلی اور دشمن کا خوف اور جب مولاؑ فرماتے ہیں۔ "نہ میں عاجز و ناتواں ہوا نہ خوفزدہ ہوں۔" تو اشارہ اس طرف ہے کہ ضعف و کمزوری کا کوئی عنصر میری ذات میں نہیں تھا۔ پھر حضرتؑ اس تمہید کو دوسرے نکتے سے جوڑتے ہیں، جو ہمیں مولاؑ کے آخری ہدف کے قریب تر لے جاتا ہے، فرماتے ہیں: "وَإِنَّ مَسِيرِي هٰذَا لِمِثْلِهَا"۔ "اس وقت بھی میرا راستہ (جنگ جمل کی جانب جاتے وقت) اُس ہدف کی جانب جارہا

[1] "ساقہ" کا لفظ "سوق" کے مادّے سے بنا ہے اور سائق کی جمع ہے۔ اصل میں یہ "سوقہ" تھا، پھر اعلال کے قواعد کے تحت ساق بن گیا۔

[2] "حذافیر" کا لفظ "حُذْفُور" کی جمع ہے اور "عُصْفُور" کا ہم وزن ہے، اس کا مطلب جانب، شریف، اور کثیر تعداد کا مجمع ہے اور یہاں پر حذافیر کا لفظ تمام جوانب کے معنی میں آیا ہے۔ اس بات پر غور کیجیے کہ "سَاقَتِهَا" میں ضمیر، جاہلیت کے دور کے لوگوں کی جانب پلٹ رہی ہے جنہوں نے اسلام کو قبول کیا اور "تولّت" اور "حذافیرھا" میں ممکن ہے کہ ضمیر اسلام کے دشمنوں کی طرف لوٹ رہی ہو کہ جنہوں نے اسلام کی کامیابی کے بعد پشت دکھادی اور پیچھے ہٹ گئے اور ممکن ہے کہ دورِ جاہلیت کے لوگوں کی طرف لوٹ رہی ہو کہ جنہوں نے اسلام کی طرف رُخ کرلیا اور جو اُن کے پاس پہلے تھا اُس سے منہ موڑ لیا۔

www.shiabookspdf.com

ہے۔" جی ہاں مولاؑ اس کلام میں ایک نہایت اہم نکتے کی طرف اشارہ فرمارہے ہیں، اور وہ یہ کہ اُمت مسلمہ نے اُس دور میں دوبارہ زمانۂ جاہلیت کے افکار اور طور طریقوں اور اُن کی جاہلانہ رسوم کی طرف لوٹنا شروع کر دیا تھا اور وہ روز بروز رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، قرآن مجید اور اسلام سے دور سے دور تر ہوتے چلے جارہے تھے، جس کا ایک نمونہ جنگِ جمل کی آگ بھڑکانے والوں کی مثال ہے کہ جنہوں نے اقتدار کے حصول کے لیے بیعت توڑی اور اتنے سارے مسلمانوں کا خون بہانے کا باعث بنے۔

مولاؑ چاہتے ہیں کہ اس جاہلیت کی طرف لوٹنے کو ناکام بنادیں اور پھر سے عہدِ رسالت مآبؐ کی تاریخی حیثیت بحال کردیں جو کہ اسلامی انقلاب کی حمایت کے لیے مولاؑ کا ایک نہایت اہم قدم تھا۔ اسی وجہ سے اس بات کے اضافے میں فرماتے ہیں:

"فَلَاَنْقُبَنَّ[1] الْبَاطِلَ حَتّٰى يَخْرُجَ الْحَقُّ مِنْ جَنْبِهٖ"

"خدا کی قسم! میں باطل کو چیر دوں گا تاکہ حق اُس کے پیچھے سے سامنے آجائے۔" اس بات کے پیش نظر کہ انقبن کا لفظ نقب کے مادّے سے ہے اور سوراخ کرنے، پھاڑنے، چیرنے اور کسی چیز کے کھولنے کے معنی میں آتا ہے، اس تعبیر سے یہ حقیقت واضح ہورہی ہے کہ جب تک باطل کے پردوں کو چاک نہ کیا جائے تب تک حق ظاہر نہیں ہوسکتا، دوسرے لفظوں میں باطل کی ہمیشہ یہی کوشش رہی ہے کہ حق پر کوئی نہ کوئی پردہ پڑا رہے اور اُسے چھپائے، جب باطل کا پردہ چیر دیا جائے تو حق کا نور اور حقائق کا جلوہ سب کے سامنے آشکار ہوجاتا ہے۔

ممکن ہے کہ یہ تعبیر ایک اور نکتے کی جانب بھی اشارہ کررہی ہو اور وہ یہ کہ اس پورے جہاں کی اساس حق پر ہے اور ہر چیز کے باطن میں حق ہی چھپا ہوا ہوتا ہے، خاص طور پر ہر انسان کی فطرت میں حق کا نور موجود ہوتا ہے اور باطل ایک عارضی پردہ ہوتا ہے جو حق کا چہرہ چھپا دیا کرتا ہے، جب بھی یہ عارضی پردہ ہٹ جائے تو ہر چیز کے باطن میں چھپا ہوا حق ظاہر ہو جاتا ہے۔ اور جب بھی گمراہ کن تعلیمات کو محو کر دیا جائے تو انسان کی فطرت کا نور واضح ہوجایا کرتا ہے، جیسا کہ خطبے کے آغاز میں کہا گیا ہے کہ اس خطبے کا مضمون الفاظ و تعبیرات کے معمولی سے فرق کے ساتھ خطبہ نمبر ۱۰۴ میں بھی آیا ہے اور وہاں مولاؑ فرماتے ہیں:

---

[1] "انقبن" کا لفظ "نقب" کے مادّے سے ہے اور سوراخ کرنے، پھاڑنے اور چیرنے کے معنی میں آتا ہے اور نقب کو زیرِ زمین کیناﻟوں کے لیے استعمال کیا جاتا ہے کیونکہ اُس میں زمین کو پھاڑتے ہوئے آگے بڑھتے رہتے ہیں اور بحث و تنقیب اُس گفتگو کو کہتے ہیں، جس سے حقائق آشکار ہوتے چلے جاتے ہیں، اور نقیب اُسے کہتے ہیں جو کسی گروہ کے بارے میں جستجو اور تحقیق کررہا ہو اور اُن کے حالات سے آگاہ ہو اور چہرے کی نقاب کو اس لیے نقاب کہتے ہیں کیونکہ وہ پورے چہرے کو تو چھپاتا ہے مگر اُس میں زیادہ تر ایک جگہ کھلی ہوئی ہوتی ہے جہاں سے دیکھا جاتا ہے۔

www.shiabookspdf.com

"وَ اَیْمُ اللّٰهِ! لَاَبْقُرَنَّ الْبَاطِلَ حَتّٰی اُخْرِجَ الْحَقَّ مِنْ خَاصِرَتِهٖ"
"خدا کی قسم میں باطل (کے پردے) کو پھاڑ دوں گا تا کہ اُس کے پہلو میں سے حق کو باہر نکالوں۔"

چند نکات

ا۔ ذی قار کہاں ہے؟

جیسا کہ خطبے کی تفسیر میں بھی بیان کیا گیا کہ ذی قار، بصرہ اور کوفہ کے درمیان ایک جگہ تھی جہاں اسلام سے قبل عربوں اور ساسانیوں کے لشکر کے درمیان ایک جنگ چھڑی تھی اور ساسانی لشکر پیچھے ہٹ گیا تھا اور عربوں کو فتح ہوئی تھی، بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس جگہ کا نام ذی قار اس لیے پڑا کہ وہاں ایک کنواں تھا، جس کا پانی تارکول کی طرح سیاہ تھا۔ [۱]

ابن عباسؓ کہتے ہیں "جب ہم مولا علی علیہ السلام کی رکاب میں ذی قار تک پہنچے تو ہم نے وہاں توقف کیا، میں نے مولا علیؑ سے عرض کیا کوفے سے کچھ تھوڑے سے افراد آپ کا ساتھ دینے کے لیے آرہے ہیں۔ [۲]

امامؑ نے فرمایا:

"ٹھیک ۶۵۶۰ افراد، بغیر کمی بیشی کے میری مدد کے لیے آئیں گے۔"

ابن عباسؓ کہتے ہیں:

"میں نے مولاؑ کے اتنی یقینی تعداد و شمار بتانے پر شدید تعجب کیا اور اپنے آپ سے کہا کہ جب وہ لوگ آئیں گے تو میں اُن کی گنتی ضرور کروں گا۔"

ہم ذی قار میں پندرہ دن رکے، یہاں تک کہ ہم نے اونٹوں اور گھوڑوں کی ہنہنانے کی آوازیں سُنیں اور کوفے کا لشکر پہنچ گیا، میں نے انہیں اچھی طرح سے گنا اور دیکھا، بغیر کمی بیشی کے ٹھیک وہی تعداد تھی، جو امامؑ نے فرمائی تھی، میں نے بے ساختہ چلّا کر کہا: اللہ اکبر، صدق اللہ و رسولہ۔ ممکن ہے، ابن عباسؓ کے ان جملوں سے مراد یہ ہو کہ مولا علی علیہ السلام نے ان سب چیزوں کو رسول اللہؐ سے یقینی انداز سے سنا ہے اور اس کی بنا پر یہ پیش گوئی کر رہے ہیں۔ ابن ابی الحدید، اس نکتے کے ذکر کے بعد اضافہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جب اہلِ کوفہ مولا علی علیہ السلام کی خدمت میں پہنچے تو حضرتؑ کو سلام کیا اور کہنے

[۱] کامل ابن اثیر، جلد ۱، صفحات ۴۸۲ تا ۴۸۹

[۲] معارج نہج البلاغہ، صفحہ ۱۲۲

www.shiabookspdf.com

لگے، خدا کا شکر ہے یا امیرالمومنینؑ کہ اُس نے ہمیں آپؑ کی مدد کے لیے چُنا اور آپؑ کی نصرت سے ہمیں محترم بنا دیا۔ ہم نے آپ کی دعوتِ حق کو دل وجان سے قبول کر لیا، اب آپؑ کا جو بھی حکم ہے سر آنکھوں پر۔ امامؑ نے بھی اُن کے احساسات کی قدر دانی فرمائی اور حکم دیا کہ بصرے میں فتنے کی آگ کو بجھانے کے لیے چل پڑیں۔ [۱]

۲۔ عرب کی جہالت

اگر اس چیز پر غور کیا جائے کہ اسلام کا ظہور ایک نہایت پس ماندہ، متعصب اور خودسر قوم کے درمیان ہوا ہے تو اسلام کی عظمت سمجھ میں آئے گی، پھر اس کے بارے میں جس قدر بھی بات کی جائے کم ہوگی، زمانہ جاہلیت کے لوگ بہت سے انحرافات اور منفی صفات کے حامل تھے مگر کوئی مضائقہ نہیں کہ ہم یہاں پر اُن کے تعصب اور انتہا پسندی کے عروج کا کچھ تذکرہ کرتے چلیں، ایک عیسائی محقق جو کہ حجاز کے لوگوں کے جاہلانہ تعصب اور وہاں کی آب وہوا میں گہرے تعلق کا قائل ہے، وہ کہتا ہے: "علاقے کی آب وہوا کی طبیعت خشک تھی اور وہاں کے لوگوں کی مزاجی طبیعت بھی خشک اور نفوذ ناپذیر تھی اُن جیسے لوگوں میں رسول اللہؐ کے ذریعے اسلام کا نفاذ ہو جانا ایک بہت بڑا اعجاز ہے۔"

اگر اس جملے کو اُس جملے سے ملا دیں کہ جہالت ونادانی، علم سے دوری اور فکر وثقافت کی سطح کا نچلے درجے پر ہونا، اور مختلف خرافات سے اُن کے دامن کا آلودہ ہونا یہ سب اُس تعصب اور خودسری اور عدمِ تاثیر کے اہم ترین عوامل میں سے ہیں، تو پھر ہم خود اس بات کی تصدیق کریں گے کہ ہاں، واقعاً اس طرح کے حالات میں اُن جیسے لوگوں کی ہدایت کتنا بڑا معجزہ تھی۔

قرآن مجید میں ایسی بہت سی آیات آئی ہیں کہ جن میں اُن کی خودسری کا تذکرہ ہوا ہے مثلاً اس آیت شریفہ میں ہے:

"سَاَلَ سَآئِلٌۢ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ"۔ [۲]

"ایک تقاضا کرنے والے نے عذاب کا تقاضا کیا جو کہ واقع ہو گیا۔"

اور ایک اور آیت میں ہے:

"وَاِذْ قَالُوا اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً"۔ [۳]

"(اور یاد کرو) وہ وقت کہ جب انہوں نے کہا: اے پروردگار اگر یہ حق ہے اور تیری جانب سے ہے، تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا دے۔"

[۱] شرح نہج البلاغہ، ابن ابی الحدید، جلد ۲، صفحہ ۱۸۷ تا ۱۸۸ (کچھ مختصر تلخیص کے ساتھ)

[۲] سورۂ معارج، آیت ۱

[۳] سورۂ انفال، آیت ۳۲

www.shiabookspdf.com

ان آیات کی متعدد ایسی شانِ نزول پڑھنے کوملتی ہیں کہ جن سے اُن کے تعصب کی انتہا کا پتا چلتا ہے، یہاں تک کہ وہ لوگ اپنی اس خودسری کی راہ میں اپنی جان کو بھی گنوا دینے پر تیار تھے، واقعاً ایسی قوم کے دلوں پر نفوذ کرنا اور اُن کی ہدایت و تربیت کرنا، سب سے بڑے معجزات میں سے ہے، یہ وہی چیز ہے کہ اوپر کے خطبے میں اس کی جانب اشارہ کیا گیا ہے، اگرچہ نہایت افسوس کے ساتھ اس بات کی تلخی محسوس ہوتی ہے کہ رسالت مآبؐ کی رحلت جاں سوز کے بعد زمانہ جاہلیت کے باقی ماندہ افراد، اسلامی حکومت کے مخصوص ترین عہدوں پر فائز ہوگئے اور رسول اللہؐ کی بہت سی زحمتوں کو برباد کردیا، اور مولاعلی علیہ السلام کو عصرِ رسالت مآبؐ کے سے اسلام اور اسلامی اقدار کو بحال کرنے میں کافی محنت ومشقت کرنی پڑی۔

۳۔حدیث خَاصِفُ النَّعل

اس خطبے کے آغاز میں يَخْصِفُ نَعْلَهٗ کا جملہ استعمال ہوا ہے کہ آنحضرتؐ اپنی چپل سی رہے تھے۔اس سے ہمیں "خاصف النعل" کی حدیث یاد آتی ہے کہ جو عصر رسول اللہؐ میں بیان ہوئی تھی اور امیر المومنینؑ کے فضائل خاصہ کی ترجمان ہے، سنن ترمذی میں آیا ہے:

"ایک دن رسول اللہؐ نے قریش کے مشرکوں کو مخاطب کرکے فرمایا:

"لَتَنْتَهُنَّ اَوْ لَيَبْعَثَنَّ اللهُ عَلَيْكُمْ مَنْ يَضْرِبُ رِقَابَكُمْ بِالسَّيْفِ عَلَى الدِّيْنِ قَدِ امْتَحَنَ اللهُ قَلْبَهٗ عَلَى الْاِيْمَانِ"

"یا تو اپنے غلط عقائد اور غلط کاموں سے دست بردار ہوجاؤ یا پھر خدا اُسے کھڑا کردے گا جو تلوار سے اسلام کے دفاع کی خاطر تمہاری گردنوں کو اُڑا دے گا، ایسا شخص جس کے قلب کو ایمان کے معاملے میں خدا آزما چکا ہے (اور اُس کے دل کو اپنے ایمان سے بھرپور پایا ہے)۔"

حاضرین نے سوال کیا؟ وہ شخص کون ہے؟ خلیفۂ اوّل نے پوچھا، وہ شخص کون ہے؟ خلیفۂ ثانی نے پوچھا وہ شخص کون ہے؟ تو رسالت مآبؐ نے فرمایا: "هُوَ خَاصِفُ النَّعْلِ" وہ شخص ہے جو چپل کو سینے میں مصروف ہے۔ یہ اُس وقت فرمایا کہ جب رسول اللہؐ نے اپنی نعل مبارک کو مولا علیؑ کو سینے کے لیے دی ہوئی تھی۔" ترمذی اُس کے بعد ابوعیسیٰ سے نقل کرتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح حدیث ہے۔ [1]

---

[1] صحیح ترمذی، جلد ۵، صفحہ ۶۳۴ (طبع دار الاحیاء التراث العربی)، کتاب ینابیع المودۃ میں بھی یہ حدیث ترمذی کے نقل کے مطابق آئی ہے۔ (ینابیع المودۃ، صفحہ ۵۹) یہ حدیث بزرگان شیعہ کی کتب میں بھی آئی ہے من جملہ بحار الانوار، جلد ۳۲، صفحہ ۳۰۰، اور احقاق الحق، جلد ۶، صفحہ ۴۲۵

www.shiabookspdf.com

ظاہری بات ہے کہ مولا علی علیہ السلام کا یہ کام (چپل سینا) رسول اللہؐ کے دور میں بھی اور اپنی خلافت کے دور میں بھی اس بات کا عکاس ہے کہ آپؑ کس حد تک تواضع اور دنیا اور جاہ و مقام سے بے اعتنائی فرماتے تھے اور آپؑ نے سادگی کی زندگی کے لیے ایک نمونۂ عمل پیش کیا۔

دوسرا حصہ

مَا لِيْ وَلِقُرَيْشٍ وَ اللهِ لَقَدْ قَاتَلْتُهُمْ كَافِرِيْنَ وَلَأُقَاتِلَنَّهُمْ مَفْتُوْنِيْنَ وَ اِنِّيْ لَصَاحِبُهُمْ بِالْاَمْسِ كَمَا اَنَا صَاحِبُهُمُ الْيَوْمَ وَ اللهِ مَا تَنْقِمُ مِنَّا قُرَيْشٌ اِلَّا اَنَّ اللهَ اخْتَارَنَا عَلَيْهِمْ فَاَدْخَلْنَاهُمْ فِيْ حَيِّزِنَا فَكَانُوْا كَمَا قَالَ الْاَوَّلُ

اَدَمْتَ لَعَمْرِيْ شُرْبَكَ الْمَحْضَ صَابِحاً　　وَ اَكْلَكَ بِالزُّبْدِ الْمُقَشَّرَةَ الْبُجْرَا

وَ نَحْنُ وَهَبْنَاكَ الْعَلَاءَ وَ لَمْ تَكُنْ　　عَلِيّاً وَ حُطْنَا حَوْلَكَ الْجُرْدَ وَ السُّمْرَا

”قریش والو! مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟ خدا کی قسم جب وہ لوگ کافر تھے، میں اُن سے لڑا اور اب جب کہ وہ منحرف ہو گئے ہیں میں پھر اُن سے لڑوں گا (تا کہ وہ خدا کی راہ کی جانب لوٹ جائیں) میں وہی ہوں کہ جو کل (اسلامی غزوات میں) اُن کے برابر میں کھڑا تھا جس طرح سے آج میں اُن کے برابر (مدمقابل) کھڑا ہوں (وہی شیر افگن بازو اور وہی ذوالفقار میرے اختیار میں ہے)۔ خدا کی قسم! قریش ہم سے اور کسی بات کا انتقام نہیں لے رہے ہیں، سوائے اس کے کہ خدا نے ہمیں اُن کے درمیان سے کیوں برگزیدہ کیا ہے، مگر (اس کے باوجود) ہم نے اُنہیں اپنوں کے زُمرے میں داخل کر لیا مگر بالآخر وہی ہوا جیسا کہ شاعر نے کہا ہے” مجھے میری جان کی قسم ہے، ہر روز صبح تم نے خالص دودھ پیا ہے اور بقدر کافی تم نے ملائی اور بغیر گٹھلی کے کھجوریں کھائی ہیں، اور طرح طرح کے لذیز کھانوں کے مزے لُوٹے ہیں اور ہم نے تمہیں عزت دی، جبکہ تم اتنے بڑے (اور لائقِ عزت) نہ تھے اور ہم نے تمہارے اطراف میں گھوڑوں اور نیزوں سے پہرا دیا ہے، اور ہم نے تمہاری حفاظت بھی کی مگر تم نے ان نعمتوں کی قدر نہ کی۔“

www.shiabookspdf.com

شرح وتفسیر

قریش والے مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟

خطبے کے اس حصے میں مولا علی علیہ السلام اپنے اور قریش کے تعلقات کی موجودہ اور گزشتہ کیفیت پر گفتگو فرما رہے ہیں، کیونکہ یہ خطبہ جنگ جمل کی طرف جاتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے اور ہم یہ جانتے ہیں کہ جنگ جمل کی آگ لگانے والے اور اُسے ہوا دینے والے طلحہ وزبیر اور دیگر کینہ ڈالنے والے قریش کے ہی افراد تھے جو کہ یا تو آشکار طور پر یا پس پردہ اس جنگ کے معاملات کو اپنے ہاتھوں سے چلا رہے تھے، اسی لیے امامؑ نے اس کلام کو ایک دھمکی کے طور پر ارشاد فرمایا ہے تاکہ لوگ جنگ جمل کے حقیقی پہلوؤں سے آگاہ ہو جائیں۔ فرماتے ہیں:

"مَالِیْ وَلِقُرَیْشٍ؟ وَاللهِ لَقَدْ قَاتَلْتُهُمْ كَافِرِيْنَ وَلَاُقَاتِلَنَّهُمْ مَفْتُوْنِيْنَ" [1]

"قریش مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟ خدا کی قسم! جب وہ لوگ کافر تھے میں اُن سے لڑا ہوں اور اب جب کہ (اسلام قبول کرنے کے بعد) یہ لوگ منحرف ہو گئے ہیں، میں پھر ان سے لڑوں گا (تاکہ یہ لوگ راہِ خدا کی طرف لوٹ جائیں)"

جی ہاں! وہ لوگ ابتدا میں مشرک اور کافر تھے اور پھر انھوں نے رسول اللہؐ کی دعوتِ اسلام اور شمشیر علیؑ کے خوف سے اسلام قبول کرلیا، مگر رسالت مآبؐ کی رحلت کے بعد اپنی جاہ طلبی کے مرض کی وجہ سے یہ لوگ بتدریج حق سے دور ہوتے چلے گئے، جب کہ انہوں نے خود ہی اُن کی بیعت کی تھی۔ مفتون کا لفظ فتن کے مادّے سے ہے اور فریب وانحراف کے معنی میں آتا ہے اور کبھی کبھار شرک وکفر کے معنی میں بھی آیا ہے اور ممکن ہے کہ اس جملے میں بھی اُن کے اسلام سے منحرف ہو کر کفر کی طرف جانے، کی جانب اشارہ ہو۔ رسول اکرمؐ سے جو روایات نقل ہوئی ہیں، ہم اُن میں پڑھتے ہیں کہ آپ نے مولا علیؑ سے فرمایا:

"یَا عَلِیُّ حَرْبُكَ حَرْبِیْ وَسِلْمُكَ سِلْمِیْ"

"تم سے جنگ کرنے کا مطلب ہے میرے خلاف جنگ کرنا اور تمہارے ساتھ صلح کرنے کا مطلب ہے میرے

---

[1] "مفتونین" کا لفظ "فتنہ" کے مادّے سے ہے اور دراصل امتحان اور ابتلا کے معنی میں آتا ہے، اُس کے بعد عذاب، تکلیف، فریب اور گمراہی کے معنی میں بھی آیا ہے اور یہاں پر اسی آخری معنی کے تحت استعمال ہوا ہے۔

www.shiabookspdf.com

ساتھ صلح کرنا۔"[1]

اس کے مطابق تو جو لوگ مولا علی علیہ السلام کے خلاف جنگ جمل، صفین اور نہروان وغیرہ میں آپؑ سے لڑے ہیں، وہ اسلام کے دائرے سے باہر چلے گئے کیونکہ انہوں نے رسول اللہؐ سے جنگ کی ہے اور اُن سے جنگ کرنے والا کافر ہوتا ہے۔ یہاں پر ممکن ہے کہ یہ سوال بھی پیدا ہو کہ اگر ایسا ہے، تو مولا علی علیہ السلام کا جنگ جمل میں فتح یاب ہونے والا لشکر مخالفین کو اسیر کرنے اور اُن کے مال ومتاع کو غنیمت کے طور پر لوٹنے کا حقدار تھا، جبکہ امامؑ نے ہرگز اُن کے ساتھ ایسا نہ کیا اور نہ یہ ایسا ہونے دیا؟ جواب میں یہ کہا گیا ہے کہ امامؑ اور اُن کے طرفداروں کو یہ سب کرنے کا پورا حق تھا، لیکن آپ نے اُس وقت اور اُس دور کے حالات کو ملاحظہ کرتے ہوئے اور مصلحت کے تحت ایسا نہ کیا، اس کے علاوہ یہ کہ ضروری نہیں ہے کہ تمام کفار کا حکم ایک سا ہو، ممکن ہے کہ کافروں کی یہ قسم جو اپنے امام زمانہ کے خلاف خروج کرے اور پھر کافر کہلائے، ان کا حکم اسیری اور اُن کے مال واسباب کے لوٹنے کے حکم سے مستثنیٰ ہو۔

بعض روایات میں آیا ہے کہ مروان ابن حکم کہتا ہے کہ جب حضرت علی علیہ السلام نے بصرہ میں ہمیں شکست دے دی تو لوگوں کے مال واسباب انہیں واپس لوٹا دیئے، جو گواہی پیش کرتا اُسے اُس کے اموال لوٹا دیتے تھے، جس کسی کے پاس کوئی دلیل اور گواہی نہ ہوتی وہ قسم کھاتا تھا یا (اُسے قسم کھلائی جاتی تھی)۔

کسی نے عرض کی: "یا امیر المومنینؑ، ہمارے درمیان اسیروں اور مال غنیمت کی تقسیم کیجیے، امامؑ نے اُس کا کوئی جواب نہ دیا، جب بہت زیادہ اصرار کیا گیا تو حضرتؑ نے (تیور بدل کر غصے میں) فرمایا:

"أَيُّكُمْ يَأْخُذُ أُمَّهُ فِي سَهْمِهِ"

---

[1] اس روایت کو مغازلی شافعی، کتاب مناقب امیر المومنینؑ میں اور ابن ابی الحدید نے شرح نہج البلاغہ میں اور محقق کرکی نے نفحات اللاہوت میں ذکر کیا ہے: احقاق الحق، جلد ۶، صفحہ ۴۴۰۔ قابل توجہ بات تو یہ ہے کہ ابن ابی الحدید نے نہج البلاغہ کے ۶۵ ویں خط کی شرح میں کہا ہے کہ "فرض کر لیتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے حضرت علیؑ کو جیسا کہ شیعہ حضرات کہتے ہیں، اپنا جانشین نہیں بنایا مگر کیا امیر شام اور اُس کے علاوہ دوسرے صحابہ یہ نہیں جانتے تھے کہ رسول اللہؐ نے ہزاروں مرتبہ حضرت علیؑ کے بارے میں فرمایا ہے کہ "أَنَا حَرْبٌ لِمَنْ حَارَبْتَ وَسِلْمٌ لِمَنْ سَالَمْتَ" یا علیؑ تم جس کسی سے بھی جنگ کرو گے، اُس سے میری جنگ ہے اور جس سے بھی تم صلح کرو گے اُس سے میری صلح ہے، یا کہیں پر یہ فرمایا ہے کہ "اَللّٰهُمَّ عَادِ مَنْ عَادَاهُ وَوَالِ مَنْ وَالَاهُ" یا اللہ جو اُسے دشمن رکھے تو اُس سے دشمنی رکھ اور جو اُسے دوست رکھے تو اُس سے دوستی رکھ، یا یہ فرمایا کہ "أَنْتَ مَعَ الْحَقِّ وَالْحَقُّ مَعَكَ" تم حق کے ساتھ ہو اور حق تمہارے ساتھ ہے۔" اور اس جیسے سیکڑوں دوسرے ایسے جملے ارشاد فرمائے۔ کیا یہ ضروری نہیں تھا کہ امیر شام رسالت مآبؐ کی اس جیسی احادیث پر غور وفکر کرتا اور خدا کا کچھ خوف کر لیتا؟ (شرح نہج البلاغہ، ابن ابی الحدید، جلد ۱۸، صفحہ ۲۴)

www.shiabookspdf.com

"تم میں سے کون اپنی ماں (عائشہ کی جانب اشارہ ہے) کو اپنے حصّے میں لینا چاہے گا۔" [۱]

بعض روایات سے یہ استفادہ بھی ہوتا ہے کہ مولا علی علیہ السلام نے اہلِ بصرہ کو اپنے عفو و درگزر کے زیرِ سایہ قرار دیا، جیسا کہ رسول اکرمؐ نے فتح مکہ کے بعد مکے والوں سے یہی معاملہ کیا تھا، دوسری وجہ یہ بھی نظر آتی ہے کہ آپؑ چاہتے تھے کہ یہ چیز ایک سنّت کی شکل نہ اختیار کر لے کیونکہ آپ کو معلوم تھا کہ مستقبل میں آپ کے شیعہ، ظالموں کے ظلم کا نشانہ بنیں گے۔ تو کہیں یہی سب کچھ اُن کے ساتھ نہ دوہرایا جائے۔ [۲]

بہرحال امام عالی مقامؑ کا اس جملے سے یہ مقصد ہے کہ انہیں قریش سے کوئی خاص کینہ وعداوت نہیں تھی اور اگر انھوں نے حسد اور کینے سے اپنے دلوں کو بھر لیا ہے تو اُس کی وجہ یہ ہے کہ امامؑ نے حق و باطل کے میدانوں میں صدرِ اسلام کے دور میں اُن سے مدمقابل کھڑے ہو کر مقابلہ کیا تھا جبکہ مولا علی علیہ السلام کا یہ کردار سوائے فرمانِ الٰہی کو جاری کرنے کے اور کچھ نہ تھا اور جنگ جمل بھی سوائے حق کے حکم کو جاری کرنے کے اور کچھ نہ تھی۔ پھر حضرتؑ اس سخن کے آگے اضافہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"وَاِنِّیْ لَصَاحِبُهُمْ بِالْاَمْسِ کَمَا اَنَا صَاحِبُهُمُ الْیَوْمَ"

"انہیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ میں وہی ہوں جو کل (اسلامی غزوات میں) اُن کے مدمقابل (اور اُن کے خلاف) تھا، جیسا کہ آج بھی میں اُن کے مدمقابل ہوں۔"

وہی شیر افگن بازو اور وہی تلوار (ذوالفقار) میرے ہاتھوں میں ہے، جس کی ضربتوں کے جلوے میں نے بدر و اُحد واحزاب و خیبر میں انہیں خوب دکھائے ہیں، اور یہ درحقیقت جنگ جمل کی آگ کو بھڑکانے والوں کے خلاف ایک منہ توڑ جواب ہے۔

کبھی یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ جملہ امیر شام اور عمرو عاص (اور مروان) جیسوں پر صادق آتا ہے جو کہ اسلامی جنگوں میں رسول اللہؐ کے مقابل تھے، مگر طلحہ و زبیر کے لیے نہیں کہا گیا جو کہ جنگ جمل کی آگ بھڑکانے والوں میں سے تھے، کیونکہ وہ لوگ ان جنگوں میں رسول اللہؐ کے ساتھ تھے، اس سوال کا کچھ یوں جواب دیا گیا ہے کہ امامؑ کے اس جملے سے مراد کوئی معین شخص نہیں ہے، مگر بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ میں رسول اللہؐ کے دور میں راہِ حق پر باطل سے لڑا ہوں، اور رسول اللہؐ کے بعد

---

[۱] وسائل الشیعہ، جلد ۱۱، باب ۲۵، جہاد العدوّ کے ابواب میں حدیث نمبر ۷۔ مزید وضاحت کے لیے کتاب انوار الفقاھۃ (کتاب الخمس والانفال) صفحہ ۷۰ پر رجوع کیجیے۔

[۲] مزید وضاحت اور اس طرح کی روایات سے مزید آگاہ ہونے کے لیے کتاب انوار الفقاھۃ (کتاب الخمس والانفال) صفحہ ۵۷ سے لے کر اس سے آگے کے صفحات پر ملاحظہ فرمائیں۔

www.shiabookspdf.com

بھی اسی راہ پر چل رہا ہوں (اور ہم یہ جانتے ہیں کہ قریش اُس دور میں ایک گروہ کی شکل میں مخالفین کی صف میں تھے) [1]

اس کے علاوہ یہ کہ، مانا کہ طلحہ وزبیر رسول اللہؐ کے ساتھ ہوتے تھے مگر مروان کی طرح جو کہ قریش سے تھا، بہت سے دیگر جمل کے فوجی بھی قریش سے تھے۔ پھر حضرتؑ جنگ جمل کی آگ لگانے والوں کے ایک اور اصلی ہدف کو محورِ سخن بناتے ہوئے فرماتے ہیں:

"وَاللهِ! مَا تَنْقِمُ مِنَّا قُرَيْشٌ إِلَّا أَنَّ اللهَ اخْتَارَنَا عَلَيْهِمْ، فَأَدْخَلْنَاهُمْ فِي حَيِّزِنَا"

"خدا کی قسم!۔۔۔ قریش ہم سے اس کے سوا اور کسی چیز کا انتقام نہیں لے رہے، کہ اللہ نے اُن کے درمیان سے ہمیں چن لیا (اور اُن پر ہمیں مقدم کر لیا) مگر (اس کے باوجود) ہم نے اُنہیں اپنوں میں شامل کر لیا۔"

پھر اضافہ فرماتے ہیں:

فَكَانُوا كَمَا قَالَ الْأَوَّلُ [2] أَدَمْتَ لَعَمْرِي شُرْبَكَ الْمَحْضَ [3] صَابِحًا وَ أَكْلَكَ بِالزُّبْدِ [4] الْمُقَشَّرَةَ [5] الْبُجْرَا [6] وَنَحْنُ وَهَبْنَاكَ الْعَلَاءَ وَلَمْ تَكُنْ عَلِيًّا وَ حُطْنَا حَوْلَكَ الْجُرْدَ [7] وَ السُّمْرَا۔ [8]

"مگر" بالآخر وہی ہوا جیسا کہ شاعر کہتا ہے کہ مجھے میری (اپنی) جان کی قسم ہے کہ تم نے ہر روز صبح کو خالص دودھ پیا اور کافی حد تک ملائی، مکھن اور بغیر گٹھلی کی کھجوریں کھائیں اور (لذیز کھانوں کے جی بھر کے مزے اُڑائے) ہم نے تمہیں

---

[1] فی ظلال نہج البلاغہ، جلد ۱، صفحہ ۲۲۳

[2] جیسا کہ معلوم ہے کہ اوپر "اوّل" کا لفظ "ثانی" کے بالمقابل والا اوّل ہے اور اس سے مراد پہلے شعراء میں سے ایک شاعر ہے، یا پھر اُوَل بروزن هُبَل ہے اور یہ ایک غیر معروف شاعر ہے، نہج البلاغہ کے نسخوں میں اور اس کی مشہور و معروف شرحوں میں اس حوالے سے کوئی چیز دیکھی نہیں گئی ہے، ہر چند کہ پہلے کا احتمال زیادہ مناسب نظر آتا ہے۔

[3] "محض" خالص دودھ کو کہتے ہیں، کہ جس کے ساتھ کسی بھی طرح کا پانی نہ ملایا گیا ہو۔ اُس کے علاوہ ہر خالص چیز کو بھی کہا جاتا ہے۔

[4] "زُبد" کا لفظ زبد کے مادّے سے ہے، یہ لفظ پیدائش یا پھر کسی چیز کا کسی چیز سے نکلنے کے معنی میں آتا ہے، اسی لیے ملائی اور مکھن کو جو کہ دودھ سے بنائے جاتے ہیں، زُبد کہا جاتا ہے۔

[5] "مقشرہ" کا لفظ "قشر" کے مادّے سے ہے جس کا مطلب ہے وہ چیز جس کی کھال اُتار دی گئی ہو، اسی لیے جس کھجور کی گٹھلی نکال دی جاتی ہے اُسے بھی یہی کہتے ہیں۔

[6] "بُجر" کا لفظ بُرج کے وزن پر ہے اور بجر کے مادے سے ہے، ناف کے باہر آجانے کے معنی میں ہے، اُس کے بعد یہ پُرخوری کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے، اور ابجر اُس شخص کو کہتے ہیں جو نہایت کثرت سے کھانا کھانے والا اور موٹا ہو۔

[7] "جرد" کا لفظ جرد کے مادے سے ہے، کھال نکال لینے اور مجرد بنانے کے معنی میں آتا ہے اور جرد اُن گھوڑوں کو کہتے ہیں جو جوان اور کم بال والے ہوتے ہیں۔

[8] "سمراء" کا لفظ سمر کا مادّے سے ہے اور شب بیداری کے معنی میں آتا ہے اور سامر اُس شخص کو کہتے ہیں جو رات کو جاگنے یا پہرا دینے یا پھر بیدار رہنے یا کسی اور وجہ سے جاگتا رہے۔

www.shiabookspdf.com

عزّت وعظمت دی جبکہ تم ہم سے بزرگ نہیں تھے، ہم نے تمہارے اردگرد نیزے لے کر پہرے دیے اور تمہاری حفاظت کی، مگر تم نے ان نعمتوں کی قدر نہ کی۔"

ہاں، انھوں نے ہماری نسبت شدید رشک کیا اور حسد سے کام لیا، مگر یہ خدا کی مرضی تھی کہ اُس نے نبوت اور امامت کو ہمارے درمیان قرار دیا، اس کے باوجود ہم نے انہیں اُن کے جیسا بدلا نہ دیا، بلکہ انہیں ہم نے عزّت دی، قدر و قیمت اور مقام سے نوازا اور اُن کی خطاؤں سے ہم نے درگزر کیا اور دشمنوں کے مقابلے میں ہم نے ان کی حفاظت کی، مگر اُنہوں نے نہ صرف یہ کہ ان بڑی نعمتوں کی قدر نہ کی کہ بلکہ ہمارے خلاف تلوار اُٹھائی اور ہم سے بے غیرتوں کی طرح لڑنے کھڑے ہو گئے۔ ہم نے حکم الٰہی کے تقاضے کے تحت اُن کے ساتھ صلہ رحمی کی اور جہاں تک ممکن تھا، ہم نے انہیں محبت دی، مگر اُنھوں نے قطع رحمی کی اور ہم سے تنازع کرنے کھڑے ہو گئے اور جنگ جمل کی آگ بھڑکائی اور مسلمانوں کو آپس میں ایک دوسرے کے خون کا پیاسا بنا دیا اور جاہل لوگوں کا خون بہا کر تباہیاں اور بربادیاں ایجاد کر دیں۔

قریش نے اپنے اس عمل سے تمام حسد کرنے والوں کی طرح اللہ کی حکمت پر اعتراض کیا، جبکہ خدا فرماتا ہے:

"اَللهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ"[۱]

"اللہ اس پر سب سے زیادہ آگاہ ہے کہ اپنی رسالت کو کہاں (اور کس خاندان میں) قرار دے۔"

اور پھر فرماتا ہے:

"اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰى مَآ اٰتَاهُمُ اللهُ مِنْ فَضْلِهٖ فَقَدْ اٰتَيْنَآ اٰلَ اِبْرَاهِيْمَ الْكِتَابَ وَ الْحِكْمَةَ وَاٰتَيْنَاهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا"[۲]

"یا وہ لوگوں (محمدؐ و آل محمدؐ) سے اس فضل کی وجہ سے حسد کرتے ہیں جو انہیں اللہ نے دیا ہے (تو اس کا کیا علاج ہے) ہم نے تو ابراہیمؑ کی اولاد کو کتاب اور عقل کی باتیں عطا فرمائی ہیں اور ان کو بہت بڑی سلطنت بھی دی ہے۔"

اور ایک جگہ فرماتا ہے:

"قُلِ اللّٰهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَ تَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ وَ تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَ تُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ"[۳]

---

[۱] سورۂ انعام، آیت ۱۲۴

[۲] سورۂ نسا، آیت ۵۴

[۳] سورۂ آل عمران، آیت ۲۶

www.shiabookspdf.com

"کہہ دیجیے اے اللہ، تو ہی حکومتوں کا مالک ہے، جسے چاہتا ہے حکومت دے دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے حکومتیں چھین لیتا ہے اور جسے چاہتا ہے عزت عطا کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے ذلیل وخوار کر دیتا ہے، تمام اچھائیاں تیرے ہاتھ میں ہیں اور تو ہر چیز پر قادر ہے۔"

ظاہری بات ہے کہ اگر کوئی قرآن کے اس اُصول کے اوپر ایمان راسخ رکھتا ہو تو وہ ہرگز اُن لوگوں سے حسد نہیں کرے گا، کہ جنہیں اللہ نے اپنی حکمتوں کے تحت مقام نبوّت و امامت وولایت عطا کیا ہے، اور کبھی حکمت الٰہیہ پر سوالیہ اُنگلی نہیں اُٹھائے گا۔

ایک نکتہ

حسد، معاشرتی فسادات کی جڑ

حسد جیسی ایک نہایت نچلے طبقے کی صفت، پوری تاریخ میں تمام بڑی معاشرتی مشکلات اور دردناک حوادث کا باعث بنی ہے، بہت سے لوگ ظرفیت کی کمی، ثقافتی سطح کے نیچے ہونے اور ایمان کے ضعف اور نفس پر اعتماد نہ ہونے کے باعث، جوں ہی یہ دیکھتے ہیں کہ ایک حسین ترین کامیابی اُن کے دوستوں، عزیزوں یا جان پہچان والوں میں سے کسی ایک کو نصیب ہو رہی ہے تو اُن کے اندر حسد کی آگ بھڑک اُٹھتی ہے اور بجائے اس کے کہ اُس کی کامیابی پر خوش ہوں اور اُس کی کامیابی کو اپنی اور دوسروں کی کامیابی کا ذریعہ بنائیں اور اُس کی خاص خوبیوں اور صلاحیتوں سے کچھ سیکھنے اور خود کو اُس کے مطابق ڈھالنے کے بجائے، اُس کے توڑ میں اُس کے مدمقابل کھڑے ہو جاتے ہیں، کبھی ناروا سلوک کے ذریعے اور کبھی تحقیر ومذمت کے ذریعے اور کبھی اُس کے راستے میں رُکاوٹیں کھڑی کرنے کے ذریعے، جہاں تک اُن سے ممکن ہو پوری کوشش کر لیتے ہیں۔ اور جب کبھی یہ مسئلہ زیادہ گرمی اختیار کر جاتا ہے تو اس حسد میں اُس شخص کا خون بھی بہا دیا جاتا ہے۔

یاد رہے کہ نسلِ انسانی میں جو سب سے پہلا خون بہا، وہ ہابیل کا خون تھا جو کہ حضرت آدمؑ کے بیٹے تھے اور اُس کی ساری کی ساری وجہ یہ حسد ہی تھا جو کہ قابیل کے اندر اُبل رہا تھا، کیونکہ بھائی ہابیل کی قربانی اللہ کی بارگاہ میں قبول ہو گئی تھی اور اُس کی قربانی قبول نہیں ہوئی تھی۔

یہی مسئلہ بار بار انسانی تاریخ میں تکرار ہوا ہے اور بھائی نے بھائی کو اور اولاد نے اولاد کو یا اولاد نے باپ کو قتل کر دیا ہے یا اُس کے برعکس ہوتا رہا ہے۔ صدرِ اسلام میں ہونے والے بیشتر دردناک واقعات خصوصاً امیر المومنینؑ کی خلافت کے

www.shiabookspdf.com

دوران پیش آنے والے تمام حادثات صرف حاسدوں کے حسد کی وجہ سے پیش آئے تھے جیسا کہ مندرجہ بالا خطبے میں امامؑ نے اشارہ کیا ہے، ہماری روایات اس اخلاقی گندگی کے خلاف بہت زیادہ ہیں، تمام روایات میں حسد کو پورے پورے معاشرے کے فساد کا باعث کہا گیا ہے، جس طرح سے ہم مولا علیؑ کی ایک حدیث پڑھتے ہیں، آپؑ فرمایا:

"إِذَا أَمْطَرَ التَّحَاسُدُ نَبِتَ التَّقَاسُدُ"

"جب حسد کی بارش (دلوں کی سرزمین پر) برستی ہے تو (اُس میں) فساد اور تباہی اُگتی ہے (اور انسانی معاشروں کو بدبختیوں اور تباہیوں کے دہانے پر لا کے کھڑا کر دیتی ہے)۔"[۱]

ایک اور اہم نکتہ جو ہمیں اس خطبے سے سیکھنے کے لیے ملتا ہے، وہ یہ ہے کہ جو لوگ الٰہی نعمتوں کی خاطر حسد کا نشانہ بن جایا کرتے ہیں، انہیں حاسدوں کو اُن کے ہی جیسا جواب نہیں دینا چاہیے، بلکہ جہاں تک ہو سکے نعمتوں کا شکرانہ اس عمل کو قرار دیں کہ وہ حسد کرنے والے کے ساتھ ٹھنڈے طریقے اور محبت کی روش سے برتاؤ کریں اور محبت کے پانی سے اس کے حسد کی آگ کو بجھا دیں، اس بات کو عرب کے شعرا میں سے ایک شاعر کے کلام پر ختم کرتے ہیں، وہ کہتا ہے:

"اِصْبِرْ عَلَى حَسَدِ الْحَسُودِ فَإِنَّ صَبْرَكَ قَاتِلُهُ   اَلنَّارُ تَأْكُلُ نَفْسَهَا إِنْ لَمْ تَجِدْ مَا تَأْكُلُهُ"

"حسد کرنے والے کے حسد کے بدلے میں صبر کا مظاہرہ کرو، کیوں کہ تمہارا صبر ہی اُسے کھا جائے گا، کیوں کہ آگ جب جلانے کے لیے کچھ نہ پائے تو اپنے آپ کو ہی ختم کر دیتی ہے۔"[۲]

---

[۱] غرر الحکم، شمارہ ۵۲۴۲

[۲] بحار الانوار، جلد ۷۰، ص ۲۵۸

www.shiabookspdf.com

www.shiabookspdf.com

چونتیسواں خطبہ

ومن خطبة له علیه السلام [1]

فِي اسْتِنْفَارِ النَّاسِ إِلَى أَهْلِ الشَّامِ بَعْدَ فَرَاغِهِ مِنْ أَمْرِ الْخَوَارِجِ. وَفِيهَا يَتَأَفَّفُ بِالنَّاسِ، وَيَنْصَحُ لَهُمْ بِطَرِيقِ السَّدَادِ

امامؑ نے اس خطبے کو لوگوں کو شامیوں کے خلاف جنگ کے لیے تیار کرنے کے لیے ارشاد فرمایا اور یہ اُس وقت ہوا جب آپؑ نہروان میں خوارج کا معاملہ نمٹا چکے تھے۔ (اور اُن کا فتنہ اور اُس کی آگ تھم چکی تھی) اس خطبے میں لوگوں کے جہاد کے معاملے میں سُستی اور کوتاہی پر شدید ناراضی کا اظہار فرماتے ہیں اور اُنہیں صحیح اور منطقی طریقے سے سمجھا رہے ہیں۔

خطبے کی شان ورود

جیسا کہ اشارہ کیا جا چکا ہے کہ مولاؑ نے اس خطبے کو جنگ نہروان کے اِختتام کے بعد ارشاد فرمایا ہے۔ ابن ابی الحدید کے کلام کے ظاہر سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ امامؑ نے اس خطبے کو نہروان کی سرزمین پر ہی بیان فرمایا ہے جبکہ نصر ابن مزاحم نقل کرتا ہے کہ امامؑ نے مذکورہ خطبے کو نہروان سے لوٹنے کے بعد اپنے سپاہیوں کی شامیوں کے خلاف جنگ کی تیاری کے سلسلے میں سستی

[1] اس خطبے کو طبری نے اپنی تاریخ میں جلد ۶، صفحہ ۵۱ پر اور ابن قتیبہ نے الامامۃ والسیاسۃ میں جلد ۱، صفحہ ۱۵۰ پر اور بلاذری نے انساب الاشراف میں (صفحہ ۳۸۰) بطور مختصر ذکر کیا ہے، نیز مرحوم شیخ مفیدؒ نے امالی، مجلس ۱۸ میں مزید واضح انداز میں ذکر کیا ہے بہ نسبت نہج البلاغہ کے (مصادر نہج البلاغہ، جلد ۱، صفحہ ۴۲۵)۔ مرحوم علامہ مجلسی نے بحار الانوار میں بھی اس خطبے کو محمد بن طلحہ شافعی کی مطالب السئول کے حوالے سے ذکر کیا ہے (بحار الانوار، جلد ۷۴، صفحہ ۳۳۳)

www.shiabookspdf.com

و کا بلی کو دیکھ کر کوفہ میں ارشاد فرمایا ہے۔ [۱]

نہج البلاغہ کے بعض دیگر شارحین نے وضاحت کی ہے کہ مولاؑ نے نہروان میں اس بات پر اصرار فرمایا کہ بغیر وقت ضائع کیے سارا لشکر شامیوں کی سمت حرکت کرنے کے لیے تیار ہو جائے تا کہ باقی افراد بھی ہم سے ملحق ہو جائیں، کیوں کہ آپؑ کو معلوم تھا کہ اگر کوفہ پہنچ گئے اور ان لوگوں نے جنگی لباس اپنے جسم سے اُتار دیے تو انہیں دوبارہ جنگ کے لیے تیار کرنا پھر اتنا آسانی سے ممکن نہ ہوگا، مگر انھوں نے مختلف بہانوں مثلاً موسم کا ٹھنڈا ہونا، زخمیوں کی تعداد کا لشکر میں زیادہ ہونا اور اسلحے کا وافر مقدار میں نہ ہونا وغیرہ وغیرہ کے ذریعے حکم امامؑ سے روگردانی کر لی۔ مولاؑ کو پھر مجبوراً کوفے کی طرف لوٹنا پڑا اور پھر انہیں تاکید فرمائی کہ اپنے آپ کو جلد سے جلد اصلی دشمن سے لڑنے کے لیے تیار کرلیں، مگر (جیسا کہ خدشہ تھا وہی ہوا) اور اُنہوں نے لیت ولعل سے کام لیا، یہ وہ وقت تھا کہ مولاؑ نے نہایت ناراضی کے ساتھ پھر یہ خطبہ ارشاد فرمایا۔ [۲]

خطبہ، ایک نظر میں

اس خطبے میں تین اہم موضوع ہیں:

۱۔ اس خطبے کا زیادہ تر حصہ دشمن سے جہاد کی تاکید اور ترک جہاد کے بُرے انجام کے بارے میں ہے۔ امامؑ خطبے کے اس حصے میں (جو کہ خطبے کا سب سے خاص حصہ ہے) کوفیوں کو ملامت کا نشانہ بنا کر اپنے انسان ساز اور شدید جملوں کے ذریعے ان کی سرزنش فرما رہے ہیں، مگر مولاؑ نے یہ طریقۂ کار اور یہ لہجہ بھی کئی مرتبہ انہیں پیار، محبت اور استدلالی اور منطقی طریقوں سے تیار کرنے کی کوششوں میں ناکام ہونے کے بعد اختیار فرمایا، کیوں کہ آپؑ کے پاس اس آخری تلخ دوا کے سوا اور کوئی دوا اور کوئی چارۂ کار نہ تھا۔ کبھی انہیں اُن پاگل افراد سے تشبیہ دیتے ہیں جنھوں نے اپنے شعور وادراک کو گنوا دیا ہے اور اپنے نفع ونقصان کی تشخیص بھی نہیں کر سکتے، اور کبھی اُنہیں اُن بیابانوں میں بھٹکتے ہوئے اُونٹوں سے تشبیہ دیتے ہیں، جو اپنے ساربان سے دور ہو گئے ہوں اور ان میں معمولی سا نظم وضبط بھی باقی نہ رہا ہو۔ اس کے بعد آپؑ ان لوگوں کو اس دشمن سے خبردار کرتے ہیں جو انتہائی بے رحم وخوں خوار ہے اور اُن کے انتظار میں ہے اُس کے حوالے سے شدید ترین دھمکیاں انہیں دیتے ہیں، اور ممکنہ حملوں سے ڈراتے ہیں تا کہ وہ لڑنے کے لیے تیار ہو جائیں۔

۲۔ اس خطبے کے دوسرے حصے میں مولاؑ اپنے عزمِ راسخ اور دشمن سے لڑنے کے حتمی فیصلے کا اعلان کر رہے ہیں خواہ

---

[۱] شرح نہج البلاغہ، ابن ابی الحدید، جلد ۲، صفحہ ۱۹۲

[۲] شرح نہج البلاغہ، ابن میثم بحرانی، جلد ۲، صفحہ ۷۷، اور شرح نہج البلاغہ، علامہ خوئی جلد ۴، صفحہ ۷۲

www.shiabookspdf.com

لوگوں کی بڑی تعداد آپؑ کے ساتھ جانا چاہے یا قلیل تعداد۔

۳۔آخری حصے میں امام اور اُمت کے حقوق پر گفتگو فرماتے ہیں، سب سے پہلے امام پر جو اُمت کے حقوق واجب ہیں اُن کا ذکر کرتے ہیں اور چار مختصر جملوں میں اُن اُصولوں کا تذکرہ فرماتے ہیں، اور پھر اگلے چار جملوں میں اُمت پر جو امام کے حقوق ہیں ان کو بیان فرماتے ہیں۔ گویا مولاؑ اس خطبے کے اوائل کی تلخی کو خطبے کے آخری حصے کی شیرینی کے ساتھ ملا دینا چاہتے ہیں تا کہ ایک ایسا معجون اور مرہم بن جائے جو اس قوم کی سستی اور کاہلی کے مرض کے لیے دوا بن جائے۔

پہلا حصہ

أُفٍّ لَكُمْ لَقَدْ سَئِمْتُ عِتَابَكُمْ أَرَضِيتُمْ بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا مِنَ الْآخِرَةِ عِوَضاً وَبِالذُّلِّ مِنَ الْعِزِّ خَلَفاً إِذَا دَعَوْتُكُمْ إِلَى جِهَادِ عَدُوِّكُمْ دَارَتْ أَعْيُنُكُمْ كَأَنَّكُمْ مِنَ الْمَوْتِ فِي غَمْرَةٍ وَمِنَ الذُّهُولِ فِي سَكْرَةٍ يُرْتَجُ عَلَيْكُمْ حَوَارِي فَتَعْمَهُونَ وَكَأَنَّ قُلُوبَكُمْ مَأْلُوسَةٌ فَأَنْتُمْ لَا تَعْقِلُونَ مَا أَنْتُمْ لِي بِثِقَةٍ سَجِيسَ اللَّيَالِي وَمَا أَنْتُمْ بِرُكْنٍ يُمَالُ بِكُمْ وَلَا زَوَافِرُ عِزٍّ يُفْتَقَرُ إِلَيْكُمْ.

"وائے ہو تم پر!۔۔۔ میں تمہیں سرزنش کر کر کے تھک گیا ہوں۔ کیا تم نے دُنیا کی پست زندگی کو آخرت کی (ہمیشگی اور سعادت بخش) زندگی کے بدلے قبول کر لیا ہے؟ اور عزت وسربلندی کے بدلے میں ذلت و بدبختی کو چن لیا ہے؟ جب میں تمہیں دشمن سے جہاد کرنے کے لیے بُلاتا ہوں تو ڈر کے مارے تمہاری آنکھیں ایسے اپنے آپ میں چکر کھانے لگتی ہیں کہ جیسے گویا موت کی وحشت نے تمہارے ہوش اُڑا دیے ہوں، اور کسی نشے کی مستی میں اپنے آپ سے بے خود ہو گئے ہو، میری مکرر باتیں تمہارے کانوں میں جا ہی نہیں رہی ہیں (اور صحیح راہ کو ڈھونڈنے میں) تم سرگرداں ہو گئے ہو اور گویا تمہاری عقلیں زائل ہو گئی ہیں اور تم کسی چیز کو درک نہیں کر رہے۔ تم لوگ ہرگز میرے اعتماد میں نہیں ہو اور کبھی بھی قابل بھروسہ نہیں ہو سکتے کہ (حیلہ گر اور خونخوار دشمن کے مقابلے میں) تم پر بھروسہ کیا جا سکے اور نہ ہی تم ایسے توانا اور قدرت مند ساتھیوں میں سے ہو کہ بصورتِ ضرورت تمہاری جانب دیکھا جا سکے۔"

www.shiabookspdf.com

شرح وتفسیر

وائے ہو تم لوگوں پر!۔۔۔شہادت سے کیوں ڈرتے ہو؟

اس خطبے کے سب سے پہلے حصے میں امامؑ لشکر کوفہ کی خودسری اور اُن کے ملک گیر خطروں کی نسبت بے توجہی کو دیکھتے ہوئے اُنہیں اپنی سرزنش اور عتاب سے بھرپور سخت جملوں کے تازیانوں کا نشانہ بنا رہے ہیں کہ شاید اُن کی بے حس روحیں اس طرح سے بیدار ہو جائیں اور اس خطرے کے پیشِ نظر کوئی موثر قدم اُٹھا لیں۔ یہ اس حال میں تھا کہ شام کے غارت گروں نے مستقل مملکت اسلامی کے مختلف علاقوں پر یکا یک حملے کرنا شروع کر دیے تھے اور طرح طرح کے مظالم اور خونریزی و غارت گری میں مصروف تھے تا کہ اس طرح سے پہلے تو لشکرِ مولا علی علیہ السلام کی روح کو کمزور اور ناتواں بنا دیں، اور پھر اُن کا مزید نقصان کریں۔ لہٰذا امامؑ فرماتے ہیں:

"أُفٍّ لَكُمْ [۱] لَقَدْ سَئِمْتُ عِتَابَكُمْ" [۲]

"وائے ہو تم لوگوں پر! میں نے تو تمہیں اتنی سرزنش کی ہے کہ تھک گیا ہوں۔"

اس تھکن کی دلیل واضح ہے، کیونکہ عتاب، وہ بھی مولا علیؑ جیسی ایک بزرگوار ہستی کی جانب سے تو پھر ضرور اس کا اثر انہیں متحرک کرنے میں اور ان کی اصلاح میں ایک اہم کردار ادا کرے گا۔

مگر جب مخاطبین کی بے خبری اور اُن کی غفلت کی شدت کے باعث اُن پر کوئی اثر نہ کر سکے تو یہ چیز بہت تھکا دینے والی ہوتی ہے۔ پھر مولاؑ اضافہ فرماتے ہیں:

---

[۱] "راغب" مفردات میں کہتے ہیں، "اُف" دراصل یہ ہر گندی اور آلودہ چیز کے لیے استعمال ہوتا ہے اور توہین اور تحقیر کے لیے بھی کہا جاتا ہے، مثلاً کہتے ہیں: افففت بکذا یعنی میں نے اُس چیز کو آلودہ جان کر کے اُس سے اظہار نفرت کر لیا ہے، بعض نے کہا ہے کہ "اُف" دراصل ناخن کے نیچے جمع ہو جانے والی گندگی کو کہتے ہیں۔ "اُف" کے ایک اور معنی بھی کیے گئے ہیں، من جملہ ناراضی کا اظہار، سرزنش اور بد بو کے لیے بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے اور چوں کہ "وائے ہو تم پر" کا جملہ نفرت اور ناراضگی کے اظہار اور سرزنش کی دلالت کر رہا ہے اس لیے "اُفٍّ لکم" کے جملے کے ترجمے میں، میں نے "وائے ہو تم پر" کا ترجمہ چنا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اصل میں یہ کلمہ یہاں سے لیا گیا ہے کہ جب کبھی گرد و غبار یا دھول مٹی کہیں بدن یا کپڑوں پر بیٹھ جاتی ہے تو انسان اُسے پھونک مار کر اپنے آپ سے دور کر لیتا ہے، تو جو آواز اس دوران انسان کے منہ سے نکلتی ہے وہ کچھ اُوف یا اُف سے مشابہت رکھنے والی آواز ہوتی ہے اور بعد میں یہ لفظ نفرت اور ناراضی کے اظہار کے لیے استعمال ہونے لگا۔ تمام تر قرائن اور تمام تر نظریات کو جمع کرنے کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ دراصل "اسم صوت" ہے۔

[۲] "سئمت" کا لفظ "سئم" کے مادّے سے ہے اور ملال کے معنی میں آتا ہے، کبھی "مِن" کے ساتھ مل کر متعدی ہو جاتا ہے اور کبھی مِن کے بغیر کہا جاتا ہے۔ سَئِمْتُهُ اور سَئِمْتُ مِنْهُ دونوں کے ایک ہی معنی ہیں، اس بناء پر سئمت عتابکم کا لفظ سئمت مِن عِتابِکُم کا معنی رکھتا ہے۔

www.shiabookspdf.com

"أَرَضِيتُمْ بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا مِنَ الْآخِرَةِ عِوَضًا؟ وَبِالذُّلِّ مِنَ الْعِزِّ خَلَفًا؟"

"کیا تم لوگوں نے دنیا کی پست زندگی کو آخرت (کی ابدی اور سعادت بخش) زندگی کے بدلے میں قبول کر لیا ہے؟ اور عزت و سربلندی کے بجائے ذلت اور بدبختی کو خرید لیا ہے؟"

یہ تمہاری موت کی سی خاموشی اور جہاد سے تمہارا اس طرح فرار کرنا یہ بتا رہا ہے کہ تم نے ایک طرح سے اپنی آخرت کو تباہ کر ڈالا ہے، کیوں کہ تم نے اُسے اپنی دنیا کی چند روزہ زندگی کے بدلے بیچ ڈالا ہے اور دوسری جانب سے تم نے اپنی دنیا کو ویران کر ڈالا ہے، کیوں کہ تم نے عزّت اور سربلندی کا ذلت سے تبادلہ کر ڈالا ہے؟ کیوں کہ باعزّت موت ایک ذلّت سے بھری ہوئی زندگی سے کہیں بہتر ہے۔ یہ وہ پیغام ہے کہ جسے ہمیشہ تاریخ بشریت کے بزرگان اور اولیاء اللہ نے اپنی پیروی کرنے والوں کو ہر دور اور ہر زمانے میں دیا ہے۔ مولا علی علیہ السلام نہج البلاغہ میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں:

"فَالْمَوْتُ فِي حَيَاتِكُمْ مَقْهُورِينَ وَالْحَيَاةُ فِي مَوْتِكُمْ قَاهِرِينَ"

"شکست کے ساتھ زندگی میں تمہاری موت ہے اور غلبہ حاصل کر کے مرجانے میں زندگی ہے۔"[1]

اور سیّد الشہداء حضرت امام حسین علیہ السلام اپنی اُس تاریخی گفتگو میں فرماتے ہیں:

"أَلَا وَإِنَّ الدَّعِيَّ ابْنَ الدَّعِيِّ قَدْ رَكَزَنِي بَيْنَ اثْنَتَيْنِ بَيْنَ السِّلَّةِ وَالذِّلَّةِ وَهَيْهَاتَ مِنَّا الذِّلَّةُ"

"آگاہ رہو کہ اس نجس ابن نجس نے مجھے ایک دوراہے پر کھڑا کر دیا ہے، ذلت اور تلوار کے بیچ میں اور ھیھات، کہ ہم ذلت کو قبول کریں (بے شک، ہم مقابلہ کرنے اور شہادت پانے کو ہی ان دونوں میں سے چنیں گے)۔"

اور دوسری جگہ پر لشکر کوفہ سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"إِنْ لَمْ يَكُنْ لَكُمْ دِينٌ وَكُنْتُمْ لَا تَخَافُونَ الْمَعَادَ فَكُونُوا أَحْرَارًا فِي دُنْيَاكُمْ"

"اگر تم لوگوں کا کوئی دین نہیں ہے اور تم روزِ قیامت سے نہیں ڈرتے تو کم از کم اپنی دنیا میں تو آزاد رہو۔"

واقعتاً امامؑ کے جملے آپؑ کی تھکن پر دلالت کر رہے ہیں کہ جو آپ کو اِن لوگوں کو سرزنش اور ڈانٹ ڈپٹ کر کے ہوئی ہے۔

گویا وہ لوگ یہ ٹھان چکے تھے کہ ذلّت وحقارت اور پروردگارِ عالم کے غضب کو عزّت و شرف اور رضائے حق پر ترجیح دیں، اسی وجہ سے اُن پر کسی بھی سرزنش کا اثر نہیں ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ امامؑ انہیں ڈانٹ ڈانٹ کر تھک گئے تھے۔ اگلے جملوں میں مولاؑ اُن کے ضعف اور کمزوری پر انگلی اُٹھا کر نشان دہی کر رہے ہیں تا کہ وہ اپنے آپ میں آئیں اور کمزوریوں کو

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ ۵۱

www.shiabookspdf.com

برطرف کر کے اپنی بدبختیوں کی جڑیں اُکھاڑ پھینکیں۔فرماتے ہیں:

"إِذَا دَعَوْتُكُمْ إِلَى جِهَادِ عَدُوِّكُمْ دَارَتْ أَعْيُنُكُمْ، كَأَنَّكُمْ مِنَ الْمَوْتِ فِي غَمْرَةٍ[۱] وَ مِنَ الذُّهُولِ فِي سَكْرَةٍ. يُرْتَجُ عَلَيْكُمْ حَوَارِي[۲] فَتَعْمَهُونَ"[۳]

"جب میں تمہیں دشمن سے جہاد کے لیے بُلاتا ہوں تو ڈر کے مارے تمہاری آنکھیں اپنے آپ میں ایسے چکر کھانے اور گھومنے لگتی ہیں کہ جیسے گویا موت کے خوف و وحشت نے تمہارے ہوش اُڑا دیے ہوں یا جیسے کسی نشے کی مستی میں اپنے ہوش کھو بیٹھے ہو، میری مکرّر باتیں تمہارے کانوں میں جاتی ہی نہیں ہیں، اسی وجہ سے تم (جینے کی صحیح راہ کو ڈھونڈنے میں) سرگرداں ہو گئے ہو۔"

"يُرْتَجُ عَلَيْكُمْ حَوَارِي" کا جملہ اس بات کے پیش نظر کہ حوار کے معنی ہیں بار بار کہنا اور "يُرْتَجُ" کا لفظ رتج کے مادّے سے ہے اور بند ہونے کے معنی رکھتا ہے۔ اس طرح سے اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں: پہلا تو یہ کہ جو اوپر بیان کیا گیا یعنی میری مکرّر باتیں تمہارے اندر اثر نہیں کر رہی ہیں اور گویا تم لوگ بالکل دَرک ہی نہیں کر رہے ہو۔ کیونکہ باتوں کو سمجھنے کے دروازے تم نے خود اپنے لیے بند کر لیے ہیں۔ دوسرے معنی یہ کہ تمہاری زبانیں میرے جواب میں بند ہو جاتی ہیں کیونکہ تمہارے پاس میرے لیے کوئی منطقی جواب ہے ہی نہیں۔ بہر حال دونوں معانی کا نتیجہ وہی ہے جو اوپر کے جملے میں ذکر ہوا ہے یعنی اُن کا سرگرداں ہو جانا (بھٹکنا)۔

اِسی بات کی تاکید میں فرماتے ہیں:

"وَ كَأَنَّ قُلُوبَكُمْ مَأْلُوسَةٌ[۴] فَأَنْتُمْ لَا تَعْقِلُونَ"

"گویا تمہاری عقلیں زائل ہو گئی ہیں اور تم کچھ اِدراک ہی نہیں کرتے۔"

---

[۱] غمرۃ۔ دراصل کسی چیز کو چھپانے اور ڈھانکنے کے معنی میں آتا ہے، وہ بھی ایسا ڈھانکنا کہ اُس کی ایک جھلک بھی نمایاں نہ رہے اور جن مواقع پر غفلت اور وحشت، انسان کی پوری فکر کو گھیر لے، وہاں یہ الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔ اور جیسا کہ لشکر کوفہ کی موت کے ڈر سے ایسی حالت تھی، اس تعبیر کو اُن کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔

[۲] حوار۔ کا لفظ حور کے مادّے سے ہے اور لوٹنے کے معنی رکھتا ہے کسی حلق میں پھنس جانے والے نوالے (لقمے) کو کہا جاتا ہے جبکہ وہ اندر اُتر جائے اور جو گفتگو لوگوں کے درمیان ہوتی ہے اور جو آمد و رفت اور تعلّقات اُن کے مابین ہوتے ہیں، اُسے (محاورہ) کہا جاتا ہے۔ اُوپر کے خطبے میں بھی اسی معنی پر اطلاق کر رہا ہے۔

[۳] تَعْمَهُونَ۔ کا لفظ عمہ کے مادّے سے آیا ہے اور حیرت و سرگردانی کے معنی میں ہے۔

[۴] مَأْلُوسَة۔ کا لفظ اَلْس کے مادّے سے ہے اور دراصل عقل گنوا دینے کے معنی رکھتا ہے۔ اسی وجہ سے دھوکا، چال بازی وغیرہ کے لیے یہ لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ (کیونکہ یہ انسان کی عقل کو باندھ دیتے ہیں)

www.shiabookspdf.com

پھر مولا اپنے گزشتہ جملوں کے لیے ایک نتیجہ اخذ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"مَا أَنْتُمْ لِي بِثِقَةٍ سَجِيْسَ [۱] اللَّيَالِيْ"

"تم لوگ ہرگز میرے معتمد نہیں ہو۔" اس بات کے پیش نظر کہ سَجِيْسُ اللَّيَالِيْ کا لفظ راتوں کی تاریکی کے معنی میں آتا ہے، اس جملے کا مفہوم کچھ یوں بنتا ہے کہ میں تم پر بھروسا نہیں کرتا اور یہ کنایہ ابدیت اور ہمیشگی کی دلیل ہے۔ کیونکہ تاریکی وظلمت کبھی رات سے الگ نہیں ہوتی اور نہ ہوگی۔ تاریکی شب کی تعبیر کا، کوفیوں کے سیاہ اور ظلم پر مبنی اعمال کو مدنظر رکھتے ہوئے، انتخاب کرنا مقتضائے حال کی رعایت کے زُمرے میں آتا ہے جسے فصاحت و بلاغت میں شمار کیا جاتا ہے اور پھر تاکید فرماتے ہیں:

"وَمَا أَنْتُمْ بِرُكْنٍ يُمَالُ بِكُمْ، وَلَا زَوَافِرِ [۲] عِزٍّ يُفْتَقَرُ إِلَيْكُمْ"

"اور تم لوگ ہرگز کوئی قابل اطمینان تکیہ گاہ نہ ہو گے کہ (خونخوار اور حیلہ گر دشمنوں کے مقابلے میں) تم پر بھروسہ اور اعتماد کیا جاسکے اور نہ ہی توانا ساتھی ہو کہ بوقت ضرورت تمہاری طرف دیکھ سکیں۔"

اِس طرح سے اِمام عالی مقامؑ اپنے مختصر اور تابڑتوڑ جملوں کے ذریعے اس سُست اور ضعیف اراووں والے گروہ کی نسبت اپنی بے اعتمادی کا اظہار کرتے ہیں اور ان کی کمزوریوں کو شمار کرتے ہیں۔ شاید کہ یہ باتیں اور یہ نصیحتیں اُن کے سوئے ہوئے ضمیر اور اُن کی بے حس روح کو بیدار اور آگاہ کردیں، تاکہ وہ اپنے خونخوار دشمن کی اینٹ سے اینٹ بجادینے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوں اور متحد ہو کر بھرپور شجاعت کے ساتھ میدانِ جنگ میں اُتر آئیں۔

ایک اہم نکتہ

اس قدر سرزنش آخر کس لیے ہے؟

[۱] سَجِيْسَ - کا لفظ سجس کے مادّے سے ہے اور پانی کی رنگت کے بدل جانے اور اُس کی کُدورت کے معنی میں آتا ہے۔ اسی لیے رات کی تاریکی کو سجیسُ اللّیالی کہا جاتا ہے، اور یہ تعبیر کبھی کبھار دوام و بقا اور ہمیشگی کے لیے بھی استعمال ہوتی ہے، مثال کے طور پر اگر یہ کہا جائے کہ جب تک رات کی تاریکی ہے اور دن کی روشنی قائم ہے، میں اس کام کو انجام دیتا رہوں گا، اور یہ خطبہ بھی یہی مفہوم رکھتا ہے۔

[۲] زَوَافِر - کا لفظ زافرۃ کی جمع ہے اور دراصل زفر - کے مادّے سے ہے اور اس کے معنی میں اتنی زور سے سانس لینا کہ آواز سنائی دے۔ اور آگ کے جلنے کی آواز کو بھی زَفِیْر کہتے ہیں۔ زافرۃ کا لفظ ساتھیوں، مددگاروں اور قوم و خاندان کے لیے استعمال ہوتا ہے کیونکہ وہ لوگ مدد کرنے کے سنگین بوجھ کو اپنے کاندھوں پہ اٹھاتے ہیں اور جلد سے جلد اور بہتر سے بہتر انداز میں کام کو مقصد تک پہنچا دیتے ہیں۔

www.shiabookspdf.com

ایک بار پھر ہم اس سوال کا جواب دینے پر مجبور ہیں کہ امام عالی مقامؑ نے اتنی فہم و درایت اور سربراہی کی صلاحیتوں کے باوجود، کیوں ان تمام کوفیوں کو اپنے عتابِ سخن اور شدید ترین تعبیرات سے لبریز خطاب کا نشانہ بنا رہے ہیں؟ کیا تمام سرزنشیں اور اُن کی نسبت عدم اعتماد کا اظہار اُن لوگوں کے تعصّب، ضد نفرت اور دوری کا باعث نہیں بنتا؟ تو پھر آخر کیوں مولاؑ نے اپنے شدت آمیز جملوں کے ذریعے اُنہیں اپنے اہداف سے مزید دور کر دیا؟

اس سوال کا جواب ہم یہ دیتے ہیں کہ یہ ملحوظ خاطر رہے کہ مولاؑ نے اپنی چہرہ شناس اور دوررس نگاہوں سے کوفیوں کے مزاج کو اچھی طرح سے درک کر لیا تھا، اور جیسا کہ تاریخ بتاتی ہے، اُن کی حالت ایسی تھی کہ جب تک وہ لوگ اپنی ذات کو خطرے اور تباہی کی زد پر نہ دیکھتے تھے، اپنی جگہ سے ہلتے نہیں تھے بلکہ یوں کہیں کہ جب تک ان کی نازک ترین رگ پر شدت وعتاب کے نشتر نہیں پڑتے تھے، وہ ہوش میں نہیں آتے تھے۔

انسانی معاشروں میں ہمیشہ کوئی نہ کوئی گروہ، ہر چند کہ تعداد کے لحاظ سے کم ہوا یسا نظر آتا ہے کہ جب تک اُن پر آخری ضربت نہیں پڑ جاتی وہ بیدار نہیں ہوتے۔ امامِ عالی مقامؑ کی اِن باتوں کا مفہوم یہ بھی نہیں کہ ہم اِس طریقے کو ہر جگہ اور ہر غیر ذمے دار اور غافل گروہ کے لیے استعمال کریں، کیونکہ افراد مختلف قسم کے ہیں:

بعض صرف ایک مختصر سی سرزنش سے یا پیار محبت سے ہی سُدھر جاتے ہیں اور سیدھی راہ پر آجاتے ہیں۔ بعض گویا ہاتھی کی طرح ہیں کہ جب تک ہاتھی سوار اُن کے دماغ پر ہتھوڑے نہ مارے وہ جگہ سے ہلتے تک نہیں۔

لہٰذا ایسے گروہ کے لیے اِس روش کو زخم پر دوا کے طور پر استعمال کیا جائے تو یہ ایک بہترین کام ہوگا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ یہ باتیں مؤثر ثابت ہوئیں اور کوفے کے لوگوں کا ایک بڑی تعداد پر مشتمل گروہ نخیلہ نامی لشکر گاہ کی جانب نکل پڑا جو کہ کوفہ سے قریب ایک مقام تھا اور شام کے فتنہ انگیزوں سے مقابلہ کرنے کے لیے سینہ سپر ہو گیا، ہر چند صد افسوس کہ اجل نے مہلت نہ دی، ہمارے مولاؑ، اشقی الآخرین ابن ملجم کی تلوار کی ضربت سے شہید ہو گئے۔

اس بات کی حقّانیت کا دوسرا ثبوت یہ ہے کہ مولاؑ نے اپنی حکومت کے آغاز میں کوفے کے لوگوں کی کافی تعریف فرمائی ہے۔[1] مگر جب وہ لوگ سستی اور کاہلی دکھانے لگے اور امیر شام کے لشکر میں طاقت آگئی، وہ شیر ہونے لگا اور روزانہ ملکِ اسلام کے کسی نہ کسی حصے کو اپنے حملوں کا نشانہ بنانے لگا، لہٰذا مولاؑ کو اِن تابڑ توڑ جملوں کا استعمال کرنا پڑا۔

دوسرا حصہ

[1] مثال کے طور پر خطبہ نمبر ۱۰۷ اور نمبر ۱۰۸ کو ملاحظہ کیجیے۔

www.shiabookspdf.com

مَا اَنْتُمْ اِلَّا كَاِبِلٍ ضَلَّ رُعَاتُهَا فَكُلَّمَا جُمِعَتْ مِنْ جَانِبٍ انْتَشَرَتْ مِنْ آخَرَ لَبِئْسَ لَعَمْرُ اللهِ سُعْرُ نَارِ الْحَرْبِ اَنْتُمْ تُكَادُونَ وَ لَا تَكِيدُونَ وَ تُنْتَقَصُ اَطْرَافُكُمْ فَلَا تَمْتَعِضُونَ لَا يُنَامُ عَنْكُمْ وَ اَنْتُمْ فِي غَفْلَةٍ سَاهُونَ غُلِبَ وَ اللهِ الْمُتَخَاذِلُونَ وَ ايْمُ اللهِ اِنِّي لَاَظُنُّ بِكُمْ اَنْ لَوْ حَمِسَ الْوَغَى وَ اسْتَحَرَّ الْمَوْتُ قَدِ انْفَرَجْتُمْ عَنِ ابْنِ اَبِي طَالِبٍ انْفِرَاجَ الرَّاْسِ.

" تمہاری مثال تو اُن اُونٹوں کی سی ہے جن کے چرواہے گم ہو گئے ہوں۔ اگر اُنہیں ایک طرف سمیٹا جائے تو وہ دوسری طرف سے تتر بتر ہو جائیں گے۔ خدا کی قسم! تم جنگ کے شعلے بھڑکانے کے لیے بہت بُرے ثابت ہوئے، تمہارے خلاف سب ہی تدبیریں ہوا کرتی ہیں اور تم دشمنوں کے خلاف کوئی تدبیر نہیں کرتے۔ تمہارے (شہروں کی) حدود (روز بروز) کم ہوتی جا رہی ہیں، مگر تمہیں اِن پر غُصّہ نہیں آتا۔ وہ تمہاری طرف سے کبھی غافل نہیں ہوتے، اور تم ہو کہ غفلت میں سب کچھ بھولے بیٹھے ہوئے ہو۔ خدا کی قسم! ایک دوسرے پر ٹالنے والے ہارا ہی کرتے ہیں۔ خدا کی قسم! میں تمہارے متعلق یہی گمان رکھتا ہوں کہ اگر جنگ زور پکڑ لے اور موت کی گرم بازاری ہو، تو تم ابنِ ابی طالبؑ سے اس طرح کٹ جاؤ گے، جس طرح بدن سے سر (کہ جس کا دوبارہ پلٹنا اور مل جانا ممکن ہی نہیں)۔"

شرح و تفسیر

دُشمن بیدار ہے اور تم خوابِ غفلت میں ہو

خطبے کے اس حصّے میں مولاؑ اپنی شدید سرزنش اور تابڑ توڑ جملوں کو آگے بڑھاتے ہوئے (جو کہ درحقیقت منطق اور دلائل سے لبریز ہیں) لشکرِ کوفہ کو کچھ نئے جملوں سے نواز رہے ہیں اور اضافہ فرماتے ہیں:

"مَا اَنْتُمْ اِلَّا كَاِبِلٍ ضَلَّ رُعَاتُهَا فَكُلَّمَا جُمِعَتْ مِنْ جَانِبٍ انْتَشَرَتْ مِنْ آخَرَ"

"تمہاری مثال تو اُن اُونٹوں کی سی ہے جن کے چرواہے گم ہو گئے ہوں، اگر اُنہیں ایک طرف سے سمیٹا جائے تو وہ دوسری طرف سے تتر بتر ہو جائیں گے۔"

اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ تم لوگ نہایت سُست ارادوں اور منتشر افکار کے حامل ہو۔ اپنی مصلحتوں کا ادراک نہیں کرتے اور اُس میں اتحادِ رائے نہیں رکھتے اور نظم و ضبط اور بھرپور قدرت کے ساتھ دشمن سے مقابلے کے لیے کھڑے نہیں ہوتے۔ اُونٹوں سے تشبیہ سے مُراد اُن کی فکر کی محدودیت کی ہے اور "ضَلَّ رُعَاتُهَا" سے مُراد اُن کی اپنے پیشوا اور امامؑ کی

www.shiabookspdf.com

اطاعت نہ کرنا ہے، اسی لیے حضرتؑ آگے فرماتے ہیں:

"لَبِئْسَ لَعَمْرُ [1] اللهِ! سُعْرُ [2] نَارِ الْحَرْبِ أَنْتُمْ"

"خدا کی قسم! تم لوگ دشمن کے خلاف جنگ کے شعلے بھڑکانے کے لیے بہت بُرے ثابت ہوئے۔"

یہ بات تو خاص وعام تسلیم کرتے ہیں کہ جنگ ایک نہایت ناپسندیدہ اور خطرناک ترین راہِ حل ہے اور اُس کے اثرات میں سے شہروں کی ویرانی، لوگوں کے قتل عام اور کئی انسانوں کے اپنے جسم کے کسی نہ کسی اعضاء و جوارح سے محروم ہوجانے، اور فقر وتنگدستی وغیرہ ہے۔ مگر یہی ناپسندیدہ طریقہ کبھی کبھار معاشرے کے لیے ایک حیات بخش دوا بن جاتا ہے۔

اور یہ اُس صورت میں ہے کہ جب خونخوار اور ظالم دُشمن، مظلوموں کے حقوق کو غصب کرنے کے لیے کھڑے ہوجائیں اور ظلم وفساد کی آگ کو بھڑکادیں، ایسے حالات میں سوائے جنگ کے اور کوئی راہِ حل نہیں ہے جس کے ذریعے معاشرے کو عدل وانصاف اور صلح وسکون لوٹایا جاسکے۔

اِسی حوالے سے قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

"أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا ۚ وَإِنَّ اللهَ عَلَىٰ نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ" [3]

"جن پر جنگ تھوپ دی گئی ہے، اُنہیں جہاد کی اجازت دے دی گئی ہے، کیونکہ اُن پر ظلم کیا گیا ہے اور خدا اُن کی مدد کے لیے طاقتور ہے۔"

دوسری جگہ ارشاد ہوا:

"وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا ۚ إِنَّ اللهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ" [4]

"اور خدا کی راہ میں ان لوگوں سے قتال کرو جو تم سے جنگ کرتے ہیں لیکن اس میں حد سے تجاوز نہ کرو، کیوں کہ خدا زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔"

اسی لیے اگر امامؑ جنگ کرنے کی تاکید فرما رہے ہیں تو اس کا واحد سبب یہی ہے کہ شام کے خون آشام غارت گر بار

---

[1] "لَعَمْرُ اللهِ" کا مفہوم دراصل عُمر اور مدتِ زندگی کی قسم کھانا ہے۔ مگر جیسا کہ معلوم ہے کہ خدا کا عمر اور زندگی کی قسم کھانا کوئی معنی نہیں رکھتا، لہٰذا اِس سے مراد اللہ کی ذات کی قسم ہے۔ اِسی جلد کے ۲۴ ویں خطبے کے آغاز میں، اِس جملے کی مزید تشریح کی گئی ہے۔

[2] "سُعر" کا لفظ "ساعر" کی جمع ہے اور "سعر" کے مادّے سے آیا ہے جس کے معنی ہیں آگ بھڑکانا، اور "سُعر" کا لفظ یہاں پر آگ کو بھڑکانے والے شعلوں کے لیے استعمال ہوا ہے۔

[3] سورۂ حج، آیت ۳۹

[4] سورۂ بقرہ، آیت ۱۹۰

www.shiabookspdf.com

بار امامؑ کے زیرِ حکومت علاقوں پر حملہ کر رہے تھے۔ ان علاقوں میں خوں ریزی کر رہے تھے اور اموال واملاک کو لوٹ مار کے ذریعے تباہ کر رہے تھے۔ اصولی طور پر امامؑ کے لیے جو کہ جانشینِ رسولؐ تھے اور تمام لوگوں نے ان کی غیر مشروط بیعت بھی کی تھی، یہ صورتحال ناقابلِ قبول تھی، ایسے مفسدوں کو دور کرنے کے لیے جنگ ہی ایک بہتر حل تھا۔

اسی بناء پر اس گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے امامؑ تین جملے ارشاد فرماتے ہیں، جن میں سے ہر ایک اس مطلب کا گواہ ہے، پہلے فرماتے ہیں:

"تُكَادُونَ وَلَا تَكِيدُونَ"

"تمہارے خلاف ایک انتہائی گھٹیا اور خطرناک صورتحال پیدا کر دی گئی ہے لیکن تم اس کا جواب دینے کے لیے قطعاً تیار نہیں ہو۔"

دوسرے جملہ میں فرماتے ہیں:

"وَتُنْتَقَصُ اَطْرَافُكُمْ فَلَا تَمْتَعِضُوْنَ۔"[1]

"تمہارے چاروں طرف دشمن چھا گئے ہیں (تمہارے آس پاس کے شہروں پر قابض ہو گئے ہیں اور وہاں کے باشندوں کو وہاں سے بے دخل کر دیا گیا ہے) اور تمہیں اس پر نہ کوئی غصہ اور غم محسوس ہوتا ہے اور نہ تم اس پر کوئی درد اور تکلیف محسوس کرتے ہو۔"

تیسرا جملہ:

"لَا يُنَامُ عَنْكُمْ وَاَنْتُمْ فِيْ غَفْلَةٍ سَاهُوْنَ!"

"وہ تمہاری جانب سے کبھی غافل نہیں ہوتے مگر تم ہو کہ غفلت میں سب کچھ بھولے بیٹھے ہو۔"

یہ بات تو واضح ہے کہ جس قوم کی یہ حالت ہو کہ وہ دشمن کی خراب کاری برپا کرنے والی سازشوں کے مقابلے میں کوئی مُنہ توڑ تدبیر نہیں رکھتی اور مستقل ان کی آبادیوں اور سرحدوں کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اِن کے شہروں کو اُن کے تصرف سے چھینا جا رہا ہو، اُن کے مؤمن اور بے گناہ لوگوں کا قتلِ عام کیا جا رہا ہو اور اُس پر یہ قوم مستقل خوابِ غفلت میں سوتی رہے، جبکہ ان کا دشمن بیدار اور ہوشیار ہو، تو ایسے لوگوں کا کیسا برا حال ہوگا۔ اسی لیے جو بیدار اور آگاہ اور مدبّر پیشوا اُن کے سہارے ایک خُونخوار دشمن سے لڑنا چاہتا ہے، اُس کا دل جلتا ہے اور وہ فریاد کرتا ہے اور ہر ممکن کوشش کرتا ہے کہ کسی طور یہ لوگ بیدار ہو جائیں۔

---

[1] "تَمْتَعِضُوْنَ" کا لفظ "معض" کے مادّے سے ہے اور درد دینے، غصہ دلانے اور ناگوار کرنے کے معنی رکھتا ہے۔

www.shiabookspdf.com

کتنی دردناک اور افسوس ناک بات ہے کہ بعض افراد، لشکر کوفہ کی رُوحانی اور جسمانی کیفیت، اُن کے درمیان نفاق، گروہ بندی اور ضعف وناتوانی کا جائزہ لیے بغیر امیرالمومنین حضرت علیؑ ابنِ ابی طالبؑ کی جنگی تدبیروں اور اُن کی زندگی کی تاریخ کے بارے میں فیصلہ کرتے ہوئے کج روی کا شکار ہوجاتے ہیں اور حضرتؑ کی ذاتِ والا صفات پر ضعف مدیریت کی تہمت لگاتے ہیں، وہ بھی ایسی بندہ نواز ہستی پر جو کہ تمام تر اسلامی جنگوں کے میدانوں میں ایک بہترین افسر، فرمانروا اور رسولِ خداؐ کے سب سے اچھے ہمدم اور یاور تھے اور اپنی لیاقت وکفایت کے تمام تر امتحانات کو بہ حُسن وخوبی سر کر چکے تھے۔

پھر اس کے بعد مولاؑ، اُن کے انجام اور اپنے مستقبل کے حال کو دو مختصر اور معنی خیز جملوں میں بیان فرما رہے ہیں:

"غُلِبَ وَاللهِ الْمُتَخَاذِلُوْنَ"

"خدا کی قسم! جو لوگ ایسے لوگوں کے بھروسے پر جنگ کریں، شکست حتمی ہے۔"

یہ صرف تم لوگ ہی نہیں ہو کہ جو نفاق کے زیرِ اثر اور وحدت اور شجاعانہ قیام کے ترک کردینے کے باعث گرفتارِ مشکلات ہوگئے ہو، بلکہ یہ ایک مستقل اور ہمیشہ رہنے والا قانون ہے کہ جو بھی تم لوگوں کی طرح سے چلے گا، یقیناً اُس کا انجام ذلت وشکست ہوگا۔

مولاؑ نے اپنے قول کو اُن پر مزید مؤثر بنانے کے لیے اِس بات کو ایک فردی موضوع کی صورت میں بیان نہیں فرمایا، بلکہ ایک عمومی حکم کے طور پر بیان کیا ہے جو کہ پُوری تاریخ بشری پر حاکم تھا اور ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ فرماتے ہیں:

"وَ اَيْمُ [1] اللهِ اِنِّيْ لَاَظُنُّ بِكُمْ أَنْ لَوْ حَمِسَ [2] الْوَغَى [3] وَ اسْتَحَرَّ [4] الْمَوْتُ، قَدِ انْفَرَجْتُمْ عَنِ ابْنِ أَبِي طَالِبٍ انْفِرَاجَ الرَّأْسِ"

"خدا کی قسم، مجھے یہ گمان ہے کہ اگر جنگ شدت اختیار کرلے، اور موت کی گرم بازاری ہو، تو تم ابن ابی طالبؑ سے

---

[1] "أَيْمُ اللهِ" کا لفظ جو کہ قسم کا مفہوم دے رہا ہے اس کے بارے میں پہلی جلد (اصل کتاب) کے صفحہ نمبر ۳۷۴ پر خطبہ نمبر ۱۰ کے ذیل میں کافی تشریح کی گئی ہے۔

[2] "حمس" کا لفظ (ح م س) کے مادّے سے ہے اور زور پکڑنے کے معنی رکھتا ہے اور حماسہ اور تحمّس کا لفظ شدّت اور تشدید کے معنی میں خاص طور پر جنگوں کے حوالے سے استعمال کیا جاتا ہے، اور اَحْمَسْ ایسے شجاع شخص کو کہا جاتا ہے جو دشمن کے سامنے جم کر کھڑا رہے اور مقابلہ کرتا رہے۔

[3] "وَغٰی" کے معنی ہیں میدان جنگ میں لڑنے والے بہادروں کی مخصوص آوازیں۔ اور بعض اوقات خود جنگ کو بھی وغی کہا جاتا ہے اور اوپر کے خطبے میں اِسی معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

[4] "اِسْتَحَرَّ" کا لفظ "حر" کے مادّے سے ہے اور یہاں کھول جانے، گرم ہوجانے اور جوش میں آجانے کے معنی میں آیا ہے اور اس بات کی طرف اِشارہ ہے کہ جب شہادت کا بازار گرم ہوتا ہے اور جنگ اپنے اوجِ کمال پر پہنچی ہوئی ہوتی ہے، تو کمزور اور ناتواں افراد ایسے میں بھاگ جانے کو ترجیح دیتے ہیں۔

www.shiabookspdf.com

اِس طرح کٹ جاؤ گے، جس طرح بدن سے سر (جس کا دوبارہ پلٹنا اور مل جانا ممکن ہی نہیں)۔"

مولاؑ اِس معنی خیز تشبیہ کے ذریعے مختلف نکات کی جانب اشارہ فرما رہے ہیں۔ پہلا نکتہ تو یہ ہے کہ آپؑ کی حیثیت اگر چہ ایسی ہے کہ جیسے بدن کے لیے سر کی ہوا کرتی ہے، مگر کیا سر جو کہ تمام ہوش وحواس کا مرکز ہے، بدن کے دوسرے اعضا کے بغیر کوئی کام آگے بڑھا سکتا ہے؟

دوسرے یہ کہ کیا بدن کے سر سے جدا ہو جانے کے بعد کوئی حیات وبقا رہے گی اور اگر بالفرض رہ بھی جائے، تو آنکھ، کان، ہوش، عقل جیسے تمام اہم اعضا کے بغیر تو وہ کوئی کام انجام نہیں دے سکتا اور اُس کے بعد کیا اُس کی حرکات وسکنات سوائے کسی ذبح شدہ عضو کی حرکات کے اور سوائے مرجانے کے اور کچھ ہو سکتی ہیں اور یہ کہ اگر ایسا حادثہ رونما ہو جائے تو اُس کا نقصان صرف مجھے نہیں پہنچے گا، بلکہ سب سے زیادہ نقصان تم لوگوں کا ہوگا۔

اور ایک مفہوم یہ بھی نکلتا ہے کہ اگر سر، بدن سے جدا ہو جائے تو عام طور پر اس کا لوٹ جانا ممکن نہیں ہوتا جب کہ باقی تمام اعضاء کا جوڑ دینا تو پھر بھی کسی نہ کسی طور پر ممکن بھی ہے۔ لہٰذا امامؑ کا مقصد بیان یہاں پر یہ ہے کہ جب جنگ کی آگ کے بھڑکتے ہی تم لوگ ایسے وحشت زدہ ہو جاتے ہو اور مجھ سے ایسے فرار کرتے ہو کہ پھر کبھی واپس لوٹ کر میرے پاس نہیں آتے۔

بعض شارحین کی طرف سے یہ احتمال بھی دیا گیا ہے کہ "اِنْفِرَاجُ الرَّأْسِ" سے مراد، سر کا تلوار کی ضربت سے پھٹ جانا یا اُس جیسی دوسری چوٹیں جن کو دوبارہ پہلے کی طرح ٹھیک نہیں کیا جا سکتا۔[1]

ایک نکتہ

پھر وہی ضعف وشکست کی وجوہات

امامِ عالی مقامؑ جو کہ ایک بڑے، انسانی، سیاسی اور فوجی رہبر ہیں، اِس خطبے کے اِس حصے میں ایک بار پھر شکست کھا

---

[1] یہ احتمال اِس حوالے سے بعید نظر آتا ہے کہ اِس جملے میں ضرور کوئی نہ کوئی تقدیر پائی جاتی ہے، کیونکہ "قَدْ انْفَرَجْتُمْ عَنِ ابْنِ أَبِي طَالِبٍ" کا جملہ، اس بات کا متقاضی ہے کہ "اِنْفِرَاجُ الرَّأْسِ" کا جملہ دراصل تقدیر (نیت وقصد) میں کچھ یوں ہو: "اِنْفِرَاجَ الرَّأْسِ عَنِ الْجَسَدِ" یا پھر "اِنْفِرَاجَ الْجَسَدِ عَنِ الرَّأْسِ" جیسے کہ خطبہ نمبر ۹۸ میں اس سے ملتی جلتی تعبیر آئی ہے: "اِنْفَرَجْتُمْ عَنْ عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ اِنْفِرَاجَ الْمَرْأَةِ عَنْ قُبُلِهَا"۔ تعجب اِس بات پر ہے کہ نہج البلاغہ کے بعض شارحین نے اوپر کے جملے کی نہایت بعید اور نامناسب تفسیریں بیان کی ہیں اور انہیں آٹھ یا اُس سے بھی زیادہ وجوہات کا ذکر کیا ہے جن کے ذکر کی ضرورت نہیں ہے۔

www.shiabookspdf.com

جانے اور پیچھے رہ جانے کی وجوہات بیان فرمار ہے ہیں اور اپنی معنی خیز تعبیرات کے ذریعے سے اِن وجوہات کے ایک اہم حصّے کو بیان فرمار ہے ہیں، جن میں سے پہلی وجہ:

اِنتشار، تفرقہ اور ایک مستقل رہنما کا نہ ہونا ہے، وہی بات جو آج کل اسلامی ممالک میں دیکھی جارہی ہے کہ اُن میں انتشار کا پایا جانا، اُن کی ساری شکست اور ویرانی کی اہم ترین وجوہات ہیں۔

اور دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ سب کے سب وحدت کا دم بھرتے ہیں، جبکہ اِن میں سے ہر شخص انتشار اور تفرقہ پھیلانے کی اپنی سی کوشش کر رہا ہوتا ہے۔!!

دوسری وجہ یہ ہے کہ اُن کے پاس ایسا صحیح اور منظم پروگرام نہیں تھا جو دشمن کے برے اور ناپاک عزائم کے مقابلے میں اِن کا ممدّ ومعاون ہوتا، جیسا کہ (تُكَادُوْنَ وَلَا تَكِيْدُوْنَ) کے جملے میں اشارہ کیا گیا ہے۔

تیسری وجہ یہ ہے اِردگرد کے حالات وحوادث کو ہلکا اور خفیف سمجھنا جب کہ وہ درحقیقت بڑے حادثات ہوتے ہیں اور "وَ تُنْتَقَصُ أَطْرَافُكُمْ فَلَا تَمْتَعِضُوْنَ" کا اِسی مطلب کی جانب اشارہ ہے بہت سے چھوٹے حادثات، بہت سے چھوٹے لیکن حد سے زیادہ اہم چھپے ہوئے مسائل سے پردہ اُٹھا دیتے ہیں۔ کبھی انسانی بدن کی بیرونی سطح پر ایک جزئی تبدیلی، بدن کے اندرونی حصوں میں کسی بڑی خرابی کی خبر دیتی ہے۔ سیاسی، معاشرتی اور فوجی مسائل میں بھی اسی طرح ہوتا ہے۔ جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ دشمن ایک چھوٹے سے سرحدی علاقے پر حملہ آور ہو گیا ہے یا ایک شخصیت کو قتل کر ڈالا ہے، تو ہمیں یہ جان لینا چاہیے کہ اُس نے اپنے آپ کو دوسری شخصیات کے قتل کے لیے آمادہ کر لیا ہے ورنہ وہ ایسی حرکت کرنے کی جرأت تک نہ کرتا۔ اِس لیے اس پہلے شعلے کو ہی اہم شمار کر لینا چاہیے اور اُس بڑی آگ سے ہوشیار ہو جانا چاہیے جو اِن چھوٹے شعلوں کے پیچھے چھپی ہوئی ہے اور اس سے غفلت نہیں برتنی چاہیے۔

چوتھی وجہ یہ کہ دشمن بیدار ہو اور دوست سو رہے ہوں، وہ مستقل ہمارے خلاف سازشوں میں مصروف رہیں اور ہم کسی خوش فہمی اور سادہ فکری سے اِن حالات کی خاموشی کو ایک عزّت دار صلح و دوستی سمجھیں اور اُس وقت خواب سے بیدار ہوں کہ جب ہمارے اور دشمن کے درمیان فاصلہ اتنا بڑھ چکا ہو کہ اُسے کم کرنے اور مٹانے کا وقت ہی نہ بچے۔

پانچویں وجہ یہ کہ موت سے ڈر اور خدا کی راہ میں شہادت سے فرار، جیسا کہ "وَاَيْمُ اللهِ اِنِّيْ لَاَظُنُّ..." کے جملے میں اس جانب اشارہ کیا گیا ہے۔ ذاتی طور پر انسان اس بات سے غافل ہے کہ موت سے ڈرنا، خود موت کا باعث ہے، اور جاں بازی اور ایثار کا جذبہ خود جان کی حفاظت کا سبب ہے، یہ تھے بعض وہ اہم نکات جن کی جانب امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے ضعف وشکست کی وجوہات سے متعلق جن کی طرف اشارہ فرمایا ہے اور اگلی بحث میں بھی یہ مسئلہ ضرور جانچا جائے گا۔

www.shiabookspdf.com

اِسی حوالے سے، اِس جلد کے پچیسویں (۲۵) خطبے میں بھی بحث کی گئی ہے اور وہاں بھی امامؑ نے شکست کی وجوہات پر کافی عمیق گفتگو فرمائی ہے۔

تیسرا حصّہ

وَ اللهِ اِنَّ امْرَأً يُمَكِّنُ عَدُوَّهُ مِنْ نَفْسِهِ يَعْرُقُ لَحْمَهُ وَ يَهْشِمُ عَظْمَهُ وَ يَفْرِي جِلْدَهُ لَعَظِيمٌ عَجْزُهُ ضَعِيفٌ مَا ضُمَّتْ عَلَيْهِ جَوَانِحُ صَدْرِهِ اَنْتَ فَكُنْ ذَاكَ اِنْ شِئْتَ فَاَمَّا اَنَا فَوَاللهِ دُونَ اَنْ اُعْطِيَ ذَلِكَ ضَرْبٌ بِالْمَشْرَفِيَّةِ تَطِيرُ مِنْهُ فَرَاشُ الْهَامِ وَ تَطِيحُ السَّوَاعِدُ وَ الْاَقْدَامُ وَ يَفْعَلُ اللهُ بَعْدَ ذَلِكَ مَا يَشَاءُ.

"خدا کی قسم! جو شخص اپنے دشمن کو اِس طرح اپنے اوپر قابو دے دے کہ وہ اس کی ہڈیوں سے گوشت تک اُتار ڈالے، اور ہڈیوں کو توڑ دے، اور کھال کو پارہ پارہ کر دے، تو اُس کا عجز انتہا کو پہنچا ہوا ہے اور سینے کی پسلیوں میں گھرا ہوا (دل) کمزور و ناتواں ہے۔ اگر تم ایسے ہونا چاہتے ہو، تو ہوا کرو۔ لیکن میں تو ایسا اُس وقت تک نہ ہونے دوں گا، جب تک مقام مشارف کی (تیز دھار) تلواریں چلا نہ لوں کہ جس سے سر کی ہڈیوں کے پرخچے اُڑ جائیں، اور بازو اور قدم کٹ کٹ کر گرنے لگیں۔ اُس کے بعد جو اللہ چاہے، وہ کرے۔"

شرح و تفسیر

میں تن تنہا دشمن کے سامنے کھڑا ہوں

اس حصے میں مولاؑ نے ایسے افراد کے لیے مزید شدید جملوں کا استعمال فرمایا ہے جو اپنی سستی اور کاہلی کی بنا پر دشمن اپنے آپ پر مسلط کر چکے ہیں۔ ارشاد فرماتے ہیں:

www.shiabookspdf.com

"وَ اللهِ! اِنَّ امْرَءً يُمَكِّنُ عَدُوَّهُ مِنْ نَفْسِهِ يَعْرُقُ [۱] لَحْمَهُ وَ يَهْشِمُ [۲] عَظْمَهُ وَ يَفْرِيْ [۳] جِلْدَهُ لَعَظِيْمٌ عَجْزُهُ، ضَعِيْفٌ مَا ضُمَّتْ عَلَيْهِ جَوَانِحُ [۴] صَدْرِهِ"

"خدا کی قسم جو شخص اپنے دشمن کو اس طرح سے اپنے اوپر قابو دے دے کہ وہ اس کی ہڈیوں سے گوشت تک اُتار ڈالے، اور ہڈیوں کو توڑ دے اور کھال کو پارہ پارہ کردے، تو اس کا عجز انتہا کو پہنچا ہوا ہے اور سینے کی پسلیوں میں گھرا ہوا (دل) کمزور و ناتواں ہے۔"

یہ بات اس نکتے کو بخوبی واضح کر رہی ہے کہ لشکرِ کوفہ نے اپنے آپ کو اتنا کمزور ظاہر کر دیا تھا کہ اُن کا دشمن اُن کی نسبت پوری طرح سے جری اور اُن کے سروں پر مسلط ہو گیا تھا اور اُن کے ساتھ وہ سلوک کرنے لگا تھا جو ہڈیوں پر سے گوشت اُتار دینے، ہڈیوں کو توڑ دینے اور کھال کو پارہ پارہ کر دینے کے برابر ہے، اور یہ ایک ایسی بہترین تعبیر ہے، کہ ایک خونخوار اور بے رحم دشمن کے کمزور اور ناتواں لوگوں پر مسلط ہو جانے کی منظر کشی کے لیے اس سے زیادہ اچھی تعبیر بیان نہیں کی جاسکتی، جس میں فصاحت اور بلاغت کی انتہا نظر آتی ہے اور واقعاً یہ ایسے جملے ہیں کہ اگر لشکرِ کوفہ میں تھوڑا سا بھی احساس اور غیرت ہوتی تو وہ فوراً متحرک ہو جاتے۔ جی ہاں لشکرِ شام کے خونخواروں کا عراق کے لوگوں کے ساتھ یہی سلوک تھا، وہ کسی چیز پر رحم نہیں کرتے تھے، بے گناہ لوگوں کو قتل کر دیتے تھے، ان کا گھر بار اور مال و متاع لوٹ لیتے تھے۔ اُن کے اس عمل کو قصاب کے ذبح شدہ حیوان کے ساتھ کیے جانے والے سلوک سے تشبیہ دی گئی ہے جو اُس کی کھال اُتار کر گوشت کو ہڈیوں سے الگ کرتا ہے اور پھر اُس کی ہڈیوں کو توڑ کر اُسے کھانے کے لیے تیار کرتا ہے۔

نہج البلاغہ کے بعض مفسرین نے اِن تینوں جملوں میں سے ہر ایک کو مستقل نکتے کے طور پر پیش کیا ہے اور "يَعْرُقُ لَحْمَهُ" یعنی "اُس کے گوشت کو ہڈیوں سے جدا کر دیتا ہے" کے جملے کو مال و متاع لوٹ لینے سے، اور "يَهْشِمُ عَظْمَهُ" کے جملے کو لوگوں کے قتل کی جانب اِشارہ جانا ہے، اور "يَفْرِيْ جِلْدَهُ" کے جملے کو معاشرے کے نظم و ضبط کے برہم کر دینے سے

---

[۱] "يَعْرُقُ" کا لفظ "ع ر ق" کے مادّے سے آیا ہے اور یہ گوشت کو ہڈی سے دانتوں کے ذریعے الگ کرنے اور پھر کھانے کے معنی میں آیا ہے۔

[۲] "يَهْشِمُ" کا لفظ "ھ ش م" کے مادّے سے آیا ہے اور کسی خشک چیز کو توڑنے کے معنی رکھتا ہے اور کبھی کبھار محض ہڈیوں کو توڑنے یا پھر سر کی ہڈیوں کو توڑنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

[۳] "يَفْرِيْ" کا لفظ "فَرْيٌ" کے مادّے سے آیا ہے اور کسی چیز کو توڑ دینے کے معنی میں آیا ہے، چاہے وہ ٹھیک ہو یا خراب ہو۔ اور بعض اوقات قطع کرنے اور کاٹنے کے معنی میں بھی آیا ہے۔

[۴] "جَوَانِحُ" کا لفظ "جانحہ" کی جمع ہے اور یہ سینے کی پسلیوں کے معنی رکھتا ہے اور دراصل "جنح" کے مادّے سے ہے، ٹیڑھا ہو جانے اور مڑ جانے کے معنی میں آتا ہے، اور چونکہ پسلیاں سیدھی نہیں ہوا کرتیں اس لیے یہ لفظ ان پر منطبق ہوتا ہے۔

www.shiabookspdf.com

تعبیر کیا ہے۔[1] مگر اس تفسیر کے لیے کوئی واضح قرینہ موجود نہیں ہے۔

مرحوم مغنیہ نے اپنی شرح میں اس جملے کے ذیل میں کہا ہے:

"ہم نے یہ تو بارہا سنا ہے کہ بعض افراد نے ظالم اور ستمگر دشمنوں کے مقابلے پر اپنے آپ کو جلا دیا یا خودکشی کر لی، مگر یہ کبھی نہیں سنا کہ کوئی اپنے آپ کو دشمن کے سامنے ایسے پیش کر دے کہ وہ اس کی کھال اتار لے اور اُس کا گوشت اس کی ہڈیوں سے اُدھیڑ لے اور اس کی ہڈیاں توڑ دے، وہ بھی بغیر دفاع کے کسی بھی قسم کا ڈر خوف یا سرِ تسلیم خم کر دینا، اِس سے زیادہ وحشت ناک نہیں ہے کہ ایک ڈرپوک اور کمزور آدمی اپنے آپ کو دشمن کے حوالے کر دے، وہ بھی ایسے انسانی قصاب اور خونخوار دشمن کے سامنے جو اِس کے ساتھ وہ سلوک کرے گا جو جنگل و بیابان کے درندے اپنے شکار کے ساتھ کرتے ہیں۔"[2]

اوپر بیان کیے گئے جملوں اور تفسیروں کو دیکھتے ہوئے ایک احتمال یہ بھی دیا جا سکتا ہے کہ ممکن ہے دشمن نے یہ تینوں کام ایک ہی فرد کے ساتھ نہ کیے ہوں، بلکہ شاید کسی ایک اپنے دشمنوں سے مقابلہ نہ کرنے والے گروہ کے ساتھ کچھ ایسا کیا ہو جو کھال اُدھیڑ دینے کے مترادِف ہو اور ایک اور گروہ کے ساتھ ایسا سلوک کیا ہو جو گوشت کو ہڈیوں سے جدا کر کے اُسے چیر پھاڑ کر کھانے کے لیے تیار کر دینے کے مترادف ہو۔

اور تیسرے گروہ کے ساتھ شاید کوئی ایسا سلوک کیا ہو جو ہڈیوں کو توڑ دینے اور ٹکڑے ٹکڑے کر دینے کے برابر ہو۔ اِس تفسیر کے مطابق اِن جملوں کی ترتیب کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔ ایک سوال یہ کیا گیا ہے کہ مولاؑ نے کھال کو پارہ پارہ کرنے کی تعبیر کو آخر میں کیوں قرار دیا ہے؟ تو ہم یوں جواب دیتے ہیں کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ گویا حضرتؑ یہ فرمانا چاہتے ہیں کہ ان خونخوار دشمنوں کے تمہاری نسبت جو مظالم ہیں وہ ایسے ہیں کہ ایک مرحلے میں گوشت کو کھال سے جدا کرنے کی مانند ہیں اور اُس سے زیادہ شدید ترین مرحلے میں ہڈیوں کو توڑ دینے کے برابر ہیں اور اُس سے نچلے مرحلے میں کھال کو پارہ پارہ کر دینے کے مترادِف ہیں۔

نہج البلاغہ کے بعض مفسرین کی رائے یہ ہے کہ یہ تمام تر تعبیرات اُن حالات و حوادث کی جانب اشارہ ہیں جو حضرتؑ کی شہادت کے بعد اور امیر شام کے خونخوار لشکر کے عراق پر مسلط ہو جانے کے بعد رونما ہوئے اور اُن لوگوں نے چھوٹے بڑے امیر، غریب، مردوں، عورتوں، صحیح سلامت یا بیمار کسی پر بھی رحم نہ کیا، جیسا کہ تاریخ اس بارے میں گواہی دیتی ہے، اور یہ سب کچھ اس وجہ سے تھا کہ ان جیسے دشمنوں کے مقابلے میں سستی، کاہلی اور کمزوری کا مظاہرہ کیا گیا اور اپنے امامِ

[1] شرح نہج البلاغہ، ابن میثم، جلد ۲، صفحہ ۸۱

[2] فی ظلال نہج البلاغہ، جلد ۱، صفحہ ۲۲۹۔۲۲۸

www.shiabookspdf.com

وقت اور پیشواؤں کے نجات بخش فرمان سے رُوگردانی کی گئی۔ [۱]

مگر ظاہری طور پر یہ مسئلہ صرف اُس زمانے کے لیے مخصوص نہیں ہے، بلکہ ہر دور میں ایسا ہی ہے، اگرچہ اُس زمانے میں اور اُس وقت کے مسئلے کی نوعیّت زیادہ شدید اور زیادہ وحشت ناک تھی۔

"مَا ضُمَّتْ عَلَيْهِ جَوَانِحُ صَدْرِهِ" کا جملہ اس بات کے پیشِ نظر، کہ "جَوَانِح" کا لفظ جَانِحَة کی جمع ہے جو کہ ہڈیوں کے لیے استعمال ہوتا ہے، لفظی اعتبار سے یوں معنی و مفہوم رکھتا ہے: "جو سینے کی پسلیوں کے اندر موجود ہے" اور یہ قلبِ انسانی کے لیے ایک روشن ترین کنایہ ہے اور امامؑ کا مقصد، جملہ "مَا ضُمَّتْ عَلَيْهِ جَوَانِحُ صَدْرِهِ" میں لشکرِ کوفہ کے جذبے اور ہر اعتبار سے ان کے ضعف و ناتوانی اور کمزوری کو بیان کرتا ہے۔ پھر مولاؑ اس بات کو آگے بڑھاتے ہوئے اِس اہم اور بنیادی نکتے کی جانب بڑھ رہے ہیں کہ آپؑ نے مستقبل اور آئندہ کے لیے بلا تردید اور بلا خوف و جھجک اپنا فیصلہ کرلیا ہے، فرماتے ہیں:

"أَنْتَ فَكُنْ ذَاكَ إِنْ شِئْتَ; فَأَمَّا أَنَا، فَوَاللهِ! دُوْنَ أَنْ أُعْطِيَ ذَالِكَ ضَرْبٌ بِالْمَشْرَفِيَّةِ تَطِيْرُ مِنْهُ فَرَاشُ [۲] الْهَامِ، وَتَطِيْحُ [۳] السَّوَاعِدُ وَالْأَقْدَامُ، وَيَفْعَلُ اللهُ بَعْدَ ذٰلِكَ مَا يَشَآءُ".

'اگر تم ایسے ہونا چاہتے ہو تو ہوا کرو۔ لیکن میں تو ایسا اُس وقت تک ہونے نہ دوں گا، جب تک مقامِ مشارف کی (تیز دھار) تلواریں چلا نہ لوں کہ جن سے اس کے سر کی ہڈیوں کے پرخچے نہ اُڑ جائیں، اور بازو اور قدم کٹ کٹ کے گرنے لگیں۔ اُس کے بعد جو اللہ چاہے وہ کرے۔"

"أَنْتَ" سے مُراد کون ہے؟ اِس بارے میں دو احتمالات دیے گئے ہیں: پہلا تو یہ کہ ایک مستقل انسان مُراد ہے یا دوسرے لفظوں میں یہ کہیں کہ یہ فرد، فردِ لشکرِ کوفہ ہے جو کہ نہایت ضعیف اور کمزور بنا ہوا تھا۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ اس سے مراد اشعث ابن قیس ہے جو کہ منافق تھا اور اس نے مولا علیؑ کو دشمن کے سامنے خم ہو جانے کا مشورہ دیا تھا، بالکل خلیفہ ثالث کے مجاہدانِ مصر کے سامنے تسلیم ہوجانے کی طرح۔

حضرتؑ نے اُس کی جانب رخ کرکے فرمایا:

"تم دشمن کے سامنے جھکنا چاہتے ہو تو جھک جاؤ، مگر میں ہرگز ایسا نہیں کروں گا اور اپنی قوت اور اقتدار پر ایسے تکیہ

[۱] مفتاح السّعادۃ، جلد ۶، صفحہ ۸۲

[۲] "فراش" کا لفظ فراشۃ کی جمع ہے۔ نرم ہڈیوں، یا پیشانی اور سر کی مخصوص ہڈیوں کے معنی رکھتا ہے اور "ھام" کا لفظ ھامہ کی جمع ہے جس کے معنی "سر" کے ہیں اور بعض اوقات ڈاڑھی اور کسی قبیلے کے بزرگ پر بھی اطلاق ہوتا ہے۔

[۳] "تَطِيْحُ" کا لفظ طوح کے مادّے سے ہے اور ہلاک یا نیست و نابود ہوجانے کے معنی رکھتا ہے، اور جیسا کہ ہاتھ پاؤں کا کٹ جانا، اُن کی نابودی کے مترادف ہے لہٰذا اوپر کے جُملے میں اِس معنی پر اطلاق ہو رہا ہے۔

www.shiabookspdf.com

کر کے دکھاؤں گا کہ دشمن حیران رہ جائے۔"

درحقیقت مولا علی علیہ السلام اُن کے حال سے مایوس ہونے کے بعد، اپنے معاملے کو اُن سے جدا کر لیتے ہیں، اور فرماتے ہیں کہ تم لوگوں نے اپنے خونخوار دشمن کے سامنے گھٹنے ٹیکنے کا فیصلہ کر لیا ہے، تو میں ہرگز تمہارے ساتھ نہیں ہوں اور تن تنہا اُن دشمنوں سے لڑوں گا یہاں تک کہ قضائے الٰہی آ پہنچے۔

تمہاری بھی ایک ذمّے داری ہے اور میری بھی ایک ذمّے داری ہے اور خدا کی بھی ایک مشیت ہے کہ ہر ایک کا حساب دوسرے سے جدا ہے۔

اگر تم اپنی ذمّے داریوں کو نہ نبھاؤ اور ذلّت اور گھٹنے ٹیکنے اور بے غیرتی سے بھرپور موت کے لیے راضی ہو جاؤ اور ملکِ اسلام کو ویرانگی کے سپرد کر دو اور خونخوار ظالموں کو مسلمانوں کے جان، مال اور ناموس پر مسلط کر دو اور اس کے نتیجے میں نہ صرف آج کی نسل کو بلکہ آنے والی نسلوں کو بھی تباہ کر ڈالو، تو پھر میں اکیلا اور تن تنہا کھڑا ہو جاؤں گا اور اس معاملے میں اپنا فرض بخوبی نبھاؤں گا اور فخر سے بھرپور شہادت کو ہر چیز پر مقدم ٹھہراؤں گا اور اپنی بھرپور طاقت کو اس معاملے پر صرف کروں گا اور ایک لمحے کے لیے بھی خود کو ضعف اور ذلّت کے حوالے نہیں کروں گا۔

گویا اس مقام پر مولاؑ ان شجاع اور غیرت مند افراد کے لہو کو گرما رہے ہیں، جو اس ضعیف و ناتوان لشکر کے درمیان موجود تھے، اور ساتھ ہی شک و تردّد کے شکار حضرات کو بھی تردّد کے اندھے کنوئیں سے نکال رہے ہیں اور انہیں اپنے ساتھ ملحق کر رہے ہیں، اور جیسا کہ تاریخ گواہ ہے مولاؑ کا یہ خطبہ نہایت موثر واقع ہوا اور لشکر کے دل میں ایک جوش اور ولولے کی لہر دوڑ گئی اور وہ لوگ دشمن سے لڑنے کے لیے تیار ہو گئے۔

ایک نکتہ

ایک شجاع رہبر کا آخری فیصلہ

معاشرتی اور سیاسی زندگی میں کبھی ایسے حساس لحات بھی آجاتے ہیں کہ بڑے بڑے رہبروں کو اس کے دباؤ تلے دبنا پڑتا ہے اور پھر وہ بھی اُس دور میں ہو کہ جب اُس کی پیروی کرنے والوں میں اختلاف و انتشار اور فیصلے کا ضعف و تردّد کی شدت پائی جاتی ہو اور اس اختلاف کا ہونا، دشمن کی حوصلہ افزائی اور مسرت کا سبب بن جائے تو وہ اپنا آخری فیصلہ سنا دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم اکیلے کھڑے ہوں گے اور چاہے دوست و مددگار ہوں یا نہ ہوں جنگ لڑیں گے اور شکست تسلیم نہیں

www.shiabookspdf.com

کریں گے خواہ اس میں ہم شہید ہی کیوں نہ ہو جائیں۔ ہم باہیں پھیلا کر شہادت کا استقبال کریں گے لیکن ذلّت اور شکست کے لیے کسی قیمت پر راضی نہیں ہوں گے۔ یہ وہی راستہ ہے جو اوپر کے خطبے میں امامؑ نے اختیار فرمایا ہے۔

جس کی ہوبہو شباہت آپؑ کے فرزند گرامی سیّد الشہداء حضرت اباعبداللہ الحسین علیہ السلام کی ذات میں کربلا کے واقعے میں نظر آتی ہے۔

اِس مکتب کی پیروی کرنے والے، شب عاشور کو اپنے پیشواؤں کے ساتھ ایک آواز ہو گئے اور اس معروف و مشہور تاریخی نشست میں، کہ جب امامؑ نے ان پر سے اپنی بیعت اُٹھالی اور انہیں لوٹ جانے کی اجازت دے دی اور پھر کمزور جذبات اور ناقص یقین کے حامل افراد نے اپنی راہ اختیار کی اور وہاں سے فرار کر گئے اور اپنے آقا و مولا اور امامِ وقت کو ان خطرناک حادثوں میں تنہا چھوڑ کر چلے گئے، اور نتیجتاً مولاؑ کے ساتھیوں کی ایک قلیل سی وفادار تعداد باقی رہ گئی، ہر ایک اپنے طور پر اُٹھا اور مختلف انداز میں اپنے ان جذبات کا اظہار کرنے لگا جو آج تاریخ کربلا کا یادگار پیغام بن کر سینۂ تاریخ پر دمک رہے ہیں، یہاں تک کہ فرمانے لگے کہ ہم آپؑ کے ساتھ کھڑے ہیں، ہر چند کہ ہمیں شہید کر دیا جائے پھر ہمارے بدن کو جلا دیا جائے اور پھر ہمیں زندہ کر دیا جائے اور اگر اسی طرح سے ستّر بار مار کر زندہ کر دیے جائیں پھر بھی ہم آپؑ کی حمایت سے دست بردار نہ ہوں گے (اور آپ کی حمایت تو حق اور عدالت کی حمایت ہے)[1]

امیر المومنین حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام نے نہج البلاغہ کے خطوط میں سے خط نمبر چھتیس ۳۶ میں اسی مفہوم کو دوسرے لفظوں میں ارشاد فرمایا ہے، جب اپنے بھائی عقیل کو جواب دے رہے تھے، جنہیں لشکر کے سردار کی حیثیت سے دشمن کی جانب روانہ کر رہے تھے، ارشاد فرمایا:

"وَ أَمَّا مَا سَأَلْتَ عَنْهُ مِنْ رَأْيِي فِي الْقِتَالِ: فَإِنَّ رَأْيِي قِتَالُ الْمُحِلِّينَ حَتَّى أَلْقَى اللهَ لَا يَزِيدُنِي كَثْرَةُ النَّاسِ حَوْلِي عِزَّةً وَ لَا تَفَرُّقُهُمْ عَنِّي وَحْشَةً وَ لَا تَحْسَبَنَّ ابْنَ أَبِيكَ، وَ لَوْ أَسْلَمَهُ النَّاسُ، مُتَضَرِّعاً مُتَخَشِّعاً وَ لَا مُقِرّاً لِلضَّيْمِ وَاهِناً"

"اور جو تم نے جنگ کے بارے میں میری رائے دریافت کی ہے، تو میری رائے آخری دم تک یہی رہے گی، کہ جن لوگوں نے ہمارے خلاف جنگ کو جائز قرار دے دیا ہے، اُن سے جنگ کرنی چاہیے، اور اپنے گرد لوگوں کا جمگھٹا دیکھ کر میری ہمت نہیں بڑھتی اور نہ ان کے چھٹ جانے سے مجھے گھبراہٹ ہوتی ہے۔ دیکھو اپنے بھائی کے متعلق، چاہے کتنے ہی لوگ اُس

[1] امامؑ کے اُس تاریخی رات میں بیان کیے گئے خطبے کے مضمون اور آپ کے جاں نثاروں کے شجاعت سے بھرپور جوابات کا مزید مطالعہ کرنے کے لیے بحار الانوار جلد ۴۴، میں صفحہ نمبر ۳۹۲ اور اُس کے بعد کے صفحات پر رجوع کیجیے۔

www.shiabookspdf.com

کا ساتھ چھوڑ دیں، ہرگز یہ خیال نہ رکھنا کہ وہ بے ہمت اور ہراساں ہو جائے گا۔ یا کمزوری دکھاتے ہوئے ذلت کے آگے جھکے گا یا مہار کھینچنے والے ہاتھ میں باآسانی اپنی مہارت دے دے گا۔"

حضرت موسیٰ ابن عمران علیہ السلام کی داستان میں بھی ہم پڑھتے ہیں کہ جب ان کی قوم بیت المقدس کے دروازوں تک پہنچی تو گروہِ عمالقہ جو کہ وہاں حاکم تھا، کی طاقت سے گھبرا کر سست پڑ گئی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اور اُن کے بھائی ہارون علیہ السلام کی نافرمانی کی ٹھان لی اور صاف صاف کہہ دیا:

"قَالُوْا يٰمُوْسٰۤى اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَاۤ اَبَدًا مَّا دَامُوْا فِيْهَا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَاۤ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ﴿۲۴﴾"۔ [1]

"انہوں نے کہا: اے موسیٰ! جب تک وہ لوگ اس (سرزمین) میں ہیں ہم ہرگز کبھی بھی وہاں داخل نہیں ہوں گے، پس تم جاؤ اور تمہارا رب (ساتھ جائے) سو تم دونوں (ہی ان سے) جنگ کرو، ہم تو یہیں بیٹھے ہیں۔"

یہی وہ وقت تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اُن سے علیحدگی اور بیزاری کا اعلان کیا کہ صرف میں اور میرا بھائی ہارون کھڑے ہوئے ہیں اب جسے جو راہ اختیار کرنی ہے کر لے۔ حضرت موسیٰ نے فرمایا:

"قَالَ رَبِّ اِنِّىْ لَاۤ اَمْلِكُ اِلَّا نَفْسِىْ وَاَخِىْ فَافْرُقْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ﴿۲۵﴾" [2]

"اے میرے پروردگار، میں صرف اپنا اور اپنے بھائی کا اختیار رکھتا ہوں۔ تو میرے اور اس گناہگار قوم کے مابین جدائی ڈال دے۔"

حضرت نوح علیہ السلام جو کہ اللہ کے بڑے صاحب عزّت و مقام نبی تھے، اُنہوں نے بھی اپنی سرکش اور جابر قوم کے سبب پیدا ہونے والے بحرانی اور طوفانی حالات میں ان سے اسی کلام سے ملتی جلتی بات کی اور فرمانے لگے:

"وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ نُوْحٍ ۘ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكُمْ مَّقَامِىْ وَتَذْكِيْرِىْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَعَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ فَاَجْمِعُوْۤا اَمْرَكُمْ وَشُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُنْ اَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً ثُمَّ اقْضُوْۤا اِلَىَّ وَلَا تُنْظِرُوْنِ﴿۷۱﴾" [3]

"اے میری قوم، اگر میرا ٹھہرنا اور خدا کی آیتوں کا چرچا کرنا تم پر شاق و گراں گزرتا ہے تو میں صرف خدا ہی پر

---

[1] سورۂ مائدہ، آیت ۲۴

[2] سورۂ مائدہ، آیت ۲۵

[3] سورۂ یونس، آیت ۷۱

www.shiabookspdf.com

بھروسا رکھتا ہوں تو تم اور تمہارے شریک سب مل کر اپنا کام ٹھیک کرلو، پھر تمہاری بات تم (میں سے کسی) پر مخفی نہ رہے، پھر (جو تمہارا جی چاہے) میرے ساتھ کر گزرو، اور مجھے (دم مارنے کی بھی) مہلت نہ دو۔"

ایک رہبر اور پیشوا کا اٹل اور کھرا موقف اختیار کرلینا، اُس کے پیروکاروں پر ایک گہرا اثر چھوڑتا ہے اور تاثیر آشکار طور پر نظر آتی ہے۔ صاحبانِ غیرت اور قوتِ ارادی کے احسن درجات پر فائز رہنے والے حضرات کے دلوں کو ایک جوش اور جذبہ فراہم کرتا ہے چاہے وہ تعداد میں کم ہی کیوں نہ ہوں اور ساتھ ہی بے حس اور سستی و کاہلی والے حضرات کو بھی جھنجوڑنے میں نمایاں کردار ادا کرتا ہے۔

اور کم سے کم الٰہی رہبروں کا اس طرح سے اٹل اور دوٹوک موقف اختیار کرنا تاریخ میں منقوش ہو جاتا ہے اور آئندہ نسلوں کے لیے الہام بخش ہوتا ہے، جیسا کہ کربلا کے روزِ عاشور کی وفادارانہ یادگاریں تاریخ میں ایک نمایاں رنگ اختیار کیے ہوئے ہیں اور تمام تر ملتوں اور معاشروں کے لیے ایک بہترین مشعل راہ کا کردار ادا کر رہی ہیں۔

چوتھا حصہ

أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّ لِي عَلَيْكُمْ حَقّاً وَلَكُمْ عَلَيَّ حَقٌّ فَأَمَّا حَقُّكُمْ عَلَيَّ فَالنَّصِيحَةُ لَكُمْ وَتَوْفِيرُ فَيْئِكُمْ عَلَيْكُمْ وَتَعْلِيمُكُمْ كَيْلَا تَجْهَلُوا وَتَأْدِيبُكُمْ كَيْمَا تَعْلَمُوا وَأَمَّا حَقِّي عَلَيْكُمْ فَالْوَفَاءُ بِالْبَيْعَةِ وَالنَّصِيحَةُ فِي الْمَشْهَدِ وَالْمَغِيبِ وَالْإِجَابَةُ حِينَ أَدْعُوكُمْ وَالطَّاعَةُ حِينَ آمُرُكُمْ.

"اے لوگو! ایک تو میرا تم پر حق ہے اور ایک تمہارا مجھ پر حق ہے، کہ میں تمہاری خیرخواہی کو پیش نظر رکھوں، اور بیت المال سے تمہیں پورا پورا حصہ دوں، اور تمہیں تعلیم دوں تاکہ تم جاہل نہ رہو اور اس طرح تمہیں تہذیب سکھاؤں جس پر تم عمل کرو، اور میرا تم پر یہ حق ہے کہ بیعت کی ذمے داریوں کو پورا کرو اور سامنے اور پس پشت خیرخواہی کرو۔ جب بلاؤں تو میری صدا پر لبیک کہو، اور جب کوئی حکم دوں تو اُس کی تعمیل کرو۔"

شرح وتفسیر

میرے اور تمہارے ایک دوسرے پر حقوق

اس خطبے کے آخری حصے میں، مولاؑ حکومت سے متعلق مسائل میں سے ایک اہم ترین مسئلے کو بیان فرما رہے ہیں اور

www.shiabookspdf.com

امام اور رہبر کا اُمت پر حق اور اُمت کا امام اور رہبر پر حق، چند مختصر اور معنی خیز جملوں میں بیان فرمارہے ہیں اور ہر حصے میں چار حقوق کی نشاندہی فرمارہے ہیں۔

سب سے پہلے امام پر اُمت کے حقوق کو بیان فرمارہے ہیں، کیونکہ اس حصے کو مقدم رکھنے سے نہ صرف یہ کہ سننے والوں میں ایک تاثیر پیدا ہورہی ہے، بلکہ اسلامی حکومت کا عوامی نقطۂ نظر واضح ہو رہا ہے اور یہ ثابت ہو رہا ہے کہ یہ حکومت، طاغوتی خودسروں کی حکومتوں سے بہت مختلف ہے جو کہ اپنے آپ کو لوگوں کا مالک اور آقا اور انہیں اپنا غلام سمجھتے تھے اور عملی طور پر بھی اُن سے آقا اور مالک کا سا معاملہ رکھتے تھے اور اُن کے ادوار میں ارباب (مالک) اور رعیت کی تعبیریں بہت زیادہ رائج تھیں۔

حضرتؑ فرماتے ہیں:

"أَيُّهَا النَّاسُ! إِنَّ لِي عَلَيْكُمْ حَقًّا، وَلَكُمْ عَلَيَّ حَقٌّ"

"اے لوگو! ایک تو میرا تم پر حق ہے اور ایک تمہارا مجھ پر حق ہے۔"

اگرچہ حق کو یہاں پر مفرد کی صورت میں ذکر کیا گیا ہے، مگر یہ جنس حق کے معنی میں آیا ہے جو کہ ایک عام مفہوم رکھتا ہے، اور اب رہی اسے نکرہ کے طور پر ذکر کرنے کی وجہ، تو اس سے مُراد ان حُقوق کی عظمت کی جانب اشارہ کرنا ہے، کیونکہ بعض اوقات نَکِرَہ کے طور پر استعمال کرنا تعظیم کے لیے ہوا کرتا ہے۔

پھر حضرتؑ، امام پر اُمت کے حق کو بیان کرتے ہیں:

"فَأَمَّا حَقُّكُمْ عَلَيَّ: فَالنَّصِيحَةُ لَكُمْ"

"اور تمہارا حق مجھ پر یہ ہے کہ میں تمہاری خیر خواہی کو پیش نظر رکھوں۔"

نصیحت دراصل خلوص کے معنی رکھتی ہے اور اسی وجہ سے خالص شہد کو "ناصح" کہتے ہیں۔ کبھی سینے پرونے کے معنی میں بھی استعمال کرتے ہیں اور اسی لیے درزی کو ناصح بھی کہا گیا ہے، اس کے علاوہ ہر قسم کے دھوکے اور فریب سے خالی اور اخلاص سے پُر خیر خواہی پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔

یہ لفظ خدا، رسول، قرآن، خاص شخصیات اور امام واُمت کے لیے مختلف حالات اور خصوصیات کے تحت استعمال ہوا کرتا ہے، اور ہر جگہ مقتضائے حال کے مطابق اس کے مفہوم کے مصداق کی جانب اشارہ ہوتا ہے۔ لغت کی بعض کتابوں میں ہم دیکھتے ہیں کہ نصیحت کا لفظ بہت سارے معنی کو اپنے آپ میں سمیٹے ہوئے ہے۔ مثال کے طور پر خدا کے معاملے میں لفظِ نصیحت کا مفہوم یہ ہے کہ اُس کی وحدانیت پر عقیدہ رکھا جائے اور اس کی عبادت میں خلوص نیت کو مدِّنظر رکھا جائے اور حق کا

www.shiabookspdf.com

ساتھ دیا جائے، اور قرآن کی نسبت نصیحت کا لفظ اُس پر عمل کرنے اور اُس کی تصدیق کرنے کے لیے اور جاہلوں کے مدمقابل اُس کی تاویل کرنے اور غالیوں کی تحریف سے بچانے کے معنی رکھتا ہے۔ اور رسولِ خداؐ کی نسبت نصیحت، آپؐ کی نبوت و رسالت کی تصدیق کرنے اور آپؐ کے احکامات کی اطاعت کرنے سے عبارت ہے اور اسی طرح سے ہر معاملے میں اُس کے تناسب کے لحاظ سے ایک خاص مفہوم کا حامل ہے۔[1]

گویا اِس مذکورہ خطبے میں اُمّت کی نصیحت اور خیر خواہی سے مقصود، لوگوں کی مادّی اور معنوی امور میں ترقی اور برتری کے لیے مکمل اور جامع منصوبہ بندی کرنا ہے، کیونکہ اُمّت کی خیر خواہی کے لیے سب سے پہلا قدم صحیح منصوبہ بندی کرنا ہے۔

لہٰذا ایک امام، والی و حاکم اور رہبر کو سب سے پہلے مرحلے میں ایسے دستور بنانے چاہئیں جو لوگوں کے تمام طبقوں کے مادّی اور معنوی منافع اور مطلوبہ کمال کی جانب اُن کے ارتقاء کے لیے کم سے کم ضروری ہوں اور تمام اہلِ فکر و نظر اس بات پر معتقد ہیں کہ وہ تمام تر اشکال اور مسائل جو ایک معاشرے کو گھیرے میں لے لیتے ہیں، وہ صحیح منصوبہ بندی نہ ہونے کی وجہ سے پیش آتے ہیں۔ اس کے بعد مولاؑ اُمت کے دوسرے حق کی جانب بڑھتے ہیں جو کہ معاشی اور اقتصادی مسائل سے متعلق ہے، فرماتے ہیں:

"وَتَوْفِيْرُ فَيْئِكُمْ عَلَيْكُمْ"

"اور تمہارے بیت المال سے تمہیں پورا پورا حصّہ دوں گا۔"

عمومی عدل و انصاف کا مسئلہ خاص طور پر معاشی اور اقتصادی حوالے سے ہمیشہ ہی تمام انسانی معاشروں کی ایک سب سے بڑی مشکل رہی ہے اور زیادہ تر جنگیں اور لہو کی ندیاں بہا دینے والی لڑائیوں کی اصل وجہ صرف یہی تھی کہ اِس عدل و انصاف کے پہلو کو پیروں تلے روند دیا گیا۔ یہی مسئلہ زیادہ تر عدالتوں کے مقدموں کی سب سے بڑی وجہ ہے، لہٰذا ان تمام تر اخلاقی انحرافات سے لڑنے کے لیے اور معاشرے میں عمومی اور خصوصی دونوں پیمانوں میں صلح و آشتی اور نظم و ضبط کو رائج کرنے کے لیے سب سے پہلے ہمیں عمومی اور اجتماعی عدالت کو زندہ کرنا ہوگا۔ اب اگر ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ امامِ عالی مقامؑ نے پورے معاشرے کے لیے صحیح پروگرام بنانے کے موضوع کے بیان کے فوراً بعد اس موضوع پر تاکید فرمائی ہے تو اُس کی وجہ وہی تمام اسباب ہیں جو اوپر بیان کیے گئے۔

اس بات پر غور کرتے ہوئے کہ "فَيْئ" کا لفظ اہلِ لغت کے مطابق نیک اور اچھی حالت کی طرف لوٹنے اور پلٹنے

---

[1] مجمع البحرین، نصح کے مادّے سے ہے۔

کے معنی رکھتا ہے، اور سائے کو بھی فئی کہا جاتا ہے کہ جب وہ مغرب سے مشرق کی طرف آتا ہے۔ یہ لفظ عموماً قرآنی آیات اور احادیث میں اس مال کے لیے استعمال ہوتا ہے جو کفار سے مسلمانوں کو حاصل ہوا ہو، اور کبھی کبھار اس مال کو بھی کہا جاتا ہے جو بغیر جنگ کے کفار سے حاصل ہو جائے اور بعض اوقات ان تمام اموال کو اور کبھی انفال (وہ قدرتی املاک اور اثاثے جو اسلامی حکومت کے متعلق ہیں اور ان کا کوئی خاص مالک نہیں ہے) کو بھی کہا جاتا ہے۔

اوپر کے جملے میں فَيْئٌ کے لفظ سے مراد بیت المال کے تمام اموال ہیں اور "تَوْفِيْرُ فَيْئِكُمْ" کی تعبیر، اس بات کے پیشِ نظر کہ "تَوْفِيْرٌ" کا لفظ وَفْرٌ کے مادّے سے ہے اور بہت سے مال کے معنی رکھتا ہے اور (توفیر) کا مطلب اسے ادا کرنا ہے، اس بات کی جانب اشارہ ہے کہ حاکم کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ لوگوں کے عمومی اموال کو پوری طرح سے ضرورت مندوں اور حق داروں پر خرچ کر دے اور لوگوں کے اقتصادی اور معاشی امور کو پوری طرح سے نبھائے۔

ایک حاکم کی تیسری ذمہ داری، تعلیم اور ثقافت سے متعلق کاموں کی انجام دہی ہے۔ اس بارے میں مولاؑ فرماتے ہیں۔ تمہارا مجھ پر تیسرا حق یہ ہے:

"وَتَعْلِيْمُكُمْ كَيْلَا تَجْهَلُوْا"

"میں تم لوگوں کو تعلیم دوں، تاکہ تم جاہل نہ رہ جاؤ۔"

جی ہاں ایک حاکم کو صحیح اور بہترین تعلیمات کے ساتھ جہالت کے خلاف کھڑے ہو جانا چاہیے اور لوگوں کی فکری سطح کو اوپر لے جانا چاہیے اور معاشرے کی ثقافتوں کو تقویت دینی چاہیے اور بدبختیوں کی تمام وجوہات میں جو سب سے بڑی وجہ ہے یعنی جہل و نادانی، کی جڑیں اکھاڑ پھینکنی چاہییں۔

حضرتؑ فرماتے ہیں کہ تمہارا مجھ پر چوتھا حق یہ ہے:

وَتَأْدِيْبُكُمْ كَيْمَا تَعْلَمُوْا"

"اور تمہیں اس طرح سے تہذیب سکھاؤں اور تمہاری ایسی تربیت کروں کہ تم آگاہ ہو جاؤ اور اس پر عمل کرو۔"

اس طرح سے مولاؑ نے چار چھوٹے اور معنی خیز جملوں میں ایک اسلامی حکومت کے چار بنیادی عناصر اور ملتوں کے حاکم طبقے پر عائد حقوق کی جانب اشارہ فرمایا ہے:

(۱) صحیح منصوبہ بندی کرنا

(۲) اِقتصادی مسائل کی عادلانہ تنظیم

(۳) تعلیم سے متعلّق معاملات پر بھرپور توجہ

www.shiabookspdf.com

(۴) اخلاقی تہذیب اور تربیت کے اُمور پر توجہ اور اخلاقی مفاسد کے خلاف جنگ کرنا

قابلِ توجہ بات تو یہ ہے کہ تیسرے حق میں فرماتے ہیں: "میں تمہیں تعلیم دوں تا کہ تم جاہل نہ رہ جاؤ" اور چوتھے حق میں فرماتے ہیں: "اور میں تمہاری تربیت اور اس طرح سے تہذیب سکھاؤں کہ تم اُس پر عمل کرو اور آگاہ ہو جاؤ۔"

جب کہ تعلیم کا نتیجہ اگرچہ آگاہی ہے، مگر تربیت اصل میں اخلاقی صفات کی پرورش ہے، نہ کہ آگاہی دلانا۔ مگر مقصد امامؑ یہ ہے کہ فضائل کے آثار اور رذائل کے نقصانات سے آگاہ ہو جاؤ تا کہ تم اِن فضائل کو اپنے وجود میں ڈھال دو اور رذائل کے خلاف لڑو۔

درحقیقت تیسرا حق، عقلِ نظری کی جانب اِشارہ ہے اور چوتھا حق عقلِ عملی کی جانب اِشارہ ہے۔ اُس کے بعد حضرت امامؑ اپنے حق کو یا دوسرے لفظوں میں یہ کہیں کہ حاکم کا اُمّتِ اسلامی پر جو حق ہے اُسے چار حصوں میں خلاصتاً بیان فرما رہے ہیں۔ پہلے فرماتے ہیں:

"وَأَمَّا حَقِّي عَلَيْكُمْ، فَالْوَفَاءُ بِالْبَيْعَةِ"

"اور میرا تم پر حق یہ ہے کہ تم بیعت کی ذمّے داریوں کو پورا کرو۔"

بیعت درحقیقت وہی عہد و پیمان ہے جو امت اور امام کے درمیان طے پاتا ہے، ایک مضبوط اور ایسا عہد جس پر عمل کرنا لازم ہو اور اس عہد و وعدے کے تحت امام اور حاکم پر لازم ہے کہ ہر جگہ اُمت اور رعایا کی مصلحت کو ہی مدنظر رکھے اور نظم و ضبط کو برقرار رکھے، دشمنوں کے خلاف لڑے اور معاشرے کی ترقی اور ترویج کے اسباب فراہم کرے۔ اُمّت کو بھی اپنے امام کے قدم بقدم چلنا چاہیے، ان کے لیے محکم اور مضبوط بازو ثابت ہونا چاہیے اور اِس عہد و پیمان کے خلاف ہرگز کوئی کام نہیں کرنا چاہیے۔ حضرتؑ دوسرے حق کے بارے میں فرماتے ہیں:

"وَالنَّصِيحَةُ فِي الْمَشْهَدِ وَالْمَغِيبِ"

"سامنے اور پس پشت خیر خواہی کرو۔"

کہیں چاپلوسوں یا مختلف قسم کے چہرے والے منافقوں کی طرح مت ہونا کہ میرے سامنے محبت، دوستی اور خلوص کے جلوے دکھاؤ اور خیر خواہی کا اعلان کرتے رہو، مگر میرے پس پشت غیر ذمّے دارانہ رویّے دکھاؤ یا فساد اور خیانت سے پیش آؤ۔ اگر میں ہر جگہ موجود نہیں ہوں تو میرا خدا تو ہر جگہ حاضر و ناظر ہے اور یہ جہان سارا کا سارا محضرِ الٰہی ہے اور ایمان دار لوگوں کے لیے میرے ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

اُس کے بعد حضرتؑ تیسرے حق کی جانب بڑھتے ہیں اور فرماتے ہیں:

www.shiabookspdf.com

"وَالْإِجَابَةُ حِينَ أَدْعُوكُمْ"

"اور جب بلاؤں تو میری صدا پر لبیک کہو۔"

اُن سُست اور ناتواں لوگوں کی طرح نہ ہونا کہ جو بیماروں کی سی حالت میں نظر آتے ہیں اور جواب دینے میں لیت و لعل اور سُستی برتتے ہیں۔ ہمیشہ اپنے امام کے حکم کی اطاعت کے لیے تیار رہو کیونکہ کبھی کبھار وقت اور لمحے تقدیر ساز ہوتے ہیں۔ اور ذرا سی سُستی اور تعلل سے ممکن ہے کہ نا قابل تلافی نقصانات اُٹھانے پڑ جائیں۔ یعنی اطاعت کے لیے تیار رہنا ایک ایسی شے ہے کہ جس پر پُوری اُمّت کو عمل پیرا رہنا چاہیے۔

چوتھے اور آخری حق کے بارے میں فرماتے ہیں:

"وَالطَّاعَةُ حِينَ آمُرُكُمْ"

"اور جب میں تمہیں حکم دوں تم اِطاعت کرو۔"

ممکن ہے کہ بعض افراد امامؑ کے بلاوے کو قبول کر لیں اور اُن کی دعوت پر لبیک کہیں، مگر جب اُن کے پاس آ جائیں اور پھر کوئی سخت اور شدید حکم مل جائے جو کہ اُمّت کے مفادات کے حق میں ہو، اُس پر یہ لوگ اطاعت نہ کریں۔ لہٰذا امامؑ کے بلاوے اور دعوتِ حق کو قبول کرنا بھی لازم ہے اور اُن کے حکم کی بجا آوری بھی لازم ہے۔ ظاہری بات ہے کہ یہ امامؑ کی اُمت پر لاگو ہونے والے چاروں حقوق، وہ معاملات ہیں جن کے مفادات براہ راست اُمّت کے ہی حق میں ہوتے ہیں۔ وہ لوگ اِن کاموں کو انجام دینے کے بعد جتانے کا بھی حق نہیں رکھتے کیونکہ وہ کوئی احسان نہیں کر رہے بلکہ امامؑ نے اُن پر احسان کیا کہ وہ اِن حقوق کے ذریعے اُنہی کے لیے اُن کی آبادی، آزادی اور اُن کی فخر و سر بلندی کے ضامن بن جاتے ہیں۔

نہج البلاغہ کے بعض شارحین نے یہاں پر اضافہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ چاروں حقوق یعنی حاکم کے عوام پر چاروں حقوق اور عوام کے حاکم پر حقوق صرف امام عادل اور منصوص من اللہ کے لیے ہیں، نہ کہ تمام تر حاکموں اور اُمرا کے لیے چاہے وہ اچھے ہوں یا برے۔

اسی وجہ سے امامؑ نے فرمایا: "إِنَّ لِي عَلَيْكُمْ حَقًّا"۔[1] "میرا تم پر ایک حق ہے۔" مگر جیسا کہ بظاہر سمجھ میں آتا ہے، یہ ایک ایسا بنیادی اصول ہے جو ہر قوم اور ہر ملت کے لیے بنایا گیا ہے۔ جو بھی پیشوا یا امیر ہو، چاہے وہ خدا کی جانب سے ہو یا پھر "لَابُدَّ لِلنَّاسِ مِنْ أَمِيرٍ بَرٍّ أَوْ فَاجِرٍ"[2] کے مقولے کے مطابق، یعنی لوگوں کے لیے کوئی نہ کوئی امیر یا پیشوا

[1] مفتاح السّعادۃ، جلد ۲، صفحات ۸۴-۸۵
[2] نہج البلاغہ، خطبہ ۴۰

www.shiabookspdf.com

ضرور ہونا چاہیے چاہے وہ نیک ہو یا فاجر ہو۔

اب جو بھی امیر اور حاکم، جس کسی معاشرے میں برسرِ اقتدار آ جائے، اگر وہ چاہتا ہے کہ اُس کا کام آگے بڑھے تو اُسے اِن چار اُصولوں کو محترم شمار کرنا ہوگا اور جو بھی ملّت یا رعایا اگر اپنے امیر کے وجود سے بہرہ مند ہونا چاہتی ہے، اُسے ان چار اُصولوں پر عمل کرنا ہوگا۔ درحقیقت جو کچھ اِس خطبے میں آیا ہے وہ ایسے ارشادات ہیں، جنہیں عقل اور منطق بھی تسلیم کرتی ہے کہ ہاں یہ مشعلِ راہ ہیں۔

چند نکات

ا۔ اِمام اور اُمت کے باہمی حقوق

حکومت دراصل ایک بندھن ہے امام اور اُمت کے درمیان۔ بالکل جس طرح سر کا بدن سے ایک بندھن ہے۔ بغیر کسی ربط اور مکمل ہم آہنگی کے ہرگز فائدہ نہیں لیتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیں کہ اللہ کی جانب سے چُنے ہوئے حکام، اُمتوں کے درمیان خدا کے نمائندے ہونے کے ساتھ ساتھ عوام کے مسائل کے حل کے لیے اُن کے نمائندے بھی ہوتے ہیں۔ اور اِسی وجہ سے امام کے اُمت پر اور اُمت کے اِمام پر سب سے زیادہ سنگین حقوق لاگو ہوتے ہیں۔ روایات میں اِن باہمی حقوق کے حوالے سے مختلف باتیں ملتی ہیں جن سے یہ پتا چلتا ہے کہ اِسلام نے اِس اہم موضوع کو خود کتنی اہمیت دی ہے اور اس کا کس درجے اہتمام کیا ہے۔ مرحوم کلینیؒ نے اُصولِ کافی کی جلد اوّل میں اس موضوع پر ایک پورا باب رقم کیا ہے اور اس بات کی سب سے پہلی حدیث ابوحمزہؓ سے نقل شدہ ہے کہ وہ کہتے ہیں:

میں نے حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے پوچھا:

"مَا حَقُّ الْإِمَامِ عَلَى النَّاسِ۔"

"امام کا لوگوں پر کیا حق ہے؟"

تو آپؑ نے جواب میں فرمایا:

"حَقُّهُ عَلَيْهِمْ أَنْ يَسْمَعُوا لَهُ وَيُطِيعُوهُ۔"

"امام کا لوگوں پر یہ حق ہے کہ اُس کی سنیں، اُس کی اِطاعت کریں۔"

پھر کہتا ہے کہ میں نے پوچھا:

www.shiabookspdf.com

"مَا حَقُّهُمْ عَلَيْهِ"

"لوگوں کا امام پر کیا حق ہے؟"

تو فرمایا:

"يُقَسِّمُ بَيْنَهُمْ بِالسَّوِيَّةِ وَيَعْدِلُ فِي الرَّعِيَّةِ"

"ہر چیز اُن کے درمیان برابری سے تقسیم کردے (اور لوگوں کے درمیان فرق نہ رکھے) اور اُن کے درمیان عدل وانصاف کا خیال رکھے۔"

بعید نہیں ہے کہ پہلا جملہ اجتماعی اور سیاسی مسائل کی جانب اشارہ ہو اور دوسرا جملہ اقتصادی مسائل کی جانب۔

اِس حدیث کے آخر میں حضرتؑ نے فرمایا:

"فَإِذَا كَانَ ذَالِكَ فِي النَّاسِ فَلَا يُبَالِي مِنْ أَخْذِ هَاهُنَا وَهَاهُنَا"

"جب کبھی لوگوں کے درمیان یہ اُمور رائج ہو جائیں تو پھر کوئی فرق نہ ہوگا کہ وہ اپنے حقوق یہاں سے لیں یا وہاں سے۔"[1] مقصدِ سخن یہ ہے کہ بہر حال لوگ اپنے حق کو پا ہی لیں گے، اب چاہے اُس کا مصداق یہاں ہو یا کہیں اور ہو۔

مرحوم محقق مجلسیؒ اپنی کتاب مرآۃ العقول میں، اس جملے کی تفسیر بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"اس جملے میں مقصد یہ ہے کہ جب حق دونوں جانب سے نبھایا جارہا ہو تو پھر جو بھی جہاں بھی چلا جائے، جیسا بھی کام کرلے، پھر اُسے کوئی مشکل درپیش نہیں ہوگی، چاہے وہ کوئی بھی ہو اور کسی بھی مذہب کا ہو اس میں کوئی امتیاز نہیں۔"[2]

حضرت امیر المومنین علیہ السلام کی زندگی اور باعث فخر تاریخ، اسلامی حکومت کے مسئلے پر ایک بہترین نمونۂ عمل اور مشعلِ راہ ہے۔ آپؑ عدل کے معاملے میں اس قدر سخت گیر تھے کہ اپنے سارے وجود کو اُس پر فدا کر دیا۔

ابن ابی الحدید اس خطبے کے ذیل میں، مؤرخین میں سے ایک، "فضیل ابن جعد" سے نقل کرتے ہیں، کہ عربوں کی ایک بہت بڑی اکثریت کا امیر المومنینؑ سے دور ہو جانے کا سب سے اہم سبب مالی مسائل تھے، کیوں کہ آپؑ اشرافِ عرب اور معروف شخصیتوں کو دوسروں پر برتری نہیں دیتے تھے اور عرب کو غیر عرب پر مقدم نہیں ٹھہراتے تھے اور قبائل کے رئیسوں اور اُمرا سے خفیہ میل جول پسند نہیں کرتے تھے اور کسی کو بھی ذاتی طور پر اپنے پاس نہیں بلواتے تھے، جبکہ امیر شام بالکل آپؑ کے برخلاف کیا کرتا تھا اور اسی وجہ سے دُنیا پرستوں نے مولا علیؑ کو چھوڑ دیا اور امیر شام سے جا ملے۔

---

[1] اصول کافی، جلد ۱، صفحہ ۴۰۵

[2] مرآۃ العقول، جلد ۴، صفحہ ۳۳۵

www.shiabookspdf.com

پھر اضافہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ حضرت علی علیہ السلام نے اپنے بہت سے اُصحاب کے ساتھ نہ دینے اور بعض کے امیر شام کی طرف چلے جانے پر مالک اشترؒ سے گفتگو کی اور گلہ کیا۔ مالکؒ نے عرض کی: یا امیر المومنینؑ! جس دن ہم نے اہل بصرہ اور اہل کوفہ کی مدد سے اہل بصرہ سے جنگ کی تھی اُس وقت لوگ متحد تھے، مگر آج اُن میں اختلافات پیدا ہو گئے ہیں اور اُن کے اِرادے کمزور اور اُن کی تعداد کم ہوگئی ہے اور آپ بھی یہ چاہتے ہیں کہ اُن کے ساتھ عدل وانصاف سے برتاؤ کریں اور حقدار کو حق دیں اور اگر عام افراد مظلوم لوگوں کی فہرست میں آ جائیں، تو آپ ظالموں سے اُن کا حق اُن کو دِلائیں گے اور اثر ورسُوخ والے اور صاحبانِ عزت وشرف آپ کی نظر میں عام لوگوں کے مانند ہیں۔ آپؑ کے بعض اُصحاب آپؑ کے اُن حضرات کی نسبت حق کے اجراء پر شکوہ کررہے ہیں اور آپ کی اس عادلانہ رویّے پر رنجیدہ ہیں۔ دوسری طرف سے اُنہیں یہ نظر آرہا ہے کہ امیر شام نے امیروں، بااثر ورسوخ حضرات کو خوش رکھنے کے لیے کیا کیا طریقے شروع کیے ہوئے ہیں۔ اُن کے دِل دُنیا کی جانب متوجہ ہو گئے ہیں اور ایسے افراد بہت کم رہ گئے ہیں جن کا دِل دنیا کی جانب متوجہ نہ ہو۔ اُن میں سے اکثر لوگ حق سے کنارہ کشی کر کے باطل کے خریدار بن بیٹھے ہیں اور دُنیا کو آخرت پر ترجیح دینے لگے ہیں، اگر آپ بااثر دنیا پرستوں کو مال سے نواز دیں تو اُن کی گردنیں آپؑ کی جانب کھنچی ہوئی چلی آئیں گی اور آپ کے خیر خواہ ہو جائیں گے اور آپؑ سے عشق کرنے لگیں گے۔ امیر المومنینؑ نے مالکؒ کی بات کے جواب میں فرمایا: اور یہ جو تم نے کہا کہ ہم عدل وانصاف کی روش پر چل رہے ہیں تو یہ فرمانِ الٰہی کی پیروی کے سوا کچھ نہیں۔ ارشادِ خداوندی ہے:

"مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا ۚ وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ۝"

"جو کوئی بھی عمل صالح انجام دے گا تو اُس کا نفع بھی اُسی کو ملے گا، اور جو کوئی بھی کوئی بُرائی انجام دے گا، تو اُس نے خود اپنے ساتھ ہی بُرا کیا ہے۔ تمہارا پروردگار ہرگز اپنے بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔" [1]

اور یہ جو تم نے کہا یعنی حق وعدالت کے نفاذ میں اُس کے بارے میں کوتاہی کرنے سے زیادہ ڈرتا ہوں، بہ نسبت اُس کے جس کی جانب تم مجھے بلا رہے ہو، لیکن یہ کہ حق کا کہنا ان پر گراں گزرا اور اسی وجہ سے ہم سے جدا ہو گئے۔ ہم معیوب نہیں تھے۔ خدا جانتا ہے کہ وہ ظلم وستم کی وجہ سے جدا ہو گئے اور ہم سے جدائی کے بعد زیرِ عدالت پناہ نہ لی، وہ فانی دنیا کے پیچھے لگ گئے اور بروزِ قیامت ان سے سوال ہوگا۔

لیکن یہ کہ ہم سے یہ کہنا کہ ہم بے حساب اموال بیت المال کو صرف کریں اور اس گروہ کے اشخاص کے لیے جن کا اشارہ کیا گیا ہے، مخصوص بخشش رکھیں، یہ کام ہمارے لیے ناممکن ہے، ہم کسی شخص کو بھی اس کے حصے سے زیادہ نہیں دے سکتے

[1] سورۂ فصلت، آیت ۴۶

www.shiabookspdf.com

اور اس گروہ کا ہم سے جدا ہونا ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا اس لیے کہ خداوند عالم نے فرمایا ہے:

"كَمْ مِنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللهِ وَاللهُ مَعَ الصَّابِرِينَ"[1]

"کتنے زیادہ چھوٹے گروہ خدا کے فرمان سے بڑے بڑے گروہوں پر کامیاب ہوئے اور خداوند عالم صبر کرنے والوں (صاحبان استقامت) کے ساتھ ہے۔"[2]

پھر بھی مناسب مقامات پر، اسلامی حکومت کی خصوصیات، امت پر حق امام، امام پر حق امت کا تذکرہ کیا جائے گا۔

۲۔ حق اور مصلحت پر کھینچا تانی

اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ بہت سے حقائق جلد گزرنے والے لحظات اور شخص و اجتماعی مصلحتوں سے تعارض کرتے ہیں اور حق ایک طرف ہو کر رہ جاتا ہے اور مصلحت اندیشی ایک طرف مقابل میں قرار پاتی ہے، یہاں عموماً دنیوی سیاستدان مصلحت اندیشی کو حق اور واقعیت پر مقدم سمجھتے ہیں اور حق کو ان پر قربان کر دیتے ہیں۔

تاریخ بھری پڑی ہے ایسے تعارض اور ترجیح کے نمونوں سے اور ہمارے دور میں بھی تقریباً روزانہ ہم اس کے شاہد ہیں۔ لیکن مردانِ الٰہی اور وہ اشخاص جنہوں نے ان کے نقش قدم پر چلنا اپنا شعار بنالیا، بلا تردد وہ حق کو ترجیح دیتے ہیں۔ امیر المومنین علیؑ کا اپنے دشمنوں اور یہاں تک کہ بعض دوستوں کے ساتھ اختلافی موارد میں یہی معاملہ تھا۔

وہ کہتے تھے کہ بیت المال کی عادلانہ تقسیم گرچہ حق ہے لیکن مصلحت اندیشی مناسب نہیں ہے، سرداروں کو مقدم کرنا چاہیے اور ثروتمندوں کو زیادہ حصہ دیا جائے اور حقیقی ضرورت مندوں کا حصہ کم رکھا جائے، حالانکہ حضرت علی علیہ السلام اجرائے حق و عدالت کی طرفداری میں بہت سخت تھے، چاہے کچھ لوگوں کے لیے یہ ناخوشگوار ہو اور آپ کی حمایت سے دست بردار ہو جائیں یا آپؑ کی مخالفت میں کھڑے ہو جائیں اور حضرت علی علیہ السلام کا تنہا رہ جانا جس کے آثار مذکورہ بالا خطبے اور نہج البلاغہ کے اکثر خطبوں میں ظاہر ہیں، زیادہ تر اسی (عدالت) کی وجہ سے تھا۔

یہ نکتہ اہمیت کا حامل ہے کہ حضرت امام علی علیہ السلام نے اسی طرح کیا جیسا کہ خدا و پیغمبرؐ نے دستور دیا تھا، اگر آپ بغیر فاصلے کے پیغمبرؐ کے بعد اپنی جگہ پر آجاتے تو بہت سی ایسی مشکلات اصلاً جنم ہی نہ لیتیں، اس لیے کہ پیغمبرؐ نے راہِ حق کو ہموار فرما دیا تھا اور لوگوں کی اکثریت قاطع اس کو قبول کر چکی تھی، لیکن خلفاء کے ناجائز ایام کا درمیان میں آجانا، خصوصاً عجیب جو خلیفہ

[1] سورہ بقرہ آیہ ۲۴۹

[2] شرح نہج البلاغہ، ابن ابی الحدید، جلد ۲، صفحہ ۱۹۸۔۱۹۷

www.shiabookspdf.com

ثالث کے دور میں بیت المال میں وجود میں آیا اور اموال بیت المال بے دریغ و بے حساب اقوام کے درمیان اور خلیفۂ ثالث کے ساتھیوں اور طاقتور گروہوں کے درمیان تقسیم ہوا، انہوں نے حالات کو بہ طور کلّی تبدیل کر دیا اور بیری سنگھوں اور عادتوں کو ایجاد کیا، اس طریقے سے کہ ان کا حق کی طرف لوٹنا بہت مشکل ہو گیا۔

غنائم کی غیر معمولی افزائش اور بیت المال میں اموال کی فراوانی بھی اس کا سبب بنی کہ ایک گروہ مثل طلحہ و زبیر نے جو سابقان اسلام اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے یارانِ خاص میں سے تھے، حق کو مصلحت شخصی کے اوپر قربان کر دیا اور یہ ہی سبب ہوا کہ حضرت امام علیؑ کی حکومتی مشکلات بہت بڑھ گئیں۔

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام اس کے باوجود کہ جانتے تھے کہ مصلحت پر حق کو ترجیح دینے کی سیاست کتنی مشکلات ان کے لیے کھڑی کر دے گی اور ممکن ہے کہ بعض موارد پر شکست سے دوچار کرے، لیکن پھر بھی الٰہی قانون سے ہاتھ نہ اٹھایا، کیونکہ اس عمل سے ایک اہم ارزش اسلامی کو زندہ فرمایا اور یقیناً قدروں کا احیاء اور اس کی حفاظت آئندہ نسلوں کے لیے ایک مکتب الٰہی میں وقتی کامیابیوں پر مقدم ہے اور یہ ایک اہم مطلب ہے جو کہ حکومت امیر المومنین علی علیہ السلام کی کس طرح کی تقسیم تھی، اس کے متعلق بہت سے سوالات کا جواب دیتا ہے اور خدا نے چاہا تو پھر مناسب موقع پر اس بارے میں بات کریں گے۔

www.shiabookspdf.com

پینتیسواں خطبہ

ومن خطبة له علیه السلام [1]

بَعْدَ التَّحْكِيمِ وَ مَا بَلَغَهُ مِنْ أَمْرِ الْحَكَمَيْنِ وَ فِيهَا حَمْدُ اللهِ عَلَى بَلَائِهِ، ثُمَّ بَيَانُ سَبَبِ الْبَلْوَى۔

حضرت امام علیؑ نے یہ خطبہ حکمین کے واقعے کے بعد ارشاد فرمایا (جب عمرو بن عاص نے نادان ابوموسیٰ اشعری کو دھوکا دیا تا کہ امام علیؑ کو خلافت سے جدا اور امیر شام کو مقرر کیا جائے اور یہ بات اہلِ عراق کو سخت ہلا دینے والی تھی) اور اس خطبے میں حضرت امام علیؑ حمد وثنائے الٰہی کے بعد اس کی ابتدا اور اس کی شرح فرماتے ہیں:

الْحَمْدُ لِلهِ وَإِنْ أَتَى الدَّهْرُ بِالْخَطْبِ الْفَادِحِ وَ الْحَدَثِ الْجَلِيلِ وَ أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللهُ لَا شَرِيكَ لَهُ لَيْسَ مَعَهُ إِلَهٌ غَيْرُهُ وَ أَنَّ مُحَمَّداً عَبْدُهُ وَ رَسُولُهُ صلى الله عليه وآله

أَمَّا بَعْدُ فَإِنَّ مَعْصِيَةَ النَّاصِحِ الشَّفِيقِ الْعَالِمِ الْمُجَرِّبِ تُورِثُ الْحَسْرَةَ وَ تُعْقِبُ النَّدَامَةَ وَ قَدْ كُنْتُ أَمَرْتُكُمْ فِي هَذِهِ الْحُكُومَةِ أَمْرِي وَ نَخَلْتُ لَكُمْ مَخْزُونَ رَأْيِي لَوْ كَانَ يُطَاعُ لِقَصِيرٍ أَمْرٌ فَأَبَيْتُمْ عَلَيَّ إِبَاءَ الْمُخَالِفِينَ الْجُفَاةِ وَ الْمُنَابِذِينَ الْعُصَاةِ حَتَّى ارْتَابَ النَّاصِحُ بِنُصْحِهِ وَ ضَنَّ الزَّنْدُ بِقَدْحِهِ فَكُنْتُ أَنَا وَ إِيَّاكُمْ كَمَا قَالَ أَخُو هَوَازِنَ

أَمَرْتُكُمْ أَمْرِي بِمُنْعَرَجِ اللِّوَى

[1] یہ خطبہ تھوڑے فرق کے ساتھ مروج الذہب مسعودی، کامل ابن اثیر، انساب الاشراف بلاذری، تاریخ طبری، الامامۃ والسیاسۃ ابن قتیبہ دینوری، صفین نصر بن مزاحم، میں آیا ہے اور سبط ابن جوزی نے تذکرۃ الخواص میں اس کو نقل کیا ہے اور ابوالفرج اصفہانی نے "آغانی" میں اس کا اشارہ کیا ہے۔ (مصادر نہج البلاغہ، جلد ۱، صفحہ ۴۲۹)

www.shiabookspdf.com

فَلَمْ تَسْتَبِينُوا النُّصْحَ إِلَّا ضُحَى الْغَدِ

"حمد و ثنا مخصوص خداوند عالم ہے، اگر چہ زمانہ سنگین واہم حوادث اور دردناک واقعات ہمارے لیے لے آیا ہے، پھر بھی ہم گواہی دیتے ہیں کہ کوئی معبود بجز خداوند یکتا نہیں ہے، وہ شریک نہیں رکھتا اور اس کے ساتھ کوئی اور معبود نہیں ہے اور ہم گواہی دیتے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے (برگزیدہ) عبد اور اس کے بھیجے ہوئے ہیں۔

امابعد! با تجربہ، دانا، مہربان اور ناصح فرد کے حکم کی نافرمانی، حسرت واندوہ کا موجب ہوتی ہے اور پشیمانی کا سبب ہوتی ہے، میں نے حکمیت کے مسئلے کے بارے میں اپنا فرمان تم لوگوں کو سنایا اور اپنی خالص رائے کو تمہارے اختیار میں دیا؟ اگر قصیر [1] کی باتوں پر کان دھرا جاتا، تو کتنا اچھا ہوتا۔

لیکن تم لوگوں نے جفا کار مخالفوں اور نافرمان پیمان شکنی کرنے والوں کی طرح حکم کو قبول کرنے سے منع کر دیا، یہاں تک کہ گویا نصیحت کرنے والے کو اپنے پند و نصیحت کی تردید کرنا پڑ گئی، اور نصیحت کو آگے بڑھانے سے اپنے آپ کو روکنا پڑا۔ اس مثال میں ہمارا اور تمہارا حال مثل اخو ہوازن، بنی ہوازن قبیلے کا ایک مرد ہے جو ایک تاریخی واقعہ میں ہے ۔فرمایا۔ میں نے سرزمین منعرج اللوی میں، اپنا حکم و دستور دیا لیکن تم نے کان نہ دھرا اور اس کے اثر کو دوسرے روز ہی دیکھ لیا۔"

خطبہ، ایک نگاہ میں

جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا کہ یہ خطبہ امیر المومنینؑ نے کار حکمین کے خاتمے کے بعد بیان فرمایا۔

حکمین کی بات جہاں اسلام کے لیے بہت سخت و ناگوار تھی، اس واقعے نے ثابت کر دیا کہ اگر حضرت علی علیہ السلام ان لوگوں کو حکمیت کے فیصلے کو قبول کرنے سے روک رہے تھے اور جنگ کو مکمل فتح تک جاری رکھنے کا حکم دے رہے تھے تو اس کی دلیل ایسے واقعات تھے۔ اسی وجہ سے حضرت علی علیہ السلام کوفے کے لوگوں کو سخت سرزنش کرتے ہیں اور انہیں بتاتے ہیں کہ یہ نافرمانی اور نصیحت قبول نہ کرنے کا نتیجہ ہے۔

[1] قصیر ایک فہمیدہ اور زیرک شخص تھا، ایک اہم تاریخی واقعے میں لوگوں نے ان کے نظریے کی مخالفت کی تو بہت بڑے نقصان کا سامنا کرنا پڑا۔

www.shiabookspdf.com

شرح وتفسیر

نافرمانی کا نتیجہ یہ ہے

وہ حالات جو اس خطبے میں بیان ہوئے بہت دردناک اور جانکاہ تھے، امیر شام اور عمرو ابن عاص کی سازشیں، ابوموسیٰ اشعری، جس کی پشت پناہی کے لیے بڑا گروہ موجود تھا، کی نادانی کی بدولت اُن کے حق میں بارآور ثابت ہوئیں۔ اور وہ حکمیت کے انجام کو اپنے مفاد میں استعمال کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

اور اپنی سوچ کے مطابق حضرت امام علی علیہ السلام کو خلافت سے معزول اور امیر شام کو ان کی جگہ بٹھائیں۔ یہ اس حال میں تھا کہ غم واندوہ نے قلب امامؑ کو مضطرب کیا تھا، کیونکہ حضرتؑ پہلے سے ان تمام امور کی پیش بینی فرما چکے تھے اور کوفہ وعراق کے لوگوں کو اس کی خبر دے چکے تھے، لیکن جہالت، عصبیت، کم ظرفی، خودخواہی، کاہلی اور تن پروری، حضرت امام علیؑ کی حکیمانہ نصیحتوں کو قبول کرنے میں مانع ہوئیں۔

بہر حال حضرت امام علی علیہ السلام اس خطبے کو دوسرے خطبوں کی طرح حمد وثناء سے شروع کرتے ہیں، حمد وثناء جو دوہرا رنگ رکھتی ہے اور خدا کی حتّٰی کہ اس دردناک حادثے اور بڑے امتحان تک میں حمد کرتے ہیں اور فرماتے ہیں:

"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَاِنْ أَتَى الدَّهْرُ بِالْخَطْبِ [1] الْفَادِحِ [2] وَالْحَدَثِ الْجَلِيْلِ"

"ثنائے مخصوص خداوند متعال کے لیے، جتنا زمانہ سنگین حوادث اور اہم اور دردناک واقعات ہمارے لیے لے آیا ہے۔"

پہلی بات یہ کہ توجہ رہے کہ حضرت امام علی علیہ السلام سب سے پہلے ان دردناک حوادث پر اللہ کا شکر بجالاتے ہیں تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ پروردگار کا شکر اور حمد وثناء صرف اچھے اور نیک واقعات اور صرف مادّی مفاد اور کامیابیوں پر ہی نہیں کی جاتی، بلکہ ہر حال میں اس کی حمد وثناء کی جائے، خواہ صحت، بیماری، خوشی، غم، فتح وشکست کا مرحلہ پیش آئے۔ یہاں تک کہ دردناک حوادث کا بھی کوئی فلسفہ ہے کہ اگر ان کا نتیجہ درست نکلے تو یہ بھی خدا کی نعمتوں اور برکتوں کا حصہ شمار ہوتے ہیں۔

---

[1] خطب، بروزن ختم بہ معنیٰ اہم کام آیا ہے کہ جو ایک انسان اور دوسرے شخص کے درمیان وجود میں آئے، اسی دلیل کی وجہ سے جو گفتگو انسانوں کے درمیان ہوتی ہے اسے "مخاطبہ" کہا جاتا ہے۔

[2] فادح، سنگین کے معنیٰ میں ہے لہٰذا اگر کوئی قرض رکھتا ہو کہ اس کے دوش پر سنگینی کا سبب ہو، اس کو "دین فادح" کہتے ہیں۔

www.shiabookspdf.com

دوسری بات یہ کہ اس دردناک واقعے کو زمانے سے نسبت دیتے ہیں اور ہم جانتے ہیں کہ زمانہ، مردم زمانہ کے علاوہ کوئی چیز نہیں وگرنہ آفتاب کی تپش و ماہتاب کی چمک و بارش کا نزول، ہواؤں کا لگنا اور سب امور طبعی ایسی چیزیں نہیں ہیں کہ ایسے واقعات کا منشاء بنیں اور یہ عدم رضایت وشکوہ کے لیے مناسب ہے۔

یہ زمانے کے لوگ ہی ہیں کہ جو اپنے غلط اعمال کی خاطر دردناک عواقب میں گرفتار ہوتے ہیں، اسی واقعے میں اگر عراقی لوگوں نے اپنے مولا و امام علی علیہ السلام کے فرمان پر کان دھرے ہوتے اور ان کی بہترین رائے سے بیدار ہوتے اور اس حکم الٰہی کی نصیحتوں سے نتیجہ لیا ہوتا، تو ہرگز ایسی سختی والے جال میں گرفتار نہ ہوتے۔

"خطب فادح۔ (خطب ایک اہم معاملے کے معنی میں استعمال ہوا ہے اور "فادح" اس پر تاکید کے لیے آیا ہے) حکمین کی داستان ہے جو اسلامی دنیا کے لیے بہت سنگین وسخت تھی اور ناگواری کی پیش بینی تھی۔

صحیح ہے کہ حکمین کی داستان، اسی شرح کے مطابق جس کے نکات بعد میں آئیں گے، نے کسی چیز کو تبدیل نہ کیا بلکہ اچھا بہانہ امیر شام اور اس کے تابعین کے ہاتھ لگ گیا کہ جنہوں نے اس سے فائدہ اٹھا کر بہت سے بے خبر اور ناآگاہ افراد کو گمراہ کردیا اور بہت سی بری بدعتیں اسلامی دنیا میں چھوڑیں۔

"حدیث جلیل" سے مراد ان بدعتوں کے برے آثار کے لیے دوسری تاکید ہے۔ حضرت علیؑ اس حمد وثناء کے بعد یگانگی خداوند عالم اور پیغمبر اسلامؐ کی نبوت کی شہادت دیتے ہیں اور فرماتے ہیں:

"وَأَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ، لَا شَرِيْكَ لَهُ، لَيْسَ مَعَهُ إِلٰهٌ غَيْرُهُ، وَأَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُوْلُهُ"

"میں گواہی دیتا ہوں کہ خداوند عالم یگانہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ کوئی شریک نہیں رکھتا اور اس کے ساتھ کوئی اور معبود نہیں ہے، اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے بھیجے ہوئے بندے اور رسول ہیں۔"

اس خطبے کے آغاز میں شہادتین کا ذکر ناممکن ہے تاکید مجدد کے علاوہ تکامل انسان کے اصولوں کی تقویت کے لزوم اسلامی کے بنیادی عقیدے کے احیاء پر بھی تاکید ہو، اور ممکن ہے اس نکتے کی طرف پھر اشارہ ہو کہ حکمین والے واقعے کی رسوائی، نے اس وجہ سے سر اٹھایا کہ لوگ اصل توحید کو پس پشت ڈال بیٹھے اور شرک آلودہ کاموں کے پیچھے لگ گئے اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیروی کو اہمیت نہ دی اور ہوائے نفس کے سامنے سر تسلیم خم کیا۔

اس کے بعد حضرت امام علی علیہ السلام خطبے کے اصل مقصد کی طرف متوجہ ہوئے، فرماتے ہیں:

www.shiabookspdf.com

"أَمَّا بَعْدُ، فَإِنَّ مَعْصِيَةَ النَّاصِحِ الشَّفِيقِ الْعَالِمِ الْمُجَرِّبِ[۱] تُورِثُ الْحَسْرَةَ، وَ تُعْقِبُ النَّدَامَةَ"

"حمد وثنائے الٰہی، وحدانیتِ حق اور پیغمبر اکرمؐ کی نبوت کی گواہی کے بعد تم لوگ جان لو، مہربان دانا باتجربہ نصیحت کنندہ کی نصیحت اور حکم کی نافرمانی حسرت وغم کا موجب اور پشیمانی کا باعث ہوتی ہے۔"

یہ جملہ درحقیقت کبریٰ کی منزل پر ہے اور ایک اہم کلّی قاعدہ بیان کرتا ہے۔ انسان کے مشورے میں چار خوبیاں جمع ہوجائیں تو اس انسان کی مخالفت موجب پشیمانی ہوگی:

پہلی: وہ ناصح وخیر خواہ ہو اور خیر خواہی کے تقاضے کے مطابق تشخیصِ حق میں لازم سعی وکوشش کو انجام دے۔

دوسری: یہ کہ مہر ومحبت سے لبریز دل رکھتا ہو اور روح کی گہرائیوں سے خدمت وکامیابی وسعادتمندی کے ساتھ عشق پیدا کرنے والا مشورہ کرتا ہو۔

تیسری: یہ کہ عالم ہو اور مطلب کے تمام جوانب کو پرکھے اور اہم مسائل کو گہری نظر کے ساتھ تحلیل کرے اور اس مطلب کے حوادث ونتائج کی اصل بنیادوں کو موردِ تحقیق قرار دے۔

چوتھی: یہ کہ انفرادی واجتماعی اہم مسائل میں کافی تجربہ رکھنے والا ہو یعنی عقلِ نظری کے ساتھ ساتھ صاحب عقل عملی بھی ہو۔ جب کوئی شخص ان چار صفات کا جامع ہوگا احتمال قوی بلکہ نزدیک بہ یقین ہے کہ انسان کو اصل ہدف تک پہنچادے گا۔

ایسے حال میں جن لوگوں نے ان کی بات کو ٹھکرا دیا اور غرور وضد کی سواری پر سوار ہوگئے، وہ راستے سے بھٹک گئے اور بدبختی کے راستے پر گامزن ہوئے۔

امامؑ یہ قاعدہ کلیہ بیان کرنے کے بعد صغریٰ اور موردِ نظر مصداق کی طرف توجہ دلاتے ہوئے فرماتے ہیں:

"وَ قَدْ كُنْتُ أَمَرْتُكُمْ فِي هٰذِهِ الْحُكُومَةِ أَمْرِي، وَ نَخَلْتُ[۲] لَكُمْ مَخْزُونَ رَأْيِي، لَوْ كَانَ يُطَاعُ لِقَصِيرٍ أَمْرٌ"

"میں نے حکمیت کے مسائل کے بارے میں اپنا فرمان تم لوگوں کو سنایا اور اپنی خالص رائے کو تمہارے اختیار میں دیا؟ اگر قصیر کی باتوں پر کان دھرا جاتا کتنا اچھا ہوتا۔"

---

[۱]۔ مجرّب۔ (بروزن محقق) کے معنی یہ ہیں کہ وہ شخص جو مختلف تجربوں کی وجہ سے آگاہی رکھتا ہو، لیکن عرب لوگ معمولاً اس کو فتحہ (زبر) کے ساتھ پڑھتے ہیں اور مجرَّب (بروزن مقرب) کہتے ہیں۔

[۲]۔ نخلت۔ "نخل" کے مادّے سے ہے اور کسی چیز کو صاف کرنے کے معنی میں آیا ہے اور "نخالہ" تصفیہ کے بعد اضافات کو کہا جاتا ہے، اس مادّے کا استعمال مذکورہ خطبے میں صحیح رائے کی طرف اشارہ ہے کہ امام علیؑ نے مسئلہ حکمیت میں اپنے اصحاب کے اختیار میں رکھی۔

www.shiabookspdf.com

حضرتؑ فرماتے ہیں کہ میں خود حکومت کے ساتھ بھی اس مسئلے میں مخالف تھا اور اس کی چگونگی اور کیفیت کے بھی مخالف تھا۔ میں نے بار بار اس برے واقعے کے اثرات کو تمہارے سامنے بیان کیا تھا، لیکن افسوس کہ تم لوگوں کی ضد اور ہٹ دھری نے جو اس باطل عقیدہ میں تم رکھتے تھے، تم لوگوں کو اجازت نہ دی کہ روشن وظاہر واقعیت کو اس اہم مسئلے میں دیکھتے اور اب کہ جب اس کے دردناک عواقب نے تمہیں گھیر لیا ہے، پشیمانی بے فائدہ ہے۔

"لَوْ كَانَ يُطَاعُ لِقَصِيْرٍ أَمْرٌ" کا جملہ عربوں کے درمیان مشہور ضرب المثل ہے اور یہ ان لوگوں کے لیے کہی جاتی ہے جو باہوش ومہربان ناصح کی باتوں کو نہ مانیں اور پشیمانی میں مبتلا ہو جائیں، اس ضرب المثل کا واقعہ اس طرح ہے: حیرہ کے بادشاہوں میں سے ایک جس کا نام جزیمہ تھا، نے عمرو ابن ظرب جو جزیرہ کا بادشاہ تھا سے جنگ کی اور اس کو قتل کر دیا، اس کے بعد اس کی ایک بیٹی زباء اپنے والد کی جانشین بنی اور وہ اس فکر میں تھی کہ کس طرح اپنے والد کے خون کا انتقام جزیمہ سے لے۔

زباء نے جزیمہ کو ایک خط لکھا کہ میں ایک عورت ہوں اور عورتوں کو بادشاہی زیب نہیں دیتی اور ان کے لیے شوہر ضروری ہے اور میں آپ کے علاوہ کسی کو شادی کے لیے پسند نہیں کرتی اور اگر لوگوں کے طعنوں کا خوف نہ ہوتا تو میں خود چل کے آپ کے پاس آجاتی، اگر آپ زحمت کر کے (خواستگاری کے لیے) ہمارے ملک میں آئیں گے تو ہمارے ملک کو اپنے مقصد کے لیے آمادہ پائیں گے۔ جس وقت زباء کا خط جزیمہ کو ملا تو اس کی طمع (اس عورت اور اس کے ملک کے حوالے سے) اس کے دل میں گھر کر گئی۔ اس نے اپنے قریبی دوستوں سے مشورہ کیا، سب نے اس کو اس سفر کے لیے شوق دلایا سوائے ایک شخص کے جس کا نام قصیر بن سعد تھا جو بہت زیرک اور عاقبت اندیش تھا، اگرچہ وہ ایک کنیز زادہ تھا۔ قصیر نے اپنی فہم وفراست سے یہ نتیجہ نکالا کہ ایک ایسی عورت کی طرف سے یہ پیشکش ہے، جس کے والد کو جزیمہ نے مارا ہے، چناں چہ یہ سازش سے خالی نہیں ہے اس دلیل کی بناء پر اس نے جزیمہ کے سب مشیروں کی مخالفت کی اور اس کو اس سفر سے روکا، لیکن جزیمہ جو اس عورت اور اس کے ملک کے عشق میں گرفتار ہو گیا تھا، نے قصیر کی باتوں پر کان نہ دھرا اور ایک ہزار سپاہیوں کے ساتھ جزیرہ کی طرف چل پڑا۔

زباء کے لشکر نے اس کا استقبال کیا، لیکن زیادہ احترام نہ دیکھا، قصیر نے پھر دوسری دفعہ جزیمہ سے کہا، میں اس روداد کو خطرناک سمجھ رہا ہوں اور مجھے نظر آرہا ہے کہ مکر وفریب کے علاوہ کچھ نہیں ہے، لیکن جزیمہ نادان جو اپنے غلط خیالات میں غرق تھا، نے قصیر کی باتوں پر توجہ نہ کی اور اپنی راہ پر آگے چل پڑا، جب وہ جزیرہ میں وارد ہوا تو زباء کے سپاہیوں نے ان کا محاصرہ کر لیا اور ان کو قتل کر دیا، قصیر بولا: لَوْ كَانَ يُطَاعُ لِقَصِيْرٍ أَمْرٌ" اگر کوئی شخص قصیر کی باتوں پر کان دھرتا تو نوبت

www.shiabookspdf.com

یہاں تک نہ پہنچتی۔" اس کے بعد یہ بات عربوں کے درمیان ضرب المثل ہو گئی۔ [۱]

امامؑ نے یہاں خود کو قصیر سے تشبیہ دی ہے اور لشکرِ کوفہ کو جزیمہ نادان وہوس باز سے کہ کوتاہ فکر مشیروں کی وجہ سے خود کو اپنے ہاتھوں سے عمرو عاص اور امیر شام کے جال میں گرفتار کر لیا۔ اس کے بعد امام علی علیہ السلام اضافہ فرماتے ہیں:

"فَأَبَيْتُمْ عَلَيَّ إِبَاءَ الْمُخَالِفِينَ الْجُفَاةِ وَ الْمُنَابِذِينَ [۲] الْعُصَاةِ حَتَّى ارْتَابَ النَّاصِحُ بِنُصْحِهِ وَ ضَنَّ [۳] الزَّنْدُ [۴] بِقَدْحِهِ [۵]"۔

"لیکن تم لوگوں نے ظالم، مخالف اور پیمان شکن، گناہ گار گروہ کی طرح ہماری باتوں کو قبول کرنے سے انکار کیا یہاں تک کہ گویا نصیحت کرنے والا اپنی نصیحت میں تردّد میں پڑ گیا، اور امامؑ نے اپنے دل کی بات کو جاری رکھنے کے بجائے خاموشی اختیار کر لی۔"

میں نے تم سے کہا کہ قرآن مجید کو نیزوں پر اٹھایا جانا مکر اور دھوکے کے سوا کچھ نہیں ہے، اس جنگ کو جو اپنے مقصد تک پہنچنے والی ہے، جاری رکھو اس لیے کہ کامیابی چند لمحوں میں حاصل ہونے والی ہے، لیکن تم لوگوں نے میری باتوں پر کان نہ دھرے اور جنگ سے ہاتھ کھینچ لیے اور حکمیت کی پیشکش کر دی۔

میں نے تم لوگوں سے کہا کہ اس حال میں کہ تم لوگ حکمیّت پر آمادہ ہو گئے ہو تو، ابن عباسؓ کو چن لو؟ لیکن تم لوگ راضی نہ ہوئے، مالک اشترؓ کے بارے میں تجویز دی تو تم لوگوں نے قبول نہ کیا، بلکہ تم لوگوں نے اصرار کیا اور ابوموسیٰ اشعری کو جو کہ احمق و نادان ہے، مکار و دھوکے باز عمرو عاص کے برابر میں قرار دیا اور نتیجہ وہی ہوا جس سے اب تم سب لوگ ناراض ہو۔ [۶]

---

[۱] بالائی ضرب المثل اور اس کے دور کی شان "الاعلام زرکلی" جلد ۵، صفحہ ۱۹۹ اور شرح نہج البلاغہ میں بھی غالباً مذکور ہے۔ یہ ضرب المثل بعض مقامات پر بہ صورت "لا یطاع لقیصر امر" نقل کیا گئی ہے۔

[۲] "منابذین" "نبذ" کے مادّے سے "دور پھینکنے" کے معنی میں ہے، خواہ انسان کسی چیز کو بطرف پشت پھینکے یا سامنے یا اطراف میں، یہ اصطلاح مورد پیمان شکنی میں استعمال ہوتی ہے، اس لیے کہ پیمان شکن شخص اپنے پیمان کو دور پھینکتا ہے۔

[۳] "ضنّ" کا مادّہ "ضنن" ہے "امساک و بخل" کے معنی میں ہے۔

[۴] "قدح" جلتی ہوئی لکڑیوں کو آپس میں ٹکرانے کے معنی میں ہے تا کہ شعلہ ان سے بلند ہو اور اس لیے لکڑی یا ہر اس وسیلے کو جس سے آگ جلائی جائے "قداحہ" کہا گیا ہے۔

[۵] مروج الذہب، جلد ۲، صفحہ ۳۹۰ کی طرف رجوع کیا جائے، آنے والے خطبے میں بھی بعض توضیحات اس بارے میں آئیں گی۔

[۶] "زند" بروزن قند اس لکڑی کو کہتے ہیں جس سے آگ جلائی جاتی ہے، کے معنی میں ہے اور ماضی میں ماچس کی جگہ آتشی پتھروں سے لکڑی کے دو ٹکڑوں کو ملاتے تھے اور اس سے شعلہ بڑھتا تھا اس کو "زند" کہتے تھے، اور اس کے بعد ہر اس چیز کو جس سے آگ جلائی جاتی ہو "زند" اور "زناد" کہا جانے لگا۔

www.shiabookspdf.com

"اَلْمُخَالِفِیْنَ الْجُفَاۃِ" کی تعبیر سے اس مطلب کی طرف اشارہ ہے کہ تمہاری مخالفت ہم سے فقط سوئے تشخیص کی خاطر نہیں تھی، بلکہ یہ جفا کاری وعصیان اور بغاوت کے ساتھ گویا ملی ہوئی تھی۔

"وَ الْمُنَابِذِیْنَ الْعُصَاۃِ" کی تعبیر سے بھی اسی معنی کی تاکید ہوتی ہے کہ تم لوگوں کی مخالفتیں عصیان گری اور پیمان شکنی کی روح سے جنم لیتی ہیں۔ حضرتؑ فرماتے ہیں کہ: یہ مخالفتیں اتنی پرُ جوش اور شدید تھیں کہ میں نے سکوت اختیار کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں دیکھا، ایسا سکوت کہ جسے شاید بعض کی نظر میں اپنی ہی نصیحتوں اور تجاویز میں تردّد اسے دوچار ہونا سمجھا جائے۔

جملہ "وَ ضَنَّ الزَّنْدُ بِقَدْحِهٖ" دراصل اس معنی میں ہے کہ" آگ جلانے والے نے آگ جلانے سے بخل کیا" یعنی اگرچہ آتشی پتھروں کو ایک دوسرے پر مارا، لیکن شعلہ نہ بھڑکا۔

یہ جملہ پھر ایک ضرب المثل ہے اور اس شخص کے بارے میں کہا جاتا ہے جو روشن فکری سے جی چرائے، اس لیے کہ وہ اپنے کانوں کا درست استعمال نہیں کرتا۔ حضرتؑ اس کے بعد اس بات کو آگے بڑھاتے ہوئے فرماتے ہیں:

"فَکُنْتُ اَنَا وَ اِیَّاکُمْ کَمَا قَالَ اَخُوْ هَوَازِنَ: اَمَرْتُكُمْ اَمْرِیْ بِمُنْعَرَجِ اللِّوٰی فَلَمْ تَسْتَبِیْنُوا النُّصْحَ اِلَّا ضُحَی الْغَدِ"

"ہماری اور تمہاری مثال موردِ حکمیّت اور اس کے برے اثرات میں اُخو ہوازن (قبیلہ بنی ہوازن کا ایک شخص) کے قول جیسی ہے کہ اس نے کہا: "میں نے سرزمین منعرج اللوئ میں اپنا حکم دیا لیکن تم لوگوں نے اس پر کان نہ دھرے اور اس کے اثر کو دوسرے دن درک کیا (جس وقت پانی سر سے گزر چکا اور پشیمانی کوئی فائدہ نہیں رکھتی)۔"

جیسا کہ کہا گیا "اخو ہوازن" سے مراد، وہ شخص ہے جو قبیلہ بنی ہوازن سے تھا، جس کا نام "درید" تھا۔ اس کا قصہ کچھ اس طرح ہے کہ وہ اپنے بھائی عبداللہ کے ساتھ بنی بکر بن ھوازن کے ساتھ جنگ کرنے گیا اور بہت سارا مالِ غنیمت حاصل کیا۔ واپسی کے راستے میں عبداللہ نے ارادہ کیا کہ ایک راہ "منعرج اللوئ" میں توقف کرے۔ درید نے اسے نصیحت کرتے ہوئے کہا کہ یہ جگہ دشمن کے علاقے سے قریب ہے یہاں ٹھہرنا بداحتیاطی ہے اور ممکن ہے شکست خوردہ قبیلہ اپنی طاقت کو جمع کرکے اور دوستوں سے مدد طلب کرکے ہم پر حملہ آور ہو۔ عبداللہ نے اس غرور کی وجہ سے جو رکھتا تھا اس کی نصیحت پر کان نہ دھرا اور رات اسی جگہ گزاری، دوسری صبح دشمن قبیلہ نے بہت سے افراد کے ساتھ ان پر حملہ کردیا اور عبداللہ کو مار ڈالا اور درید بری طرح زخمی ہوتے ہوئے ان کے ہاتھ سے نجات یافتہ ہوا اور اس کے بعد اس نے ایک قصیدہ کہا کہ اس قصیدے کی ابیات

www.shiabookspdf.com

سے ایک بیت وہی ہے جس کی طرف امیر المومنینؑ نے اس خطبے میں اس کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔[1] اس تمام گفتگو سے امام ؑ کا مقصود یہ تھا کہ میں نے موقع پر ہی تمہیں نصیحت کی اور سمجھایا کہ جنگ کو انجام تک پہنچاؤ کیوں کہ تمہاری فتح کے راستے میں کوئی چیز حائل نہیں اور اگر تم نے اس وقت کمزوری دکھائی تو امیر شام اور اس کے ساتھی سیکڑوں چالاکیوں اور مکارانہ چالوں کے ذریعے تم پر غالب آ جائیں گے لیکن تم نے میری باتوں پر کوئی توجہ نہیں دی اور ان کے قرآن نیزوں پر بلند کرنے سے دھوکا کھا گئے اور خود کو حکمیت کے حوالے کر دیا اور اس پر اس قدر اصرار کیا کہ مجبوراً مجھے بھی رضامند ہونا پڑا اور اب جب پانی سر سے گزر چکا تو ہوش میں آئے ہو اور اپنے کیے پر پشیمان ہو مگر جان لو کہ یہ پشیمانی بے سود ہے۔

نکات

داستانِ حکمیت

کتب تاریخ میں آیا ہے کہ قرآن کا نیزوں پر بلند کرنا اور پھر دستور قرآن کے نفاذ کے سلسلے میں حاکمیت کا مسئلہ ایسے زمانے میں وجود میں آیا کہ جب لشکر امامؑ کی کامیابی کے آثار بالکل واضح تھے، اس لیے کہ منگل کے روز، بتاریخ ۱۰ صفر سال ۳۷ ہجری، نماز صبح کے بعد لشکرِ امامؑ نے لشکرِ شام کے ساتھ بہت شدید جنگ کی، لشکر شام کمزور پڑ گیا، لیکن لشکر امامؑ مالک اشترؒ کی شعلہ بیاں گفتگو سے اور ان کے دلیرانہ حملوں سے ایسا جنگ میں آگے بڑھ گیا کہ کوئی ایسی چیز باقی نہ بچی تھی کہ لشکر امیر شام اس کی پناہ لیتا۔

اس وقت لشکرِ امیر شام نے قرآن کو نیزوں پر بلند کیا، مالک اشترؒ اور امامؑ کے چند باوفا دوستوں نے امامؑ سے تقاضا کیا کہ جنگ کو کامیابی تک جاری رکھیں، لیکن منافق اشعث ابن قیس، غصے سے اٹھا اور کہنے لگا:

"یا امیر المومنینؑ کتاب خدا کی طرف ان کی دعوت کو قبول کریں اس لیے کہ آپ ان سے لائق و قریب تر ہیں، لوگ چاہتے ہیں کہ زندہ بچ جائیں اور جنگ جاری رکھنے کے لیے مائل نہیں ہیں۔"

امامؑ نے فرمایا:

"ہم فکر کر رہے ہیں"۔

---

[1] "اغانی ابوالفرج اصفہانی" جلد ۱۰، صفحہ ۳، شرح نہج البلاغہ، علامہ خوئی، جلد ۴، صفحہ ۸۸، اور شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید جلد ۲، صفحہ ۲۰۵، اپنے ریفرنسز میں اس داستان کو کچھ فرق کے ساتھ نقل کیا ہے اور وہ جو کچھ مذکور ہے، ان کا ہی ایک خلاصہ ہے۔

www.shiabookspdf.com

یہاں پر لوگوں کو آواز دی تا کہ جمع ہو جائیں اور ان کی باتوں کو سنیں اور خطبے کے ضمن میں فرمایا:

"اے لوگو! میں لائق ترین شخص ہوں کہ کتاب خدا کی طرف دعوت کو قبول کروں، لیکن امیر شام اور عمرو عاص اور اس کے دوسرے قریبی ساتھی، اہل قرآن نہیں ہیں، میں ان کو کمسنی سے جانتا ہوں اور بڑا ہونے کے بعد بھی ان کی حالت کا شاہد ہوں، تم پر وائے ہو! انہوں نے قرآن کو نیزوں پر اس لیے بلند نہیں کیا کہ وہ اُس کے مطابق عمل کرنے والی ہیں، بلکہ یہ ان کا فقط ایک فریب و دھوکا ہے فقط ایک گھنٹہ تم لوگ اپنی توانائیوں کو میرے سپرد کر دو تا کہ اس گروہ کی طاقت کو فنا کر دوں اور فتنے کی آگ کو ہمیشہ کے لیے بجھادوں۔"

اس موقع پر حضرت امام علی علیہ السلام کے سپاہیوں میں سے تقریباً بیس ہزار سپاہیوں کا حال یہ تھا کہ اپنی تلواریں کاندھوں پر رکھی ہوئی تھیں اور ان کے پیشانیوں پر سجدے کے آثار نمایاں تھے، امام علی علیہ السلام کے پاس آئے اور ان کو -بجائے امیر المومنین کے- نام سے آواز دی اور کہنے لگے:

"یَا عَلِیُّ! اَجِبِ الْقَوْمَ اِلٰی کِتَابِ اللّٰہِ اِذَا دُعِیْتَ اِلَیْہِ وَ اِلَّا قَتَلْنَاکَ کَمَا قَتَلْنَا ابْنَ عَفَّانَ! فَوَ اللّٰہِ! لَنَفْعَلَنَّہَا اِنْ لَمْ تُجِبْہُمْ۔"

"یا علیؑ! اس قوم کی دعوت کو جو کتاب اللہ کی حکمیت کے لیے ہے قبول کرو، اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو تمھیں اس طرح قتل کریں گے جس طرح خلیفۂ ثالث کو قتل کیا تھا۔ خدا کی قسم! اگر تم نے (امیر شام کے ساتھیوں) کی دعوت کو قبول نہیں کیا تو ہم یہ کام کریں گے۔"

حضرت امام علیؑ نے فرمایا:

"میں وہ پہلا فرد ہوں، جس نے لوگوں کو کتاب اللہ کی طرف دعوت دی اور کتاب اللہ کو قبول کیا، ایسا لگتا ہے میں نے اہلِ شام سے اس لیے جنگ کی ہے کہ وہ حکم قرآن کے سامنے اپنے سر جھکائیں، کیوں کہ انھوں نے کتاب اللہ کو ایک طرف رکھ لیا تھا، لیکن میں نے تم لوگوں کو بتایا کہ ان کا مقصد قرآن پر عمل کرنا نہیں ہے اور یہ فقط ایک فریب و دھوکا ہے، انھوں نے کہا :

"کسی کو بھیج کر مالک اشترؒ کو واپس بلائیں۔"

یہ اُس وقت تھا جب مالک اشترؒ لشکر امیر شام پر کامیابی کے بالکل قریب پہنچ چکے تھے۔ امامؑ نے ایک شخص کو مالکؒ کے پاس بھیجا اور حکم دیا کہ واپس آجائے۔

مالکؒ نے کہا:

"امیر المومنینؑ سے کہیے، یہ وہ وقت نہیں ہے کہ مجھے اس ماموریت سے روکیں، کامیابی بالکل قریب ہے۔"

مالک اشترؒ جب یہ بول رہے تھے، اس وقت سپاہِ امیر شام نے فرار کرنا شروع کر دیا تھا۔ جب امامؑ کے فرستادہ نے پیامِ اشترؒ ان کی خدمت میں پیش کیا، تو ضدی اور نادان لوگوں نے اپنا دباؤ اور بڑھایا اور کہا:

"اشترؒ کو کہیں کہ واپس آئے وگرنہ خدا کی قسم تمہیں خلافت سے معزول کر دیں گے۔"

حضرت امام علی علیہ السلام نے دوسری مرتبہ اپنے فرستادہ (یزید ابن ہانیؓ) کو اشترؒ کے پاس بھیجا اور فرمایا:

"اشترؒ کو کہیں کہ فتنہ واقع ہو گیا ہے اور اب بہت دیر ہو گئی ہے۔"

اشترؒ نے پھر بھی فرستادۂ امام علیؑ کی طرف دیکھ کر کہا:

"آیا فتح و کامیابی کو نہیں دیکھ رہے ہو؟ آیا اس موقع کو ہاتھ سے گنوانا مناسب ہے کہ میں واپس لوٹ آؤں۔"

فرستادۂ امامؑ نے کہا:

"سچ میں، تعجب ہے اس ضدی گروہ نے قسم کھائی ہے کہ اگر اشترؒ واپس نہ پلٹے تو ہم تجھے قتل کر دیں گے، اس طرح جس طرح خلیفۂ ثالث کو قتل کیا تھا۔"

مالک اشترؒ مجبور ہو کر ناراضی کے ساتھ واپس ہوئے اور حضرت امام علی علیہ السلام کے حضور میں فریب خوردگان، نادان سپاہیوں سے بہت اصرار کیا کہ اس کو مہلت دی جائے کہ امیر شام کے سپاہیوں کا کام تمام کیا جائے، لیکن انہوں نے موافقت نہ کی، اس ترتیب سے جنگی فعالیت جو کامیابی کے بالکل قریب تھی موقوف ہو گئی اور مسائل حکمیت قرآن کو درمیان میں لایا گیا اور اس لیے کہ یہ واضح ہو جائے کہ حکم قرآن اس جنگ کے سلسلے اور مسئلۂ خلافت کے بارے میں کیا ہے، یہ طے ہوا کہ ہر گروہ سے ایک شخص بہ عنوان حکم انتخاب کیا جائے۔

شامیوں نے عمرو عاص کو اس کام کے لیے منتخب کیا اور اشعث بن قیس جو کہ اہل نفاق کا سردار تھا، اور اس کے دوسرے ہم فکر گروہ نے ابوموسیٰ اشعری کو، جو ایک نادان بظاہر مسلمان لیکن اسلام کی حقیقت سے ناآشنا شخص تھا، اس کام کے لیے انتخاب کیا۔

حضرت امام علی علیہ السلام اس کے بعد مجبوراً حکمیت پر خاموش رہے، فرمایا:

"کم سے کم عبداللہ ابن عباسؓ کو اس کام کے لیے چنا جائے، کیونکہ وہ یہ صلاحیت رکھتا ہے کہ عمرو عاص کی مکاری کو رد کر سکے۔"

لیکن اشعث اور ان کے ساتھیوں نے یہ بات بھی قبول نہ کی۔ امام علیؑ نے فرمایا:

www.shiabookspdf.com

"مالک اشترؒ کا انتخاب کریں۔"

انہوں نے مالک اشترؒ کی شجاعت کو معیوب شمار کیا اور کہا:

"اس نے آتشِ جنگ کے شعلے کو بھڑکایا ہے، ہم اس کی حکمیت کو ہرگز نہ مانیں گے۔"

حضرت امام علی علیہ السلام نے مجبور ہو کر ابوموسیٰ کی حکمیت قبول کی اور ایک صلح نامہ دونوں گروہوں کے درمیان تیار کیا گیا۔ عمرو عاص نے شروع سے ہی ایک منصوبہ بندی کی ہوئی تھی کہ کس طرح ابوموسیٰ کو فریب دے گا، ہر جگہ اس کو مقدم کر رہا تھا اور بولنے کے وقت یہ اظہار کرتا تھا، ابتدائے کلام آپ کا حق ہے؟ اس لیے کہ آپ ہم نشینِ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھے اور یہ کہ آپ سن میں ہم سے بڑے بھی ہیں۔ عمرو بن عاص اس کو ہر جگہ صدر مجلس بنا کر بٹھاتا اور جب تک ابوموسیٰ کھانے کی طرف ہاتھ نہ بڑھاتا تھا، کھانا کھانا شروع نہیں کرتا تھا، اور ہر وقت اس کو "یا صاحب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم" کے لقب سے خطاب کرتا تھا۔

خلاصہ کلام ان سب کاموں نے ابوموسیٰ کو خام سے خام تر بنا دیا یہاں تک کہ عمرو بن عاص کی خیانت کا احتمال اس کے دماغ سے نکل گیا۔ آخر میں عمرو عاص نے ابوموسیٰ سے کہا:

"اس امت کی اصلاح کے لیے آپ کی آخری رائے کیا ہے؟"

ابوموسیٰ نے کہا:

"ہماری نظر میں دونوں (علیؑ اور امیر شام) کو خلافت سے معزول کریں اور مسلمانوں کو انتخابِ خلیفہ کے لیے ایک شوریٰ بنانے کی دعوت دیں۔"

عمرو عاص نے پلٹ کر کہا:

"خدا کی قسم، یہ نظریہ بہت اچھا نظریہ ہے۔"

اس کے بعد دونوں حاضرین کے سامنے ظاہر ہوئے تاکہ اپنی نظر و رائے کا اعلان کریں۔ یہاں پر ابن عباسؓ آگے بڑھے اور ابوموسیٰ کو اپنے قریب بلا کر کہا:

"وائے ہو تم پر، مجھے گمان ہے کہ اس نے تجھے دھوکا دیا ہے۔ اگر یہ قرار پایا ہے کہ کچھ کہا جائے، تو عمرو بن عاص کو مقدم رکھو! اس لیے کہ یہ خوف ہے کہ اگر تو نے پہلے بات کی تو وہ اپنی بات کو اپنے مطلب کے مطابق دوسرے طریقے سے ادا کرے گا وہ بہت مکار شخص ہے۔"

نادان ابوموسیٰ جو ایک عجیب غرور و غفلت میں گرفتار تھا، نے ابن عباسؓ کی طرف دیکھا اور کہا:

www.shiabookspdf.com

"اوہ! ہم دونوں اتفاق نظر رکھتے ہیں۔"

ابوموسیٰ نے گھمنڈ میں آ کر قدم آگے رکھا اور کہا:

"ہماری رائے یہ ہے کہ علی علیہ السلام و امیر شام کو معزول کیا جائے اور ایک شوریٰ تشکیل دی جائے، جو خلیفہ کا انتخاب کرے گی، سب لوگ جان لو! میں نے دونوں کو معزول کر دیا، جائیں کسی اور شخص کو خلافت کے لیے منتخب کریں۔"

اس کے بعد ایک دم عمرو عاص کھڑا ہو گیا اور کہا:

"سب نے ابوموسیٰ اشعری کی باتوں کو سنا کہ اس نے اپنے رئیس و بڑے کو معزول کر دیا اور میں بھی اس کو معزول کرتا ہوں اور اپنے رئیس، امیر شام کو مقام خلافت پر قائم رکھتا ہوں۔ وہ ہی خلیفۂ ثالث کا ولی و وارث اور اس کے خوں بہا کا طلبگار اور اس مقام کے لیے سب لوگوں سے لائق ترین شخص ہے۔"

اس ترتیب کے ساتھ ایک طرف سے ایک گروہ کی حماقتوں اور نادانیوں نے، اور دوسری طرف سے احزاب جاہلی کے بچے ہوئے لوگوں کی کوششوں نے اپنا کام دکھا دیا اور جہاں اسلام کی فضا کو تاریک کر دیا۔ فریب خوردہ لشکر جلد ہی پشیمان ہو گیا، لیکن اب پشیمانی بے فائدہ تھی اور مناسب موقع ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ [۱]

اہل نظر کی آراء سے فائدہ اٹھانا

بیشک شوریٰ اسلام کی اساسی تعلیمات میں سے ہے، جس کے متعلق قرآن مجید اور روایات میں تفصیل سے ذکر موجود ہے۔

قرآن مجید اس کے علاوہ بھی کاموں کو مشورے سے انجام دینے کو اہل ایمان کی اصلی نشانیوں میں سے شمار کرتا ہے اور اُسے نماز و زکوٰۃ، جو ارکان اسلام ہیں، کا ہم پایہ قرار دیتا ہے، فرمانِ الٰہی ہے:

"اَلَّذِیْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَیْنَهُمْ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ"۔ [۲]

"وہ لوگ جنہوں نے دعوتِ پروردگار کو قبول کیا اور نماز کو قائم کیا، ان کے کام مشاورت کے ذریعے ان کے درمیان صورت پذیر ہوتے ہیں، اور جو ان کو روزی دی گئی ہے، اس میں سے انفاق کرتے ہیں۔"

[۱] شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید، جلد ۳، صفحات ۲۰۶ تا ۲۵۶ سے اقتباس اور خلاصہ۔

[۲] سورہ شوریٰ، آیہ ۳۸

www.shiabookspdf.com

خداوند عالم پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو صراحت کے ساتھ حکم دیتا ہے کہ اہم امور میں مومنین کے ساتھ مشورہ کریں، باوجود اس کے کہ آپؐ عالم وحی سے براہ راست ارتباط رکھتے تھے اور عقلاء کی نظر میں مافوق افراد بشر تھے، ارشاد ہوا:

"وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ" [1]

"اور اپنے کام میں ان سے مشورہ کرو۔"

مشاورت کے مسئلے میں اہم بات انتخابِ مشیران ہے، ایسے مشیران جو خاص صفات کے حامل ہوں، جو مذکورہ خطبے میں یہ صفات بیان کی گئی ہیں کہ مشیر خیر خواہ، مہربان، آگاہ اور پُرتجربہ ہوں، "اَلنَّاصِحِ الشَّفِيقِ الْعَالِمِ الْمُجَرِّبِ" اور یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ ایسے شخص کی رائے کی مخالفت کی صورت میں حسرت وندامت کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا۔

صحیح ہے کہ ضدی سرکش لوگ صفین میں، حضرت امام علی علیہ السلام کے ساتھ مشاورت میں نہ بیٹھے، لیکن بہر حال حضرت امام علیؑ نے اپنی خیر خواہانہ نظر کو بہ عنوان ناصح شفیق عالم ومجرب ان کے اختیار میں رکھ دیا، لیکن افسوس صد افسوس انہوں نے تنہا اس کو قبول نہ کیا، بلکہ امامؑ کے ساتھ مقابلے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے اور ان کو قتل کی دھمکی دی اور اس کا نتیجہ وہ ہی تاریکی، رسوائی اور ندامت شدید اور ناقابل جبران تھی، اور اس خودسری اور حماقت نے ظالموں کی حکومت کے لیے اس علاقے میں صدیوں تک راہ ہموار کر دی۔

---

[1] سورۂ آل عمران، آیہ ۱۵۹

www.shiabookspdf.com

چھتیسواں خطبہ

ومن خطبة له عليه السّلام [1]

فی تخويف اهل نهروان

حضرت امام علی علیہ السلام نے یہ خطبہ نہروان کے خوارج کی تنبیہ کے سلسلے میں بیان فرمایا ہے، (تا کہ وہ بیدار ہو جائیں اور حق کے سامنے اپنی گردنیں جھکا دیں)

فَاَنَا نَذِيْرٌ لَكُمْ اَنْ تُصْبِحُوْا صَرْعٰى بِاَثْنَاءِ هٰذَا النَّهْرِ وَبِاَهْضَامِ هٰذَا الْغَائِطِ عَلٰى غَيْرِ بَيِّنَةٍ مِّنْ رَبِّكُمْ وَلَا سُلْطَانٍ مُبِيْنٍ مَعَكُمْ قَدْ طَوَّحَتْ بِكُمُ الدَّارُ وَ احْتَبَلَكُمُ الْمِقْدَارُ وَ قَدْ كُنْتُ نَهَيْتُكُمْ عَنْ هٰذِهِ الْحُكُوْمَةِ فَاَبَيْتُمْ عَلَيَّ اِبَاءَ الْمُنَابِذِيْنَ حَتّٰى صَرَفْتُ رَاْيِيْ اِلٰى هَوَاكُمْ وَ اَنْتُمْ مَعَاشِرُ اَخِفَّاءُ الْهَامِ سُفَهَاءُ الْاَحْلَامِ وَلَمْ آتِ لَا اَبَا لَكُمْ بُجْرًا وَلَا اَرَدْتُ لَكُمْ ضُرًّا

"ہم تم کو خبردار کر رہے ہیں کہ پروردگار کی طرف سے کوئی واضح دلیل نہ ہونے اور مدرک سے خالی ہونے کے ساتھ تم لوگوں نے اپنے اجسادِ بے جان کو اس نہر کے کنارے اور اس پستی میں پھینکا ہے، دنیا (اور دنیا پرستی) نے تم کو اس بدبختی میں ڈال دیا ہے اور تمھارے باطل افکار نے تم کو اس خطرناک جال میں گرفتار کر دیا ہے۔

میں نے تمھیں سختی سے اس حکمیت کو قبول کرنے سے روکا تھا، مگر تم نے شدت کے ساتھ میری مخالفت کی، یہاں تک

سندِ خطبہ: مکمل خطبہ یا اس خطبے کا کچھ حصہ بہ صورت مسند یا بہ صورت مرسل مندرجہ ذیل مورخین اور محدثین کی طرف نقل شدہ ہے:
(الف) ابن ابی الحدید کے بقول (ج ۲ ص ۲۸۳) ابن حبیب بغدادی (متوفی ۲۵۴ ھ ق) نے اس کو نقل کیا ہے۔ (ب) ابن قتیبہ دینوری (متوفی ۲۸۴) الامامۃ والسیاسۃ، ج ۱، ص ۱۲۷۔ (ج) بلاذری (متوفا ۲۸۹ ھ ق) انساب الاشراف، ج ۲، ص ۳۸۱۔ (د) طبری (متوفی ۳۱۰ ھ ق) تاریخ الرسل والملوک، ج ۶، ص ۳۳۸۸

www.shiabookspdf.com

کہ میں مجبور ہو گیا کہ قبول کروں اور تمہارے حسب منشاء عمل کروں۔ یہ سب اس لیے ہوا کہ تم ایک نادان گروہ اور کوتاہ فکر ہو۔
خداوند عالم تم کو خوار و ذلیل کرے! میں نے کوئی غلط کام نہیں کیا اور ہم نہیں چاہتے تھے کہ تمہیں کوئی نقصان ہو۔ (یہ تم لوگ تھے کہ مجھے تنگی میں قرار دے دیا اور تم نے مجھے حکمیت کو قبول کرنے پر مجبور کیا)۔"

خطبہ، ایک نگاہ میں

سب کے علم میں ہے کہ امام علی علیہ السلام نے یہ خطبہ خوارج کے ساتھ جنگ والے دن نہروان کے پاس ارشاد فرمایا، یہ جنگ سال ۳۷ ہجری میں واقع ہوئی، اس خطبے میں حضرت امام علی علیہ السلام نے تین نکات پر بہت زور دیا۔

اوّل یہ کہ خیال رکھا جائے کہ بغیر کسی دلیل شرعی کے جو خدا کی خدمت میں قبول ہو جائے، اس میدان میں وارد نہ ہوں کہ اس صورت میں ان کی جان برباد ہو جائے۔

دوّم یہ کہ ان کو ہم یاد دلاتے ہیں کہ تم لوگوں نے مسئلہ حکمیت کو بہانہ بنایا ہے، حالانکہ ہم ابتدا سے اس کے مخالف تھے۔

سوّم یہ کہ تم مجھ سے جنگ کرنے اٹھ کھڑے ہوئے ہو، حالانکہ میں نے کوئی غلط کام انجام نہیں دیا ہے، اگر غلطی تھی تو تمہاری اور دوسرے لوگوں کی تھی، لیکن تم کم عقل افراد اصلی عاملوں کو چھوڑ کر ہمارے پیچھے پڑ گئے ہو اور اس طرح حضرت امام علیؑ نے ان پر اتمامِ حجت فرمایا۔

شرح وتفسیر

نہروان کے خوارج پر اتمام حجت

جس طرح اوپر اشارہ کیا گیا، یہ خطبہ جنگ نہروان شروع ہونے سے پہلے امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کی طرف سے ارشاد ہوا ہے اور یہ جانتے ہیں کہ جنگ نہروان داستانِ حکمیت کے نتائج میں سے ایک ہے۔ نادان اور عقل کے اندھے حکمین کے ناخوشگوار نتیجے کا مشاہدہ کر چکے تھے اور انہوں نے امامؑ سے بغاوت کی اور آپ کو حکمیت اور اس کے نتیجے کا ذمے دار ٹھہرایا۔ جبکہ امامؑ خود اصل مسئلہ حکمیت کے مخالف تھے اور اس شخص کے بھی جس کو بعنوان حکم انتخاب کیا۔ یہ خطبہ حقیقت میں ایک اتمام حجت ہے ان لوگوں کے لیے جو گزشتہ ماجرے سے آگاہی نہیں رکھتے تھے یا آگاہی رکھتے تھے لیکن عملاً جیسے

www.shiabookspdf.com

اس کو فراموش کر بیٹھے تھے۔

بعض روایات میں آغازِ خطبہ میں کچھ ایسے جملے دیکھے گئے ہیں کہ حضرت امام علیؑ نے پہلے اپنا تعارف کرایا، فرماتے ہیں:

"نَحْنُ أَهْلُ بَيْتِ النُّبُوَّةِ وَ مَوضِعُ الرِّسَالَةِ وَ مُخْتَلَفُ الْمَلَائِكَةِ وَ عُنْصُرُ الرَّحْمَةِ وَ مَعْدَنُ الْعِلْمِ وَ الْحِكْمَةِ. نَحْنُ أُفُقُ الْحِجَازِ، بِنَا يَلْحَقُ الْبَطِيئُ وَ إِلَيْنَا يَرْجِعُ التَّائِبُ"۔[1]

"ہم خاندانِ نبوّت، جائے گاہ رسالت اور ملائکہؑ کی آمد و رفت کے محل اور عنصرِ رحمت اور دانش و حکمت کے معدن ہیں، ہم افقِ تابناک حجاز ہیں، اور کُند رو ہم سے ہی ملحق ہوتے ہیں اور سست رو ہم سے ملحق ہو جاتے ہیں اور جلدی توبہ کرنے والے ہماری طرف پلٹ آتے ہیں۔

یہ درحقیقت اشارہ ہے اس افراط و تفریط کی طرف جو ناداں گروہ مسئلہ حکمیت میں رکھتے تھے، حضرتؑ اس کے بعد ان کو مخاطب کرکے فرماتے ہیں:

"فَأَنَا نَذِيرٌ لَكُمْ أَنْ تُصْبِحُوا صَرْعَى[2] بِأَثْنَاءِ هٰذَا النَّهْرِ، وَ بِأَهْضَامِ[3] هٰذَا الْغَائِطِ[4] عَلَى غَيْرِ بَيِّنَةٍ مِنْ رَبِّكُمْ، وَلَا سُلْطَانٍ مُبِينٍ مَعَكُمْ"

"میں تمہیں خبردار کرتا ہوں کہ خداوند عالم کی بارگاہ میں قبول ہو سکنے والی کسی واضح دلیل اور کسی مضبوط ثبوت کے بغیر تم اپنے بے جان اجسام کو نہر کے کنارے اس گڑھے میں ڈال رہے ہو اور کھڈّے میں پھینک دیا ہے۔"

امامؑ حقیقت میں اپنے ان بیانات میں صریحاً جنگ نہروان کے اختتام کی پیش گوئی فرما رہے ہیں اور ان کو خبر دے رہے ہیں کہ ایسی جگہ پر تم سب لوگ خاک پر پڑے ہوئے ہو گے، لیکن اہم مشکل یہ ہے کہ تمہارے نامہ اعمال بروز قیامت بالکل سیاہ و تاریک ہوں گے، اس لیے کہ اس جنگ کا کوئی سبب نہیں ہے۔ سوائے تنگ نظری اور خودغرضی کے تم کوئی قابل قبول ثبوت نہیں رکھتے ہو اس طرح سے تمہاری دنیا بھی برباد ہے اور تمہاری آخرت بھی۔

---

[1] شرح نہج البلاغہ، ابن الحدید، جلد ۲، صفحہ ۲۸۳۔

[2] صرعی- جمع ہے صریع کی اور مادّہ صرع- سے "زمین پر کوئی چیز پھینکنے" کے معنی میں ہے، اور صریع، جنازہ یا کوئی مرا ہوا جو زمین پر پڑا ہوا ہو، کے معنی میں ہے اور اس شخص کو بھی جو کشتی لڑتے ہوئے زمین پر گر پڑے، اس کو بھی صریع کہا جاتا ہے، اس لیے صرع کی بیماری کا یہ نام رکھا گیا کیونکہ انسان غش کھا کر زمین پر گر جاتا ہے۔

[3] اھضام- جمع ہے ھضم کی، "وسط درّہ" کے معنی میں ہے اور دراصل "توڑنے، زور سے دبانے اور کوٹنے کے معنی میں ہے۔

[4] غائط- پست زمین" کے معنی میں ہے اور دراصل غوط، یعنی "کھودنا" سے لیا گیا ہے اور اسی وجہ سے بیابان کے مسافر افراد گزشتہ زمانوں میں رفع حاجت کے لیے پستی والے اور نظروں سے دور مقام کا انتخاب کرتے تھے اس جگہ کو "غائط" اور مدفوع انسان کو بھی غائط کہا گیا ہے۔

www.shiabookspdf.com

حضرتؑ اس کے بعد اضافہ فرماتے ہیں:

"قَدْ طَوَّحَتْ [1] بِكُمُ الدَّارُ وَاحْتَبَلَكُمُ [2] الْمِقْدَارُ"

"دنیا اور دنیا پرستی نے تمہیں اس بدبختی میں پھینکا ہے اور تمہاری غلط فکروں نے تمہیں اس خطرناک جال میں گرفتار کیا ہے۔"

"دار" کا لفظ یہاں دارِ دنیا یا دوسری تعبیر میں دنیا پرستی کی طرف اشارہ ہے۔ اور "احتبل" از "حبل" کے مادّے سے "جال" کے معنی میں ہے اور "مقدار" سے مقصود بعض شارحینِ نہج البلاغہ کے بقول وہی غلط افکار اور مختلف حوادث کی بیہودہ تحلیلیں ہیں اور بعض دیگران کے بقول مقدار سے مراد، مقدّراتِ الٰہی ہیں کہ جو انسانوں کی لیاقت کے مطابق خداوند جل شانہ کی طرف سے معین ہوتے ہیں۔

جب ہم اس تاریخی ماجرے کا غور سے مطالعہ کریں، تو امامؑ کے فرامین کے آثار مکمل طور پر اس گروہ کی زندگی میں نمایاں اور واضح نظر آئیں گے۔ وہ ضدی، متعصب، کم فکر، دنیا پرست اور متلوّن مزاج گروہ تھے۔

اس کے بعد امامؑ حکمیت کی داستان کی وضاحت کرتے ہیں اور باصراحت فرماتے ہیں:

"وَ قَدْ كُنْتُ نَهَيْتُكُمْ عَنْ هٰذِهِ الْحُكُومَةِ فَأَبَيْتُمْ عَلَيَّ إِبَاءَ الْمُخَالِفِينَ الْمُنَابِذِينَ، حَتّٰى صَرَفْتُ رَأْيِي إِلٰى هَوَاكُمْ"

"میں نے تمہیں اس حکمیت سے روکا، لیکن تم نے سختی سے اس کی مخالفت کی اور میرے حکم و فرمان کو نظر انداز کر دیا، یہاں تک میں نے مجبوراً اسے قبول کیا اور تمہاری مرضی کے مطابق خاموش رہا۔"

حقیقت میں وہ چیز جس کا تم مجھ پر اعتراض کرتے ہو اس کی بنیاد ڈالنے والے خود تم لوگ تھے اور میرے اوپر اس کو مسلط کیا اور یہاں تک کہ مجھے قتل کرنے کی دھمکی دی۔ اب جب حکمیت کے بعد آثار تم نے دیکھ لیے، اب تم لوگ چاہتے ہو کہ اپنا گناہ کسی دوسرے کی گردن میں ڈال دو۔ اس کے بعد حضرتؑ فرماتے ہیں:

"وَأَنْتُمْ مَعَاشِرُ أَخِفَّاءُ الْهَامِ [3] سُفَهَاءُ الْأَحْلَامِ"

---

[1] "طوحت"، "طوح" کے مادّے سے "سقوط و ہلاکت" کے معنی میں ہے اور جب باب تفعیل میں آجائے (جس طرح بالائی خطبہ میں) "اوپر والے مقام سے نیچے زور سے پھینکنے" کے معنی میں آتا ہے کہ وہ معرضِ ہلاکت میں آجاتا ہے۔

[2] "احتبل"، "حبل" کے مادّہ سے "رسّی" کے معنی میں لیا گیا ہے اور "حبالہ" جال کے معنی میں اور "احتبال" کسی کو جال میں پھنسانے کے معنی میں ہے۔

[3] "ھام"، "ھامہ" کی جمع ہے، سر انسان یا سب موجوداتِ ذی روح کے معنی میں ہے اور اس پر توجہ کرتے ہوئے کہ "اخفا"، خفیف کی جمع ہے، تعبیر با "اخفاء الھام" نادان اور غافل افراد کے معنوں ہے۔

www.shiabookspdf.com

"(یہ سب اس وجہ سے ہوا کہ) تم لوگ سرکش اور کوتاہ فکر گروہ ہو۔"

ممکن ہے کہ یہ جملے نہروانیوں کی نادانی و بیوقوفی پر تاکید ہوں اور ممکن ہے پہلا جملہ جیسا کہ بعض شارحینِ نہج البلاغہ نے کہا ہے کہ ان کی نادانی کی طرف اشارہ ہو کہ جو معمولی سی بات پر اپنی سوچ اور راستہ تبدیل کر لیتے ہیں، ایک دن میں حکمیت کے شدید حمایتی تھے، تو دوسرے دن اس کے سخت دشمن۔ دوسرا جملہ ان کی کم فکری کی طرف اشارہ ہے؟ اس لیے کہ دشمن کی سازشیں یکے بعد دیگرے ظاہر ہو رہی تھیں اور ان کے قرائن تمام ہوشمندوں کے لیے آشکار و واضح تھے، یہ ان کو نہ دیکھتے تھے نہ درک کرتے تھے اور اسی سبب سے بارہا لشکر امیر شام اور اس کے طرفداروں کے فریب میں آ گئے اور ایسے راستے پر چل نکلے جو ان کی بدبختی اور جہانِ اسلام کی مصیبت کا سبب بن گیا۔

حضرتؑ اپنے ان بیانات کے آخر میں ایک مرتبہ پھر اس حقیقت پر تاکید فرماتے ہیں کہ یہ بلائیں جو تمہارے اوپر نازل ہوئی ہیں تمہاری اپنی غلطیوں کی وجہ سے ہیں اور میرا اس میں کوئی دخل نہیں جس کی وجہ سے تم لوگ ہم سے جنگ کے لیے تیار ہو گئے ہو اور ہمارے اوپر اپنی تلواریں تان لی ہیں اور اس میدان کے راہی بن گئے ہو۔

امامؑ فرماتے ہیں:

"وَلَمْ آتِ لَا أَبَا لَكُمْ بُجْرًا [1] وَلَا أَرَدْتُ لَكُمْ ضُرًّا۔"

"خداوند تمہیں ذلیل و خوار کرے، میں نے کوئی غلط کام نہیں کیا اور میں تمہیں کوئی نقصان پہنچانا نہیں چاہتا تھا۔"

جملہ "لَا أَبَا لَكُمْ" - تمہارا کوئی باپ نہ ہو" ممکن ہے کہ ایک دشنام کے مثل ہو کہ اس کا مفہوم اردو زبان میں "اے بد نسل" ہوگا اور یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ تمام لوگ ایسے افراد ہوں جن کی خاندانی تربیت نہ صحیح طریقے سے اسلامی ہوئی ہے نہ انسانی۔ اس دلیل کی وجہ سے غلط کام انجام دے رہے ہو، بعد میں جب ان کے بدآثار دیکھتے ہو تو دوسرے کی طرف منسوب کرتے ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ ایک قسم کی بددعا اور لعنت ہو یعنی "خداوند تمہارے آباء کو اٹھا لے"۔ جو حقیقت میں خوار و ذلیل ہونے کی طرف ایک کنایہ ہے۔ اس لیے کہ والد سے محروم ہو جانا خصوصاً چھوٹی عمر اور آغاز جوانی میں، سبب خواری و ذلت ہوتا ہے۔

جی ہاں، جس طرح ہم نے اوپر ذکر کیا کہ امامؑ شروع سے اصل مسئلہ حکمیت کے مخالف تھے اور اس وقت جنگ جاری رکھنے کا حکم صادر فرمایا، جب جنگ حساس اور کامیابی کے قریب مراحل میں داخل ہو چکی تھی لیکن ان نادانوں نے حضرت امام علی علیہ السلام کو قتل کی دھمکی دی اور جنگ سے ہاتھ اٹھانے پر مجبور کیا اور بعد کے مرحلے میں امامؑ کو حکمیت قبول کرنے پر

---

[1] بجر - اہم کام یا خراب اور دردناک حادثہ کے معنی میں آیا ہے۔

www.shiabookspdf.com

مجبور ہونا پڑا، امامؑ جس شخص کو حکم بنانے کی رائے دے رہے تھے، اگر اس پر بھی عمل ہوتا تو ابوموسیٰ اشعری احمق کی رسوائی والا ماجرا رونما نہ ہوتا۔ اس بنیاد پر ہر مرحلے میں امامؑ نے اپنے وظیفے کو ان کی کامیابی اور سربلندی کے لیے انجام دیا اور انہوں نے ہر مرحلے میں آپؑ کی مخالفت کی۔

جب حکمیت کے دردناک نتائج آشکار ہوئے تو بجائے اس کے کہ خود کو ملامت کرتے اور امامؑ کی خدمت میں آکر عرضِ توبہ کرتے، اپنے گناہ کو گردنِ امامؑ میں ڈالتے ہوئے گستاخانہ انداز میں کہا "تم نے قبول کیوں کیا؟" اور اس کے بعد آتش جنگ نہروان کو برپا کیا! اور یہ ہے افراد نادان کا طریقہ اور کم عقل، بے وقوفوں کا طریقہ کار۔

نکتہ

خوارج کی عبرت انگیز داستان

جس طرح پہلی جلد میں، خطبۂ شقشقیہ کی شرح میں ہم نے کہا کہ خوارج ایک متعصب ضدی نادان ٹولہ تھا، جو جنگ صفین اور داستانِ حکمیت سے آشکار ہوا۔

انہوں نے شروع میں مسئلہ حکمیت (عمروعاص اور ابوموسیٰ اشعری) کو قبول کیا اور خود امام کو اس کے قبول کرنے پر مجبور کیا اور جتنا بھی امامؑ نے زور دے کر فرمایا کہ یہ سب چیزیں ایک فریب، دھوکا ہیں اور دشمن پر کامیابی اور شامیوں اور پیروانِ امیرِ شام کے فتنے کی آگ بجھانے میں چند قدم کا فاصلہ ہے (لہٰذا جنگ جاری رکھیں) لیکن انہوں نے کان نہ دھرے اور جب بعد میں نتیجہ حکمیت کو دیکھا، اپنے کام پر پشیمان ہوئے اور اپنی اصلاح کی خاطر توبہ کی لیکن اس قدر تفریط میں چلے گئے کہ کہنے لگے: حکمیت کا قبول کرنا کفر تھا کیونکہ حکم فقط خدا کا ہے۔ ہم نے کفر سے توبہ کر لی ہے اور چاہیے کہ علی ابن ابی طالب علیہ السلام بھی توبہ کریں۔

امامؑ نے انہیں فرمایا: حکمیت کفر نہیں تھا، قرآن دو موارد میں مسئلۂ حکمیت کی طرف اشارہ کرتا ہے:
ایک خانوادگی اختلاف [1] میں اور دوسرے کفاراتِ احرام کے مورد میں۔ [2]

---

[1] فَابْعَثُوا حَكَمًا مِنْ أَهْلِهِ وَحَكَمًا مِنْ أَهْلِهَا: سورۂ نساء، آیت ۳۵۔
[2] يَحْكُمُ بِهِ ذَوَا عَدْلٍ مِنْكُمْ: سورۂ مائدہ، آیہ ۹۵۔

www.shiabookspdf.com

"يَحْكُمُ بِهٖ ذَوَا عَدْلٍ مِنْكُمْ "[1] لیکن حکمیت کی وہ شکل جس پر تم نے عمل کیا وہ سرتا پا فقط ایک غلطی تھی۔

بہر حال اس نادان اور فراموش کار گروہ نے جس میں بظاہر ایسے افراد موجود تھے، جو بہت عبادت گزار اور شرعی واجبات اور مستحبات کے خوگر دیکھے جاتے تھے، اور جنہوں نے اسلام کے ظاہری طور طریقوں پر عمل کیا، مگر روح کو چھوڑ دیا تھا، اور حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام (روحی له الفداء) کے مقابلے میں کوفے کے نزدیک ایک علاقہ بنام حروراء اور نہروان کی صف آرائی کی۔ امامؑ بہت حوصلے اور برد باری کے ساتھ ان کے روبرو ہوئے اور انہیں ناصحانہ انداز میں اتمام حجت کیا۔

امامؑ کے نصائح کامیاب اور موثر ثابت ہوئے اور ان میں سے اکثریت نے توبہ کی اور خوارج کے لشکر سے الگ ہو گئے اور تقریباً چار ہزار افراد تختی سے اپنی احمقانہ بات پر قائم رہے اور ایک محدود لڑائی میں لشکر امامؑ کے ساتھ چند افراد کے سوا سب کے اجساد اسی نہر کے قریب زمین پر گر پڑے بالکل اسی طرح جس طرح امامؑ نے پہلے صراحت کے ساتھ پیش بینی کی تھی۔

خوارج کی زندگی میں عجیب تضاد اور عبرت انگیز نکات دیکھنے میں آتے ہیں جو ان کی مانند بہت کم گروہوں میں دیکھے گئے ہیں:

۱۔ عبداللہ ابن خبابؓ جو خباب ابن آرتؓ، معروف صحابیٔ پیغمبرؐ کے فرزند تھے، قرآن کا نسخہ اپنی گردن میں حمائل کیے ہوئے اپنی حاملہ زوجہ کے ہمراہ اپنے مرکب پر سوار خوارج کے مرکز کے قریب سے گزرے، خوارج نے ان کا راستہ روک لیا اور کہا:

"یہی قرآن جو تیری گردن میں ہے، ہمیں تیرے قتل کا حکم دیتا ہے۔"

عبداللہؓ نے کہا:

"جس چیز کو قرآن نے زندہ کیا ہے، اس کو زندگی دیں اور جس کو قرآن نے ختم کیا ہے اس کو ختم کریں۔"

خوارج نے ان کی حکیمانہ گفتار پر کوئی توجہ نہ دی۔ اسی وقت خوارج میں سے ایک شخص نے کھجور کا ایک دانہ اٹھایا جو کھجور کے درخت سے زمین پر گرا تھا اور اس کو اپنے منہ میں رکھا، تو اس پر اس کے دوستوں نے چلّا کر کہا:

"کیوں دوسروں کے مال میں تجاوز کیا اور مال غصب کھایا؟"

اس نے فوراً کھجور منہ سے نکالی اور پھینک دی۔ دوسرے نے ایک خنزیر جو اس کا راستہ روک رکھا تھا، کو مار دیا، تو

---

[1] سورہ مائدہ، آیت ۹۵۔

www.shiabookspdf.com

دوسروں نے اس پر اعتراض کیا کہ یہ ناجائز عمل تھا اور یہ حقیقت میں فساد فی الارض کا مصداق ہے۔اس کے بعد عبد اللہ بن خباب ؓ کی طرف متوجہ ہوئے اور ان سے کہا:

"ہمارے لیے اپنے والد سے مروی کوئی حدیث بیان کرو"

انہوں نے کہا:

"میں نے اپنے والد سے سنا جو انہوں نے پیغمبر اکرمؐ سے نقل کیا ہے کہ عنقریب ہمارے بعد ایک فتنہ سر اٹھائے گا کہ لوگوں کے دل اس طرح مردہ ہو جائیں گے، جس طرح بدن مرتے ہیں۔کچھ لوگ دن میں مؤمن ہوں گے تو رات کو کافر۔"

اس کے بعد ان کے ساتھ بہت بحث کی، یہاں تک کہ بات کو یہاں تک لے آئے اور کہا:

"علیؑ کے بارے میں حکمیت کے قبول کرنے کے بعد کیا کہتے ہو؟"

انہوں (عبد اللہ ابن خباب ؓ) نے کہا:

"علیؑ بہ حکم خدا دانا تر ہیں اور حفظِ دین کے لحاظ سے سب سے لائق تر اور آگاہ تر ہیں۔"

تو اس پر خوارج نے کہا:

"تو پیروِ ہدایت نہیں ہے۔"

ان کو نہر کے قریب لائے اور نیچے لٹا کر (بکری کی طرح) ان کے سر کو قلم کیا، اس کے بعد ان کی زوجہ کی طرف پلٹے تو انہوں نے فریاد کی کہ میں ایک حاملہ خاتون ہوں، مگر انہوں نے ایک نہ سنی اور پہلے ان کے شکم کو چاک کیا اور پھر خود ان کو اور ان کے جنین کو قتل کر دیا۔ [1]

۲۔حضرت علی علیہ السلام اپنے اصحاب اور دوستوں کو خوارج کے مقابلے میں تحمل کی دعوت دیتے رہے اور ان فریب خوردہ افراد جو بظاہر مسلمان تھے سے الجھنے کو صلاح نہیں سمجھتے تھے۔حبہ عُرنی کہتے ہیں:

"جب ہم خوارج کے مقابلے کے لیے پہنچے، انہوں نے بلا تامل ہم پر تیروں کی بارش کر دی۔ہم نے حضرت علی علیہ السلام سے مقابلے کی اجازت چاہی، فرمایا تحمل و صبر سے کام لیجیے۔"

پھر دوسری مرتبہ تیر اندازی کر دی، اب بھی امامؑ نے ہمیں اپنے آپ پر ضبط کی دعوت دی۔تیسری بار جب تیروں کی بارش کا آغاز کیا اور ہم نے امامؑ سے اجازت مانگی، تو فرمایا: "اب جنگ صحیح ہے، ان پر حملہ کیجیے۔"

[1] شرح نہج البلاغہ، ابن ابی الحدید، ج ۲ صفحہ ۲۸۱۔تاریخ طبری، ج ۴، ص ۶۰، ۶۱ حوادث سال ۳۷

www.shiabookspdf.com

لشکر امامؑ نے حملہ کیا، اوران کو نیست و نابود کر دیا۔ قیس ابن سعد ابن عبادہ کہتے ہیں: جب امامؑ خوارج کے مقابلے میں ان کے روبرو ہوئے، فرمایا:

"اس شخص کو جس نے عبداللہ ابن خبابؓ کو قتل کیا ہے سامنے لایا جائے، تا کہ اس کا قصاص ہو۔"

ان بے وقوفوں نے بے شرمی سے کہا:

"ہم سب اس کے قاتل ہیں۔"

امامؑ نے فرمایا:

"خدا جل شانہ کی ذات کی قسم! یہ اعتراف جو انہوں نے کیا ہے، اگر سب اہل دنیا ایک شخص کے قتل پر ایسا اعتراف کریں، وہ سب سزا کے لائق ہیں۔"[1]

۳۔ جب خوارج لشکر امامؑ پر حملہ آور ہوئے، امامؑ نے اپنے دوستوں سے فرمایا:

"ان پر حملہ کرو! قسم بخدا! تم میں سے دس افراد نہ مارے جاؤ گے اور ان میں سے دس افراد سلامت نہ بچیں گے۔"

لطف یہ کہ ایسا ہی ہوا؛ یارانِ امامؑ سے فقط نو افراد شہید ہوئے اور خوارج میں سے صرف آٹھ یا نو اشخاص فرار ہو سکے۔

۴۔ حقیقت یہ ہے کہ داستانِ خوارج نے، امامؑ کی پاک و ملکوتی روح پر بہت بڑا اثر چھوڑا اور اسلامی مملکت کی فضا کو بھی شدید آلودہ کیا، امامؑ نے بارہا نہج البلاغہ کے خطبات میں اس حوالے سے بات کی ہے اور منطقی پیرائے میں گویا ہوئے ہیں اور بذات خود حکمت آمیز گفتگو سے ان کے انحرافی خطوط کو واضح اور روشن کیا ہے کہ کہیں دوسرے لوگ اسی زمانے کے یا دوسرے زمانوں کے ایسے تفکرات میں گرفتار نہ ہو جائیں۔ اس لیے کہ ایسے طرز تفکر کے، جو جہل و خودسری سے ملا ہوا ہو، کے طرفدار ہر عصر اور ہر زمانے میں پائے جاتے ہیں، اگر چہ کم ہی کیوں نہ ہوں۔

من جملہ ان خطبات میں سے کہ جن میں امامؑ نے خوارج کے بارے میں گفتگو فرمائی ہے، یہ ہیں: ۴، ۵، ۶۰، ۶۱، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۷، ۱۸۴، نامہ ۷۷، ۷۸، کہ بتوفیق خدائے جل عزّہ، ذیل میں ان کے بارے میں مناسب بحث آئے گی۔

اس بات کو اس نکتے کے ذکر کے ساتھ ختم کرتے ہیں کہ راہ خوارج، جس طرح کہ اشارہ ہوا، ایسی راہ ہے کہ جو ایک طرزِ عمل کی صورت پوری تاریخ میں دکھائی دیتی ہے اور یہ فقط امیرالمومنینؑ کے زمانے سے مخصوص نہیں ہے۔ وہ ایسا گروہ ہیں جو دین و مذہب کے متعلق چند ظاہری بے وقعت چیزوں کے کچھ نہیں جانتے اور اپنے ظاہری اعمال پر مغرور اور حوادث اجتماعی

[1] شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید، ج ۲ ص ۲۷۱ تا ۲۸۲

www.shiabookspdf.com

کی تحلیل میں کمزور اور اپنے افکار کی بہ نسبت سخت دل بستہ وشدید ضد پرست ہیں اور وہ اپنے علاوہ ہر غیر کو کافر قرار دیتے ہیں اور ضدی پن اور بے وقوفی میں کسی حد کو نہیں مانتے اور ان کی زندگی تضادات افعال اور ضد وتناقض سے پُر ہے۔

واضح رہے کہ امامؑ نے شخصاً اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا اور خوارج کے مستقبل کے بارے میں خطبہ ۶۰ میں یہ پیشگوئی کرتے ہیں۔

جس وقت تقریباً یہ سب نابود ہوجاتے ہیں، امامؑ کے ساتھیوں میں سے ایک اس مادۂ فساد کے قطع ہونے پر خوشی کا اظہار کرتے ہیں، امامؑ فرماتے ہیں:

"كَلَّا! وَ اللهِ! إِنَّهُمْ نُطَفٌ فِيْ أَصْلابِ الرِّجالِ وَ قَرَارَاتِ النِّسَاءِ كُلَّمَا نَجَمَ مِنْهُمْ قَرْنٌ قُطِعَ حَتّٰى يَكُوْنَ آخِرُهُمْ لُصُوْصًا سَلَّابِيْنَ"

"نہیں، خدا کی قسم! یہ نطفے کی صورت میں صلب پدران ورحم مادران میں باقی رہیں گے، جن کی ہر زمانے میں شاخ پھوٹ نکلے گی اور قطع ہوگی، یہاں تک کہ ان کے آخر والے چور اور لٹیرے ہوں گے۔"

www.shiabookspdf.com

سینتیسواں خطبہ

ومن کلام لہ علیہ السلام [1]

یَجْرِیْ مَجْرَی الْخُطْبَةِ وَفِیْهِ یَذْکُرُ فَضَائِلَهُ (علیہ السلام) قَالَهُ بَعْدَ وَقْعَةِ النَّهْرَوَانِ

جو بمنزلہ خطبہ ہے اور اس میں نہروان کے واقعے کے بعد آپؑ نے اپنے فضائل اور کارناموں کا تذکرہ کیا ہے۔

خطبہ، ایک نگاہ میں

جس طرح کہ ابن ابی الحدید کے کلام میں بھی آیا ہے، یہ خطبہ چند مختلف حصوں پر مشتمل ہے جس کے ہر مطلب پر غور وخوض کی ضرورت ہے۔

پہلے حصے میں، امامؑ اپنی ان خدمات کی طرف اشارہ فرماتے ہیں جو انہوں نے اسلام کے ابتدائی دنوں میں آغازِ دعوتِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں انجام دیں، فرماتے ہیں کہ میں ان طوفانوں اور تند وتیز ہواؤں کے مقابلے میں جو دشمن کی طرف سے چلائی گئی تھیں ایک پہاڑ کی طرح محکم کھڑا رہا اور نقطۂ ضعف کسی بھی طور میرے دامنِ زندگی میں وجود نہیں رکھتا۔

دوسرے حصے میں اس مطلب کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ میں مسلسل طاقتور ظالموں کے مقابلے میں اور مظلوم

---

[1] "مصادر نہج البلاغہ" میں "ابن ابی الحدید" کے کلام سے شرح نہج البلاغہ میں، یہی استفادہ ہوتا ہے کہ اس نے اس خطبے کو دیگر منابع میں، مبسوط تر صورت میں پایا ہے، کیونکہ وہ کہتا ہے: یہ خطبہ چار حصوں پر مشتمل ہے جو ایک دوسرے سے زیادہ ربط نہیں رکھتے اور سید رضیؒ نے ہر حصے کو الگ کیا اور یہ امیر المومنین علیہ السلام کے کلام سے جو ایک طولانی خطبہ ہے جسے واقعۂ نہروان کے بعد ارشاد فرمایا ہے، لیا ہے۔" اس کے بعد مرحوم صدوقؒ امالی میں نقل کرتے ہیں کہ شہادت امیر المومنین علیہ السلام کے بعد ایک بوڑھا شخص گریہ کرتے ہوئے آیا اور حضرتؑ کے گھر کے سامنے کھڑے ہو کر ایسی باتیں بیان کیں کہ دقیقاً اس خطبے کے مضامین سے مناسبت رکھتی ہیں۔ یہاں اس فرق کے ساتھ کہ حضرت علی علیہ السلام ضمیروں کو متکلم کی صورت میں اس خطبے میں لائے ہیں اور اُس نے بہ صورت ضمیر مخاطب ان جملوں کو تکرار کیا، اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ یہ خطبۂ مذکورہ طولانی سابقہ رکھتا ہے۔ (مصادر نہج البلاغہ جلد ۱ صفحہ ۴۳۳)

www.shiabookspdf.com

ضعیفوں کے ساتھ کھڑا رہا ہوں تا کہ ان کا حق لے لوں۔

تیسرا حصہ آئندہ رونما ہونے والے حوادث وواقعات کی روک تھام کے عنوان سے ہے جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کیا گیا ہے۔ آپؑ فرماتے ہیں:

"پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نسبت کوئی ناروایات میں کیسے کہہ سکتا ہوں، حالاں کہ میں وہ پہلا شخص تھا جس نے اُن کی تصدیق کی۔"

خطبے کے آخری حصے میں خلفاء سے بیعت کے عذر کو یوں بیان کرتے ہیں کہ میں حکمِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر مجبور تھا کہ اپنے آپ کو بیعت کے لئے پیش کروں اور اپنے حق کے لینے کے لیے قیام نہ کروں کہ مبادا مسلمانوں کے صفوں میں دراڑ پڑ جائے اور اس سے دشمن استفادہ کرے۔

پہلا حصہ

فَقُمْتُ بِالْاَمْرِ حِيْنَ فَشِلُوْا وَ تَطَلَّعْتُ حِيْنَ تَقَبَّعُوْا وَ نَطَقْتُ حِيْنَ تَعْتَعُوْا وَ مَضَيْتُ بِنُوْرِ اللهِ حِيْنَ وَقَفُوْا وَ كُنْتُ اَخْفَضَهُمْ صَوْتًا وَ اَعْلَاهُمْ فَوْتًا فَطِرْتُ بِعِنَانِهَا وَ اسْتَبْدَدْتُ بِرِهَانِهَا كَالْجَبَلِ لَا تُحَرِّكُهُ الْقَوَاصِفُ وَلَا تُزِيْلُهُ الْعَوَاصِفُ لَمْ يَكُنْ لِاَحَدٍ فِيَّ مَهْمَزٌ وَلَا لِقَائِلٍ فِيَّ مَغْمَزٌ

"میں نے اس وقت اپنی ذمہ داریوں کے ساتھ قیام کیا جب سب ناکام ہو گئے تھے۔ اور اس وقت سر اٹھایا جب سب گوشوں میں چھپے ہوئے تھے اور اس وقت بولا جب سب گونگے ہو گئے تھے اور اس وقت نورِ خدا کے سہارے آگے بڑھا جب سب ٹھہرے ہوئے تھے۔ میری آواز سب سے مقدم، میرا اثبات پہاڑوں جیسا تھا جنھیں نہ تیز ہوائیں ہلا سکتی تھیں اور نہ آندھیاں ہٹا سکتی تھیں۔ نہ کسی کے لیے میرے کردار میں طعن وطنز کی گنجائش تھی اور نہ کوئی عیب لگا سکتا تھا۔"

شرح وتفسیر

طوفانوں کے مقابلے میں اپنی جگہ قائم رہنا

اگر چہ نہج البلاغہ کے بعض شارحین نے اس خطبے کے ابتدائی جملوں کو خلیفۂ ثالث کے زمانے کے حوادثات کو سمجھا ہے کہ امامؑ نے بارہا اس کو اس کے غلط کاموں سے منع کیا، حالاں کہ دوسرے خاموش بیٹھے ہوئے تھے، لیکن امامؑ کے بات کرنے

www.shiabookspdf.com

کا انداز بتاتا ہے کہ یہ بات پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے بالخصوص آغازِ اسلام سے تعلق رکھتی ہے۔ فرماتے ہیں:

"فَقُمْتُ بِالْأَمْرِ حِيْنَ فَشِلُوْا وَ تَطَلَّعْتُ [۱] حِيْنَ تَقَبَّعُوْا [۲] وَ نَطَقْتُ حِيْنَ تَعْتَعُوْا۔ [۳]

"اُس وقت جب دوسرے سستی میں پڑے ہوئے تھے، میں نے (اسلام کے دفاع کے لیے) قیام کیا اور جب سب نے خود کو پوشیدہ رکھا تھا میں آشکار میدان میں آیا اور اس دن جب دوسروں نے لب سی لیے تھے، میں نے بات کی۔"

"وَ مَضَيْتُ بِنُوْرِ اللهِ حِيْنَ وَقَفُوْا. وَ كُنْتُ أَخْفَضَهُمْ صَوْتًا وَ أَعْلَاهُمْ فَوْتًا۔ [۴]

"(اور اس وقت جب سب نے ڈر کے حکومت کو اختیار کیا تھا) میں نورِ الٰہی کے ساتھ راستے پر چل پڑا (لیکن میں فریاد نہ کرتا تھا اور نہ کوئی جنجال راہ میں ڈالا) میری صدا سب سے آہستہ تر تھی، لیکن میں سب سے پیش پیش تھا۔"

اس کے بعد فرماتے ہیں:

"فَطِرْتُ بِعِنَانِهَا وَ اسْتَبْدَدْتُ بِرِهَانِهَا۔ [۵]

"میں اس وقت مرکب پیروی پر سوار ہو گیا، اس کی لگام کو ہاتھوں میں تھاما اور پرواز کرنے لگا اور مقابلے کے میدان میں دوسروں پر سبقت لے گیا۔"

"كَالْجَبَلِ لَا تُحَرِّكُهُ الْقَوَاصِفُ وَلَا تُزِيْلُهُ الْعَوَاصِفُ [۶]۔

---

[۱] "تطلّعت" "طلع" کے مادہ سے ہے کسی چیز کی جستجو میں گردن تان کر رکھنا کے معنی میں ہے اور دراصل "طلوع" کے مادے سے لیا گیا ہے "ظہور و آشکار" کے معنی ہیں۔

[۲] "تقبّعوا" "قبع" کے مادّے سے ہے "اپنے سر کو داخل کرنا کسی چیز میں مثل لباس و کرتہ" کے معنی میں آیا ہے اور دراصل "قبوع" سے لیا گیا ہے اور یہاں کچھوے کی طرح اپنے سر کو اندر کر دینا اور صحنۂ حوادث سے اپنے آپ کو دور رکھنے کے معنی میں ہے۔

[۳] "تعتعوا" مادۂ "تعتع" سے لیا گیا ہے جو "لکنت زبان" کے معنی میں ہے اور حرکاتِ شدید پر بھی اطلاق ہوتا ہے، اس لیے وہ افراد جو لکنت زبان والے ہوتے ہیں وہ زور اور حرکات شدید کرتے ہیں کہ اپنے مافی الضمیر کو بیان کر سکیں۔

[۴] "فوت" اصل میں "ہاتھ سے کسی چیز کا نکل جانا" کے معنی میں ہے، یہ لفظ دو چیزوں کے درمیان تفاوت اور دو چیزوں کی ایک دوسرے سے ایسی دوری کہ ایک دوسری کو درک نہ کرے، اس کے لیے کہا جاتا ہے اور اسی وجہ سے یہ لفظ اس شخص کے مورد میں جو دوسرے پر سبقت لے جائے یا اس کو پیچھے چھوڑ دے، بولا جاتا ہے اور بالائی جملے میں یہی معنی مراد ہیں۔

[۵] "رہان" "رہن" کے مادہ سے ہے "ایک چیز کو دوسری چیز کے قریب رکھنے" کے معنی میں ہے اور اسی وجہ سے قرضے کے لیے ضمانت کے طور پر رکھی جانی والی چیز کو "رہن" کہتے ہیں اور اسی وجہ سے مقابلوں کے انعامات اور دی جانے والی چیزوں کو بھی "رہان" کہا جاتا ہے اور بالائی جملے میں بھی "استبددت برہانہا" سے مراد یہی ہے کہ اس مسابقۂ الٰہی کا انعام میں نے تنہا حاصل کیا۔

[۶] "قواصف" و "عواصف" جمع "قاصف" و "عاصف" دونوں "تیز ہوا" کے معنی میں ہیں لیکن پہلا کلمہ کے مفہوم میں اور دوسرے "ہلا دینا اور چیزوں کو اچک جانا" کے مفہوم میں آیا ہے۔ اس بنا پر ان تیز ہواؤں کو جو درختوں کی شاخوں کو توڑ دیں "قاصف" کہتے ہیں اور وہ بہت تیز و سریع ہوائیں جو درختوں کو اپنی جگہ سے اکھاڑ دیں اور اپنے ساتھ لے اڑیں ان کو "عاصف" کہتے ہیں۔

www.shiabookspdf.com

"میری آواز سب سے مؤثر، میرا اثبات پہاڑوں جیسا تھا، جنہیں نہ تیز ہوائیں ہلا سکتی تھیں اور نہ آندھیاں ہٹا سکتی تھیں۔"

"لَمْ يَكُنْ لِأَحَدٍ فِيَّ مَهْمَزٌ [1] وَلَا لِقَائِلٍ فِيَّ مَغْمَزٌ [2]"۔

"نہ کسی کے لئے میرے کردار میں طعن وطنز کی گنجائش تھی اور نہ کوئی عیب لگا سکتا تھا۔"

اسی فراز کے آغاز میں امامؑ چار نکتوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں:۔

پہلا: اس زمانے میں دوسرے سست اور کمزور تھے، میں نے کمر ہمت باندھ لی اور قیام کیا اور اپنے وظیفے کو انجام دیا۔

دوسرا: اس زمانے میں دوسروں نے ڈر کی وجہ سے اپنا سر کچھوے کی طرح چھپا دیا تھا۔ میں نے اپنی گردن تان لی اور دشمن کو ہر جگہ زیر نظر رکھا۔ توجہ رہے کہ "تطلّع" کسی چیز کی جستجو میں گردن کھینچنے کے معنی میں آتا ہے اور "تقبّع" چھپ جانا اور کچھوے کی طرح سر چھپا دینا" کے معنی میں ہے۔

تیسرا: جب دوسروں کی زبانیں گنگ ہو چکی تھیں اور اہم اسلامی مسائل میں اظہار نظر اور اعلیٰ حقائق کے بیان سے رک گئی تھیں، میں نے بولنا شروع کیا اور حقائق کو بیان کیا۔

چوتھا: اس وقت دوسرے شک، تردّد، حیرت اور سرگردانی کی وجہ سے راستے سے بھٹک گئے تھے، میں نے نور پروردگار (نور ایمان ویقین یا نور قرآن ووحی) کے سائے میں قدم بڑھا تا رہا اور بہت آگے نکل گیا۔

لیکن ان سب کے باوجود کوئی دعویٰ نہ کیا اور کوئی شور وشرابہ نہ کیا اور یہ وہ ہی چیز ہے جو "كُنْتُ أَخْفَضَهُمْ صَوْتًا" میں اس کی طرف اشارہ ہے۔

اس کے بعد نتیجے کے طور پر فرماتے ہیں۔ ان امور کا نتیجہ یہ نکلا کہ میں نے عنانِ حکومت کو ہاتھ میں لے لیا اور اس میں قوت پرواز پیدا ہو گئی اور فضائل کی دوڑ میں بازی لے گیا۔

بعد والے جملے میں گزشتہ مسائل پر تاکید کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ میں پہاڑ کی طرح کھڑا رہا اور کوئی حادثہ میرا

---

[1] "مهمز" مادہ "همز" سے دراصل "نچوڑنا اور دباؤ ڈالنا" کے معنی میں ہے اور مورد عیب جوئی میں جس میں ایک طرف کو دباؤ کے تحت قرار دیا جاتا ہے اس لیے استعمال کیا گیا ہے اور اس کلمے سے مراد بھی جملۂ بالا میں یہی معنی ہیں یعنی کوئی جگہ عیب جوئی کے لیے مجھ میں نہ تھی۔

[2] "مغمز" مادہ "غمز" سے ہے۔ یہ بھی دراصل "نچوڑنا یا دباؤ بڑھانا" کے معنی میں ہے یہ اصطلاح اس دباؤ ڈالنے والے مورد میں لائی جاتی ہے کہ کسی تیز نوک والی چیز سے سواری پر اس کی حرکت کو تیز کرنے کے لیے دباؤ ڈالا جائے اس مناسبت سے بہت سے موارد میں عیب جوئی کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے اور "غمّاز" "شخص عیب جو اور غیبت کنندہ" کے معنی میں آیا ہے اور امامؑ کے کلام میں بھی یہی معنی مراد ہیں۔

www.shiabookspdf.com

سامنا کرنے کی قدرت نہ رکھ سکا۔ اوران سب کے باوجود پاک زندگی گزاری اور پاک رہا اور کوئی شخص مجھ میں عیب تلاش نہ کر سکا۔

جیسا کہ کہا گیا کہ ممکن ہے ان جملوں کا آغاز ظہور اسلام کی طرف اشارہ ہو، اس لیے کہ ہم جانتے ہیں وہ پہلا شخص جو مردوں میں سب سے پہلے ایمان لایا، وہ حضرت علی علیہ السلام تھے اور ان ایام میں اسلام اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غریب تھے اور مومنین کم اور دشمن طاقتور اور حوصلہ مند، وہ شخص جو ہر جگہ اور تمام واقعات میں حاضر تھا اور اپنے تمام وجود کے ساتھ، اسلام وقرآن کا اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دفاع کیا، وہ علی علیہ السلام تھے۔

یہ سلسلہ چلتا رہا، یوم الدار جو اسلام کی تین سالہ مخفیانہ تبلیغ کے بعد اعلانیہ طور پر تبلیغ کے آغاز کا سال تھا، تنہا وہ فرد، جس نے دعوت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر لبیک کہا، وہ حضرت علی علیہ السلام تھے۔ اور لیلۃ المبیت میں وہ ہی تھے جنہوں نے اپنی جان کو یقینی خطرات میں ڈالا، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مردانہ وار دفاع کیا۔

جنگ خیبر کی داستان اور دوسروں کا قلعے کو فتح کرنے میں کمزوری دکھانا اور مضبوط ترین دروازے کا علی علیہ السلام کے دست مبارک سے کھلنا اور جنگ احزاب میں حضرت کا عمرو ابن عبدود سے مقابلہ، جبکہ لشکر اسلام سے کوئی شخص اس کے مقابلے کے لیے جانے کو تیار نہ تھا، امام علی علیہ السلام کا اُسے پچھاڑ دینا اور ان جیسی اور مثالیں جنہیں تاریخ نہ بھولی ہے اور نہ کبھی بھول پائے گی۔

یہ احتمال بھی موجود ہے کہ قیام بہ امر اور باقی چار جملوں سے خلفاء کے دور میں اسلام کا دفاع مراد ہو، کیونکہ مؤرخین اسلام نے لکھا ہے کہ جس وقت کوئی اہم مشکل مسلمانوں کے لیے پیش آتی اس میں جو حلال مشکلات تھے وہ حضرت علی علیہ السلام ہی کی ذات تھی۔ مسلمانوں کے دوسرے خلیفہ ثانی کا مشہور جملہ:

"اَللّٰهُمَّ! لَا تُبْقِنِي لِمُعْضِلَةٍ لَيْسَ لَهَا أَبُو الْحَسَنِ۔"[1]

"پروردگارا! ابوالحسن علی ابن ابی طالب علیہما السلام مسائل کے حل کے لیے حاضر نہ ہوں مجھے زندہ مت رکھنا۔"

یا اس جیسے اور بہت سے جملے، جو شیعہ وسنی کتب میں واضح طور پر نقل ہوئے ہیں، اس دعوے کی زندہ دلیل ہیں۔ یہ مطلب اس قدر معروف ومشہور ہے کہ بعض ارباب لغت عرب نے جملہ "مُشْكِلَةٌ لَيْسَ لَهَا أَبُو الْحَسَنِ" کو مشہور ضرب المثل کے طور پر ذکر کیا ہے۔

[1] یہ حدیث مختلف تعبیرات سے اہل سنت کی بہت سے معروف کتابوں میں نقل ہوئی ہے منابع کی تفصیلی آگاہی کے لیے کتاب الغدیر، جلد ۳، ص ۹۸ کی طرف رجوع کریں۔

www.shiabookspdf.com

یہاں پر تیسرا احتمال بھی موجود ہے کہ تیسرے خلیفہ کے دستورات کی ناکامی کے بعد خلافت کے سلسلے میں قیام کرنے اور ان کے آخری دور خلافت اور قتل کے بعد رونما ہونے والے جان لیوا طوفانوں، جس نے پوری اسلامی دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا، ممکن ہے حضرتؑ کے ان تمام جملوں کا اشارہ اس طرف ہو۔

جی ہاں! اُس وقت مکمل طور پر اسلامی معاشرے کا شیرازہ بکھر چکا تھا اور وہ دیوانے، منافقین اور زمانہ جاہلیت کے باقی ماندہ افراد اور عرب کے مشرکین اس کوشش میں لگے ہوئے تھے کہ کسی طرح پرچم اسلام کو سرنگوں کیا جائے۔

مسلمانوں کی امید کی کرن فقط حضرت علی علیہ السلام کی ذات تھی، جی ہاں! وہ ہی تھے جنہوں نے اُس وقت قیام کا حکم دیا اور مسلمانوں اور اسلام کو مزید بکھر جانے اور تنزلی سے نجات دلائی۔ البتہ تینوں تفسیروں میں کوئی منافات نہیں ہے اور ممکن ہے وہ سب تفاسیر مذکورہ تفسیر کے مفہوم میں جمع ہوں۔

"كُنْتُ أَخْفَضَهُمْ صَوْتًا" کی تعبیر میں امامؑ کی تواضع سے مراد ان کامیابیوں طرف کی اشارہ ہو جو آپ کو حاصل ہیں۔ فرماتے ہیں: میں کسی بھی حالت میں دکھاوا اور شور شرابہ کرنے والوں میں سے نہیں ہوں اور ہر حال میں ثابت قدم رہا، کیوں کہ شور شرابہ کرنا کمزور اور ناتواں لوگوں کا کام ہے۔

"وَ أَعْلَاهُمْ فَوْتًا" کا جملہ جو دوسروں پر سبقت لے جانے کے معنی میں ہے۔ ایمان، ہجرت، مبارزہ، جہاد اور سب فضائل اخلاقی میں پیش پیش ہونا بھی اس مطلب پر تاکید ہے، بالخصوص ابتدا میں "فاء تفریع" کا آنا گزشتہ مطلب کا نتیجہ ہے۔

"فَطِرْتُ بِعِنَانِهَا وَ اسْتَبْدَدْتُ بِرِهَانِهَا" میں کامیابی کی سواری پر سوار ہو کر دوسروں پر سبقت لے گیا۔ اور یہ اس لیے تھا کہ میں نے ایک لحظہ بھی اپنے آپ میں سستی کو آنے نہ دیا، بڑے حوادث سے نہ ڈرا، فرصتوں کو ہاتھ سے جانے نہ دیا اور کوئی شور شرابہ بھی نہ کیا۔ امام علیہ السلام بعد والے جملے میں اپنے آپ کو کوہِ عظیم سے تشبیہ دیتے ہیں جو کبھی بھی تیز ہواؤں اور طوفانوں سے اپنی جگہ سے نہیں ہلتا۔

لطف کی بات یہ ہے کہ پہلے فرماتے ہیں "قواصف" یعنی تیز طوفانی ہوائیں ان کو نہیں ہلا سکتیں۔ اس کے بعد اضافہ کرتے ہیں کہ "عواصف ان کو جڑوں سے اکھاڑ نہیں سکتے" قواصف، توڑنے والی تیز ہواؤں کے معنی میں ہے اور عواصف، بہت تیز طوفانی ہواؤں کے معنی میں ہیں، جو چیزوں کو جڑ سے اکھاڑ کر اپنے ساتھ لے جاتی ہیں۔ اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ کبھی حادثہ اس حد تک ہے کہ انسان کو اپنی جگہ پر توڑ کر رکھ دیتا ہے اور وہ کام کرنے کے قابل نہیں رہتا اور کبھی اس سے بھی شدید تر ہے کہ اس کو درخت کے پتوں کی طرح اپنے ساتھ لے جاتا ہے اور دور دراز جگہ پر پھینک دیتا ہے۔

www.shiabookspdf.com

امامؑ فرماتے ہیں کہ کوئی بھی ایسا حادثہ میرے پائے استقلال میں لغزش پیدا کرنہ کر سکا۔ اس خطبے کے آخری جملوں میں ایک اور اہم نکتے کی طرف اشارہ فرماتے ہیں کہ اس سب اجتماعی جدوجہد کے باوجود کوئی شخص بھی مجھ میں کوئی چھوٹا سا عیب بھی نہیں نکال سکا۔ ہم جانتے ہیں کہ افراد جس وقت اجتماعی معاملات میں قدم رکھتے ہیں اور اہم کام انجام دیتے ہیں وہ ہر حال میں گوشہ و کنار سے تنقید کا نشانہ بنتے ہیں۔ مگر کوئی شخص اگر تمام اہم معاملات میں قدم رکھے اور بہت بڑا کام انجام دے سکتا ہو، اس کے باوجود اس کا دامن کسی عیب یا تہمت سے داغ دار نہ ہو تو یہ بہت بڑا کام ہے۔ یہی صورتحال ان لوگوں کی ہے جو امام علیہ السلام کی نسبت ہر اعتبار سے کمتر تھے۔ انہیں بھی بہت ساری باتیں کہی گئی ہیں۔ [1]

دوسرا حصہ

الذَّلِيلُ عِنْدِي عَزِيزٌ حَتَّى آخُذَ الْحَقَّ لَهُ وَ الْقَوِيُّ عِنْدِي ضَعِيفٌ حَتَّى آخُذَ الْحَقَّ مِنْهُ رَضِينَا عَنِ اللهِ قَضَاءَهُ وَ سَلَّمْنَا لِلّٰهِ أَمْرَهُ

"تمہارا ذلیل میری نگاہ میں عزیز ہے، یہاں تک کہ اس کا حق دلوادوں اور تمہارا عزیز میری نگاہ میں ذلیل ہے، یہاں تک کہ اس سے حق لے لوں۔ میں قضائے الٰہی پر راضی ہوں اور اس کے حکم کے سامنے سراپا تسلیم ہوں۔"

شرح و تفسیر

طاقتور ظالم میرے نزدیک ضعیف ہیں

چوں کہ اکثر حوادث اور خونی جنگیں امامؑ کے دور حکومت میں رونما ہوئی ہیں، وہ لوگ کئی سال سے سابقہ خلفاء کے ادوار میں ظلم و ستم کا شکار ہوئے۔ بالخصوص تیسرے خلیفہ کے دور میں تو عادی ہو گئے تھے۔ آسانی سے بیت المال اور قانون کے دروازے تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔ امامؑ اس خطبے میں تاکید کرتے ہیں کہ اپنی اس روش (عدالت) کو ہرگز ہاتھ سے جانے نہیں دوں گا اور میں نے حق و عدالت کا اجراء کمزوروں اور ضعیفوں کے حق کو طاقتور لوگوں سے چھیننے کے لیے قبول کیا ہے۔ فرمایا:

"اَلذَّلِيلُ عِنْدِي عَزِيزٌ حَتَّى آخُذَ الْحَقَّ لَهُ وَ الْقَوِيُّ عِنْدِي ضَعِيفٌ حَتَّى آخُذَ الْحَقَّ مِنْهُ"

---

[1] اس کتاب کی جلد اول میں شرح خطبہ شقشقیہ میں بہت قیمتی توضیحات اس مطلب کے بارے میں گزری ہیں۔ صفحات ۳۴۵ تا ۳۵۳

www.shiabookspdf.com

"مظلوم کمزور میری نظر میں عزیز ہے تاکہ ان کے حق کو ان سے لے لوں۔ اور ظالم طاقتور میرے نزدیک حقیر و ضعیف ہیں کہ دوسروں کے حق کو ان سے چھین لوں۔"

امامؑ، پیغمبر اکرمؐ کے مشہور قول کو، جس کی طرف آپؑ نے مالک اشترؒ کے نام حکم نامے میں بھی اشارہ فرمایا ہے، مورد توجہ قرار دیتے ہیں۔ اسی بنا پر مالک اشترؒ کو صریحاً وصیت کرتے ہیں کہ اپنا کچھ وقت نیازمندوں کے ساتھ گزارو اور ان سے عمومی ملاقات کرو، دارالامارہ کے دروازوں کو کھول دو اور محافظوں کو ایک طرف ہٹا دو تاکہ لوگ آسانی سے تم سے مل سکیں اور اپنی مشکلات اور پریشانیاں تمھارے سامنے رکھیں۔ فرماتے ہیں: یہ اس لیے ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کو بارہا یہ فرماتے ہوئے سنا ہے:

"لَنْ تُقَدَّسَ أُمَّةٌ لَا يُؤْخَذُ لِلضَّعِيفِ فِيهَا حَقُّهُ مِنَ الْقَوِيِّ غَيْرَ مُتَتَعْتِعٍ [1]"

"وہ لوگ جو طاقتور منہ زوروں سے کمزور وضعیف لوگوں کے حق کو نہ لے پائیں وہ کبھی پاک نہ ہوں گے اور اپنے لیے سعادت کبھی نہیں دیکھ پائیں گے۔"

امامؑ اپنے تمام امور میں اسی اصول پر کاربند وفادار رہے اور یہی روش آپؑ کی پوری زندگی میں دیکھنے میں آئی۔ دشمن آپؑ پر تنقید کرتے تھے تو وہ یہی تھی کہ آپ عدالت کو شخصی مفاد اور اپنے اقتدار پر قربان نہیں کرتے تھے۔ دنیا پرست اور خودغرض لوگ جنھیں اقرباپروری کی عادت تھی، کو دینے سے دور رکھا۔

اس بارے میں حکایات اور احادیث زیادہ نقل ہوئی ہیں۔ کچھ کتاب "روضۂ کافی" میں آئی ہیں:

"امامؑ ایک روز بیت المال کے عطایا (خراج اور اس کی مانند چیزوں) کو تقسیم فرما رہے تھے کہ انصار میں سے ایک سردار آئے تو امامؑ نے ان کو تین دنیار دیے اور اس کے بعد ایک سیاہ غلام آیا امامؑ نے ان کو بھی تین دینار دیے۔

انصار مرد نے عرض کی:

"یا امیرالمومنین! یہ میرا غلام تھا، جس کو کل میں نے آزاد کیا تھا، آپ اس کو میرے ساتھ یکساں قرار دے رہے ہیں؟"

امامؑ نے فرمایا:

"میں نے کتابِ خدا میں دیکھا ہے کہ فرزندانِ اسماعیلؑ کو فرزندانِ اسحاقؑ پر کوئی برتری نہ دیکھی۔"

"إِنَّ آدَمَ لَمْ يَلِدْ عَبْدًا وَلَا أَمَةً وَإِنَّ النَّاسَ كُلَّهُمْ أَحْرَارٌ."

---

[1] نہج البلاغہ، نامہ ۵۳ مالک اشترؒ کے نام فرمان۔

www.shiabookspdf.com

" آدم سے کوئی غلام اور کوئی کنیز پیدا نہیں ہوئی ہے سب انسان آزاد ہیں۔"[1] (اور اگر کبھی کسی کے گردن میں طوقِ بندگی پڑ بھی جائے تو ان کو بھی آزاد ہونا چاہیے اور اپنی اصل کی طرف لوٹنا چاہیے)

اگر اس تعبیر سے مراد یہ ہو کہ ایک گروہ کو دوسرے گروہ پر برتری حاصل ہو جائے تو فرزندان اسماعیل ذبیح اللہ علیہ السلام کو دوسروں پر فوقیت حاصل ہونی چاہیے۔ مزید اضافہ کرتے ہیں:

"رَضِيْنَا عَنِ اللهِ قَضَاءَهُ وَسَلَّمْنَا لَهُ أَمْرَهُ"

"ہم اللہ کے حکم پر راضی ہیں اس کے امر کے سامنے سر تسلیم خم ہیں۔"

یہ تعبیر ممکن ہے کہ دو معنی میں سے ایک کی طرف اشارہ ہو۔ خداوند متعال کا پہلا حکم یہ ہے کہ مظلوم کی حمایت اور ظالم سے مقابلہ کریں اور ہمیں اس حکم کو ماننا اور اسے تسلیم کرنا چاہیے چاہے دوسرے اس کو پسند کریں یا پسند نہ کریں۔

دوسرے معنی یہ کہ مظلوم اور ضعیف لوگوں کی حمایت اور طاقتور ظالم سے مقابلہ انسانی زندگی میں مشکلات بڑھاتا ہے اور میں یہ جانتے ہوئے بھی اس راہ پر چل نکلا ہوں اور اس راہ میں مشکلات کو دل وجان سے قبول کرتا ہوں اور خدا کے فیصلے پر راضی ہوں۔

نہج البلاغہ کے بہت سے مفسرین اس جملے کو بعد والے خطبے کے لیے مقدمہ اور اس سے مربوط سمجھتے ہیں، لیکن جس طرح اوپر والی تفسیر میں ذکر ہوا ظاہر ہے کہ یہ جملہ گزشتہ بحث کا تسلسل ہے۔ اس سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ امامؑ مظلوموں کی حمایت اور ظالموں سے مقابلے میں کبھی پیچھے نہیں ہٹیں گے اور ہر مشکل کو جو اس راہ میں آئے برداشت کریں گے اور حکم خداوندی کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے ہیں۔

نکتہ

مظلوم کی حمایت اور ظالم سے جنگ

یہ مسئلہ کہ حکومت اسلامی کو چاہیے کہ مظلوموں کی مدافع اور ان کی مددگار رہو اور ظالموں کے حملے کے مقابلے میں ان کی حمایت اور ان کا دفاع کرے، نہج البلاغہ کی متعدد عبارات سے ظاہر ہے جس کا ایک واضح نمونہ خطبہ شقشقیہ تھا جس کے آخر میں امامؑ صراحت کے ساتھ فرماتے ہیں:

---

[1] روضہ کافی صفحہ ۶۹ حدیث ۲۶

www.shiabookspdf.com

"وَمَا أَخَذَ اللهُ عَلَى الْعُلَمَاءِ أَنْ لَا يُقَارُّوْا عَلٰى كِظَّةِ ظَالِمٍ وَلَا سَغَبِ مَظْلُوْمٍ"

"میں تمہاری حکومت وخلافت کا طالب نہ تھا، وہ چیز جس نے مجھے اس کے قبول کرنے پر مجبور کیا وہ وعدہ ہے جو خداوند نے ہرامت کے علماء سے لیا ہے کہ پیٹ بھرے ظالموں کے مقابلے میں اور مظلوموں کی بھوک پر سکوت نہ کریں، مظلوموں کے گروہ کی حمایت ومدد کے لیے قیام کریں اور ظالموں کے گروہ سے مقابلے کریں۔"

امام علیہ السلام کی آخری وصیتوں میں بھی ہے۔ بستر شہادت پر اپنے فرزندوں کو تاکید کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"كُوْنَا لِلظَّالِمِ خَصْمًا وَلِلْمَظْلُوْمِ عَوْنًا"۔[1]

"ہمیشہ ظالموں کے دشمن اور مظلوموں کے یاور ومددگار رہو۔"

امامؑ کی ساری زندگی اور اہم حوادث جو آنحضرتؐ کی حیات میں واقع ہوئے، سے ظاہر ہے کہ اپنے عمل میں بھی ہمیشہ اس دستور العمل کے وفادار رہے اور اس کی انجام دہی میں ایک لحظہ بھی کوتاہی نہ فرمائی۔ نہج البلاغہ کے ایک دوسرے خطبے میں یہی بات ایک نئے جوش وولولے کے ساتھ ذکر ہوئی ہے۔ فرماتے ہیں:

"وَ أَيْمُ اللهِ! لَأُنْصِفَنَّ الْمَظْلُوْمَ مِنْ ظَالِمِهٖ وَلَأَقُوْدَنَّ الظَّالِمَ بِخِزَامَتِهٖ حَتّٰى أُوْرِدَهُ مَنْهَلَ الْحَقِّ وَإِنْ كَانَ كَارِهًا"[2]۔

"خدا کی قسم! مظلوم کا انصاف ظالم سے ضرور لوں گا اور ظالم کی لگام کو کھینچوں گا یہاں تک کہ حق کی منزل تک آجائے، چاہے وہ اس سے کراہت کرتا ہو۔"

بنیادی طور پر یہ ایک اہم اسلامی اصول ہے جس کی قرآن مجید تاکید کرتا ہے اور مومنین کو صراحت کے ساتھ حکم دیتا ہے کہ مظلوم کی نجات کے لیے قیام کریں یہاں تک کہ اسلحہ اٹھانا پڑے اور ظالموں سے مقابلہ کریں، اللہ فرماتا ہے:

"وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ أَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ أَهْلُهَا ۚ وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۚ وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا ﴿۷۵﴾"[3]

"اے مسلمانو! تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ خدا کی راہ میں ان کمزور اور بے بس مردوں اور عورتوں اور بچوں کو کفار کے

[1] نہج البلاغہ، نامہ ۴۸

[2] نہج البلاغہ خطبہ ۱۳۶

[3] سورۂ نساء، آیت ۷۵

www.shiabookspdf.com

پنجے سے چھڑانے کے لیے جہاد کیوں نہیں کرتے۔ مجبور لوگوں کی طرح بیٹھ کر دعائیں کر رہے ہو کہ اے خدا یہ مکہ والے بڑے ظالم لوگ ہیں، کسی طرح ہمیں یہاں سے نکال لے اور اپنی طرف سے کسی کو ہمارا سرپرست بنا دے اور تو کسی کو اپنی طرف سے ہماری مدد کے لیے بھیج دے۔"

یہاں یہ نکتہ نہیں بھولنا چاہیے کہ حکومتوں کی تشکیل اور قوانین کا نفاذ، خواہ وہ قوانین الٰہی ہوں یا عام انسانوں کے لیے بنائے گئے ہوں، کا فلسفہ کمزوروں کے حقوق کی حفاظت اور ان کی حمایت کرنا ہے، کیوں کہ طاقتور اپنی قدرت و زور کے بھروسے پر نہ صرف اپنا حق لے لیتے ہیں بلکہ اس سے زیادہ کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اس بنا پر اگر حکومت اور قانون مظلوموں اور کمزوروں کا حامی نہ ہو تو وہ اپنے وجود کے فلسفے کو کلی طور پر کھو دیتے ہیں اور کبھی ظالموں کے ہاتھوں میں اس طرح کھیل جاتے ہیں کہ وہ ظالم اور ستمگروں کی طرف داری میں لگ جاتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت امام علی علیہ السلام نے اسی خطبہ شقشقیہ میں حکومت کو تسلیم کرنے کے مسئلے کو مظلوموں کی حمایت اور ظالموں کی مخالفت قرار دیا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ان معاشروں میں جہاں رشوت کے ذریعے قوانین کے نفاذ میں تبدیلی کی جاتی ہے وہاں قانون کا نتیجہ برعکس نکلتا ہے، کیوں کہ رشوت کے ذریعے حق کو ضائع کرنے والے ظالم لوگ ہیں ضعیف اور مظلوم لوگ نہیں۔ ایسے معاشرے میں قانون ظالم اور ستمگروں کی غیر شرعی سرگرمیوں کے لیے سرچشمہ اور ان کے ظلم و ستم کے توجیہ کا سبب بن جاتا ہے، لیکن یہ بات سچ ہے کہ مظلوموں کی حمایت کی خاطر عدالتِ الٰہی پر عمل کرنا اور ظالموں سے ٹکرانا بہت سوں کے لیے ناپسند اور تکلیف دہ ہے۔

جو لوگ اس حقیقت کو اپنے غیر شرعی مفادات کے حصول کے لیے رکاوٹ سمجھتے ہیں یا اس سے بڑھ کر کہ معاشرے میں سب سے زیادہ حقوق لینے کے خواہشمند ہیں، برابری اور مساوات کو اپنے حق میں توہین سمجھتے ہیں، وہ بہت مشکل سے عدل و انصاف کے فیصلے کو قبول کر سکتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں کہ جو عدل الٰہی کی حکومتوں کے لیے رکاوٹ بنتے ہیں، وہ کسی بھی بُرے عمل سے روگردانی نہیں کرتے۔ یہی وہ لوگ تھے جنہوں نے حضرت امام علی علیہ السلام کی حکومت کے لیے اندرونی طور پر مشکلات پیدا کیں اور اسلامی معاشرے کی فضا کو تہس نہس کر دیا۔

اس بات کو مرحوم علّامہ مجلسیؒ کے ایک جملے کے ذریعے جو بحار الانوار میں راوندی کی کتاب "الدعوات" سے نقل کیا ہے، ختم کرتے ہیں، آپ اسے علی ابن جعدہ سے نقل کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"عربوں کا امیر المومنین علیہ السلام کی حمایت سے ہاتھ اٹھانے کا اہم ترین سبب ان کی اپنی مالی مشکلات تھیں، کیوں کہ

www.shiabookspdf.com

امام علیہ السلام کسی شریف کو غیر شریف اور کسی عربی کو کسی عجمی پر ترجیح نہیں دیتے، قبائل کے سرداروں اور حکومتی سربراہوں کے ساتھ حساب و کتاب کا ایک مخصوص کھاتا (جیسا کہ سلاطین کی سیرت تھی) نہیں کھولا تھا، وہ مال و متاع کے ذریعے کسی کو اپنی طرف مائل نہیں کراتے تھے، البتہ امیر شام اس کے بالکل برعکس عمل کرتا تھا۔"[1]

تیسرا حصہ

أَتَرَانِي أَكْذِبُ عَلَى رَسُولِ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وَاللهِ لَأَنَا أَوَّلُ مَنْ صَدَّقَهُ فَلَا أَكُونُ أَوَّلَ مَنْ كَذَبَ عَلَيْهِ فَنَظَرْتُ فِي أَمْرِي فَإِذَا طَاعَتِي قَدْ سَبَقَتْ بَيْعَتِي وَإِذَا الْمِيثَاقُ فِي عُنُقِي لِغَيْرِي

"کیا تمہارا خیال ہے کہ میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں کوئی غلط بیانی کر سکتا ہوں جب کہ سب سے پہلے میں نے آپ کی تصدیق کی ہے تو اب سب سے پہلے جھوٹ بولنے والا نہیں ہو سکتا ہوں۔ میں نے اپنے معاملے میں غور کیا تو میرے لیے اطاعت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مرحلہ بیعت پر مقدم تھا اور میری گردن میں آنحضرتؐ کے عہد کا طوق پہلے سے پڑا ہوا تھا۔"

شرح و تفسیر

میں پہلا مسلمان ہوں

جس طرح پہلے اشارہ ہوا کہ دیکھنے میں آیا ہے کہ جو کچھ اس خطبے میں ذکر ہے وہ ایک طویل خطبے کے مختلف حصے ہیں جنہیں سیّد رضیؒ نے باقی حصوں سے جدا کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خطبوں کے حصوں کے درمیان کبھی کوئی رابطہ نہیں دیکھا گیا۔ اگر چہ خطبے کے مختلف حصوں کو جتنا ہو سکے آپس میں ملا سکتے ہیں۔

بہر حال خطبے کا یہ آخری حصہ دو چیزوں پر مشتمل ہے:

پہلی چیز یہ کہ امام علیہ السلام مسلسل آئندہ حوادث کی خبر دیتے ہوئے فرماتے ہیں: یہ وہ مسائل ہیں جن کی مجھے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خبر دی ہے۔

من جملہ اہل جمل و صفین و نہروان کے ساتھ جنگ تھی، جہاں تک بعض ضعیف الایمان افراد امامؑ کی پیغمبر

[1] بحار الانوار، جلد ۴۱، ص ۱۳۳

www.shiabookspdf.com

اکرم ﷺ سے حدیث کی نقل کی صحت سے بھی انکار کرتے تھے اور امام علیہ السلام ان کے جواب میں فرماتے تھے:

"أَتَرَانِي أَكْذِبُ عَلَى رَسُولِ اللهِ ﷺ؟"

"کیا تم لوگ گمان کرتے ہو کہ یہ ممکن ہے کہ میں رسول خدا ﷺ پر جھوٹ باندھ رہا ہوں؟ اور غیب کی خبریں اور پیشگوئیوں کو جو آنحضرت ﷺ سے نقل کرتا ہوں، کیا وہ خلاف حقیقت ہیں؟"

"وَاللهِ لَأَنَا أَوَّلُ مَنْ صَدَّقَهُ؛ فَلَا أَكُونُ أَوَّلَ مَنْ كَذَبَ عَلَيْهِ."

"خدا کی قسم! میں ہی وہ پہلا شخص تھا، جس نے ان کی تصدیق کی، اس بنا پر میں وہ پہلا شخص نہیں بنوں گا جو ان کی تکذیب کرے۔"

اس دن جب سب اُن کے مخالف تھے اور آنحضرت ﷺ کی تکذیب کرتے تھے، میں نے ان کی بات کی تصدیق کی اور ان کے صدق کلام پر یقین رکھتا تھا اور میں پہلا شخص تھا مردوں میں سے جو اُن پر ایمان لے آیا اور جو کچھ میں رکھتا تھا وہ سب اخلاص کے ظرف میں رکھ کر ان کے سامنے پیش کر دیا میں جنگوں میں ان کی سپر تھا اور تمام دشوار ترین حوادث میں ان کے فرمان کے تابع تھا۔ آیا اس حال میں یہ ممکن ہے کہ میں ان کی راہ سے منحرف ہو جاؤں یا کسی جھوٹ کو ان پر باندھوں؟ یہ محال ہے اور ناممکن ہے۔

ایک دوسرا احتمال بھی اس جملے کی تفسیر میں ہے اور وہ یہ ہے کہ امام علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اگر میں نے خلفاء کی بیعت کی ہے تو وہ اس لیے نہیں تھی کہ میں ان کو لائق سمجھتا تھا، بلکہ فرمان پیغمبر اکرم ﷺ پر قائم رہا تا کہ مسلمانوں کے درمیان کوئی اختلاف وتفرقہ پیدا نہ ہو پائے۔ کیا تم یہ خیال کرتے ہو کہ ان باتوں کے ذریعے پیغمبر اکرم ﷺ کو جھوٹی نسبت دوں یا یہ خیال کرتے ہو کہ میں دستور پیغمبر اکرم ﷺ کو پس پشت ڈال دوں؟ اس بنا پر میں نے خلفا کی بیعت کی اور اپنے حق سے موقتاً صرف نظر کر دیا تا کہ فرمان رسول خدا ﷺ کی اطاعت کروں۔ یہ تفسیر بعد والے جملوں کے ساتھ زیادہ سازگاری رکھتی ہے اور بہت مناسب نظر آتی ہے۔"

آپؑ اس کے بعد اس نکتے کی طرف اشارہ فرماتے ہیں:

"فَنَظَرْتُ فِي أَمْرِي، فَإِذَا طَاعَتِي قَدْ سَبَقَتْ بَيْعَتِي وَإِذَا الْمِيثَاقُ فِي عُنُقِي لِغَيْرِي."

"میں نے اپنے کام میں فکر کیا، میرے لیے ہر قسم کی بیعت سے اطاعتِ رسول اللہ ﷺ مقدم تھی اور ان سے کیے پیمان میرے گردن پر ہیں۔"

اگر چہ یہ جملہ جو نہج البلاغہ کے پیچیدہ ترین جملوں میں سے ہے، نہج البلاغہ کے شارحین کے درمیان اس کی تفسیر کے

www.shiabookspdf.com

بارے میں کافی اختلاف رائے پایا جاتا ہے، لیکن وہ کچھ جو اوپر کہا گیا، سب سے زیادہ مناسب نظر آتا ہے۔ گویا یہ جملہ ایک سوال کا جواب ہے جو ذہنوں میں ابھرتا تھا کہ اگر امامؑ خود کو خلافت کے لیے لائق تر سمجھتے تھے حتیٰ کہ باصراحت فرمایا ہے، میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے اس مقام کے لیے منصوب شدہ ہوں تو پھر کیوں تین خلفا کے زمانے میں ان کو تسلیم کیا اور ان کی بیعت کی؟

امامؑ جواب میں کہتے ہیں کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے دستور دیا تھا کہ اگر مجھ سے مخالفت کریں حفظِ اسلام کی خاطر ان کے ساتھ نہ الجھوں، بلکہ اہم ترین مصلحتوں کی خاطر جن کی حفاظت میرے اوپر واجب ہے، ان کی بیعت کو تسلیم کروں، اس بنا پر میں نے اپنی بیعت سے پہلے اطاعتِ فرمانِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مدنظر رکھا اور بیعت کے بعد، یہ میثاق اور پیمان میری گردن پر تھا اور میں مجبور تھا کہ اس سے وفا کرتا۔

یہ سب باتیں ظاہر کرتی ہیں کہ بالائی خطبہ مختلف جملوں سے مرکب ہے جو ایک بہت بڑے تفصیلی خطبے سے لیا گیا ہے اور ہر ایک حصے کا ایک خاص مطلب ہے۔

جیسا کہ ہم نے اوپر کے جملے میں کہا کہ بعض شارحین نہج البلاغہ نے پہلے جملے کی تفسیر کی ہے اور کہا کہ وجوبِ اطاعتِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میرے لیے خلفاء کے ہاتھ پر بیعت پر مقدم تھا۔ انہوں نے دستور دیا تھا کہ (ان شرائط پر) میں راضی رہوں، لیکن دوسرے جملے کی تفسیر میں انہوں نے کہا ہے کہ اس میثاق سے مراد وہ عہد و پیمان ہے جو دوسروں کی خاطر گردنِ امامؑ پر تھا۔ وہ ہی پیمانِ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے جو امامؑ کو دستور دیا گیا تھا کہ اس گروہ کے ساتھ مبازرہ اور منازعہ نہ کریں اور اس پیمان کی مخالفت جائز نہ تھی۔[1] وہ چیز جو اس تفسیر کو ذہن سے دور کرتی ہے وہ "غیری" کی تعبیر ہے یہ چیز پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نسبت مناسب تعبیر نہیں ہے۔

دوسری تفسیر جو شارح بحرانی نے ایک احتمال کے عنوان سے ذکر کی ہے، یہ ہے کہ امامؑ فرماتے ہیں: اس سے پہلے کہ لوگ میری بیعت کریں، اعلانِ اطاعت کر دیا اور یہ ایک میثاق کی صورت میں ان کی طرف سے میری گردن پر تھا۔

اس بنا پر میرے لیے اس کے علاوہ کوئی راستہ نہ تھا کہ اٹھوں اور ان کی دعوت کو قبول کر لوں اور ان کی بیعت کو قبول کروں اور امر حکومت کے لیے قیام کروں۔[2] اس وجہ سے اوپر والا جملہ اس جملے سے ہم آہنگ ہے جو خطبۂ شقشقیہ میں آیا ہے۔

---

[1] شرح نہج البلاغہ: ابن ابی الحدید، جلد ۲ صفحہ ۲۹۶۔ محمد عبدہ معروف مصری شارح اور علامہ خوئی نے بھی تقریباً اسی معنی کو انتخاب کیا ہے۔
[2] شرح نہج البلاغہ ابن میثم بحرانی، ج ۲، ص ۹۷

www.shiabookspdf.com

"أَمَا وَالَّذِي فَلَقَ الْحَبَّةَ وَبَرَأَ النَّسَمَةَ! لَوْلَا حُضُورُ الْحَاضِرِ... لَأَلْقَيْتُ حَبْلَهَا عَلَى غَارِبِهَا"

"اُس ذات کی قسم! جس نے دانے کو شگافتہ کیا اور انسان کو پیدا کیا! اگر حاضرین میں (بیعت کے مشتاق گروہ) نہ ہوتے تو میں خلافت کی مہار اس کی پشت پر ڈال کر اس کو چھوڑ دیتا۔"

یہ تفسیر بھی صحیح نہیں ہے، اس لیے کہ لوگوں نے بیعت سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمان کی اطاعت نہ کی تھی، بلکہ بیعت کے لیے آمادگی رکھتے تھے اور کوئی میثاق وہاں وجود نہ رکھتا تھا سوائے اس کے کہ میثاق کے کوئی مجازی معنٰی مراد لے لیں۔

نکتہ

وہ پیمان جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا علی علیہ السلام سے تھا

مذکورہ بالا خطبے میں امامؑ ایک پیمان کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو آپ کے اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے درمیان تھا اور تعبیرات خطبہ سے اجمالی طور پر یہ ظاہر ہوتا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امامؑ سے ایک پیمان لیا تھا جو اپنے بعد حاکمانِ وقت کے ساتھ نرمی پر مبنی تھا۔ اگرچہ حکومت سے ہم آہنگی نہ تھی۔ بعض احادیث کے منابع میں ایک روایت امامؑ سے نقل ہوتی ہے جو اس پیمان کے مطلب کو بیان کرتی ہے۔

مرحوم سید ابن طاؤس کتاب کشف المحجّۃ میں حضرت امام علی علیہ السلام سے ایک روایت اس طرح نقل کرتے ہیں:

"وَ قَدْ كَانَ رَسُولُ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ عَهِدَ إِلَيَّ عَهْدًا، فَقَالَ: يَا بْنَ أَبِي طَالِبٍ! لَكَ وِلَاءُ أُمَّتِي. فَإِنْ وَلَّوْكَ فِي عَافِيَةٍ وَأَجْمَعُوا عَلَيْكَ بِالرِّضَا فَقُمْ بِأَمْرِهِمْ وَإِنِ اخْتَلَفُوا عَلَيْكَ فَدَعْهُمْ وَمَا هُمْ فِيهِ فَإِنَّ اللهَ سَيَجْعَلُ لَكَ مَخْرَجًا"

"پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھ سے عہد لیا تھا، انہوں نے فرمایا: اے فرزند ابو طالبؑ! تم امت کے سرپرست ہو (اور خدا کی طرف سے یہ بات طے ہے کہ) اگر لوگوں نے تیری ولایت کو قبول کیا اور سب اس پر راضی ہو گئے، تو اُن کے امور کے لیے قیام کرنا، لیکن اگر تیرے بارے میں اختلاف کیا، تو ان کو ان کے حال پر چھوڑ دینا، یہاں تک کہ خداوند متعال ایک راہ نجات تیرے لیے قرار دے گا۔"

www.shiabookspdf.com

حقیقت یہ ہے کہ کبھی انسان ایسے دوراہے پر آجاتا ہے کہ جس کے دونوں راستے اچھے نہیں ہیں، لیکن ان میں سے ایک زیادہ ناخوش گوار ہے۔ ایسے مواقع پر عقل حکم کرتی ہے کہ زیادہ خراب راستے کو چھوڑنے کے لیے انسان کو کم زحمت والے راستے کو اختیار کرنا ہوگا۔ اور یہ چیز "قاعدۂ اہم و مہم" کے نام سے مشہور ہے اور کبھی اسے "دفعِ افسد بفاسد" سے تعبیر کیا گیا ہے امیر المومنین علیہ السلام کا دستور العمل پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد اسی معنی میں تھا۔

امامؑ کے سامنے دو راستے تھے یا حکومت کو جو آپؑ کا مسلّم حق ہے اور اسلام و مسلمین کے مصالح کے لیے بہت اچھی ہے اسے چھوڑ دیں اور یا اسلام خطرے میں ڈال دیں، اس لیے کہ ظہور اسلام کے زمانے کے شکست خوردہ عرب کے جاہل گروہ گھات لگائے ایسی فرصت کے منتظر تھے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد ان کی جانشینی کے سلسلے میں بھرپور مخالف کریں اور مسلمانوں کو آپس میں لڑا کر خود وہاں سے پیچھے ہٹ جائیں اور اسلام کے قوانین کو تہس نہس کر کے حکومت اسلامی پر قبضہ جمالیں گے۔ اسی لیے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے متعلق پہلے ہی سے علی علیہ السلام کو بتا دیا تھا اور امامؑ اپنے تمام وجود سے اسلام کے عاشق تھے، لہٰذا پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مشورے پر من و عن عمل کیا۔

www.shiabookspdf.com

اڑتیسواں خطبہ

ومن کلام لہ علیہ السلام [1]

وَفِيهَا عِلَّةُ تَسْمِيَةِ الشُّبْهَةِ شُبْهَةً ثُمَّ بَيَانُ حَالِ النَّاسِ فِيهَا

اس خطبے میں شبہ کو شبہ کیوں کہا جاتا ہے، کی علت، اور اس کے بعد شبہات میں گرفتار لوگوں کے حال کو بیان کیا گیا ہے۔

خطبہ، ایک نگاہ میں

اگر اس خطبے کے مفہوم پر تھوڑا سا غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ گفتگو ایک تفصیلی بحث کا حصہ ہے جسے مرحوم سیدؒ رضیؒ نے یہاں چند جملوں میں بیان کیا ہے۔ اس گفتگو کے دو حصے ہیں جو بظاہر ایک دوسرے مربوط نہیں ہیں۔

پہلا حصہ: شبہ کے نام رکھنے کی علت اور شبہات سے نجات حاصل کرنے کے بارے میں بیان کیا گیا ہے۔

دوسرا حصہ: اس میں موت کے وقت لوگوں کا کیا حال ہوتا ہے کہ نہ وہ موت سے ڈرتے ہیں کہ اس سے نجات پائیں گے اور نہ وہ جو ہمیشہ زندہ رہنے کے خواہشمند ہیں کہ اس (خواہش) تک رسائی حاصل کریں۔ ظاہر ہے کہ دونوں کا آپس میں کوئی ربط نہیں ہے۔

نہج البلاغہ میں ایسے بہت سے قرائن ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سیدّ رضیؒ نے مولاؑ کے تمام خطبوں کو مکمل طور پر

---

[1] سند خطبہ: ان لوگوں میں سے جنہوں نے خطبۂ بالا کو نقل کیا ہے، عبدالواحد تمیمی آمدی غرر الحکم میں ہیں، لیکن جب اس پر توجہ کریں گے جو آمدی نے نقل کیا ہے اس چیز کے ساتھ جو نہج البلاغہ میں آئی ہے، جدائی رکھتا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آمدی نے اس کو نہج البلاغہ کے علاوہ کسی کتاب سے لیا ہے۔ (مصادر نہج البلاغہ، جلد ۱، صفحہ ۴۳۳)

www.shiabookspdf.com

نقل کرنے کی نہیں ٹھانی تھی۔ بلکہ وہ حصے جو فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے وسیع مفہوم رکھتے ہوں اور بلاغت کے فنون سے معمور ہوں، انہی حصوں کا انتخاب کیا اور نہج البلاغہ میں ذکر کیا۔

من کلام لہ" یا "من خطبۃ لہ' کی تعبیر میں جو "من" تبعیضیہ سے شروع ہوتا ہے، کی تعبیر بھی اس مدعا پر گواہ ہے کیوں کہ "ومن خطبتہ" یا "ومن کلماتہ" نہیں کہا ہے، جس کا مفہوم یہ ہے کہ "مولاؑ کے خطبوں میں سے ایک یا مولاؑ کے کلمات میں سے ایک یہ ہے"، بلکہ فرماتے ہیں "ومن خطبۃٍ لہ" یعنی جو یہاں آیا ہے، وہ حضرتؑ کے ایک خطبے کا ایک حصہ ہے، یا فرماتے ہیں "ومن کلام لہ" یعنی جو یہاں آیا ہے، وہ حضرتؑ کے کلام کا ایک حصہ ہے۔

بہر حال مذکورہ خطبہ شبہہ کی تفسیر اور موت کے وقت لوگوں کی حالت سے متعلق دو نکات کا خلاصہ بیان کرتا ہے، جو اس خطبے کی تشریح کے دوران آئیں گے۔

"وَ إِنَّمَا سُمِّيَتِ الشُّبْهَةُ شُبْهَةً لِأَنَّهَا تُشْبِهُ الْحَقَّ فَأَمَّا أَوْلِيَاءُ اللهِ فَضِيَاؤُهُمْ فِيهَا الْيَقِينُ وَ دَلِيلُهُمْ سَمْتُ الْهُدَى وَ أَمَّا أَعْدَاءُ اللهِ فَدُعَاؤُهُمْ فِيهَا الضَّلَالُ وَ دَلِيلُهُمُ الْعَمَى فَمَا يَنْجُو مِنَ الْمَوْتِ مَنْ خَافَهُ وَلَا يُعْطَى الْبَقَاءَ مَنْ أَحَبَّهُ"

"شبہ کو اسی لیے شبہ کہا جاتا ہے کہ وہ حق کے ساتھ شباہت رکھتا ہے، تو جو دوستانِ خدا ہوتے ہیں، ان کے لیے شبہات (کے اندھیروں) میں یقین اجالے کا اور ہدایت کی سمت رہنما کا کام دیتی ہے۔ اور جو دشمنانِ خدا ہیں وہ ان شبہات میں گمراہی کی دعوت و تبلیغ کرتے ہیں۔ اور کوری و بے بصری ان کی رہبر ہوتی ہے۔ موت وہ چیز ہے کہ ڈرنے والا اس سے چھٹکارا نہیں پا سکتا اور ہمیشہ کی زندگی چاہنے والا ہمیشہ کی زندگی حاصل نہیں کر سکتا۔"

شرح و تفسیر

شبہات میں کیا کرنا چاہیے؟

منابع کے کچھ حصوں سے معلوم ہوتا ہے کہ خطبہ کا یہ حصہ داستانِ طلحہ و زبیر اور جنگ جمل سے متعلق ہے، کیونکہ اس جنگ میں لوگوں کا ایک گروہ گرفتار شبہ ہوا اور پیمان شکنی اور حق کے خلاف قیام کا اعلان کیا۔ شبہ کے عوامل میں سے چند ایک یہ تھے کہ زوجۂ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا میدانِ جنگ میں قدم رکھنا، خلیفۂ ثالث کا قتل اور ان جیسی دیگر مثالیں تھیں۔ امامؑ یہاں شبہے سے متعلق ایک دقیق تحلیل و تجزیہ فرماتے ہیں:

www.shiabookspdf.com

"وَإِنَّمَا سُمِّيَتِ الشُّبْهَةُ شُبْهَةً لِأَنَّهَا تُشْبِهُ الْحَقَّ۔"

"شبہ کو فقط اس لیے شبہ کہا گیا ہے کہ وہ حق سے شباہت رکھتا ہے (چاہے وہ حقیقت میں باطل ہی ہو)۔"

اس سے سادہ لوح افراد کو فریب کا شکار ہونے اور شیطان صفت افراد کو حق سے فرار ہونے کے لیے عذر مل جاتا ہے۔ حقیقت میں وہ امور جو انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں پیش آتے ہیں وہ تین حالتوں سے خالی نہیں ہیں:

ا۔ کبھی "حق" بالکل صاف نظر آتا ہے۔ مثال کے طور پر جو شخص نیکی کرتا ہے اس کا نتیجہ اس کو مل جاتا ہے اور وہ شخص جو راہِ خطا پر چلے گا، پھنس جائے گا۔

اور کبھی "باطل" بالکل صاف و واضح دکھائی دیتا ہے۔ مثال کے طور پر کوئی یہ کہتا ہوا نظر آئے کہ "نظم وضبط اور قانون کے بغیر زندگی گزارنا بہتر ہے۔ اس قسم کی گفتگو کرنے والے کا باطل پر ہونا واضح ہے۔

لیکن کبھی ایسے موارد پیش آتے ہیں کہ وہ موارد پہلی قسم یعنی نہ حق کے ساتھ ہیں اور نہ دوسری قسم باطل کی طرح ہیں یہی وہ منزل ہے کہ باطل کو حق کے لباس میں پیش کیا جاتا ہے، جس کا ظاہر حق ہے اور اس کا باطن باطل اور ہمیشہ باطل لبادہ اوڑھ کر ہی لوگوں کو فریب دیا کرتا ہے یا بے بنیاد استدلال کے ذریعے باطل کو حق ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

بالکل اسی طرح سے اصحابِ جمل، امیر شام اور اس کے ساتھی جنگ کی آگ بھڑکانے کے لیے اس قسم کے بے بنیاد عذر کا سہارا لیتے تھے۔

انسانی معاشرے کی سب سے بڑی مشکل کل بھی یہی تھی اور آج بھی مشکل یہی ہے اور زمانے کے گزرنے کے ساتھ ساتھ اس میں وسعت پیدا ہوتی جارہی ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ حقوق انسانی، آزادی، قانون کا احترام، نظم وضبط اور عالمی اتحاد کی آڑ میں ظالمانہ تسلط اور بُرے اہداف کے حصول کے لیے آواز اٹھاتے ہیں۔

اس کے بعد امامؑ شبہات سے نجات حاصل کرنے کے طریقے بتاتے ہیں اور شبہات کے مقابلے میں دوستانِ خدا اور دشمنانِ خدا کی حالت کو خوبصورت عبارت میں ایسے بیان کرتے ہیں:

"فَأَمَّا أَوْلِيَاءُ اللهِ فَضِيَاؤُهُمْ فِيهَا الْيَقِينُ وَدَلِيلُهُمْ سَمْتُ[1] الْهُدٰى۔"

"لیکن دوستانِ خدا کا شبہات کے مقابلے میں (ان کی تاریکی دور کرنے کے لیے) یقین اور ان کی دلیل چراغ کا نور ہے اور ہدایت کا راستہ ہے۔"

---

[1] ۔ سَمْت۔ "راہ یا شاہراہ" کے معنی میں ہے، نیک لوگوں کے چہرے یا قیافہ کو بھی تسمیت کہا گیا ہے۔ تسمیت۔ چھینکنے والے شخص کے حق میں دعا کرنے کے معنی میں ہے، اسی مناسبت سے خدا سے اس کے لیے سلامتی کا تقاضا کیا جاتا ہے اور یہ انسان کی سلامتی کی علامت بھی ہے۔

www.shiabookspdf.com

یہ تعبیر ممکن ہے دو چیزوں میں سے ایک کی طرف کی اشارہ ہو:

پہلی: اولیاء اللہ مضامینِ وحی پر یقین رکھنے کی وجہ سے قرآن مجید اور معصوم پیشواؤں کے فرامین کی طرف رجوع کرتے ہیں اور اس نور کے ذریعے شبہات کی تاریکی کو توڑتے ہیں اور اس کی قید سے اپنے آپ کو آزاد کر لیتے ہیں۔

اس تفسیر کی بنا پر یقین سے مراد خدا اور نبوت پر ایمان کی طرف اشارہ ہے "وسمت الہدیٰ" ان ہدایتوں کی طرف اشارہ ہے جو وحی کے ذریعے انسان کو نصیب ہوتی ہیں۔ جیسے قرآن مجید فرماتا ہے:

"ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ"[1]

"اس عظیم کتاب میں شک کی کوئی گنجائش نہیں ہے جو پرہیزگاروں کی ہدایت کے لیے ہے۔"

دوسری: یقین سے مراد، حتمی تیاری اور یقینی امور سے استفادہ کرنا ہے کہ جب انسان اپنی تحلیل میں امور یقینی پر تکیہ کرے تو وہ شبہ کی گرہ کو کھول سکتا ہے اور ہدایت کی راہ پر چل سکتا ہے۔

ایک اور تعبیر کے مطابق، اولیاء، چونکہ ہوا و ہوس میں گرفتار نہیں ہوتے اور عقلِ سلیم ان کے وجود پر حاکم ہے وہ اس نور کے سائے میں شبہ کی تاریکیوں کو ختم کر لیتے ہیں اور راہِ ہدایت پر قدم رکھتے ہیں۔ اگر ان کی فکر ہوا و ہوس سے آلودہ ہو تو وہ کبھی چہرۂ حق اور شبہات کی تہوں میں چھپے ہوئے باطل کو ایک دوسرے سے تمیز نہ دے پائیں گے۔

ان دو تفسیروں میں کوئی باہمی اختلاف نہیں ہے اور مذکورہ بالا جملوں کے مفہوم میں داخل ہیں۔ ممکن ہے کہا جائے کہ آیات اور روایات میں کچھ ایسی تعبیرات ہیں جو مشتبہ اور مختلف تفسیروں کے قابل ہیں تو ایسے مرحلے میں کیا کرنا چاہیے؟

اس سوال کا جواب قرآن مجید کی روشنی میں دیا ہے اور وہ یہ کہ ایسے موارد میں، آیات اور روایات محکمات کی طرف رجوع کرنا چاہیے اور ان آیات و روایات کے سائے میں جو صراحت کے ساتھ حقائق کو بیان کرتی ہیں، موارد مشتبہ کی تفسیر کرتی ہیں اور اس الٰہی آزمائش جو آیات و روایات متشابہ کے وسیلے سے ہیں، سے سرخرو ہو کر نکلیں۔

انسانی زندگی کے معاملات بھی آیاتِ قرآن، محکمات و متشابہات کی طرح وجود رکھتی ہیں، مثال کے طور پر ہم نے اپنے ایک دوست کی ایک مشکوک حرکت دیکھی، جس کی ہم اچھی یا بری توجیہ کر سکتے ہیں، جب کہ وہ دوست سالہا سال اپنی زندگی میں نیک کاموں اور گوناگوں حوادث میں پیش پیش رہا ہے، اس کی سابق اچھی کارکردگی محکمات کا حصہ ہے اور وہ مشکوک حرکت جس کی توجیہ محکمات کے ذریعے کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے، متشابہات میں سے ہے۔ پھر آپؑ دشمنانِ خدا کی روش کی نشاندہی کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

[1] سورۂ بقرہ، آیۃ شریفہ ۲

www.shiabookspdf.com

"وَ أَمَّا أَعْدَاءُ اللهِ فَدُعَاؤُهُمْ فِيهَا الضَّلَالُ وَ دَلِيلُهُمُ الْعَمٰى"

"لیکن دشمنانِ خدا (ان کو متشابہات کی طرف دعوت دینے والے) ان کی ضلالت اور ان کے اندھا پن کے علاوہ کچھ نہیں۔"

کسی بھی راستے میں آگے بڑھنے کے لیے حرکت لازمی امر ہے۔ صحیح رہنمائی یہ ہے کہ اللہ کے دوست اور دشمنوں کا راستہ الگ ہو۔ اللہ کے دوست سوائے اللہ اور قیامت کے کسی اور پر یقین نہیں رکھتے ہیں اور رہنمائی سائے وحی و نبوت کے کسی سے نہیں لیتے ہیں حالانکہ خدا کے دشمن گمراہی کے مختلف عوامل مثلاً ہوائے نفس اور شیاطین جن و انس کے وسوسوں کا سہارا لیتے ہیں۔ دل کے اندھوں (بے ضمیروں) کی رہنمائی کے سوا کچھ نہیں رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پہلا گروہ سعادت دائمی کو حاصل کرتے ہیں:

"أَلَا إِنَّ أَوْلِيَاءَ اللهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ [1] لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَ فِي الْآخِرَةِ [2]"

"آگاہ ہو جاؤ! خدا کے دوست نہ کسی سے ڈرتے ہیں اور نہ غمگین ہوتے ہیں (جن کا ماضی و مستقبل دونوں روشن اور امید بخش ہو) دنیاوی زندگی بھی تابناک ہے اور آخرت میں بھی مسرور ہوں ہوں گے۔"

دونوں جہانوں میں وہ نور سعادت سے فیضیاب ہوں گے، حالانکہ خدا کے دشمن اس آیت کے مصداق مطابق ہیں۔:

"أَوْ كَظُلُمَاتٍ فِي بَحْرٍ لُّجِّيٍّ يَغْشَاهُ مَوْجٌ مِّن فَوْقِهِ مَوْجٌ مِّن فَوْقِهِ سَحَابٌ ۚ ظُلُمَاتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ ۚ إِذَا أَخْرَجَ يَدَهُ لَمْ يَكَدْ يَرَاهَا ۗ وَمَن لَّمْ يَجْعَلِ اللهُ لَهُ نُورًا فَمَا لَهُ مِن نُّورٍ ﴿٤٠﴾ [3]"

"یا ان کی شان اس تاریکی کی طرح ہے جو گہرے سمندر میں ہو جس پر ایک موج چھائی ہو اور اس کے اوپر بادل تہ بہ تہ اندھیرے ہی اندھیرے ہوں، جب انسان اپنا ہاتھ نکالے تو وہ اسے نظر نہ آئے اور جسے اللہ نور نہ دے تو اس کے لیے کوئی نور نہیں۔"

یہ وہ لوگ ہیں جو گمراہی و ضلالت کی موجوں اور بدبختی و شقاوت کے اندھیروں میں قدم رکھتے ہیں۔

---

[1] سورۂ یونس، آیت ۶۲

[2] سورۂ یونس، آیت ۶۴

[3] سورۂ نور، آیت ۴۰

www.shiabookspdf.com

جو کچھ امامؑ کے اس پُر مغز خطبے میں ذکر ہوا ہے، اجتماعی زندگی کے نشیب و فراز میں اس کے آثار وحشت ناک طریقے سے پھیلے ہوئے ہیں۔

اور اس کا کامل نمونہ دوسرے جملے میں "اعداء اللہ" سے مراد وہی تین گروہ ہیں، جو جنگ "جمل" و "صفین" و "نہروان" میں بے مقصد شبہات اور کمزور دلیلوں، جو تارِ عنکبوت سے کمزور تھیں، کا سہارا لے کر امامؑ سے مقابلے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے اور پیکر اسلام و مسلمین پر سنگین ضربیں لگانے کے مرتکب ہوئے ہیں۔

توجہ رہے کہ صحیح بخاری میں خلیفہ اوّل (پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک ساتھی) سے اس طرح نقل ہوا ہے کہ انہوں نے کہا کہ میں نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک حدیث سنی ہے، جو جنگ جمل کے دوران مجھے فائدہ مند ثابت ہوئی۔ قریب تھا کہ میں جنگ جمل میں شریک ہو جاتا اور امام علی علیہ السلام کے مدمقابل آجاتا اور وہ حدیث یہ تھی کہ "جب یہ خبر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پہنچی کہ کچھ ایرانی گروہوں نے کسریٰ کی بیٹی کو تخت بادشاہت پر بٹھا دیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "لَنْ يُفْلِحَ قَوْمٌ وَلَّوْا أَمْرَهُمُ امْرَأَةً" "جو قوم و ملت عورت کو اپنا حکمران بنائے وہ کبھی کامیاب نہیں ہوں گی۔" یہی وجہ تھی کہ لشکرِ جمل جس پر درحقیقت حضرت عائشہ کی حکومت تھی، اُس سے خود کو الگ رکھا۔ [1]

نکتہ

حقائق کی تحریف میں شبہے کا کردار

اگر باطل اپنے حقیقی چہرے کو ظاہر کر دے تو یہ بات کسی سے پوشیدہ نہیں رہے گی کہ بیدار انسانی ضمیریں اور مزاج انسانی اسے ہرگز قبول نہیں کریں گے۔ صرف وہی لوگ اس کی تلاش میں ہوں گے جن کے دل بیمار اور فکری طور پر منحرف ہیں۔

شبہے کی دوسری شاخ یہ ہے کہ حق کی کچھ مقدار اور باطل کی کچھ مقدار کی آمیزش ہو تو اس صورت میں باطل کا مکروہ چہرہ اس اختلاف میں چھپ جائے گا۔

ایک شاخ یہ ہے کہ باطل کو حق کے ساتھ مخلوط کیے بغیر توجیہات کے ذریعے اسے حق کا لبادہ اُڑھا کر ظاہر کیا جائے۔ جن مصائب اور برے واقعات نے افراد یا معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لیا ہے، اس مقام پر بخوبی واضح ہو سکتے ہیں۔

[1] صحیح بخاری، جلد ۶، ص ۱۰، باب کتاب النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم الی کسریٰ و قیصر۔

www.shiabookspdf.com

تاریخ انسانی شبہات اور شیطانی وسوسوں کی وجہ سے پیدا ہونے والی مشکلات سے پُر ہے، جس نے انسانوں کو اپنے دھوکے اور فریب کاریوں میں گرفتار کیا۔ حیلہ و بہانہ گروں اور فریب کاروں نے شبہات کے ایجاد کرنے کے ساتھ سادہ لوح افراد کو اپنے جال میں پھنسا دیا ہے۔

معروف جنگیں جو بصرہ، صفین اور نہروان میں واقع ہوئیں، جنہوں نے لوگوں کو موت کی وادی میں پہنچا دیا، ان لوگوں میں سادہ لوح افراد کثیر تعداد میں تھے۔ فریب کاروں نے اپنے مقاصد کے حصول کے لیے ان شبہات سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔

خلیفۂ ثالث کے قتل پر آنسو بہانے اور ان کی خون آلود قمیص لوگوں کو اکسانے کے لیے استعمال کی یہاں تک کہ جن لوگوں کے ہاتھ خلیفۂ ثالث کے خون میں رنگے ہوئے تھے، انہوں نے ہی امّ المؤمنین کو اونٹ پر سوار کر کے میدان جنگ میں دھکیلا۔ انہی مقاصد کی تکمیل کے لیے نمونے ہیں۔ قرآن کو سروں پر اٹھانا اور حکمِ قرآنی کے آگے سرِ تسلیم خم کرنے کے نعرے (لاحکم الا للہ)، ایسے شبہات تھے کہ جنہوں نے جنگِ صفین کو خطرناک نتیجے تک پہنچا دیا

اس خطرناک واقعے کا راز اُس وقت ظاہر ہوتا ہے کہ عمارؓ کی لشکرِ امامؑ میں موجودگی کو اُن کے قتل کے ثبوت کے طور پر پیش کر کے، مولا علی علیہ السلام کو اُن کا قاتل ٹھہرا گیا۔ اس طریقے سے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی معروف حدیث "یا عمّارُ! تَقْتُلُكَ الْفِئَةُ الْبَاغِيَةُ" "اے عمار! تجھے ایک باغی گروہ قتل کرے گا"، جو کہ امیر شام کے ٹولے کے فساد اور ستمگری پر واضح دلیل تھی، امیر شام کے مفاد میں، اس کی تفسیر کی۔

نہروان میں بھی ایک گروہ جو بظاہر قاریِ قرآن، تہجد گزار تھا اور جن کی پیشانیوں پر سجدوں کے نشانات تھے، لاحکم الا للہ کا نعرہ بلند کر کے شبہات کے بازار کو اس حد تک گرم کر دیا کہ غافلوں کے ایک بڑے گروہ کو موت کے منہ میں دھکیل دیا، ایسی موت کہ جس کا انجام جہنم تھا۔

آج کی پُر فریب دنیا میں حالت اس سے کہیں زیادہ بدتر ہے، بہت اچھے خوبصورت نعرے، مثلاً آزادی، انسانی مساوات، لوگوں کی حکومت، احیائے حقوق بشر، تہذیب و تمدن، اور ترقی میں پیشرفت کے دلفریب نعرے اور ان کے علاوہ بہت سے عناوین ہیں کہ جن کی آڑ میں بدترین ظلم اور بہت برے اعمال اور نفرت آمیز کام انجام دیے جاتے ہیں۔

چالیسویں اور پچاسویں خطبے میں اس بارے میں بہت لطیف تشریح کی گئی ہے۔ خدا نے چاہا تو جلد ہی تفسیر کریں گے اور کلمات قصار میں بھی حکمت ۱۹۷ میں بہت ظریف اشارہ اس مسئلے کی طرف ہوا ہے۔

-فَمَا يَنْجُوْ مِنَ الْمَوْتِ مَنْ خَافَهُ وَلَا يُعْطَى الْبَقَاءَ مَنْ-

www.shiabookspdf.com

"وہ شخص جو موت سے ڈرتا ہے، (ہرگز اس ڈر کی وجہ سے) موت سے آزادی نہ پائے گا اور وہ شخص جو بقا کو چاہتا ہے اس کو نہ دی جائے گی۔"

شرح وتفسیر

موت سے ڈرنا بے فائدہ ہے

نہج البلاغہ کے بہت سے شارحین کا خیال ہے کہ اس خطبے کا پہلے خطبے سے کوئی خاص تعلق نہیں ہے، کیوں کہ ان میں سے ہر ایک خطبہ الگ الگ مقام سے لیا ہے۔ اور مرحوم سیّد رضیؒ نے انہیں ایک خطبہ یا دو منتخب خطبوں کے عنوان سے یہاں ذکر کیا ہے۔

ہاں! البتہ ایک لحاظ سے ان دونوں کے درمیان ربط پیدا کیا جا سکتا ہے اور وہ اس طرح کہ جو لوگ شبہات کے جال میں پھنس گئے اور انکے آگے سرِ تسلیم خم کر لیا ہے، ممکن ہے وہ موت کی ڈر کی وجہ سے ہو۔ امامؑ نے آخری جملے میں فرمایا کہ موت کا خوف اس سے نجات کا باعث نہیں ہو سکتا ہے۔

بہرحال اس خطبے کا یہ حصہ دو جملوں سے مرکب ہے جو انسان کی موت اور زندگی کے خاتمے کے مسلئے سے تعلق رکھتے ہیں۔ پہلے جملے میں فرماتے ہیں:

"فَمَا يَنْجُوْ مِنَ الْمَوْتِ مَنْ خَافَهُ"

"وہ شخص جو موت سے ڈرتا ہے (وہ ہرگز اس ڈر کی وجہ سے) موت سے آزادی نہ پائے گا۔"

بلکہ یہ ڈر اور وحشت خود موت کو قریب کرنے کے اسباب میں سے ایک ہے۔ موت ایک ایسا اٹل قانون ہے جو تمام زندہ موجودات کی پیشانی پر لکھا گیا ہے، کیونکہ حیاتِ جاودانی خدا کے سوا کسی کے لیے نہیں ہے۔

سب ممکنات محدود ہیں اور آخر فانی ہوں گے، وہ جو باقی رہے گی، خدا جل شانہ کی ذاتِ پاک ازلی وابدی ہے جس کی کبریائی کے دامن پر ہرگز فنا کی گرد وغبار نہ بیٹھے گی۔ اس بنا پر موت سے ہرگز ڈر اور وحشت کے بدلے کوئی چیز ہے اور نہ بقا کے لیے ہاتھ پاؤں مارنا بقا وحیات جاودانی کا سبب ہے۔

اس بنا پر دوسرے جملے میں امامؑ فرماتے ہیں:

"وَلَا يُعْطَى الْبَقَاءَ مَنْ أَحَبَّهُ"

www.shiabookspdf.com

"اور وہ شخص جو بقا کو پسند کرتا ہے اس کو بقا نہیں دی جاتی۔"

ممکن ہے اس زندگی کا خاتمہ جلد یا بدیر ہو، لیکن بقول معروف ومشہور کوئی فائدہ نہیں آب حیات کے پیچھے بھاگنا اور اس سے ایک گھونٹ پی لینا اور ہمیشہ زندہ رہنا یہ بالکل خام خیالی اور ناممکن امر ہے۔

نکتہ

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس جہانِ ہستی میں ذات پاک پروردگار کے سوا ہر چیز آہستہ آہستہ پرانی ہوتی ہے اور راہ فنا و موت پر چلتی ہے۔

یہ سورج جو نظامِ شمسی کا سب سے بڑا سیارہ ہے اور اس کا حجم کرۂ زمین سے بارہ لاکھ گنا بڑا ہے۔ آخر کار ختم اور خاموش ہو جائے گا، کیونکہ ہر دن رات میں اس کے مادّے کی بہت بڑی مقدار انرجی میں تبدیل ہو جاتی ہے اور فضا میں بکھر جاتی ہے۔ کرۂ زمین، تمام سیارات اور کہکشاں آخر موت رکھتے ہیں۔

اصولاً تولّد (پیدا ہونا) خود ایک بہترین دلیل ہے موت پر۔ اس لیے کہ اگر کوئی چیز جاودانی ہوتی ہے تو وہ نہ تولّد رکھتی ہے نہ موت۔ اس بنا پر اگر کوئی شخص حیات جاوداں کا تصور رکھتا ہو تو یہ ایسا باطل تصور ہے جو انسانی خلقت کے بنیادی قانون کے برخلاف ہے۔

آیہ شریفہ۔ كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ۔ "ہر انسان کو موت کا مزہ چکھنا ہے۔" اور اس سے بڑھ کر آیہ۔ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ۔ "ہر چیز فانی ہے سوائے ذات پاک خدا جل شانہ کے۔" یہ ایسے عمومی مسائل میں سے ہے جس میں کوئی استثنیٰ نہیں ہے اور کوئی حکم اختصاصی وارد نہیں ہوا ہے۔ اس بنا پر موت سے ڈر ایک ایسا ڈر ہے جو بغیر دلیل ہے اور حیاتِ جاوداں کا انتظار بے معنیٰ انتظار ہے۔

جو چیز اہم ہے وہ یہ ہے کہ موت کے لیے تیار رہنا چاہیے اور اپنی زندگی سے احسن طریقے سے فائدہ اٹھانا چاہیے اور موت فقط فنا کی معنیٰ میں نہیں بلکہ ایک محدود اور چھوٹے مسافر خانے سے ایک بہت وسیع جہان جو نعمتوں سے بھرا ہوا ہے، کی طرف انتقال کے معنیٰ میں جانیں کہ اگر ہمارا عمل پاک ہوگا تو نہ موت ہمیں کوئی نقصان پہنچائے گی اور نہ اس ڈر و وحشت کی دنیا سے انتقال کوئی نقصان دے گا۔ ہاں اہم چیز ایمان اور پاک عمل ہے۔

www.shiabookspdf.com

www.shiabookspdf.com

انتالیسواں خطبہ

و من خطبة له علیه السّلام [1]

خَطَبَهَا عِنْدَ عِلْمِهِ بِغَزْوَةِ النُّعْمَانِ بْنِ بَشِيرٍ، صَاحِبِ مُعَاوِيَةَ لِعَيْنِ التَّمْرِ، وَ فِيهَا يُبْدِي عُذْرَهُ وَيَسْتَنْهِضُ النَّاسَ لِنُصْرَتِهِ"

جو معاویہ کے سردارِ لشکر نعمان بن بشیر کے عین التمر پر حملے کے وقت ارشاد فرمایا اور لوگوں کو اپنی نصرت پر آمادہ کیا۔

خطبہ ایک نگاہ میں

یہ خطبہ جس طرح اوپر اشارہ ہوا اُس وقت بیان ہوا جب نعمان ابن بشیر نے عین التمر، جو عراق کی معروف آبادیوں میں سے ایک تھا، پر حملہ کر دیا۔ امیر شام نے اس کو پہلے کہا تھا کہ ایسے حملوں سے میرا مقصد عراقی لوگوں کے دلوں میں خوف پیدا کرنا ہے۔ نعمان جو عثمانیوں میں سے تھا، اس کام کے لیے آمادہ ہوا۔ امیر شام نے دو ہزار سپاہی اس کے اختیار میں دیے اور اس کو سفارش کی کہ شہروں اور آبادیوں کے قریب نہ جائے۔ اور ایسے مراکز پر حملہ کیا جائے جہاں بہت کم سپاہی موجود ہوں اور جلدی سے حملہ کر کے واپس لوٹ آئے، اس لیے کہ ایسا نہ ہو کہ عراقی سپاہیوں کے نرغے میں پھنس جائیں۔ اور نتیجہ اُلٹ ہو جائے۔ نعمان چل پڑا اور "عین التمر" کے قریب پہنچا وہاں مالک ابن کعب (علی علیہ السلام کی طرف سے) موجود

---

[1] سندِ خطبہ: یہ خطبہ کم از کم ان تین کتابوں میں جو سید رضیؒ سے پہلے لکھی گئی ہیں، دیکھا گیا ہے۔ "الغارات" ابراہیم ابن ہلال ثقفی کی (متوفی سال ۲۸۳) اور "انساب الاشراف" جس میں بلاذری اس کا ایک حصہ لائے ہیں اور "تاریخ طبری" وہ بھی اس خطبے کے کچھ حصوں کو لائے ہے اور اسی طرح "مصادر نہج البلاغہ" جلد ا۔ صفحہ ۴۳۸ میں بھی یہ خطبہ موجود ہے۔

www.shiabookspdf.com

تھے، مالک کے ساتھ ایک ہزار سپاہی تھے، لیکن ان کو اجازت دے دی کہ کوفہ لوٹ جائیں اور اس کے پاس فقط ایک سو سپاہی باقی تھے۔

مالک جب نعمان کی آمد سے باخبر ہوا، ایک خط امام علیؑ کو لکھا اور ماجرے کی خبر دی، جس وقت خط امام علی علیہ السلام کو ملا، اپنے اصحاب سے فرمایا، "جلدی اُٹھو! اور مالک کی مدد کے لیے دوڑ پڑو، اس لیے نعمان تھوڑے شامی سپاہیوں کے ساتھ عین التمر پر حملہ آور ہوا ہے لیکن لوگوں نے دعوتِ امام کا مثبت جواب نہ دیا۔ امام علی علیہ السلام نے قبائل کے رئیسوں کو دستور دیا کہ وہ خود بھی چلیں اور اپنے قبیلے کو بھی جمع کریں۔ انھوں نے بھی کوئی مثبت کام انجام نہ دیا اور فقط تین سو (۳۰۰) یا اس سے کم افراد جمع ہوئے۔

امامؑ اس سُستی و کمزوری اور اپنے پیشوا کی دعوت کے جواب کے معاملے پر سخت برہم ہوئے اور ظاہر کیا کہ مسلمانوں اور اہل عراق کی ساری مشکل اسی جمعیت کی ضعف و کمزوری میں ہے۔ جو دشمنوں کی جسارت اور دوستوں کی ناامیدی کا سبب ہے۔ [1]

پہلا حصہ

مُنِيتُ بِمَنْ لَا يُطِيعُ إِذَا أَمَرْتُ وَ لَا يُجِيبُ إِذَا دَعَوْتُ لَا أَبَا لَكُمْ مَا تَنْتَظِرُونَ بِنَصْرِكُمْ رَبَّكُمْ أَمَا دِينٌ يَجْمَعُكُمْ وَ لَا حَمِيَّةَ تُحْمِشُكُمْ أَقُومُ فِيكُمْ مُسْتَصْرِخاً وَ أُنَادِيكُمْ مُتَغَوِّثاً فَلَا تَسْمَعُونَ لِي قَوْلًا وَ لَا تُطِيعُونَ لِي أَمْراً حَتَّى تَكَشَّفَ الْأُمُورُ عَنْ عَوَاقِبِ الْمَسَاءَةِ فَمَا يُدْرَكُ بِكُمْ ثَارٌ وَ لَا يُبْلَغُ بِكُمْ مَرَامٌ

"میں ایسے افراد میں پھنس گیا ہوں جنہیں حکم دیتا ہوں تو اطاعت نہیں کرتے ہیں اور بلاتا ہوں تو لبیک نہیں کہتے ہیں۔ خدا تمہارا برا کرے، اپنے پروردگار کی مدد کرنے میں کس چیز کا انتظار کر رہے ہو؟ کیا تمہیں جمع کرنے والا دین نہیں ہے اور کیا جوش دلانے والی غیرت نہیں ہے؟ میں تم میں کھڑا ہو کر آواز دیتا ہوں اور تمہیں مدد کے لیے بلاتا ہوں لیکن نہ میری بات سنتے ہو اور نہ میرے حکم کی اطاعت کرتے ہو۔ یہاں تک کہ حالات کے بدترین نتائج سامنے آجائیں۔ سچی بات یہ ہے کہ تمہارے ذریعہ نہ کسی خون ناحق کا بدلہ لیا جاسکتا ہے اور نہ کوئی مقصد حاصل کیا جاسکتا ہے۔"

---

[1] اقتباس مصادر نہج البلاغہ سے، جلد ا، ص ۴۳۷

www.shiabookspdf.com

شرح وتفسیر

میں نے کیوں ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا؟

جس طرح کہ اوپر اشارہ ہوا کہ یہ خطبہ اس وقت بیان ہوا جب شامی ظالموں میں سے ایک نعمان ابن بشیر کے نام سے امیر شام کی طرف سے مقرر ہوا کہ بعض عراقی علاقوں پر ایسے وحشیانہ حملے کرے، جن سے لوگوں کی ہمتیں کمزور پڑ جائیں اور امام علیؑ نے لوگوں کو اس کے ساتھ مقابلے کے لیے دعوت دی، لیکن افسوس عراقی لوگوں نے کمزوری کے اثر کو قبول کرتے ہوئے امامؑ کو مثبت جواب نہ دیا اور امامؑ نے مجبور ہو کر اس خطبے کو دو مقاصد کے لیے بیان فرمایا:

پہلا: وہ تکالیف اور مشکلات جو اس راہ سے حاصل ہوں گی اپنی طاقت سے ان کو دور کریں اور ان کی ذمے داری عراقی لوگوں کی گردنوں پر ڈالیں جو اس حد تک پہنچ چکے تھے کہ دشمن کی چھوٹی سی حرکت کے مقابلے میں بھی ضعف اور ذلت کو ظاہر کرتے تھے۔

دوسرا: شاید یہ گفتگو ان مردہ ضمیروں کو جھنجوڑ کر بیدار کر دے، تا کہ ان خطرات کو سمجھیں اور اپنی ذمے داری کو محسوس کریں، اس لیے حضرت فرماتے ہیں:

"مُنِيتُ بِمَنْ لَا يُطِيعُ إِذَا أَمَرْتُ وَلَا يُجِيبُ إِذَا دَعَوْتُ"

"میں ایسے لوگوں میں پھنس گیا ہوں جن کو جب حکم دیتا ہوں، میری اطاعت نہیں کرتے اور جس وقت ان کو بلاتا ہوں جواب نہیں دیتے۔"

یہ بات واضح ہے کہ طاقتور ترین اور مدبر ترین حاکم و مدیر جب ایسی قوم اور لوگوں میں گرفتار ہو جائے وہ کوئی کام نہیں کر سکتا اور جب ایسی قوم کو کسی نقصان کا سامنا ہو تو اُس کا ذمے دار بھی وہ ہوگا۔

اس کے بعد حضرتؑ فرماتے ہیں:

"لَا أَبَا لَكُمْ! مَا تَنْتَظِرُونَ بِنَصْرِكُمْ رَبَّكُمْ"

"اے بدنسلو! پروردگار کے آئین کی مدد کے لیے کس چیز کا انتظار کرتے ہو؟"

دشمن سے مقابلے کے تمام شرائط تم میں پائی جاتی ہیں، افرادی قوت اور وسائل بھی رکھتے ہو اور دشمن کی چالوں سے بھی آگاہ ہو اور اُن خطروں سے بھی، جو تمہیں لاحق ہیں باخبر ہو، پھر کس چیز کے منتظر ہو؟ دشمن کے ہاتھوں اپنی ذلت آمیز موت

www.shiabookspdf.com

کا تماشا دیکھنے کا انتظار کر رہے ہو؟

جملہ "لَا أَبَا لَكُمْ، اے بدنسلو" جس طرح پہلے بھی اشارہ ہوا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ گویا تم لوگوں پر باپ کی سرپرستی نہیں تھی اور خاندانی تربیت سے محروم ہو اس لیے کمزور ہو اور یا ایک قسم کی لعنت اور بددُعا ہے یعنی حضرت بددُعا کرتے ہیں کہ خداوند تمہیں باپ کی سرپرستی سے محروم کر دے اور یہ بھی ذلیل و خوار ہونے کا کنایہ ہے، اس لیے کہ جو شخص باپ کی سرپرستی سے محروم ہو گویا ذلت کا غبار اس کے سر پر پڑے گا۔ ان کو متحرک کرنے کے لیے اس بیان کو تسلسل دیتے ہیں۔

"أَمَا دِينٌ يَجْمَعُكُمْ وَلَا حَمِيَّةَ تُحْمِشُكُمْ؟[۱]

"تم لوگوں کا کوئی دین نہیں ہے جو تم کو اپنے گرد جمع کرے یا کوئی غیرت نہیں جو تمہیں جوش دلائے؟"

حقیقت میں ان دونوں میں سے ہر ایک ان کے جان لیوا درد کی دوا بن سکتے ہیں۔ اس لیے کہ ایک دین رکھنا جو ایک دوسرے کو ملانے والے حصار کی مانند ہے کہ ظاہراً مختلف رنگ و نسل کے مگر ایک ہدف اور مقصد پر جمع اور منظم کرتا ہے اور جو کسی بھی کامیابی کا راز ہے۔

جب ان کے درمیان اس قسم کا دین نہ ہو یا عملی طور پر کمزوریاں پائی جائیں تو کم از کم اجتماعی غیرت، اپنی سرزمین اور قومی دفاع اور تحفظ کا جذبہ تو ہو اور دشمن کے مقابلے میں متحد و متحرک ہوں۔

مگر افسوس کہ اُس وقت عراق اور کوفہ کے لوگ ان دونوں اصولوں سے بہرہ مند نہیں تھے، یعنی نہ کسی مضبوط دین کے تابع تھے اور نہ اجتماعی غیرت ان کے پاس تھی۔ اس قسم کے گروہ جن کے پاس مضبوط اجتماعی مرکز کا فقدان ہو، درحقیقت یہ ایک مدبر پیشوا کے لیے سب سے بڑی مشکل ہے۔ دوسرے خطبوں میں امام علیہ السلام نے کیا خوب فرمایا ہے، اسی کمزور اور منتشر گروہ کو مخاطب کیا ہے اور فرماتے ہیں:

"أُرِيدُ أَنْ أُدَاوِيَ بِكُمْ وَأَنْتُمْ دَائِي كَنَاقِشِ الشَّوْكَةِ بِالشَّوْكَةِ۔[۲]

"عجیب بات ہے میں تمھارے وسیلے سے اپنی بیماری کی دوا کرنا چاہتا ہوں اور تم لوگ خود میری بیماری ہو، اسی طرح کہ کوئی شخص کانٹے کو کانٹے کے وسیلے سے اپنے بدن سے نکالتا ہے۔"

اسی دلیل کی بنا پر امامؑ اپنی گفتگو کو تسلسل دیتے ہیں:

---

[۱] "تحمِش" "حمش" کے مادّے سے ہے۔ مقاییس اللغۃ کے کہنے کے مطابق دو معنی رکھتا ہے ایک معنی "غصے میں آنا" اور دوسرا معنی "باریکی" ہے۔ یہاں وہی پہلا معنی مراد ہے، اس لیے کہ امامؑ فرماتے ہیں "اگر تم لوگ غیرت رکھتے تو اس افسوس ناک واقعے کو سن کر غیظ و غضب میں آتے۔"

[۲] نہج البلاغہ خطبہ ۱۲۱۔

www.shiabookspdf.com

"أَقُومُ فِيكُمْ مُسْتَصْرِخًا [1] وَ أُنَادِيكُمْ مُتَغَوِّثًا [2] فَلَا تَسْمَعُونَ لِي قَوْلًا، وَ لَا تُطِيعُونَ لِي أَمْراً، حَتَّى تَكَشَّفُ الْأُمُورُ عَنْ عَوَاقِبِ الْمَسَاءَةِ [3]"

"میں تمھارے درمیان قیام کرتا ہوں اور فریاد کرتا ہوں اور دردمندانہ تم سے مدد طلب کرتا ہوں لیکن تم لوگ نہ میری بات سنتے ہو اور نہ میرے حکم کی اطاعت کرتے ہو، اس وقت تک جب تک تمھاری بداعمالی کے نتائج تم پر ظاہر ہوں۔"

کیا اس سے بڑھ کر کوئی دردناک چیز ہوگی کہ ایسا پیشوا جو آگاہ، شجاع، عادل اور تجربہ کار ہو، ایسی قوم وملت میں پھنس جائے جو مسلسل خونِ دل پیتا رہے اور فریاد کرتا رہے لیکن سننے والے کان نہ ہوں۔

ایسا صرف امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام کے ساتھ نہیں ہوا، بلکہ تاریخ کہتی ہے کہ امیرالمومنینؑ کے فرزندانِ رشید، امام حسن اور امام حسین علیہما السلام کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا گیا۔ کربلا کے خونی حادثے کے بعد جس میں امام حسین علیہ السلام اور ان کے تمام اصحابؓ شہید ہوگئے اور وہ سب ہو چکا، جو نہیں ہونا چاہیے تھا، کوفے کے لوگوں کو بڑا دھچکا لگا اور بیدار ہوئے اور پشیمان ہوئے اور توابین کے عنوان سے امام حسینؑ کے خون کا انتقام لینے کے لیے قیام کیا لیکن اس کا کیا فائدہ کام ہاتھ سے نکل چکا تھا اور اس روز جب اطراف سے بڑی دلیری سے امام حسین علیہ السلام کے نمائندے حضرت مسلم بن عقیل علیہ السلام کو گرفتار کیا، سب نے بیعت توڑ دی۔ سب اپنے گھروں میں جا چھپے اور آخر جناب مسلم بن عقیل علیہ السلام تنہا رہ گئے اور ان کے ساتھ جنگ کی اور ذلت کے ساتھ ہتھیار ڈالنے پر فخر کے ساتھ شہادت کو ترجیح دی۔ خطبے کے اس آخری حصے میں آپ نتیجہ پیش کرتے ہیں: "فَمَا يُدْرَكُ بِكُمْ ثَارٌ، وَ لَا يُبْلَغُ بِكُمْ مَرَامٌ" (تم لوگوں کے حالات دیکھتے ہوئے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ) نہ تمھارے ساتھ مل کر بے گناہوں کے خون کا انتقام لیا جا سکتا ہے اور نہ ہی تمہاری مدد سے ہدف اور مقصد حاصل ہو سکتا ہے۔

دوسرا حصہ

[1] "مستصرخ" "صرخ" کے مادے سے ہے، "بلند آواز اور فریاد کرنے" کے معنی میں ہے اور بعض ارباب لغت کہتے ہیں کہ "بلند فریاد" کے معنی میں ہے جو خوف ووحشت یا مصیبت کے وقت ہو اور اس کے وسیلے سے مدد طلب کی جائے۔

[2] "متغوث" "غوث" کے مادے سے ہے اور مصیبت کے وقت مدد کرنے کے معنی میں ہے، اس بنا پر متغوث اس شخص کو کہتے ہیں جو مصیبتوں میں دوسروں سے مدد طلب کرتا ہے۔ یہ تعبیر اور مستصرخ کی تعبیر یہ ظاہر کرتی ہے کہ امامؑ اہل کوفہ کی سستی سے مشکلات کے وقت کتنے رنجیدہ تھے۔

[3] "المساءة" "سوء" کا مصدر ہے۔ بدی اور مادی یا معنوی، دنیوی یا اخروی، بدنی یا غیر بدنی نعمتوں کو گنوا دینا کے معنی میں ہے۔

www.shiabookspdf.com

"دَعَوْتُكُمْ إِلَى نَصْرِ إِخْوَانِكُمْ فَجَرْجَرْتُمْ جَرْجَرَةَ الْجَمَلِ[1] الْأَسَرِّ[2] وَ تَثَاقَلْتُمْ تَثَاقُلَ النِّضْوِ[3] الْأَدْبَرِ[4] ثُمَّ خَرَجَ إِلَيَّ مِنْكُمْ جُنَيْدٌ[5] مُتَذَائِبٌ[6] ضَعِيفٌ كَأَنَّمَا يُسَاقُونَ إِلَى الْمَوْتِ وَ هُمْ يَنْظُرُونَ"

"میں نے تم کو تمہارے ہی بھائیوں کی مدد کے لیے پکارا، مگر تم اس اونٹ کی طرح بلبلانے لگے، جس کی ناف میں درد ہو اور اس کمزور شتر کی طرح ست پڑ گئے جس کی پشت زخمی ہو۔ اس کے بعد تم سے ایک مختصری کمزور، پریشان حال سپاہ برآمد ہوئی، اس طرح جیسے انہیں موت کی طرف دھکیلا جا رہا ہو اور یہ بے کسی سے موت کو دیکھ رہے ہوں۔"

شرح وتفسیر

کمزوروں کے ساتھ دشمن کے مقابلے میں کھڑے نہیں ہو سکتے

امامؑ نے خطبے کے اس حصے میں کوفیوں کے متعلق جو سرزنش کی ہے، دشمن کی طرف سے ایذا رسانیوں کے مقابل سستی، کاہلی اور کمزوری دکھانے پر انہیں سخت تنبیہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"دَعَوْتُكُمْ إِلَى نَصْرِ إِخْوَانِكُمْ فَجَرْجَرْتُمْ جَرْجَرَةَ الْجَمَلِ الْأَسَرِّ، وَ تَثَاقَلْتُمْ تَثَاقُلَ النِّضْوِ الْأَدْبَرِ"

"میں تم لوگوں کو اپنے بھائیوں کی مدد کے لیے (مالک ابن کعب اور ان کے دوستوں کی طرف اشارہ ہے جو "عین

---

[1] "جرجرۃ" اصل میں "ایسی آواز جو اونٹ کے گلے میں آتی جاتی ہے" کے معنی میں ہے اور بعض نے کہا ہے "جر" کے مادّے سے "کھینچنے" کے معنی میں ہے اور جب تکرار ہو تو جرجر کہا جاتا ہے۔

[2] "أسر" "سرر" کے مادّے سے ہے "ایسی مخصوص بیماری جو اونٹ کی ناف کے اطراف میں ہوتی ہے" کے معنی میں ہے اور بعض کہتے ہیں کہ ایسا درد ہے جو اونٹ کے سینے کی طرف ہو۔

[3] "نضو" مادّہ "نضو" اصل میں "کمزور و لاغر یا برہنہ ہونا" کے معنی میں ہے۔ "نضو" خطبے میں "کمزور حیوان" کے معنی میں ہے کہ کبھی اسی وصف کی خاطر اس حیوان کی پشت پر اس پر سونے کی وجہ سے زخم ہو جاتا ہے اور "أدبر" کا اس پر اطلاق ہوتا ہے۔

[4] "أدبر" مادّہ "دبر" سے "ایسا زخم جو پشت حیوان پر زین یا پالان کے دباؤ سے پیدا ہو جائے" کے معنی میں ہے اس بنا پر أدبر اس حیوان کو کہتے ہیں جو ایسے زخم میں مبتلا ہو جائے۔

[5] "جنید" اسم مصغر ہے مادّہ "جُند" سے اور "چھوٹے لشکر" کے معنی میں ہے۔

[6] "متذائب" جس طرح متن میں آیا ہے "مضطرب و پریشان" کے معنی میں ہے۔

www.shiabookspdf.com

التمر" سرزمین میں شامی ظالموں کے زد میں آ چکے تھے) دعوت دی لیکن تم لوگوں نے اس اونٹ کی طرح جو سینے کے درد میں چیختا ہے اور اس حیوانِ لاغر کی طرح جس کی پشت پر زخم ہو سستی دکھائی۔"

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ تم نے بات کرنے میں بھی اظہار ناتوانی کیا اور عمل میں بھی ایسا کام کیا کہ جو تمہاری شکست کا سبب ہوا دنیا و آخرت میں بھی اور زخمی دشمن کو اپنے سامنے دلیر کر دیا اور جس نے تمہارے جانی و مالی نقصانات میں اضافہ کر دیا۔ ان کو حیوانات کے ساتھ تشبیہ دینا ممکن ہے ان کی ضعفِ فکری اور ارادے کی کمزوری کی طرف اشارہ ہو۔ اس لیے کہ عاقل انسان کبھی بھی اپنے دشمن کو اجازت نہیں دیتا کہ ایسے دلیرانہ طریقے سے اس کے وطن پر حملہ کرے اور جہاں چاہے بغیر کسی مانع کے بڑے سے بڑا نقصان پہنچائے۔

حضرتؑ اس خطبے کے آخری جملے میں ایک چھوٹے گروہ کی طرف اشارہ فرماتے ہیں کہ جنھوں نے ان کی دعوت پر لبیک کہا، لیکن عین وقت پر خوف و وحشت نے انہیں اپنی لپیٹ میں لیا ہوا تھا جو ان کے چہروں سے نمایاں تھا، ان کے لیے فرماتے تھے:

"ثُمَّ خَرَجَ إِلَيَّ مِنْكُمْ جُنَيْدٌ مُتَذَائِبٌ ضَعِيفٌ، كَأَنَّمَا يُسَاقُونَ إِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنْظُرُونَ"

"اس کے بعد ایک چھوٹا گروہ میری طرف آیا، ایسا گروہ جو مضطرب، وحشت زدہ و کمزور تھا کہ گویا ان کو موت کی طرف لے جایا جا رہا ہو، حالاں کہ وہ موت کا اپنی آنکھوں سے نظارہ کر رہے ہیں۔"

جیسا کہ سید رضیؒ اس خطبے کے آخر میں فرماتے ہیں کہ "متذائب" مضطرب کے معنی میں آیا ہے۔ اور تذائبت الرِّیح (ہوائیں مختلف انداز میں چلیں) سے لیا گیا ہے اور بھیڑیے کو عربی زبان میں ذِئْب کہتے ہیں اس لیے کہ راہ چلتے وقت مسلسل اس طرف اور اُس طرف دوڑتا ہے۔

اس بنا پر یہ چھوٹا سا گروہ بھی ایسا گروہ نہ تھا جو "كَمْ مِنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً" کا مصداق قرار پاتا، اس پر اعتماد کیا جا سکتا، بلکہ ایک ایسا گروہ تھا جو کمزور، ڈرپوک اور مضطرب و پریشان تھا کہ گویا ان کو کسی قربان گاہ کی طرف لے جایا جا رہا ہو اور وہ اپنی موت کا اپنی آنکھوں سے نظارہ کر رہے ہوں، ایسا گروہ جن کا عدم ان کے وجود سے برتر ہے اور ان پر اعتماد کرنا شرمساری کا سبب ہے۔ کتنا دردناک ہے کہ مولا علی علیہ السلام جیسے شجاع و مدبر حاکم کو ایسے لوگوں کو جھیلنا پڑ جائے۔

سورۂ انفال میں ارشاد ہوتا ہے:

www.shiabookspdf.com

"كَأَنَّمَا يُسَاقُونَ إِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنْظُرُونَ"[1]

"گویا ان کو موت کی طرف لے جایا جارہا ہو، اور وہ موت کا اپنی آنکھوں سے نظارہ کر رہے ہوں۔"

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے کے مومنین جو انتہائی ضعیف و ڈرپوک تھے، وہ ایسے لوگ تھے جو جہاد سے فرار کے لیے مسلسل بہانے ڈھونڈتے رہتے اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ خدا کے حکم، جنگِ بدر کے بارے میں تکرار کرتے تھے۔ لیکن بدر کے واقعے نے یہ واضح کر دیا کہ وہ لوگ کس طرح ایک بے مقصد ڈر اور خوف میں گرفتار ہوئے تھے۔ اور کتنی عظیم کامیابی اس جنگ میں مسلمانوں کو حاصل ہوئی۔ عجیب بات یہ تھی کہ جنگ کے بعد وہی ڈرپوک اور بزدل لوگ غنائم کی تقسیم کے وقت اعتراض کرتے تھے۔

یہ تعبیر ممکن ہے اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ اگر یہ چھوٹا سا گروہ بھی سچے عزم اور مقاومت والا ہوتا پھر بھی وہ اپنے سے بڑے دشمن پر کامیاب ہو جاتا۔

نکتہ

دشمن کے مقابلے میں سستی کا نتیجہ

اس بنا پر کہ تعلیماتِ اسلام سب اقوام وملتوں کے ساتھ سوائے ان مواقع پر جہاں اسلام و مسلمین کے ساتھ جنگ ہو رہی ہو، جہاں عمل کی شدت واجب ہو، صلح و آشتی پر مبنی ہوں۔ اس کا نمونہ وہی چیز ہے جو اوپر والے خطبے میں اور نہج البلاغہ کے دیگر خطبوں میں امیر شام اور شامی ظالموں کے مورد میں دیکھی گئی ہے۔

امیر شام کوفی و عراقی سپاہیوں کی قوت میں کمزوری پیدا کرنے کے لیے مسلسل منصوبے بناتا تھا اور ان فکروں اور کاموں میں ایک نمایاں ترین کام اذیت دینا تھا۔ وہ ایک گروہ کو جمع کرتا تھا کہ وہ علاقہ جو حکومتِ مولا علیؑ کے زیر نظر تھا ان پر غفلت کی حالت میں حملہ کر دیں اور جو بھی ان کی شمشیر کی زد میں آئے، چاہے مرد، عورت یا بچہ ہی کیوں نہ ہو، انہیں تہہ تیغ کر دیں اور ان کے سارے اموال لوٹ لیں اور پھر تیزی کے ساتھ اپنے مرکز پر لوٹ کر آئیں۔

یہ صورت حال کئی دفعہ حکومت علی علیہ السلام کے دور میں پیش آئی اور جس وقت مولا برہم ہوتے اور اپنے لشکر کو دشمن کا تیزی سے تعاقب کرنے اور دندان شکن جواب دینے کا کہتے، وہ اس قسم کے مسائل میں لاپرواہی اور سستی دکھاتے اور جب

---

[1] سورہ انفال، آیت ۶

www.shiabookspdf.com

امامؑ ان کو بلاتے تھے تیزی سے حرکت کرنے کو کہتے تو یہ سست وکاہل افراد اپنی جگہ سے نہیں ہلتے تھے گویا دشمن کے حملوں کا ان سے کوئی تعلق نہیں۔

یہی امر سبب ہوا کہ ظالمین شام روز بہ روز دلیر ہوتے گئے اور آخر کار مولا علی علیہ السلام کی شہادت کے بعد عراق آسانی سے امیر شام کے زیر نگیں آ گیا اور امام حسن علیہ السلام اپنی منزلت ومقام کے باوجود، اس ظالم شخص کے سامنے قیام نہ کر سکے، کیونکہ اچھی اور دلیر فوج جو دشمن کے غرور کو کافور کر سکتی ہے وہ آپؑ کے پاس نہیں تھی۔

آج کل کی دنیا میں بھی یہی عمل دوہرایا جا رہا ہے یعنی اگر شروع ہی سے دشمن کی تکلیف دہ حرکات پر قابو نہ پایا گیا اور اسی انتظار میں بیٹھے رہے کہ وہ ہر طرف سے ہلا بولیں تو ہمارے بیدار ہونے سے پہلے ہی وہ اپنا کام کر چکے ہوں گے۔

نہ صرف دشمن کی ایک معمولی حرکت، خواہ فوجی ہو یا سیاسی یا تبلیغی ہو یا اقتصادی، اس کی فوراً روک تھام کریں بلکہ اس میں خود پہل کریں تا کہ دشمن کے ہاتھ حملے کا موقع نہ آئے اور وہ دفاعی پوزیشن اختیار کرنے پر مجبور ہو۔

معمولاً سست افراد جب دشمن کی حرکات کا مشاہدہ کرتے ہیں تو اپنی راحت طلبی کی وجہ سے، اس کی توجیہ کرتے ہوئے اُسے صحیح گردانتے ہیں۔ درحالیکہ ایسے مواقع میں بدگمانی پر مبنی ہیں، اس لیے کہ مقابلے میں خونخوار دشمن ہے، نہ کہ ایک آزاد انسان کہ اس کے عمل کو صحت پر محمول کیا جائے۔ خطبۂ جہاد میں ایک سبق آموز عبارت کی شرح گزر چکی ہے، اسی پر بات کو ختم کرتے ہوئے امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"أَلَا وَ إِنِّيْ قَدْ دَعَوْتُكُمْ إِلٰى قِتَالِ هٰؤُلَاءِ الْقَوْمِ لَيْلًا وَ نَهَارًا وَ سِرًّا وَ إِعْلَانًا وَ قُلْتُ لَكُمْ ،اُغْزُوْهُمْ قَبْلَ أَنْ يَغْزُوْكُمْ: فَوَاللهِ مَا غُزِيَ قَوْمٌ قَطُّ فِيْ عُقْرِ دَارِهِمْ إِلَّا ذَلُّوْا۔"[1]

"تم لوگ آگاہ ہو جاؤ! میں نے شب و روز اور مخفی وظاہر طریقوں سے تمہیں دشمنوں سے مقابلہ کرنے کے لیے بلایا اور کہا: اس سے پہلے کہ وہ تم پر حملہ آور ہوں تم ان کے ساتھ جنگ کرو۔ خدا کی قسم! وہ قوم جس کے دشمن ان کے گھروں پر حملہ کریں، وہ یقیناً ذلیل وخوار ہوگی۔"

سوال:

ممکن ہے پھر یہ سوال ایک گروہ سے متعلق ہو کہ کیوں امیر المومنینؑ نے اپنے لشکریوں سے اتنے تند و تیز لہجے میں گفتگو کی اور اس حد تک تحقیر کی؟ آیا یہ بہتر نہ تھا کہ لطف سے کام لیتے اور محبت بھرے لہجے میں اُن سے باتیں کرتے؟

اس بات کا جواب متعدد بار گزشتہ خطبوں کے ذیل میں بیان کیا ہے، اور کہا ہے کہ یہ آخری دوا اور حقیقت میں ایک

[1] نہج البلاغہ، خطبہ ۲۷

www.shiabookspdf.com

قسم کا زخم تھا، جس میں کسی چیز سے گریز نہیں کیا جاتا۔

www.shiabookspdf.com

چالیسواں خطبہ

فِي الْخَوَارِجِ لَمَّا سَمِعَ قَوْلَهُمْ "لَا حُكْمَ إِلَّا لِلّٰهِ"

خوارج کے بارے میں، جب اُن کا یہ مقولہ سنا کہ "حکم اللہ کے علاوہ کسی کا نہیں ہے۔

خطبہ، ایک نگاہ میں

اس خطبے کو امامؑ نے جنگ صفین کے بعد ارشاد فرمایا اُس وقت جب خوارج یہ الزام لگا رہے تھے کہ مسئلہ حکمیت کو کیوں قبول کیا؟ دو شخص نمائندے کے عنوان سے اصحاب امامؑ کی طرف سے اور امیر شام کے طرفداروں کی طرف سے اس بات کے لیے چنے گئے، تا کہ جنگ صفین اور خلافت مسلمین کی قسمت کے بارے میں فیصلہ کریں۔ حالاں کہ آیات قرآن مجید کے مطابق

"اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ" [1] حکمیت خدا کے لیے مخصوص ہے اور "لَا حُكْمَ اِلَّا لِلّٰهِ" کا نعرہ اسی سے اخذ کر کے آیت کا سہارا لیا جبکہ واضح طور پر غلطی ظاہر ہو چکی تھی اور اپنی تنگ نظری کی بنا پر اس برائی کو سمجھ نہ سکے۔

جس وقت امامؑ نے اس نعرے کو سنا، یہ خطبہ ارشاد فرمایا اور اس میں چار نکات کی طرف اشارہ فرمایا ہے:

پہلا نکتہ: ان کے یہ نعرہ بلند کرنے کی اصل وجہ بتاتے ہیں: "لَا حُكْمَ اِلَّا لِلّٰهِ" حق اور سچ بات ہے جو یہ بلند کر رہے ہیں مگر یہاں لوگوں کو اس جملے کے ذریعے دھوکا دے کر ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔

دوسرا نکتہ: اس خطبے کے تسلسل میں یہ سمجھایا کہ انسان ایک حاکم انسانی کا محتاج ہے۔ امامؑ اس کو واضح کرتے ہیں اور

[1] سورہ انعام، آیت ۵۷، سورہ یوسف آیات ۴۰ تا ۶۷۔

www.shiabookspdf.com

دوسری تعبیر کے مطابق حکومت کی ضرورت واہمیت کو بیان کرتے ہیں۔

تیسرا نکتہ: ایک عادل اور منصف حاکم کے وظائف بیان کرتے ہیں اور اس ساتھ دوسری چیزوں کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں۔

چوتھا نکتہ: اس خطبے کے آخری حصے میں ایک عادل اور منصف حاکم کے وجود کے نتیجے اور فائدے کو دو مختصر اور جامع جملوں میں بیان فرماتے ہیں۔

مرحوم سید رضیؒ اس خطبے کے آخر میں اسی مضمون کو دوسری روایت کے مطابق مختصر عبارت میں نقل کرتے ہیں:

قَالَ عليه السلام كَلِمَةُ حَقٍّ يُرَادُ بِهَا بَاطِلٌ نَعَمْ اِنَّهُ لَا حُكْمَ اِلَّا لِلّٰهِ وَلٰكِنَّ هٰؤُلَاءِ يَقُوْلُوْنَ لَا اِمْرَةَ اِلَّا لِلّٰهِ وَاِنَّهُ لَا بُدَّ لِلنَّاسِ مِنْ اَمِيْرٍ بَرٍّ اَوْ فَاجِرٍ يَعْمَلُ فِيْ اِمْرَتِهِ الْمُؤْمِنُ وَيَسْتَمْتِعُ فِيْهَا الْكَافِرُ وَيُبَلِّغُ اللّٰهُ فِيْهَا الْاَجَلَ وَيُجْمَعُ بِهِ الْفَيْءُ وَيُقَاتَلُ بِهِ الْعَدُوُّ وَتَأْمَنُ بِهِ السُّبُلُ وَيُؤْخَذُ بِهِ لِلضَّعِيْفِ مِنَ الْقَوِيِّ حَتّٰى يَسْتَرِيْحَ بَرٌّ وَيُسْتَرَاحَ مِنْ فَاجِرٍ۔

وَفِيْ رِوَايَةٍ اُخْرٰى اَنَّهُ عليه السلام لَمَّا سَمِعَ تَحْكِيْمَهُمْ قَالَ:

حُكْمَ اللّٰهِ اَنْتَظِرُ فِيْكُمْ وَقَالَ اَمَّا الْاِمْرَةُ الْبَرَّةُ فَيَعْمَلُ فِيْهَا التَّقِيُّ وَاَمَّا الْاِمْرَةُ الْفَاجِرَةُ فَيَتَمَتَّعُ فِيْهَا الشَّقِيُّ اِلٰى اَنْ تَنْقَطِعَ مُدَّتُهُ وَتُدْرِكَهُ مَنِيَّتُهُ۔

"یہ ایک کلمۂ حق ہے جس سے باطل معنیٰ مراد لیے گئے ہیں۔ بیشک حکم صرف اللہ کا ہے، لیکن ان لوگوں کا کہنا ہے کہ حکومت اور امارت بھی صرف اللہ کے لیے ہے حالانکہ کھلی ہوئی بات ہے کہ نظام انسانیت کے لیے ایک حاکم کا ہونا بہر حال ضروری ہے چاہے نیک کردار ہو یا فاسق، کہ حکومت کے زیر سایہ ہی مومن کو کام کرنے کا موقع مل سکتا ہے اور کافر بھی مزے اڑا سکتا ہے اور اللہ ہر چیز کو اس کی آخری حد تک پہنچا دیتا ہے اور مال غنیمت وخراج وغیرہ جمع کیا جاتا ہے اور دشمنوں سے جنگ کی جاتی ہے اور راستوں کا تحفظ کیا جاتا ہے اور طاقتور سے کمزور کا حق لیا جاتا ہے تاکہ نیک کردار انسان کو راحت ملے اور بد کردار انسان سے راحت ملے۔"

ایک روایت میں ہے کہ جب آپ کو تحکیم کی اطلاع ملی تو فرمایا:

"میں تمہارے بارے میں حکم خدا کا انتظار کر رہا ہوں۔"

پھر فرمایا:

"حکومت نیک ہوتی ہے تو متقی کو کام کرنے کا موقع ملتا ہے اور حاکم فاسق وفاجر ہوتا ہے تو بدبختوں کو مزہ اڑانے کا موقع ملتا

www.shiabookspdf.com

ہے یہاں تک کہ اس کی مدت تمام ہوجائے اور موت اسے اپنی گرفت میں لے لے۔"

شرح وتفسیر

حضرت امام علی علیہ السلام نے اس خطبے کے پہلے حصے میں لَا حُکْمَ إِلَّا لِلّٰہِ کے نعرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا"یہ بات حق ہے جس کے غلط وباطل معنی لیے گئے ہیں یا دوسری تعبیر کے مطابق یہ ایسی حق بات ہے کہ انھوں نے اس کے اصل مفہوم میں تحریف کردی ہے اور گمراہی کے راستے پر گامزن ہوئے۔

"کَلِمَةُ حَقٍّ يُرَادُ بِهَا بَاطِلٌ"۔ اس کے بعد اس بات کی وضاحت میں مختصر اور جامع جملہ بیان کرتے ہیں اور فرماتے ہیں:

"نَعَمْ إِنَّهُ لَا حُكْمَ إِلَّا لِلّٰهِ وَلٰكِنَّ هٰؤُلَاءِ يَقُوْلُوْنَ: لَا إِمْرَةَ إِلَّا لِلّٰهِ"

"جی ہاں حکم مخصوص خدا جل شانۂ کے لیے ہے، لیکن یہ گروہ کہتا ہے کہ لوگوں پر امارت اور حکمرانی کرنا صرف ذاتِ خدا سے مخصوص ہے۔"

خوارج کی بڑی غلطی یہی تھی کہ وہ"اِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلّٰهِ"کا نعرہ جو کہ قرآن سے لیا گیا تھا، کی یوں تفسیر کرتے تھے کہ ہر طرح کی"حکمیت وفیصلہ سازی"اور"حاکمیت" یعنی لوگوں پر حکمرانی کرنا خدا سے مخصوص ہے اور اسی وجہ سے انہوں نے حکمیت کے مسئلے سے اختلاف کیا اور اس کو ایک قسم کا شرک شمار کیا، اس لیے کہ غیر خدا کے لیے حکومت وفیصلے کا حق قرار دیا گیا ہے۔ یہ بات واضح ہے اگر حکمیت اور فیصلہ مخصوصِ خدا ہو تو لوگوں کے درمیان حاکم بھی خدا ہو اس بنا پر حکومت کی حقیقت ختم ہونی چاہیے اور آج کی تعبیر کے مطابق"انارکی"اور لاقانونیت اس کی جگہ لے لے اور حکومتیں اور عدالتیں بھی لوگوں کے درمیان سے اُٹھالی جائیں؟ اس لیے کہ ان محکموں میں فیصلے کرنے والے افراد انسان ہیں، خدا نہیں۔

وہ چاہتے تھے کہ اپنی سوچ کے مطابق"توحید حاکمیت اللہ" کو زندہ کریں اور شرک سے نجات پائیں، لیکن اپنی نادانی، جہالت اور تعصب کی وجہ سے انسانی معاشرے کو بدنظمی میں مبتلا کردیا، عدل وانصاف سے دور کردیا چھوٹے چھوٹے توہمات کا شکار ہوگئے کہ لفظ توحید کے لیے عدل و انصاف کی حکمرانی سے انکار کیا۔ لیکن انہوں نے دیکھا کہ ہر گروہ کے لیے حکومت اور سرپرستی لازم ہے تو اپنے باطل توہمات پر باقی رہے، کسی بھی صورت میں وہ اپنے جہل ونادانی اور تنگ نظری سے باز نہ آئے۔

لیکن خوش بختی سے ان میں سے ایک عظیم گروہ امامؑ کے بیدار کرنے والے فرامین کی وجہ سے جنگ نہروان کے

www.shiabookspdf.com

میدان میں خواب غفلت سے بیدار ہوا اور توبہ کی اور اپنے افکار کی بے وقعتی کو سمجھ گئے۔

بہر حال امامؑ اس خطبے میں اس نکتے پر تاکید کرتے ہیں کہ بغیر کسی شک کے حاکم اور قانون نافذ کرنے والا ہی شریعت اور احکام خدا کو اصل حالت میں نافذ کرنے والا ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ لوگوں پر حاکمیت اور فیصلے کی اجازت بھی اسی سے صادر ہوتی ہے۔ لیکن اس معنی میں نہیں ہے کہ خداوندا خود عدالت میں حاضر ہو اور لوگوں کے درمیان فیصلہ کرے، لوگوں کے اوپر حکومت کے کام کو اپنے ہاتھ میں لے اور مثال کے طور پر صدر، بادشاہ، اور وزیر اعلیٰ، گورنر کا کام کرے یا اپنے فرشتوں کو آسمانوں سے اس کام کے لیے مبعوث کرے۔

یہ بات لغو اور غیر منطقی ہے کہ ہر وہ شخص جو تھوڑا سا بھی شعور رکھتا ہو اس کو اپنی زبان پر جاری نہیں کرتا لیکن افسوس کہ ضدی و نادان خوارج اس بات کے طرفدار تھے اور اسی وجہ سے حضرت علیؑ کی مخالفت کی، اور کہا کہ مسئلہ حکمیت کو کیوں قبول کیا؟

نہج البلاغہ کے بعض شارحین کہتے ہیں: خوارج کا دعویٰ تھا کہ حکمیت خود الٰہی اجازت چاہتی ہے اور قرآن میں اس معنیٰ کی صراحت ہو، حالاں کہ قرآن نے اجازت کسی شخص کو نہیں دی ہے اور شاید اس دلیل کی بناء پر بزرگانِ اسلام [1] نے حکمیت سے متعلق اس آیت کے ذریعے خوارج کے خیالات کی نفی کی ہے جو خاندانی اختلافات سے مربوط ہے۔ قرآن میں ارشاد ہوتا ہے:

"وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا ۚ اِنْ يُّرِيْدَآ اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا خَبِيْرًا ۝" [2]

"اور جب ان دونوں (زن و شوہر) کے درمیان جدائی کا خوف ہو تو ایک حاکم (فیصلہ کرنے والا) شوہر کے خاندان سے اور ایک حاکم زوجہ کے خاندان سے انتخاب کیجیے اگر وہ دو حاکم اصلاح کا ارادہ رکھتے ہوں، خداوند ان کو ان کے درمیان موافقت کی مدد و توفیق عطا کرتا ہے کیونکہ خداوند کریم واقف و آگاہ ہے۔"

جب اس طرح کے چھوٹے موٹے مسائل پیش آئیں جو محدود پیغامات رکھتے ہوں۔ انصاف کے طریقے کے ساتھ ان کو حل کرنا چاہیں تو وہ کام جو اہم ہیں اگر ان میں اختلاف باقی رہے جو اجتماعی زندگی کو خراب کرے اور ہر چیز کو درہم

---

[1] علامہ خوئی نے جلد ۴ میں، شرح نہج البلاغہ، ص ۱۸۳ میں اس معنی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ تاریخ کامل ابن اثیر سے استفادہ ہوتا ہے کہ ابن عباسؓ نے بھی خوارج کے سامنے اسی آیت مبارکہ سے دلیل دی۔ کامل ابن اثیر، جلد ۳، صفحہ ۳۲۷

[2] سورۂ نسا، آیت ۳۵۔

www.shiabookspdf.com

برہم کرے، کیا اس کو حکمیت سے حل نہیں کرنا چاہیے؟

اور اس دلیل بنا پر کچھ لوگ معتقد ہیں کہ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام اصل مسئلہ حکمیت سے متعلق کسی خاص مطلب کے حصول کی خاطر مخالف نہ تھے، بلکہ حکم کے لیے معین شخص کے مخالف تھے اور اس کی سخت مخالفت کی۔ بہر حال امامؑ اپنے بیان کے تسلسل میں تشکیل حکومت کی ضرورت کو واضح فرماتے ہیں، اس لیے کہ پہلے بھی اشارہ کیا گیا کہ خوارج نے نہ فقط مسئلہ حکمیت کی صفین میں مخالفت کی، بلکہ لزوم حکومت پر بھی اعتراض کر دیا اور کہا: کسی امام و حکمران کی کوئی ضرورت نہیں ہے، لیکن جب مجبور ہو گئے اپنی تشکیل میں تو "عبداللہ ابن وہب راسبی" کو سرپرست منتخب کر دیا اور خود عملاً اپنے اس فضول دعوے سے پھر گئے[1]۔ اس وقت امامؑ اپنی اس بات کے اثبات کے لیے کچھ دلائل کو مختصر اور جامع عبارت میں بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"وَإِنَّهُ لَابُدَّ لِلنَّاسِ مِنْ أَمِيرٍ بَرٍّ أَوْ فَاجِرٍ"

"یقیناً لوگ ایک امیر کے محتاج ہیں، چاہے وہ نیکوکار ہو یا بدکار" (اگر ان کو نیک حاکم کی پیروی نصیب نہ ہو تو حکومت کے نہ ہونے سے فاجر امیر کا وجود بھی بہتر ہے)۔

اس کے بعد حکومت کے سات فائدوں اور برکتوں اور آثار کی طرف اشارہ کرتے ہیں جن سے بعض معنوی اور بعض مادّی مفاد وابستہ ہیں:

پہلا: "يَعْمَلُ فِي إِمْرَتِهِ[2] الْمُؤْمِنُ"[3] "اس کی حکومت کے سائے میں مومن اپنے کام کو تسلسل کے ساتھ انجام دیتا ہے (اور اپنی راہ کو مقام قرب الٰہی میں جاری رکھتا ہے)

دوسرا: "وَيَسْتَمْتِعُ فِيهَا الْكَافِرُ"۔ "کافر بھی اس کی حکومت میں (مادّی چیزوں سے) بہرہ مند ہوتا ہے (اور وہ اپنی مادی زندگی گزارتا ہے)

تیسرا: "وَيُبَلِّغُ اللهُ فِيهَا الْأَجَلَ" "خداوند لوگوں کو فرصت دیتا ہے کہ اپنی عادی زندگی کو اختتام تک (نسبی

---

[1] شرح نہج البلاغہ، ابن ابی الحدید، جلد ۲، صفحہ ۳۰۸

[2] "اِمْرَة" "عِبْرَة" کے وزن پر یا تو مصدر ہے یا اسم مصدر۔ یہ لفظ "أمر" کے مادّے سے ہے جو کہ حکم دینے کے معنیٰ میں آتا ہے اور کبھی حکومت کرنے معنیٰ میں آتا ہے اور امرۃ کا لفظ یہاں حکومت کے معنیٰ میں ہے۔

[3] واضح ہے کہ "اِمْرَتِهِ" میں جو ضمیر ہے وہ امیر مطلق کی طرف رجوع کرتی ہے چاہے وہ نیک ہو یا بد اور اس طرح "فیھا" والی ضمیر امیر مطلق امارت کی طرف لوٹتی ہے۔ بعض شارحین نہج البلاغہ نے پہلی کو نیک امارت کی طرف اور دوسری کو امارت فاجر کی طرف یا دونوں کو امارت فاجر کی طرف لوٹایا ہے جو بالکل ظاہر کلام کے مخالف ہے۔

www.shiabookspdf.com

سلامتی میں) طے کریں۔

چوتھا: "وَ يُجْمَعُ بِهِ الْفَيْءُ"[1] اس کے وسیلے سے اموالِ بیت المال جمع ہوتے ہیں۔ (دفاعی وعمرانی وانتظامی اخراجات فراہم ہوتے ہیں)

پانچواں: "وَيُقَاتَلُ بِهِ الْعَدُوُّ" اس کی مدد سے دشمنوں سے مقابلے ہوتا ہے۔

چھٹا: "وَ تَأْمَنُ بِهِ السُّبُلُ" اس کے ذریعے راستے پُرامن وامان ہوجاتے ہیں۔

ساتواں: "وَ يُؤْخَذُ بِهِ لِلضَّعِيفِ مِنَ الْقَوِيِّ" اور حکومت کی مدد سے ستمگروں سے کمزوروں کا حق چھینا جاتا ہے۔

ان سات وظائف کے انجام پانے کے سائے میں "حَتَّى يَسْتَرِيحَ بَرٌّ وَ يُسْتَرَاحَ مِنْ فَاجِرٍ" نیکوکار لوگ عمدہ زندگی گزاریں گے اور بدکاروں کے ہاتھوں سے محفوظ رہیں گے۔

سیاسی دنیا کی تاریخ سے واضح ہے کہ ماضی میں وہ یہاں تک کہ آج بھی کچھ لوگ ہیں کہ جو حکومت وحاکیت کی نفی کے طرفدار ہیں۔ اور ہم ان کی کمزور دلیلوں کی طرف آئندہ بحث میں اشارہ کریں گے، خوارج بھی ایسے کمزور فکر کی طرفداری کرتے تھے۔ تاریخ نے ان کو جواب دیا ہے؟ اس لیے کہ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے یا سنا ہے کہ ایک حکومت کا شیرازہ جب بکھر تا جاتا ہے اور لوگ چند روز یا چند گھنٹوں کے لیے بغیر حکومت کے شرائط میں ہوتے ہیں تو، بدمعاش اور ظالم لوگ جو ہر جگہ ہوتے ہیں لوگوں کے اموال اور ناموس پر حملہ کردیتے ہیں، دکانوں اور مراکز تجارت کو فوراً لوٹ لیتے ہیں، ناموس تجاوز کا شکار ہوتی ہیں۔ اور بے گناہوں کا خون بہایا جاتا ہے، راستے بے امن ہوجاتے ہیں اور تمام مثبت اجتماعی سرگرمیاں رک جاتی ہیں۔ دشمن ہر طرف سے اس ملک پر حملہ کرتے ہیں، بیت المال لوٹ لیا جاتا ہے، نہ مومن امان میں ہوتا ہے نہ کافر، نہ فقط حقدار کو اپنا حق نہیں ملتا بلکہ سب کے حقوق پامال ہوجاتے ہیں۔ نہ کوئی سکون سے رہتا ہے نہ چین سے۔

بے شک صحیح زندگی گزارنے کے لیے پہلی اور اہم ترین شرط امن وامان اور نظم وضبط ہے۔ اس کے بعد طاقتور افراد کا وجود جو خارجی دشمنوں کے مقابلے اور زیادہ حق لینے والے داخلی افراد کے لیے مانع ہے۔ اس لیے کہ یہ بھی بغیر کسی حکومتی نظام کے بیت المال اور بعض عمومی اموال کو جمع کیے بغیر ممکن نہیں ہے۔

امامؑ نے اپنی جامع گفتگو میں ان سب نکات کی طرف اشارہ کیا ہے، اور بے حکومتی کے طرفداروں کی کمزور منطق کو بطور کلی باطل کیا ہے۔

---

[1] "فَيْءٌ" یہاں اس کے معنی بیت المال کے اموال ہیں، اس بارے میں خطبہ ۳۴ میں تفصیلی بحث گزر چکی ہے۔

www.shiabookspdf.com

سوال: یہاں پر ایک سوال ابھرتا ہے کہ اوپر والے ساتوں وظائف کی انجام دہی عادل، صالح و نیک حاکم سے تو مسلّم ہے لیکن آیا امیر فاجر و ظالم بھی ان وظائف کو انجام دے سکتا ہے؟ جبکہ کلام امامؑ میں یہ وظائف دونوں کے لیے بیان کیے گئے ہیں۔ ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ دونوں ان کے بجالانے کی طاقت رکھتے ہیں۔

جواب: اس سوال کے جواب میں اس نکتے کی طرف توجہ دینی چاہیے امیر عادل و نیکوکار یقیناً ان وظائف کو انجام دے گا، لیکن فاجر بطور کامل تو نہیں، لیکن نسبتاً جی ہاں! یہ کام انجام دے سکتا ہے، کیونکہ وہ اپنی حکومت قائم رکھنے کے لیے اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں رکھتا کہ نظم کی رعایت کرے، خارجی دشمنوں سے مقابلہ کرے، راستوں کو پُرامن بنائے اور نسبت کے اعتبار سے ظالموں کے ظلم کو ختم کرے، اگرچہ وہ خود ظالموں میں سے ایک ظالم ہے۔ بصورت دیگر لوگ اس کے خلاف کھڑے ہو جائیں گے اور دشمن اس پر مسلط ہو جائیں گے اور اس کی حکومت فوراً ختم ہو جائے گی۔ اس بنا پر اکثر ظالم حکومتیں بھی کوشش کرتی ہیں کہ مذکورہ سات امور کی کسی حد تک رعایت کریں۔ جو کچھ اوپر کہا گیا اس سے یہ نتیجہ بخوبی نکالا جا سکتا ہے کہ جو حکومت بھی مذکورہ امور میں سستی کرے گی حقیقت میں وہ اپنے وجودی فلسفے کو بُھلا چکی ہے۔

سوال: مذکورہ عبارت میں امامؑ نے کیوں مومن و کافر کے درمیان فرق رکھا ہے، مومن کے بارے میں فرماتے ہیں "یَعْمَلُ" اور کافر کے بارے میں فرماتے ہیں "یَسْتَمْتِعُ"؟

جواب: اس سوال کا جواب یہ ہے کہ مومن کا ہدف دنیاوی زندگی میں وسائل سے زیادہ لطف اندوز ہونا نہیں ہے بلکہ اس کا اصل ہدف رضائے خدا اور خوشنودی خدا کو حاصل کرنا ہے اور اگر وہ زندگی کے مزے لوٹ بھی رہا ہے تو وہ اس کی اصلی نہیں بلکہ طبیعی ضرورت ہے۔ جبکہ کافر و بے ایمان شخص نہ فقط رضائے خدا کی قربت کی کوشش نہیں کرتا، بلکہ فقط وہ چاہتا ہے کہ جتنا ہو سکتا ہے مادّی وسائل سے فائدہ اٹھائے۔ چاہے وہ حرام طریقے سے ہی کیوں نہ ہو۔ اس لیے امامؑ فرماتے ہیں: تشکیل حکومت سے ہر ایک اپنے ہدف کو پالیتا ہے۔ اس صورت میں کہ اگر حکومت ہی نہ ہو، سب چیزیں ختم ہو جائیں گی، نہ مومن عمل خالص انجام دے سکتا ہے اور نہ کافر آرام والی زندگی گزار سکتا ہے۔ یہ گفتگو مذکورہ گفتگو سے تھوڑی مختلف ہے، فرماتے ہیں کہ امام علیہ السلام نے جس وقت ان کی "تحکیم" (لَا حُكْمَ إِلَّا لِلّٰهِ) کے بارے میں سنا تو فرمایا: "حُكْمَ اللّٰهِ أَنْتَظِرُ فِيكُمْ" "جی ہاں! میں تمھارے بارے میں حکم الٰہی کے انتظار میں ہوں۔"

یہ جملہ ممکن ہے اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ امامؑ نے ان کی اپنی بات سے اقتباس کیا اور فرمایا، یہ جو تم کہہ رہے ہو حکم صرف خدا کا ہے، تمہاری خاطر اسی حکم الٰہی کا انتظار کر رہا ہوں کہ وہ تمہاری تنگ نظری کی وجہ سے مسلمانوں کی صفوں میں شگاف پیدا کرنے پر دردناک سزا دے۔ یا اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ میں تمہارے انتظار میں ہوں کہ تمہیں اتمام حجت

www.shiabookspdf.com

ہو اور تمھاری تنگ نظری اور گمراہی سے متعلق حکم جاری کرسکوں ۔ مرحوم سیّد رضیؒ مزید کہتے ہیں : اس روایت کے مطابق امامؑ فرماتے ہیں:

"أَمَّا الإِمْرَةُ الْبَرَّةُ فَيَعْمَلُ فِيهَا التَّقِيُّ، وَ أَمَّا الإِمْرَةُ الْفَاجِرَةُ فَيَتَمَتَّعُ فِيهَا الشَّقِيُّ، إِلَى أَنْ تَنْقَطِعَ مُدَّتُهُ وَ تُدْرِكَهُ مَنِيَّتُهُ"

"نیک حاکم کی حکومت میں پرہیز گار شخص اپنے وظیفے کو صحیح طریقے سے انجام دیتا ہے اور بدکار حاکم کی حکومت میں ظالم اور بد بخت شخص فائدہ اٹھاتا ہے یہاں تک کہ وہ وقت آ پہنچے اور موت آئے۔"

لیکن اس بات کی جانب توجہ کرتے ہوئے کہ مولاؑ کی مذکورہ گفتگو کا مفہوم یہ ہے کہ نیکوکاروں کی حکومت میں کفّار مباح لذّتوں سے بھی محروم ہوں گے اور فاجر کی حکومت میں مومنین کو کسی قسم کا سکون اور آرام میسّر نہیں آئے گا (یہ اس مقصد کے خلاف ہے کہ جس کی خاطر یہ خطبہ بیان ہوا کہ حکومت بہر صورت ضروری ہے)، پہلی روایت صحیح تر اور دقیق تر ہے۔

شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید میں ایک مطلب آیا ہے، جو پہلے جملے "حُكْمَ اللهِ أَنْتَظِرُ فِيكُمْ" کے مطلب کو واضح کرنے میں بہت اچھا معاون ہے اور وہ یہ ہے کہ "جس وقت حضرت علی علیہ السلام صفین سے پلٹے اور کوفہ آئے خوارج "حروراء" صحرا (جو کوفہ کے نزدیک ہے) میں جمع ہوئے اور یکے بعد دیگرے امام علیہ السلام کے پاس آئے (اور نا مناسب الفاظ کہے اور واپس لوٹے) اُس وقت ان میں سے ایک خدمتِ امام علیہ السلام میں مسجد میں آیا اور اس حال میں کہ حضرتؑ کے گرد لوگ جمع تھے اس نے فریاد کی "لَا حُكْمَ إِلَّا لِلّٰهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ" اور اس تعبیر سے اصحابِ حضرتؑ پر شرک کا الزام لگایا، سب لوگوں نے اس کی طرف دیکھا، اس نے پھر فریاد کی "لَا حُكْمَ إِلَّا لِلّٰهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُتَلَفِّتُوْنَ" یہاں اس نے ان لوگوں پر جو اسے دیکھ رہے تھے، شرک کی تہمت لگائی۔

امام علی علیہ السلام نے اپنا سر بلند کیا اور اس کو دیکھا، وہ شخص بہت بے شرم تھا اس نے پھر فریاد کی "لَا حُكْمَ إِلَّا لِلّٰهِ وَ لَوْ كَرِهَ اَبُوْ حَسَنٍ" یہاں امام علی علیہ السلام پر حکم خدا کی مخالفت کی تہمت لگائی، امامؑ نے فرمایا، ابوالحسن (علی ابن ابی طالب) حکم خدا کی مخالفت نہیں کرتا، میں خصوصاً تمہارے بارے میں حکم خدا کا منتظر ہوں۔ (خدا کی طرف سے حساب، یا مومنین کے زریعے حساب ہونا)

یہاں پر لوگوں نے کہا، یا امیر المومنین علیہ السلام کیوں اس گروہ (جسور اور بے منطق) کی نابودی کا ارادہ نہیں کرتے؟ امامؑ نے فرمایا: یہ ہرگز نابود نہ ہوں گے، یہ اپنے آباواجداد کے صلب اور ماؤں کے رحمیں روز قیامت تک ہونگے۔ (اگر ان کا

www.shiabookspdf.com

ایک گروہ ختم ہوگا تو دوسرا گروہ اسی بے دلیل، تعصب آمیز اور منطق و عقل سے دور طرزِ فکر میں ان کا جانشین ہوگا) [1] کیسی حکیمانہ باتیں ہیں؟ (روحی لہ الفداء)

نکات

ا۔تحریف کی آفت

فقط خوارج نہ تھے جنھوں نے اپنے برے مقاصد تک رسائی حاصل کرنے کے لیے حقائق کی تحریف کی اور آیات الٰہی کی تفسیر بالرائے سے فائدہ حاصل کیا، بلکہ اگر آغاز سے اب تک تاریخ بشریت پر اجمالی نگاہ ڈالی جائے تو ظالموں اور گمراہ لوگوں کی جانب سے اعلان حقائق کی تحریف نظر آتی ہے۔

ایک گروہ آیات الٰہی یا انبیاءؑ و بزرگان کے اقوال کو جن کے مقابلے میں سب لوگ خاضع تھے، اپنی مرضی کے مطابق تفسیر و تحریف کرتا تھا اور اس کام کے پیچھے دو ہدف تھے، کبھی سادہ و جاہل لوگوں کو فریب دینا اور کبھی اپنے ضمیر کو فریب سے ہمکنار کرنا۔

قرآن مجید میں سورۂ بقرہ، طٰہٰ اور دیگر سورتوں کی آیات میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مقابل نمرود اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابل فرعون کی باتوں پر اگر غور کریں تو انہوں نے بھی اکثر یہی روش اختیار کی ہے۔

بات حق کی کرتے تھے اور باطل کا ارادہ کرتے تھے، تاکہ اپنے دوستوں کی آنکھوں میں دھول جھونکیں اور لوگوں کو فریب دیں۔ آج کی دنیا میں یہی انداز بڑے پیمانے پر اختیار کیا گیا ہے۔

مختلف الفاظ مثلاً آزادی، عظمتِ انسان، حقوقِ بشر، تہذیب و تمدنِ انسانی، دہشتگردی سے جنگ اور ان کے علاوہ بہت سارے الفاظ و کلمات حق ہیں جو غالباً آج کل ہمارے اس وقت کے ظالم اور جابر حاکموں کی زبانوں پر جاری ہوتے ہیں، لیکن ان سے ارادۂ باطل کرتے ہیں، اور ان میں جو بھی تحریفِ حقائق اور شیطانی توجیہات میں زیادہ مہارت رکھتا ہے وہ اپنے ناجائز مقاصد تک رسائی حاصل کرنے میں زیادہ کامیاب ہے، یہاں تک کہ قوم و ملت کے علمائے الٰہی اور باایمان دانشمندوں کی ذمہ داری بہت بھاری ہو جاتی ہے، انہیں چاہیے کہ لوگوں کو لازمی طور پر علم و آگاہی دیں اور عمومی آگاہی کی سطح کو بلند کریں تاکہ ظالم حکماء اور ظالم گروہ کلمات حق بول کر باطل ارادہ نہ کر سکیں اور اپنی خود غرض حکومتوں کی بنیادوں کو مستحکم نہ کر سکیں۔

---

[1] شرح نہج البلاغہ، ابن ابی الحدید، جلد ۲، ص ۳۱۰

www.shiabookspdf.com

۲۔ تشکیل حکومت کی ضرورت

ان مسائل میں سے جو کبھی کبھی علمی حلقوں میں موردِ گفتگو ہوتے ہیں، حالاں کہ میدانِ عمل میں کسی شک و شبے کی گنجائش نہ تھی اور نہ ہے۔ پوری تاریخ میں کسی بھی زمانے یا کسی بھی جگہ لوگوں کو حکومت کی ضرورت رہی ہے۔ طول تاریخ میں انسان ہر زمانے میں اور ہر مقام پر ایک حکومت والے تھے، چاہے حکومت قبیلے کے سردار کی ہو، خاندانی بزرگ کی ہو، امیرِ شہر کی ہو، یا بادشاہوں کی حکومت ہو یا آج کل کی حکومتیں جنہوں نے عوامی حکومت کی شکل اختیار کی ہوئی ہے۔

یہ دلیل بھی واضح ہے، کیوں کہ ایک معاشرہ چھوٹا ہو یا بڑا امن، حفظ حقوق، لوگوں کے آپس میں جھگڑے وفسادات کی روک تھام کا محتاج ہے اور جب تک کوئی حاکم اور قابل لوگ امورِ مملکت کی نظارت نہیں کریں گے یہ معاملات درست نہیں ہوں گے۔

آج یہ مسئلہ بہت زیادہ ابھر کر سامنے آ گیا ہے، اس لیے کہ اجتماعی طور پر سرگرمیوں کی ضرورت ہے، خواہ وہ علمی، اقتصادی، یا سیاسی ہوں۔ اگر حکومتوں کی مکمل نظارت ان پر نہ ہو تو ہر چیز ختم ہو جائے گی۔ نہ فرہنگ رہے گی نہ اقتصاد اور نہ امن لہٰذا ان امور کے لیے حکومتوں کی طرف سے بڑی دقیق منصوبہ بندی کی ضرورت ہے۔ اگر چہ ان کا نفاذ لوگوں کے ہاتھوں میں ہی ہو۔

لیکن ماضی میں اور اسی طرح آج کے زمانے میں کچھ ایسے لوگ ہیں جو "بے حکومتی" اور نئے اصلاح میں "فوضی" یعنی افراتفری اور "انارکی" کے حامی ہیں کہتے ہیں کہ لوگوں کے امور بغیر حاکم کے انجام پذیر ہوں اور حکومت کے وجود کی کیا ضرورت ہے؟ یا مارکس ازم کے حامیوں کے کہنے کے مطابق حکومتیں طبقاتی منافع کے حفاظت کے لیے وجود میں آئی ہیں، اور حافظان منافع سرمایہ دار لوگ ہیں، جب طبقاتی نظام ہی نہ رہے گا، حکومت کے وجود کا فلسفہ خود بہ خود ختم ہو جائے گا، اور پھر حکومت کی کوئی ضرورت نہیں۔ وہ معتقد ہیں کہ گزشتہ قومیں بھی اسی حالت پر تھیں۔

لیکن نہ مارکسی اور نہ کوئی اور ہرگز اس کام کا کوئی عملی ثبوت پیش کر سکے۔ وہ یہ بھلا چکے ہیں کہ حکومت کا م بالفرض جو باتیں انہوں نے کیں اگر تسلیم بھی کریں، فقط طبقاتی مفادات کا تحفظ نہیں، بلکہ ایک بڑی اجتماعی منصوبہ بندی کے سلسلے کا ہونا لازم کیا ہے جو سب سے مربوط ہو، مثلاً تربیتی امور تمام طبقات کے لوگوں کے لیے لازم ہیں آیا بغیر کسی منصوبہ بندی اور فردی مدیریت کے تربیتی امور یا کوئی دوسرا نام اس کام کے لیے امکان پذیر ہے؟

معاشرے کے اقتصادی مسائل میں، زرعی میدان ہو یا گلہ بانی یا صنعت ہو، ان میں ہر ایک منصوبہ بندی کا خواہاں ہے جس میں مدیریت کے لیے کسی وزیر یا دوسرے کے بغیر اس کا نفاذ کرنا ممکن نہیں ہے، صحت کے مسائل اور لوگوں کے عمومی

www.shiabookspdf.com

علاج ومعالجے کے لیے بھی زبردست قسم کی منصوبہ بندی کی ضرورت ہے، اس کے لیے ایک قابل منتظم کا ہونا ضروری ہے جو ان تمام کاموں کی نگرانی کرے۔ ہر معاشرے میں لڑائی جھگڑے اور فساد کا عنصر موجود ہے کہ کسی طرح ایک دوسرے کو اصلی حق کی ملکیت سے محروم کرے، کیوں کہ ٹکراؤ صرف مالی مسائل سے مربوط نہیں ہے بلکہ دیگر امور میں بھی یہ عنصر موجود ہے۔ لوگوں کے تنازعات کے حل کے لیے عدالتیں اور جج صاحبان طبیعی طور پر موجود ہوں، یہاں بھی مدیر کی ضرورت ہے۔ یہ تمام چیزیں مل کر ایک حکومت کو تشکیل دیتی ہیں اور جو اس مجموعے کی نگرانی کرتا ہے اسے وزیر اعظم، صدر کہا جاتا ہے۔

بنابراین ساری اقوام عالم میں اتنے اختلافات کے باوجود اعتقادی وفکری سلیقوں کے حوالے سے حکومتیں سب ایک دوسرے کی طرفداری کرتے ہیں اور جنہیں وہ "انارکزم" کے سربراہ کہتے ہیں وہ فقط باتوں کی حد تک ہی ہوتا ہے اور عملی طور پر اس کا کوئی وجود نہیں ہوتا اور نہ اس کا کوئی اثر دیکھا گیا ہے۔

اسی چیز کی مولا امیر المومنین علیہ السلام نے اس مختصر وجامع خطبے میں نشاندہی فرمائی اور حکومت کے تمام وظائف کو سات جملوں میں معین کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"سُلْطَانٌ ظَلُوْمٌ خَيْرٌ مِنْ فِتْنَةٍ تَدُوْمُ." [1]

"مسلسل فتنہ وبدامنی سے ایک ظالم حاکم کا وجود بہتر ہے۔"

وہ اس لیے کہ ظالم وجابر حکومتیں بھی اپنے مفادات کی حفاظت کے لیے امنیت وعدالت کی رعایت کرنے پر مجبور ہیں۔ اگر چہ وہ خود لوگوں پر ظلم کرتے ہیں لیکن کم از کم یہ اجازت نہیں دیں گے لوگ ایک دوسرے پر ظلم کریں، کوئی بھی حکومت خواہ عادل، یا ظالم، بدنظمی کی صورت میں حکومت پر قائم نہیں رہ سکتی اور جلد ہی ختم ہو جائے گی۔ اسی لیے تمام حکومتیں مصر رہتی ہیں کہ لوگوں کو ہرج ومرج سے روکیں اور اس قوم کی بہبود آبادی وامنیت ودفع دشمنان کے لیے منصوبہ بندی کریں اگر چہ ناقص ہی ہوں۔ اس سلسلے میں ایک معروف حدیث:

"أَلْمُلْكُ يَبْقىٰ مَعَ الْكُفْرِ وَلَا يَبْقىٰ مَعَ الظُّلْمِ"

"حکومت کفر کے ساتھ تو باقی رہ سکتی ہے مگر ظلم کے ساتھ باقی نہیں رہ سکتی۔"

ممکن ہے یہ بھی ایک اشارہ ہو اس مذکورہ معنیٰ کی طرف یا کم از کم اس معنیٰ کی ایک تفسیر ہو۔

ابن ابی الحدید کی غلطی

---

[1] میزان الحکمۃ، جلد ۱، ص ۹۸

www.shiabookspdf.com

ابن ابی الحدید اس خطبے کی شرح کے شروع میں کہتا ہے:

"امام علیہ السلام کی یہ گفتگو نصبِ امام کے وجوب پر نصِ صریح ہے جبکہ یہ مسئلہ لوگوں کے درمیان موردِ اختلاف رہا ہے، متکلمین (علمائے عقائد) میں سے ایک گروہ نے فرمایا: امامت وحکومت واجب ہے، صرف ابوبکر اصم (جو معتزلہ کے قدیم علماء میں سے ہیں) نے کہا ہے کہ اگر امت انصاف کی رعایت کرے اور ایک دوسرے پر ظلم نہ کرے تو کسی حکومت وامامت کی ضرورت نہیں۔

ابن ابی الحدید اس کے بعد کہتا ہے کہ "حقیقت میں ابوبکر اصم کی بات میں باقی افراد کی بات کے مخالفت نہیں ہے، اس لیے کہ حکومت کے بغیر عدالت کی رعایت اور اس کا نفاذ ایک فرضی شے ہے، جس کا ظاہر میں کوئی وجود نہیں پایا جاتا۔

موصوف بات کو جاری رکھتے ہوئے کہتا ہے کہ ظاہراً خطبے میں امامؑ کی گفتگو ایک ایسی چیز کی مانند ہے جو علمائے معتزلہ کا نظریہ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ: امامت کے معنی دنیاوی مصلحتوں کے پیش نظر مکلفین پر حکومت کرنا عقلی طور پر واجب ہے۔ اور وہ امور جو امامؑ نے اس خطبے میں جن کی طرف اشارہ کیا ہے، وہ سب مصالح دنیوی سے ہیں۔

پھر اس کے بعد وہ خود اپنے اوپر اعتراض کرتے ہوئے کہتا ہے کہ تم کہتے ہو، تمام علمائے اسلام معتقد ہیں کہ نصب امام واجب اور لازم ہے (ایک گروہ کہتا ہے امام کا نصب کرنا خدا پر لازم ہے اور ایک گروہ اسے امت کی ذمہ داری سمجھتے ہیں) تو امیرالمومنینؑ اس خطبے میں کس طرح خوارج سے نقل کرتے ہیں کہ وہ نصبِ امیر کو لازم نہیں سمجھتے تھے؟

اس کے بعد وہ جواب دیتے ہوئے کہتا ہے کہ خوارج نے ابتدائی دنوں میں ایسی باتیں کی تھیں اور وہ اس پر اعتقاد بھی رکھتے تھے کہ امام کے وجود کی ضرورت نہیں ہے لیکن بعد میں وہ لوگ اس عقیدے سے پھر گئے اور "عبداللہ ابن وھب راسبی" کو (امام) امیر کے طور پر چن لیا۔"[1]

ابن ابی الحدید نے یہاں جو غلطی کی ہے وہ سات امور ہیں جنہیں مولا علی علیہ السلام نے امیر اور رہنما کے چناؤ کے لیے معین فرمایا تھا مگر ابن ابی الحدید نے انہیں مادّی مصلحتوں کے لیے کافی سمجھا ہے۔

جب کہ جملہ "يَعْمَلُ فِي إِمْرَتِهِ الْمُؤْمِنُ" مسائل معنوی سے تعلق رکھتا ہے اس لیے کہ مومن کا عمل خدائی افعال سے تعلق رکھتا ہے۔

بہر حال! بالفرض کہ یہ سارے امور مادّی مصالح سے تعلق رکھتے ہیں، پھر بھی امام معصومؑ کا فرمان لوگوں پر امارت و حکومت کے عنوان سے تعلق رکھتا ہے، جو امام معصومؑ کے وجود کے عناصر میں سے ایک ہے۔ اس لیے کہ مکتب اہلِ بیتؑ کے

[1] شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید، جلد ۲، ص ۳۰۸

www.shiabookspdf.com

علماء اور متکلمین کے عقیدے کے مطابق، امامؑ وہ ہستی ہے جو امورِ دین و دنیا پر حاکم ہے اور راہِ خدا کی طرف ہدایت کرتا ہے، تفسیرِ قرآن اور دین کے احکام کو بیان کرنے والا ہے، اس کے اعمال و اقوال اللہ کی طرف سے قطعی سند شمار ہوتے ہیں اور اسی دلیل کی بنا پر اس کا معصوم ہونا ثابت ہے۔ اور یہ واضح ہے کہ معصوم کو خدا کے سوا کوئی نہیں جان سکتا اور اسی وجہ سے معتقد ہیں کہ امام کا معین کرنا خداوند متعال کی ذمے داری ہے۔

شارحینِ نہج البلاغہ کی ایک جماعت نے ابن ابی الحدید کی باتوں کا ایسے جواب دیا ہے کہ یہ خطبہ مسئلہ نصب امیر سے تعلق رکھتا ہے اور خدا کی طرف سے نصبِ امام سے کوئی ربط نہیں اور اسی لیے فرماتے ہیں **لَا بُدَّ لِلنَّاسِ مِنْ اَمِيْرٍ بَرٍّ اَوْ فَاجِرٍ** اور ہم جانتے ہیں کہ فاجر امیر امام نہیں ہو سکتا، لیکن واضح ترین جواب وہی ہے جو ہم نے ذکر کیا ہے کہ امارت امام کی ذمے داریوں میں سے ایک ہے۔

اس بات پر گواہ وہ نظریہ ہے جو ہمارے متکلمین عقاید کی کتب میں مصالح دنیاوی کی خاطر نصب امام کے واجب ہونے کے سلسلے میں دلائل بیان کرتے وقت اور وہ جو اس خطبے میں ہے اسے بھی ذکر کیا ہے۔

دوسری تعبیر کے مطابق: شیعہ حضرات معتقد ہیں کہ امارت امامت سے جدا نہیں ہے اور امیرِ فاجر کو تسلیم کرنا، امام معصوم تک دست رسی نہ ہونے کی بنا پر ہے، نہ کہ بہ عنوان ہدف و مطلوبِ اصلی۔

www.shiabookspdf.com

www.shiabookspdf.com

اکتالیسواں خطبہ

ومن خطبة له علیه السّلام [1]

وَفِيهَا يَنْهَىٰ عَنِ الْغَدْرِ وَيُحَذِّرُ مِنْهُ

اس میں امامؑ نے وعدہ شکنی سے روکا ہے۔

خطبہ، ایک نگاہ میں

درحقیقت امامؑ نے اس خطبے میں تین اہم نکات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ پہلا یہ کہ آپ وعدہ پورا کرنے، سچ بولنے اور راست گوئی کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہیں اور وعدہ شکنوں کو سخت ملامت کرتے ہیں۔

دوسرا یہ کہ جیسا کہ یہ عہد شکن اپنے زعم باطل میں خیال کرتے ہیں، اس کے برعکس چالاکی، مکاری اور جھوٹ بولنا ہوش منداور زیرک ہونے کی ہرگز دلیل نہیں ہے۔ ہوش منداور ذہین انسان وہ ہے جو ہر جگہ اور ہر موقع پر اپنے وعدوں اور قول کا پابند رہے اور انہیں ہر قیمت پر نبھائے۔

تیسرے نکتے میں آپ اس زندگی کی فرصت کو امر الٰہی کے نفاذ اور اپنے عہد و پیان پورے کرنے جیسے بلند مقاصد میں صرف کرنے اور اس سے بہرہ مند ہونے کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہیں۔

---

[1] یہ خطبہ "ابن طلحہ شافعی" کی "مطالب السئول" سے لیا گیا ہے۔ اگرچہ یہ درست ہے کہ ابن طلحہ شافعی سیّد رضی کے بعد کے زمانے کے ہیں لیکن ابن طلحہ کا طرز روایت یہ نشاندہی کرتا ہے کہ انہیں یہ خطبہ نہج البلاغہ کے علاوہ کسی دوسرے ذریعے سے حاصل ہوا ہے۔ "جاحظ" نے بھی اپنے رسالہ "معاش و معاد" میں اس خطبے کا اقتباس دیا ہے۔ "الصدق والوفاء توأمان"۔ اس سے بھی نشاندہی ہوتی ہے کہ جاحظ نے یہ خطبہ کسی ایسی کتاب سے نقل کیا ہے جو سیّد رضی سے پہلے لکھی گئی تھی (کیوں کہ جاحظ تیسری صدی کے شروع میں حیات تھے جب کہ سیّد رضی چوتھی صدی کے اواخر کے علماء میں سے ہیں)

www.shiabookspdf.com

اَيُّهَا النَّاسُ اِنَّ الْوَفَاءَ تَوْاَمُ الصِّدْقِ وَلَا اَعْلَمُ جُنَّةً اَوْقَى مِنْهُ وَمَا يَغْدِرُ مَنْ عَلِمَ كَيْفَ الْمَرْجِعُ وَلَقَدْ اَصْبَحْنَا فِي زَمَانٍ قَدِ اتَّخَذَ اَكْثَرُ اَهْلِهِ الْغَدْرَ كَيْساً وَنَسَبَهُمْ اَهْلُ الْجَهْلِ فِيهِ اِلَى حُسْنِ الْحِيلَةِ مَا لَهُمْ قَاتَلَهُمُ اللهُ قَدْ يَرَى الْحُوَّلُ الْقُلَّبُ وَجْهَ الْحِيلَةِ وَدُونَهَا مَانِعٌ مِنْ اَمْرِ اللهِ وَنَهْيِهِ فَيَدَعُهَا رَاْيَ عَيْنٍ بَعْدَ الْقُدْرَةِ عَلَيْهَا وَيَنْتَهِزُ فُرْصَتَهَا مَنْ لَا حَرِيجَةَ لَهُ فِي الدِّينِ۔

"اے لوگو! وعدہ وفا کرنا حق گوئی کا ہمزاد ہے (اور یہ دونوں کبھی جدا نہیں ہو سکتے) اور میرے علم میں حفاظت کے لیے اس سے بہتر اور برتر سپر نہیں ہے۔ ایسا شخص جو اپنی بازگشت (معاد) سے آگاہ ہے کبھی وعدہ خلافی نہیں کرتا۔ لیکن ہم ایک ایسے زمانے میں زندگی بسر کر رہے ہیں جب اکثریت خیانت اور وعدہ شکنی کو ذہانت اور عقل مندی شمار کرتی ہے اور جاہل اور بے خبر افراد انہیں عاقل اور مدبر تصور کرتے ہیں۔ ان کا کیا علاج کیا جائے خدا انہیں غارت کرے۔ ایسا ہوتا ہے کہ بعض افراد جو صاحب علم بھی ہوتے ہیں اور تجربہ کار بھی اور مکر و فریب کی ہر ترکیب اور طریقے سے بخوبی آشنا بھی ہوتے ہیں، لیکن فرمان الٰہی اور ان افعال و اعمال کی شرعی ممانعت ان کے سدراہ ہو جاتی ہے اور وہ یہ سب کچھ کرنے کی قدرت رکھنے کے باوجود اس سے خود کو باز رکھتے ہیں۔ لیکن ایسے افراد جو گناہ اور دینی احکامات کی پروا نہیں کرتے ایسے مواقع سے فائدہ اٹھا لیتے ہیں۔"

(اور ایسے کام کر گزرتے ہیں جو خلاف شرع ہوتے ہیں لیکن سطحی فکر و نظر کے حامل افراد اسے بہترین تدبیر و سیاست سمجھتے ہیں)

شرح و تفسیر

اگرچہ نہج البلاغہ کے مفسرین نے، جہاں تک ہماری معلومات ہیں، اس خطبے کے ارشاد کے بیان کرنے کی کوئی وجہ بیان نہیں کی ہے، لیکن اس کا تعلق ۳۵ویں خطبے سے ضرور ہے اور دوسرے قرائن سے بھی یہ نشاندہی ہوتی ہے کہ یہ بھی جنگ صفین اور مسئلہ حکمین سے متعلق ہے، کیونکہ حکمین کے افسوس ناک واقعے کے بعد یہ مسئلہ مسلمانوں کے درمیان مورد بحث بنا ہوا تھا اور شاید ایک سادہ لوح اور کم فہم گروہ ایسا تھا جو عمرو بن عاص کی خیانت، مکر اور عہد شکنی کو اس کی ہوشیاری اور عقل مندی کی دلیل قرار دینے لگا تھا اور اس بات کے پیش نظر کہ کہیں یہ فکر لوگوں کے لیے باعث کشش نہ بن جائے اور انہیں اس قسم کے غیر انسانی اور غیر اسلامی کاموں پر مائل نہ کر دے، امامؑ نے حفظ ما تقدم کے طور پر ان افعال کی روک تھام کے لیے یہ خطبہ ارشاد فرمایا اور مکاری، چالاکی اور عہد شکنی کی شدید مذمت کرتے ہوئے ان کے برے نتائج کی طرف اشارہ کیا ہے اور ان کے مقابلے میں ایفائے عہد اور قول و فعل کی سچائی کی مدح و ستائش کی ہے۔

اس خطبے کے پہلے حصے میں امامؑ تمام لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

www.shiabookspdf.com

"أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّ الْوَفَاءَ تَوْأَمُ [1] الصِّدْقِ"

"اے لوگو وفائے عہد راست گوئی کا ہمزاد ہے۔" (اور یہ دونوں کبھی جدا نہیں ہو سکتے)

"تَوْأَمٌ" کے معنی ہمزاد کے ہوتے ہیں جبکہ "تَوْأَمَانِ" جڑواں بچوں کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اور جب دو چیزیں ایک دوسرے سے جڑی ہوئی اور مربوط ہوں تو وہاں بھی یہ اصطلاح استعمال کی جاتی ہے اور امامؑ نے اس جگہ دو صفات (ایفائے عہد اور صداقت) کو دو جڑواں بچوں سے تشبیہ دی ہے کیونکہ ان میں ایک دوسرے سے گہری شباہت اور ظاہری اور باطنی رابطہ موجود ہے۔

اس مفہوم پر گہری فکر سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ان دونوں صفات روحی اور فکری کا سرچشمہ ایک ہی ہے اور ایک ہی مطلب کے حامل ہیں۔ وفا یعنی اپنے عہد و پیمان کو پورا کرنا درحقیقت صداقت اور راست گوئی ہی کی ایک نوع ہے۔ اسی طرح صداقت اور راست گوئی ادائیگی حق سے وفا کرنا ہے۔

ایک وسیع معنی میں صرف گفتار کی درستی اور سچائی نہیں ہے، بلکہ اس میں عمل کی سچائی بھی شامل ہے، جیسا کہ قرآن مجید میں بھی ارشاد ہوتا ہے:

"مِنَ الْمُؤْمِنِينَ رِجَالٌ صَدَقُوا مَا عَاهَدُوا اللَّهَ عَلَيْهِ" [2]

"مومنین میں ایسے لوگ ہیں جنہوں نے خدا سے جو عہد کیا تھا، اس پر صادق رہے۔"

ظاہر ہے کہ یہاں "صدقِ عہد" سے مراد "صدقِ عمل" ہی ہے جس کی دلیل میں اس آیت کے بعد ارشاد ہوتا ہے

"فَمِنْهُمْ مَنْ قَضَىٰ نَحْبَهُ وَمِنْهُمْ مَنْ يَنْتَظِرُ"

"ان میں سے کچھ ایسے ہیں جنہوں نے اپنا عہد پورا کر دیا (اور راہ خدا میں شہادت کی منزل حاصل کر لی) اور کچھ ایسے ہیں جو اپنا عہد پورا کرنے کے منتظر ہیں۔"

یہ درست ہے کہ عموماً صدق کے معنی گفتاری کی راستی اور سچائی ہی کے لیے جاتے ہیں۔ لیکن اس کے وسیع معنی قول و فعل دونوں کی صداقت پر مشتمل ہوتے ہیں اور اسی سے وفا اور صدق کا رابطہ روشن ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک شخص یہ عہد کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میں فلاں کام انجام دوں گا پھر جب وہ عہد شکنی کا مرتکب ہوتا ہے تو وہ حقیقتاً جھوٹ کا ارتکاب کرتا ہے

---

[1] "توأم" بعض ارباب لغت کے نزدیک مادۂ "وئام" سے موافقت کے معنی میں آیا ہے جب کہ دوسرے جیسے صاحب مقاییس "تاء" کو اصلی سمجھتے ہیں اور "إتئام" (باب افعال) کو جڑواں بچے پیدا ہونے کے معنی میں ذکر کیا ہے اور ہر حال میں معمولاً وسیع کے معنی میں جو لفظ دو چیزوں میں مقارنت و شباہت کے لیے آتا ہو، استعمال کیا جاتا ہے اور ہم نے بھی اسی لیے ہمزاد کے معنی میں تفسیر کی جو فارسی میں ایک خاص و عام وسیع مفہوم رکھتا ہے۔

[2] سورۂ احزاب، آیت ۲۳

www.shiabookspdf.com

اور عہد شکن شخص کو جھوٹا شخص کہا جا سکتا ہے اور صداقت کا حُسن اور جھوٹ کی بدصورتی اور عیب ہر شخص پر واضح ہے، اسی لیے امامؑ نے ایفائے عہد اور عہد شکنی کو صدق اور دروغ کے برابر قرار دیا ہے، تا کہ ان کا حُسن وقبح زیادہ واضح ہو جائے۔

اس کے بعد ایفائے عہد کے مثبت اثرات پر گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"وَلَا أَعْلَمُ جُنَّةً [1] أَوْقَى مِنْهُ"

"انسانی حفاظت کے لیے ایفائے عہد اور صداقت سے افضل اور بہتر کوئی چیز میرے علم میں نہیں۔"

یہ درحقیقت ایفائے عہد کے اہم ترین اثرات وبرکات میں سے ایک ہے جسے امامؑ نے مضبوط ترین سپر قرار دیا ہے، کیوں کہ اجتماعی زندگی کی اساس انسانوں کا ایک دوسرے پر اعتماد اور باہمی تعاون اور معاہدوں اور قراردادوں پر مکمل عملدرآمد خواہ ان کی نوعیت انفرادی ہو یا اجتماعی، پر ہوتی ہے اگر یہ متزلزل ہو جائے تو کوئی ایسی چیز نہیں جو اس کی جگہ لے سکے۔ دوسرے الفاظ میں اگر باہمی اعتماد موجود ہو تو دوسری چیزوں کی کمی پوری کی جاسکتی ہے لیکن اگر باہمی اعتماد اٹھ جائے تو پھر کوئی سرمایہ کام نہیں آ سکتا۔

اصولاً دین کی اصل واساس کی تشکیل ہی عہد و پیان کے ایفا سے ہوتی ہے ایفائے عہد و پیان کے سائے میں رحمت الٰہی کی بارشیں ہوتی ہیں اور اُس کی بخششوں اور برکات کا تمام انسانی معاشروں پر نزول ہوتا ہے اور بلائیں اور مصیبتیں ٹل جاتی ہیں۔ حدیث نبویؐ میں ارشاد ہوتا ہے:

"لَا دِيْنَ لِمَنْ لَّا عَهْدَ لَهٗ" [2]

"جو شخص اپنے عہد کا پابند نہیں اس کا کوئی دین نہیں۔"

اور ایک دوسری حدیث میں ارشاد ہوتا ہے:

"إِذَا نَقَضُوا الْعَهْدَ سَلَّطَ اللهُ عَلَيْهِمْ عَدُوَّهُمْ [3]"

"جب لوگ عہد شکنی کرتے ہیں تو اللہ ان پر ان کے دشمنوں کو مسلط کر دیتا ہے۔"

---

[1] جُنَّةٌ (بروزن قُصہ) سپر (ڈھال) کے معنی میں، اور در اصل مادہ جِنّ (بروزن فَنّ) ڈھانپنے کے معنی میں آیا ہے اور پاگل کو مجنون کہتے ہیں، اور اسی لیے گویا اس کے عقل پر پردے آچکے ہیں اور باغ کو جنت کہتے ہیں اس لیے کہ اس کی زمین درختوں کی وجہ سے چھپی رہتی ہے اور جنین کو جنین بھی اس لیے کہتے ہیں وہ شکم مادر میں چھپا ہوا ہے اور اطلاق جن موجودات میں سے ایک گروہ کو اس خاطر کہتے ہیں کہ وہ مخفی ہیں اور سپر کو جنّہ کہا جاتا ہے اس لیے کہ انسان کو دشمن کے خطرناک اسلحے سے بچانے کے لیے چھپاتے ہیں۔

[2] کتاب نوادر راوندی، ص ۵

[3] بحار الانوار، جلد ۹۷، ص ۴۶

یہ نکتہ قابل غور ہے کہ "جُنَّةٌ" ڈھال یا سپر کے معنی میں ایک ایسا وسیلہ ہے جو میدان جنگ میں دشمن کے حملے کے مقابلے میں دفاع کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ وفا کو ڈھال یا سپر سے تشبیہ دینے میں یہ حقیقت پوشیدہ ہے کہ معاشرے کے اجتماعی خطرات اور انتشارات جو بدنظمی، عہد شکنی اور قانون شکنی کے بطن سے جنم لیتے ہیں، عہد و پیمان کی پابندی سے ختم کیے جا سکتے ہیں۔

اس کے بعد امامؑ ایفائے عہد کے معنوی اور اخروی فوائد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"وَمَا يَغْدِرُ مَنْ عَلِمَ كَيْفَ الْمَرْجِعُ"

"جو شخص قیامت کی ہولناکیوں سے واقف ہے وہ کبھی عہد شکنی نہیں کر سکتا۔"

یہ وہی چیز ہے جس کی طرف امیرالمومنینؑ نے اپنے ایک دوسرے خطبے میں بھی اشارہ کیا ہے، فرماتے ہیں:

"وَلَوْلَا كَرَاهِيَةُ الْغَدْرِ لَكُنْتُ مِنْ أَدْهَى النَّاسِ! وَلٰكِنْ كُلُّ غُدَرَةٍ فُجَرَةٌ وَكُلُّ فُجَرَةٍ كُفَرَةٌ وَلِكُلِّ غَادِرٍ لِوَاءٌ يُعْرَفُ بِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ[1]"

"اگر میں عہد شکنی، فریب اور مکاری سے بیزار نہ ہوتا تو سب سے بڑا سیاستدان ہوتا لیکن ہر عہد شکن اور فریب کار گنہگار ہوتا ہے اور ہر گنہگار کافر ہوتا ہے (کفر اس معنی میں کہ گنہگار احکام الٰہی سے روگردانی کرتا ہے) اور ہر غدار اور مکار انسان کے ساتھ قیامت میں ایک علم ہوگا جس سے اس کی شناخت ہوگی۔"

اور جب کوئی معاشرہ صحیح اور حقیقی اخلاقی اصولوں سے انحراف کا عادی ہو جاتا ہے تو وہاں اخلاقی اقدار بے وقعت ہو جاتی ہیں اور انجام کار یہاں تک ہوتا ہے کہ عہد شکنی، دغابازی، فریب اور مکاری جیسی شیطانی صفات کو ذہانت اور ہوشیاری اور مصلحت اندیشی کا نام دے دیا جاتا ہے اور ایفائے عہد کرنے والے کو احمق اور سادہ لوح سمجھا جانے لگتا ہے۔ امامؑ اپنی گفتگو میں اس مسئلے پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں:

"وَلَقَدْ أَصْبَحْنَا فِي زَمَانٍ قَدِ اتَّخَذَ أَكْثَرُ أَهْلِهِ الْغَدْرَ كَيْساً[2] وَنَسَبَهُمْ أَهْلُ الْجَهْلِ فِيهِ إِلَى حُسْنِ الْحِيلَةِ"

"ہم ایک ایسے زمانے میں زندگی گزار رہے ہیں کہ جہاں اکثریت خیانت اور عہد شکنی کو فراست، عقل اور ذہانت

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ ۲۰۰

[2] "کیس" اور "کیاست" چالاکی و ہوشیاری کے معنی میں ہے اور کیس بوزنی سید عاقل و ہوشیار کے معنی میں ہے اور ابن فارس کے کہنے کے مطابق کیس جب لباس یا کیسہ کو اس نام سے اس لیے یاد کرتے ہیں کہ اشیاء اس کے اندر جمع ہوتی ہے، جس طرح باہوش انسان اپنے فکر میں مختلف مسائل کو جمع کرتا ہے اور ہر ایک کا حل ڈھونڈ نکالتا ہے۔

www.shiabookspdf.com

شمار کرتی ہے اور جہلاء اور کم عقل لوگ اس قسم کے شاطر اور مکار افراد کو عقلمند اور دانشور سمجھتے ہیں۔“

جی ہاں! اگر کسی معاشرے میں نیکی اور بدی کی قیمت کا معیار دگرگوں ہو جائے تو پھر ایسی ہی بدعات ظہور پذیر ہونے میں زیادہ وقت نہیں لگتا۔ ان معاشروں میں معروف منکر بن جاتا ہے اور منکر معروف بن جاتا ہے۔ بدی کے دیو فرشتے نظر آتے ہیں اور فرشتے شیطان کے نمائندے۔

انتہائی افسوس کا مقام ہے کہ یہ صورتحال آج کے دور میں بھی واضح طور پر موجود ہے کہ آج بھی سیاست عالم پر عہد شکن، مکار اور چالباز افراد ذہین اور دانشور سیاستدانوں کی شکل میں حکمران ہیں اور وہ لوگ جو ایمان اور حقیقی انسانی اقدار کے محافظ اور اپنے عہد و پیمان کو پورا کرنے کے پابند ہوتے ہیں، بے وقوف، سادہ لوح اور ناتجربہ کار کہلاتے ہیں۔ ایسے زمانے میں زندہ رہنا اور سانس لینا بھی کتنا دشوار گزار امر ہے؟

ممکن ہے کہ ایک قلیل مدت اور عرصے کے لیے عہد شکنی اور مکاری کسی شخص کے لیے سودمند ثابت ہو اور وہ سیاست میں کامیاب ہو جائے۔ لیکن یہ یقینی امر ہے کہ ایک طویل مدت میں یہ شیرازہ بکھر جائے گا۔ یہ درست ہے کہ اپنے الفاظ سے پھر جانے والا فرد کچھ مواقع پر مادی فوائد سے بہرہ مند ہو جاتا ہے لیکن جیسے ہی اس کی یہ فطرت لوگوں پر روشن ہوتی ہے تو وہ مادی طور پر بھی تباہی کا شکار ہو جاتا ہے اور بربادی کے گرداب میں پھنس جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے بے ایمان اور کسی قید و بند کا احترام نہ کرنے والے افراد بھی اپنے طویل المدت منافع کے حصول کے لیے اپنے کاروباری معاملات میں امانت اور باہمی قراردادوں کا احترام کرتے ہیں۔ خصوصاً اقتصادی عہد ناموں میں جہاں غیروں کے ساتھ کاروباری شراکت کرنی پڑتی ہے وہاں اس چیز اور اصول کی پابندی سختی سے کی جاتی ہے تاکہ دوسروں کا اعتماد حاصل کر کے اپنے منافع کو بڑھایا جا سکے۔

اسی دلیل کی بنا پر اسلامی روایات میں بیان ہوا ہے:

"اَلْاَمَانَةُ تَجْلِبُ الْغِنٰى وَالْخِيَانَةُ تَجْلِبُ الْفَقْرَ"[1]

"امانت داری غنا اور خوشحالی کی ضامن ہوتی ہے اور خیانت فقیری اور تنگدستی کا سرچشمہ ہے۔"

یہ درست ہے کہ امانت داری اور وفائے عہد کے دو الگ مفہوم ہیں لیکن اگر غائر نظر سے مطالعہ کیا جائے تو دونوں میں ایک گہرا ربط نظر آتا ہے اور ہر اہم موقع پر یہ دونوں ایک دوسرے سے استفادہ کرتے ہیں، اسی لیے امیرالمومنینؑ نے ایک حدیث میں فرمایا ہے:

---

[1] بحارالانوار، جلد ۷۲، ص ۱۱۴

www.shiabookspdf.com

"اَلْاَمَانَةُ وَالْوَفَاءُ صِدْقُ الْاَفْعَالِ" [۱]

"امانت داری اور وفائے عہد افعال کی صداقت ہیں۔"

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے ایک صحابی عبدالرحمن بن سیابہ کہتے ہیں:

"جب میرے والد اس دنیا سے رخصت ہوئے تو میری مشکلات بے انتہا بڑھ گئیں، ایسے موقع پر میرے والد کے کچھ دوستوں نے میرے دستگیری کی اور مجھے مدد فراہم کی اس کے بعد میں حج بیت اللہ سے مشرف ہوا اور امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپؑ فرمایا:

"میں چاہتا ہوں کہ تجھے کچھ نصیحت کروں۔"

میں نے عرض کی:

"میں آپ پر فدا ہو جاؤں حکم کیجیے میں اطاعت کروں گا۔"

فرمایا:

"عَلَيْكَ بِصِدْقِ الْحَدِيْثِ وَ اَدَاءِ الْاَمَانَةِ تَشْرَكُ النَّاسَ فِيْ اَمْوَالِهِمْ هٰكَذَا- وَ جَمَعَ بَيْنَ اَصَابِعِهٖ- قَالَ فَحَفِظْتُ ذٰلِكَ عَنْهُ فَزَكَّيْتُ ثَلَاثَمِأَةَ اَلْفِ دِرْهَمٍ"

"تیرے اوپر لازم ہے کہ ہمیشہ سچ بولے اور امانت داری پر قائم رہ تاکہ اس طرح تو دوسروں کی املاک میں شریک ہو جائے (امامؑ نے یہ جملہ کہا) اور آپؑ نے اپنی دو انگلیوں کو اس طرح ملایا کہ ان میں فاصلہ نہ رہا۔" (اس سے امامؑ کا اشارہ اس طرف تھا کہ تو اس طرح لوگوں کے مال میں شریک ہو جائے گا)

عبدالرحمٰن کہتے ہیں:

"میں نے مولاؑ کی نصیحت گرہ میں باندھ لی اور اس پر مکمل عمل کیا، زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ میرے مال کی زکوٰۃ تین لاکھ درہم تک پہنچ گئی۔" [۲]

اس کے بعد امامؑ نے ایک شخص کے جواب میں جس نے آپ پر اصول سیاست سے ناواقف ہونے کی تہمت عائد کی تھی، فرمایا:

---

[۱] غرر الحکم، حدیث ۲۸۳

[۲] فروع کافی، جلد ۵، ص ۱۳۴ (تھوڑے سے خلاصے کے ساتھ)

www.shiabookspdf.com

"مَا لَهُمْ! قَاتَلَهُمُ اللهُ! قَدْ يَرَى الْحُوَّلُ[1] الْقُلَّبُ وَجْهَ الْقَلْبِ[2] وَجْهَ الْحِيلَةِ وَ دُونَهَا مَانِعٌ مِنْ أَمْرِ اللهِ وَ نَهْيِهِ. فَيَدَعُهَا رَأْيَ عَيْنٍ بَعْدَ الْقُدْرَةِ عَلَيْهَا"

"ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے۔ خدا انہیں ہلاک کرے۔ ایسے فرد ہوتے ہیں جنہیں طویل تجربہ ہوتا ہے اور مکر و فریب کی ہر چال اور طریقے سے بخوبی آگاہ ہوتے ہیں لیکن خداوند متعال کا حکم اور تنبیہ ان کے آڑے آ جاتی ہے اور وہ لوگ باوجود اس کے کہ انہیں ہر طرح کی قدرت اور اختیار ہوتا ہے ایسے امور سے دور رہتے ہیں۔"

اس کے بعد فرماتے ہیں:

"وَ يَنْتَهِزُ[3] فُرْصَتَهَا مَنْ لَا حَرِيجَةَ[4] لَهُ فِي الدِّينِ"

"لیکن وہ شخص جو گناہ اور دینی احکامات کی مخالفت سے نہیں ڈرتا ان مواقع سے فائدہ اٹھاتا ہے (اور ہر ایسا کام کر گزرتا ہے جس سے اس کا مفاد حاصل ہو جائے اور سطحی نظر رکھنے والے اسے مدبر اور کامیاب سیاستدان سمجھتے ہیں)"

مزید فرماتے ہیں:

"میں اگر یہ کام نہیں کرتا کہ دشمن کا مقابلہ نامردوں کی طرح کروں یا غیر اخلاقی اور غیر شرعی طریقوں سے کروں تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ مجھے یہ سب کچھ نہیں آتا بلکہ اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ مجھے خدا سے خوف آتا ہے اور اسی خوف خدا کی وجہ سے میں ہر شخص، یہاں تک کہ اپنے دشمنوں کے مقابل بھی اصولِ عدالت و جوانمردی اور تقویٰ پر عمل کرتا ہوں اور اپنے ہدف اور مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ہر حیلہ و مکر کو استعمال کرنے اور ہر قیمت ادا کرنے کے لیے تیار نہیں، جبکہ میرا دشمن ان اصولوں میں سے کسی ایک کی بھی پاسداری کے لیے تیار نہیں ہے۔ وہ اپنے مفاد اور مقصد کے حصول کے لیے ہر کام کرنے کے لیے تیار ہے اور اس کے لیے ہر ناجائز اور غیر اسلامی راستے پر چل رہا ہے، وہ نہ بے گناہوں کا خون بہانے سے ڈرتا ہے، نہ کسی ظلم و تشدد سے اسے عار ہے اور نہ عہد و پیمان کی اس کی نظروں میں کوئی وقعت ہے۔ اس کی نظر میں صرف ایک چیز اہم ہے اور

---

[1] حُوَّل: (بروزن ذُرَّت) چیزوں کے دگرگوں ہونا کے معنی میں ہے اور حول ایسے شخص کو کہتے ہیں جو مسائل کو حل کرنے کی صلاحیت کا حامل ہو اور مختلف تجارت سے فائدے لے سکے اور سال کو اس لیے حول کہتے ہیں کہ اس کے گزرنے سے مسائل دگرگوں ہوتے ہیں۔

[2] قُلَّب (بروزن قلّک) مادۂ قلب سے وہ بھی تبدیلی کے معنی میں ہے اور قلب اس شخص کو کہتے ہیں کہ مختلف مسائل کو حل کرتا ہو اور لفظ قلب کا استعمال عضوِ مخصوص کی اسی وجہ سے ہے کہ دائماً حرکت و تغییر و دگرگونی میں ہے۔

[3] یَنْتَہِزُ: مادۂ اِنْتِہَاز سے کسی کام پر اقدام کرنا کے معنی میں ہے اور بہت سارے موارد میں اس خطبے کی طرح، فرصت کے ساتھ مورد بحث ہوا ہے اور فرصتوں سے مکمل فائدہ حاصل کرنے کے معنی میں ہے۔

[4] حَرِیجَۃٌ: مادۂ حَرَج (بروزن کرج) جمع ہونا اور سکڑنا کے معنی میں ہے اور بعض نے اس کے اصل کو روحی فشار جو مشقتیں برداشت کرنے سے ہوا ہو، کے معنی میں لیا ہے۔ یہ لفظ (حرج) کبھی گناہ کے معنی میں بھی آتا ہے اور حریجہ گناہ سے پرہیز کے معنی میں آیا ہے۔

www.shiabookspdf.com

وہ ہے اس کے اپنے غیر شرعی مقاصد کا حصول، خواہ وہ کسی بھی طریقے سے ممکن ہو۔ یہ کم عقل لوگ جب ایسے افراد کی حرکتیں اور میرا ایسی حرکتوں سے اجتناب دیکھتے ہیں، تو وہ اسے سیاست کے اصولوں سے ناواقفیت پر محمول کرتے ہیں، جبکہ وہ سیاست جو تقویٰ اور دینداری پر مشتمل ہو، اس سیاست سے جو گنہگاروں اور ظالموں کی ہوتی ہے، بالکل مختلف ہے۔"

نکتہ

سیاستِ الٰہی اور شیطانی سیاست

مختلف سیاسی روشوں کا اختلاف دراصل مسئلہ حکومت کے بارے میں مختلف آراء اور نظریات سے پیدا ہوتا ہے۔ وہ حکمران جو اپنے ذاتی یا گروہی مفادات اور منافع کے لیے حکومت حاصل کرتے ہیں ان کی سیاست بھی اسی کے مطابق ہوتی ہے، جبکہ وہ لوگ جو اخلاقی اقدار اور انسانیت کی فلاح کے لیے حکومت حاصل کرتے ہیں، اُن کے اصول اُن کے مقاصد اور اہداف سے ہم آہنگ ہوتے ہیں۔

اس کی مزید وضاحت یہ ہے کہ ماضی میں جب بادشاہوں، اور آمروں کی حکومتیں ہوتی تھیں تو ان کا محور اس دور کے افراد ہوتے تھے اور ہوتا یہ تھا کہ کوئی طاقتور اور زور آور شخص اپنے ذاتی منافع، مال و متاع اور بلند مرتبے کے حصول کے لیے اپنی طاقت کے بل بوتے پر کسی علاقے یا ملک کے عوام پر مسلط ہو جاتا تھا اور ایسے افراد کو منتخب کرتا تھا جو اس کی حکومت کو مضبوط کرنے اور اس کی حفاظت کرنے میں اس کی مدد کریں، خواہ وہ غلط طریقے سے ہی کیوں نہ ہو۔ یہی ان کی سیاست کا محترم اصول ہوتا تھا۔

آج کے دور میں بھی اگرچہ حکومتوں کی شکل بدل گئی ہے لیکن ان کی اندرونی حقیقت ماضی سے کوئی تفاوت نہیں رکھتی۔ اگرچہ اس راستے پر بہت سے گروہ جال ڈالے ہوئے ہیں۔ مثلاً آج کی دنیا کے بڑے صنعتی ممالک میں ایسے گروہ تشکیل پاتے ہیں، جن میں سے ہر ایک اپنے گروہ کے مفادات کی حفاظت کے لیے کوشاں رہتا ہے۔ اس کے بعد ہر ممکن جائز و ناجائز طریقے سے اکثریت کی رائے (ووٹ) اپنے حق میں حاصل کر لی جاتی ہے اور اس وسیلے سے ایوان حکومت تک پہنچ جاتے ہیں اور جب حکومت حاصل کر لیتے ہیں تو ایسے افراد کو ملازم رکھتے ہیں جو ان کے اقتدار کو استحکام دیں اور ایسے اصول اپناتے ہیں جو ان کے گروہی مفادات کی حفاظت کے ضامن ہوتے ہیں۔

یہ ان کی حکومتوں کا اصل مقصد اور ماخذ ہوتا ہے۔ اگرچہ اپنے اعمال زشت پر پردہ ڈالنے اور سادہ لوح افراد کو

www.shiabookspdf.com

فریب دینے کے لیے یہ لوگ کبھی حقوق بشر، کبھی آزادی انسان اور کبھی اخلاقی اقدار کی حفاظت کا جال پھیلا دیتے ہیں لیکن یہ خود بھی اور تمام سمجھدار عوام بھی اس بات کو بخوبی جانتے ہیں کہ یہ سب کچھ دھوکے اور فریب کے سوا کچھ نہیں اور جب کبھی یہ ساری چیزیں حکمرانوں کے مفاد سے ٹکرائیں گی تو نابود ہو جائیں گی۔

اسی وجہ سے ایسے لوگ جب ان کے حریف حقوق بشر کی ذرا سی بھی مخالفت کے مرتکب ہوتے ہیں اور اصطلاحاً ذرا سا بھی قدم آگے پیچھے کرتے ہیں تو یہ لوگ زبردست ہنگامہ برپا کر دیتے ہیں لیکن اگر ان کے حمایتی اور ان کے مفادات کے نگہبان صبح و شام ان انسانی حقوق کو پامال کرتے رہیں تو قطعاً مورد اعتراض قرار نہیں دیے جاتے۔

اس قسم کی حکومت کے مقابل انبیاء اللہ اور اولیاء کی حکومت ہے کہ نہ کسی فرد کے مفاد میں اور نہ کسی مخصوص گروہ کے مفاد میں کام کرتی ہے بلکہ اس کی اصل و اساس بلند و ارفع انسانی اقدار کی حفاظت اور استحکام ہوتی ہے۔

پہلا گروہ صراحت کے ساتھ یہ بات کہتا ہے کہ سیاست اور اخلاقیات ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتے، اسی لیے ان کے نزدیک وہ حکمران جو اخلاقی اصولوں کا احترام اپنے لیے لازم قرار دیتا ہے، سیاسی شعور سے بے بہرہ ہوتا ہے اور ایسے حکمرانوں کی حکومت کو کبھی دوام حاصل نہیں ہوتا۔ یہ گروہ اپنا ہدف حاصل کرنے کے لیے ہر وسیلے کے لیے کوئی توجیہ ڈھونڈ لیتا ہے اور ہر وہ عمل جو انہیں اپنے اہداف کے حصول میں مدد دے ان کے نزدیک صحیح اور جائز قرار پاتا ہے۔ جب کہ اس کے مقابلے میں گروہ دوّم کے پیشوا اور رہبر "آنحضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم" ارشاد فرماتے ہیں:

"اِنَّمَا بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْاَخْلَاقِ"۔[1]

"میں صرف اخلاقیات کو انتہا تک پہنچانے کے لیے مبعوث کیا گیا ہوں۔"

یا یہ:

"لَوْلَا ... مَا أَخَذَ اللهُ عَلَى الْعُلَمَاءِ أَنْ لَا يُقَارُّوا عَلَى كِظَّةِ ظَالِمٍ وَلَا سَغَبِ مَظْلُومٍ"۔[2]

"اگر یہ مجبوری نہ ہوتی کہ خداوند عالم نے امت کے علمائے سے یہ عہد لیا ہے کہ وہ ظالموں کی ستمگری اور پرخوری اور مظلوموں کی بے بسی اور بھوک پر خاموش نہیں بیٹھیں گے تو میں تمہاری اس خلافت کو ہرگز قبول نہ کرتا۔"

حضرت امام حسین علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

[1] کنزالعمال جلد، ۳، ص ۱۶، حدیث ۵۲۱۸

[2] نہج البلاغہ خطبہ ۳

www.shiabookspdf.com

: "إِنَّمَا خَرَجْتُ لِطَلَبِ الْإِصْلَاحِ فِي أُمَّةِ جَدِّي صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ وَسَلَّمَ [1]۔"

"میں حکومت واقتدار کے حصول کے لیے نہیں بلکہ اپنے نانا کی امت کی اصلاح کے لیے قیام کر رہا ہوں۔" (تا کہ انہیں راہ حق وعدالت اور بلند اخلاقی اقدار کی طرف واپس لاسکوں۔)

ظاہر ہے کہ جو اصول پہلے گروہ کی سیاست کا مرکز اور محور ہیں، ان اصول سیاست سے جو دوسرے گروہ کی شناخت ہیں نہ صرف مکمل طور پر مختلف ہیں بلکہ متصادم ہیں۔ تاریخ اس حقیقت کی شاہد ہے کہ پہلے گروہ نے ہمیشہ اپنے اقتدار کی بقا کے لیے تمام انسانی اور اخلاقی اقدار کو قربان کر دیا ہے جبکہ گروہ ثانی نے بارہا اور ان اخلاقی اور دینی اقدار کی حفاظت کے لیے حکومت واقتدار کو ٹھکرا دیا ہے۔

امامؑ نے مندرجہ بالا خطبے میں جو کچھ ارشاد فرمایا ہے وہ درحقیقت اسی معنی اور مطلب کو روشن کرتا ہے۔ امیر المومنینؑ فرماتے ہیں:

"میں اس مخرب اخلاق سیاست کی تمام باریکیوں اور رگ وریشے سے بخوبی آگاہ ہوں اور دشمن پر فتح حاصل کرنے کے تمام راستوں سے واقف ہوں اور اس کے لیے میرے پاس قدرت اور وسائل بھی موجود ہیں لیکن میں جانتا ہوں کہ دینی اور اخلاقی اصولوں کی حفاظت مجھے ان طریقوں میں سے بیشتر کو استعمال کرنے کی اجازت نہیں دیتی، کیوں کہ ان کا سرچشمہ شیطانی اصول ہیں۔ میں وامر ونواہی الٰہی پر نظر رکھتا ہوں جہاں تک وہ اجازت دیتے ہیں جاتا ہوں اور جہاں روک دیتے ہیں رک جاتا ہوں۔"

"وَاللهِ مَا مُعَاوِيَةُ بِأَدْهَى مِنِّي وَلٰكِنَّهُ يَغْدِرُ وَيَفْجُرُ وَلَوْ لَا كَرَاهِيَةُ الْغَدْرِ لَكُنْتُ مِنْ أَدْهَى النَّاسِ۔" [2]

"خدا کی قسم! امیر شام مجھ سے بڑا سیاستدان نہیں ہے لیکن وہ مکر وفریب اور ہر قسم کی مکاری استعمال کرتا ہے اور گناہ کا مرتکب ہوتا ہے۔ اگر مکر وفریب اور عہد شکنی اللہ کے نزدیک ناپسندیدہ اور ناشائستہ نہ ہوتیں، تو میں تمام انسانوں میں سب سے کامیاب سیاستدان ہوتا۔"

"أَتَأْمُرُونِّي أَنْ أَطْلُبَ النَّصْرَ بِالْجَوْرِ فِيمَنْ وُلِّيتُ عَلَيْهِ؛ وَاللهِ لَا أَطُورُ بِهِ مَا سَمَرَ سَمِيرٌ، وَمَا أَمَّ

---

[1] بحار الانوار جلد ۴۴، ص ۳۲۹

[2] نہج البلاغہ، خطبہ ۲۰۰ اور دوسری جگہ پر حضرتؑ ہی سے منقول ہے: لولا التقى۔ یا۔ لولا الدين والتقى لكنت أدهى العرب: "اگر دین وتقویٰ نہ ہوتے میں عربوں کا بڑا سیاستدان ہوتا۔" اشارہ ہے شیطانی سیاست کی طرف۔ شرح ابن ابی الحدید، جلد ۱، ص ۲۸

www.shiabookspdf.com

نَجْمٌ فِي السَّمَاءِ نَجْمًا [۱]۔

"مجھ سے کہا جاتا ہے کہ اپنی حکومت کی مضبوطی اور استحکام کے لیے عوام پر جور وستم سے کام لوں (کچھ بڑے اور طاقتور افراد کو بیت المال سے بے حساب نوازوں جبکہ نیک اور متقی کمزور افراد کو اس سے محروم کردوں) میں خدا کی قسم کھاتا ہوں کہ جب تک میری زندگی باقی ہے اور یہ دن اور رات باقی ہیں اور آسمان پر ستارے طلوع اور غروب ہو رہے ہیں، میں ہرگز ایسے کاموں میں ہاتھ نہیں ڈالوں گا (اپنی حکومت کے دوام کے لیے اپنا دین اور احکامات الٰہی کو قربان نہیں کروں گا)۔"

یہ دو متضاد نظریاتِ سیاست یعنی سیاستِ الٰہی اور شیطانی سیاست اس بات کا سبب بنتے ہیں کہ بعض افراد جو کم عقل اور کم فہم ہوتے ہیں، حامیانِ سیاست الٰہی کو کمتر قرار دیتے ہیں اور ان کے اعمال کو عاقبت نا اندیش اور دنیاوی سیاست کے اصولوں سے ناواقفیت پر محمول کرتے ہیں، یہ لوگ اس بات سے غافل ہوتے ہیں کہ سیاست الٰہی کے تابع افراد ایک دوسرے عالم کے باسی ہوتے ہیں کہ جس کا حاکم انہیں اس روش کے علاوہ کسی روش کو اختیار کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔

مثال کے طور پر جب وہ سنتے ہیں کہ صفین کی جنگ میں جب دشمن نے گھاٹ پر قبضہ کر کے لشکر امامؑ پر پانی بند کر دیا اور امامؑ کے لشکر نے جنگ کے بعد انہیں وہاں سے دور دھکیل دیا اور فرات کے گھاٹ پر قبضہ کر لیا تو آپؑ نے اپنے بعض اصحاب کی اس رائے کو کہ ہمیں بھی دشمن پر اسی طرح پانی بند کر دینا چاہیے قطعاً درخورِ اعتناء نہیں سمجھا اور فرمایا جس پانی کو خدا نے ان پر حلال کر دیا ہے میں انہیں اس سے منع نہیں کروں گا۔ [۲]

اور اسی طرح جب وہ یہ سنتے ہیں کہ امیر المومنین علیہ السلام سے پہلے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان لوگوں کی رائے کو جو خیبر کے محاصرے کے وقت اصرار کر رہے تھے کہ یہودیوں پر پانی بند کر دیا جائے، کوئی توجہ نہیں دی تھی تو انہیں تعجب ہوتا ہے۔ [۳]

یا جب وہ سنتے ہیں کہ حضرت مسلم بن عقیل علیہ السلام جب مکمل طور پر اس بات پر قادر تھے کہ ہانی بن عروہؓ کے گھر ابن زیاد کو غفلت کی حالت میں قتل کر دیں، لیکن اس عمل سے باز رہے اور فرمایا "مجھے رسولؐ کی وہ حدیث یاد آ گئی، جس میں آپؐ نے کسی کو غافل دیکھ کر قتل کرنے سے منع فرمایا ہے" اَلْإِيْمَانُ قَيَّدَ الْفَتْكَ [۴]"۔ ایمان، دوسروں کو غافل پا کر قتل کرنے سے

---

[۱] نہج البلاغہ خطبہ ۱۲۶

[۲] تاریخ طبری ج ۳، ص ۵۶۹، سال ۳۲ ہجری کی تاریخ کے بیان کے ضمن میں۔

[۳] سید المرسلین، جلد ۲، ص ۴۰۸۔ سیرۃ حلبی جلد ۳، ص ۴۰ سے نقل کی گیا۔

[۴] یعنی ایمان دھوکے سے مارنے سے منع کرتا ہے اور مومن کو ایسے کام پر اقدام کی اجازت نہیں دیتا یہ درحقیقت ایک اصول ہے واس ضمن میں بعض محدود اور معدود کا ہونا مانع نہیں ہوتا۔ (اس حدیث کو علامہ مجلسی نے بحار الانوار ج ۴، ص ۳۴۴ اور ج ۹۴، ص ۱۳۸ پر نقل کیا ہے) تو تعجب میں ڈوب جاتے ہیں۔ میزان الحکمہ: مادّہ امانت ج ۳، ص ۱۴۹ کی طرف رجوع کیا جائے۔

www.shiabookspdf.com

روکتا ہے۔" تو وہ حیرت میں پڑ جاتے ہیں۔

اور اسی طرح جب وہ تاریخ میں پڑھتے ہیں کہ امیر المومنینؑ نے جنگ صفین میں عمرو بن عاص کے قتل سے اس وقت ہاتھ روک لیا تھا جب اس نے خود کو بالکل برہنہ کیا تھا حالانکہ اگر امامؑ اسے اس وقت قتل کر دیتے تو جنگ کا انجام بالکل مختلف ہوتا۔ تو ایسے مواقع پر یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس قسم کے کام میدان سیاست میں قابل قبول نہیں اور جو شخص ایسے کردار کا حامل ہو وہ کامیاب سیاست دان نہیں ہو سکتا۔

اسی طرح عہد و پیمان کی پابندی پر اصرار یہاں تک کہ دشمنوں کے ساتھ بھی جیسا کہ کلام الٰہی اور احادیث نبویؐ میں وارد ہوا ہے اور امانت کی حفاظت چاہے وہ امانت دشمن کی تلوار ہی کیوں نہ ہو یہ تمام اخلاقی اصول اور اقدار دنیاوی اصول سیاست سے ہم آہنگ نہیں ہوتے بلکہ یہ کہا جاتا ہے کہ کامیاب سیاستدان وہ ہوتا ہے جو عہد و پیمان کو پورا کرنے اور امانتداری کا خیال اسی حد تک کرے کہ اس کے مفادات مجروح نہ ہوں اور جہاں ان مفادات کو نقصان کا اندیشہ ہو، وہاں اسے ان ساری اخلاقی قیود و بند سے باز رہنا چاہیے۔[1]

ایسے افراد جو شیطانی سیاست پر حاکم شرائط و ضوابط کے تحت زندگی بسر کرتے ہیں، کبھی بھی سیاست الٰہی پر جس کی بنیاد اور متن ہی دینی اور اخلاقی اقدار کی حفاظت ہے تیار نہیں ہوتے۔ کسی بھی الٰہی سیاست پر عمل کرنے والے فرد کے لیے دشمن پر فتح اور کامیابی حاصل کرنا ثانوی اہمیت کا حامل ہوتا ہے، جبکہ سب سے اولیٰ اہم اخلاقی اقدار کی حفاظت ہوتی ہے۔ یہ اقدار جو باقی رہنے والی ہیں اور انسانی معاشروں کی مکمل تکمیل اور انسانوں کی بہترین اور شائستہ پرورش کے لیے "حیاتِ طیبہ" بہترین نمونہ اور وسیلہ ہے۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے جس کی طرف ابن ابی الحدید نے شرح نہج البلاغہ میں اس مقام پر جہاں انہوں نے ابراہیم بن عبداللہؒ جو اولادِ امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام میں سے تھے، کی جوانمردی کا ذکر کرتے ہوئے اشارہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں" اولادِ ابو طالبؑ میں یہ جوانمردی (جو دینی اقدار کی حفاظت کے لیے تھی) بہت زیادہ تھی کیوں کہ یہ لوگ اہل دین تھے نہ کہ اہل دنیا۔ وہ دنیا کو صرف اس لیے طلب کرتے تھے کہ اس کی مدد سے قیام دین کر سکیں نہ کہ اس سے ان کا مطلوب ذاتی منفعت اور حصول دنیا ہوتا تھا جو دنیاوی سیاستدانوں کا مطمح نظر ہوتا ہے۔

اس گفتگو کا دامن وسیع ہے، جس کا آئندہ مناسب موقع پر انشاءاللہ ذکر کیا جائے گا۔

---

[1] شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید ج ۲ ص ۳۱۴

www.shiabookspdf.com

www.shiabookspdf.com

بیالیسواں خطبہ

ومن کلام لہ علیہ السلام [1]

وَفِيهِ يُحَذِّرُ مِنَ اتِّبَاعِ الْهَوٰى وَطُوْلِ الْاَمَلِ فِي الدُّنْيَا

اس میں امامؑ نے اتباع، ہوائے نفس اور دنیا میں طویل امیدیں باندھنے سے روکا ہے۔

خطبہ، ایک نگاہ میں

اس خطبے، جسے "نصر ابن مزاحم" سے نقل کیا گیا ہے، کی سند سے یہ بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ یہ خطبہ جنگِ جمل کے بعد اس وقت صادر ہوا، جب امیر المومنینؑ کوفہ واپس تشریف لائے، اور ظاہراً اُن افراد سے متعلق ہے جو اکثر طور پر جنگوں میں فتح

[1] سندِ خطبہ: یہ خطبہ مختلف اسناد کے ساتھ حضرتؑ سے نقل کیا گیا ہے۔ لوگوں کے ایک ایسے گروہ نے جو سیّد رضیؒ سے قبل گزرے تھے، اس خطبے کو اپنی کتابوں میں معمولی فرق کے ساتھ نقل کیا ہے، ان میں سے ایک "نصر بن مزاحم" ہیں جنہوں نے اپنی کتاب "صفین" میں اور شیخ مفیدؒ نے کتاب "مجالس" میں اور مسعودی نے "مروّج الذھب" میں اسے نقل کیا ہے۔ نصر ابن مزاحم کہتے ہیں "جب امیر المومنینؑ جنگ جمل کے بعد بصرہ سے کوفہ واپس تشریف لائے تو کوفہ کے قاری اور علماء اور اشراف شہر آپ کے استقبال کے لیے آئے اور دشمن پر فتح حاصل ہونے کی مبارکباد پیش کی، پھر دریافت کیا" آپ کہاں جائیں گے کیا دارالامارہ؟" فرمایا: "نہیں میں شہر کے میدان میں جانا چاہتا ہوں۔" یہ فرما کر سواری سے اترے اور پیدل شہر کی جامع مسجد کی طرف روانہ ہوئے وہاں پہنچ کر حضرت نے دو رکعت نماز ادا کی پھر منبر پر تشریف لے گئے اور خدا کی حمد و ثنا بیان کی پھر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود و سلام بھیجا، اس کے بعد ارشاد فرمایا: "حمد اور درود و سلام کے بعد: اے اہل کوفہ اسلام میں تمہاری فضیلت اس وقت تک باقی ہے جب تک تم خود اپنی حالت نہ بگڑنے دو۔ میں نے تمہیں دعوت حق دی اور تم نے اسے قبول بھی کیا مگر پھر اس کے مخالف کام بھی کیے اور اپنی حالت دگرگوں کر لی (اشارہ تھا ان لوگوں کی طرف جنہوں نے جنگ جمل میں کوتاہیاں کیں اور ایک گروہ جس نے جنگ میں شرکت نہیں کی) اگر تم نے کوئی فضیلت والا کام کیا ہے تو وہ تمہارے اور خدا کے درمیان ہے لیکن جہاں تک احکام الٰہی کے اجراء اور مال غنیمت اور بیت المال کی تقسیم کا سوال ہے تو تمہیں دوسروں پر کوئی فوقیت حاصل نہیں۔" اسی سلسلے میں آپؑ نے یہ خطبہ ارشاد کیا اور جو کچھ نصر بن مزاحم نے اپنی کتاب میں درج کیا ہے وہ وہی ہے جو معمولی فرق کے ساتھ سیّد رضیؒ نے نہج البلاغہ میں لکھا ہے۔

www.shiabookspdf.com

حاصل کرنے کے بعد گھمنڈ میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور بے جا توقعات کرتے ہیں، خاص طور پر جبکہ مالِ غنیمت بھی سامنے موجود ہو۔ جس کی وجہ سے کچھ افراد میں دنیا طلبی کی حس بیدار ہو رہی تھی اور کچھ افراد جن کا خیال تھا کہ اس فتح میں ان کا زیادہ ہاتھ تھا اپنے لیے زیادہ مالِ غنیمت طالب تھے۔

اس خطبے میں امامؑ کا مقصد اور ہدف یہ ہے کہ لوگوں کو ہوشیار اور بیدار کریں اور جن بلند مقاصد اور اہداف کے حصول کے لیے یہ جنگ لڑی گئی تھی وہ انہیں یاد دلائیں؛ دنیا کی چمک دمک پر فریفتہ ہونے اور اسے مقصد حیات بنانے سے روکیں ؛ہوائے نفس کا شکار ہونے؛ بڑی بڑی امیدیں اور آرزوئیں کرنے کے نقصانات سے انہیں آگاہ کر دیں؛ کیونکہ یہی چیزیں انسان کو راہ حق سے دور کر دیتی ہیں اور آخرت کو فراموش کرنے کا باعث بنتی ہیں۔

اس خطبے میں امامؑ نے خاص طور پر دنیاوی زندگی کا اختصار اور اس چند لمحوں کی زندگی کو، جو انسان کو دی گئی ہے غنیمت جان کر عملِ صالح کو آخرت کے لیے ذخیرہ کرنے کی تاکید کی ہے۔ ایک مختصر لیکن جامع گفتگو میں امیر المومنینؑ نے انتہائی دقیق اور فکر انگیز مسائل بیان فرمائے ہیں۔

پہلا حصہ

أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّ أَخْوَفَ مَا أَخَافُ عَلَيْكُمُ اثْنَانِ اتِّبَاعُ الْهَوَى وَ طُولُ الْأَمَلِ فَأَمَّا اتِّبَاعُ الْهَوَى فَيَصُدُّ عَنِ الْحَقِّ وَ أَمَّا طُولُ الْأَمَلِ فَيُنْسِي الْآخِرَةَ

"اے لوگو! وہ وحشت ناک ترین چیزیں جن سے میں تمہارے لیے خوف کھاتا ہوں دو ہیں۔ ہوائے نفس کی پیروی اور لمبی امیدیں۔ کیونکہ ہوائے نفس کی پیروی (انسان کو) حق سے دور کر دیتی ہے اور لمبی امیدیں اور خواہشیں آخرت فراموشی کا سبب بن جاتی ہیں۔"

شرح و تفسیر

جیسا کہ اس سے پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے، بظاہر امامؑ نے یہ خطبہ جنگ جمل میں فتح حاصل کرنے کے بعد اس وقت ارشاد فرمایا، جب آپ کوفہ واپس تشریف لائے، تا کہ اُس غرور و تکبر کو، جو لوگوں کے ذہنوں میں اس فتح سے پیدا ہونے لگا تھا اور مال غنیمت کی تقسیم پر پیدا ہونے والی رقابت کو، لگام دے سکیں۔ فرماتے ہیں:

-"أَيُّهَا النَّاسُ! إِنَّ أَخْوَفَ مَا أَخَافُ عَلَيْكُمُ اثْنَانِ: اتِّبَاعُ الْهَوَى وَ طُولُ الْأَمَلِ"

www.shiabookspdf.com

"اے لوگو جن وحشت ناک ترین چیزوں سے مجھے تمہارے بارے میں خوف ہے وہ دو ہیں۔ ہوائے نفس کی پیروی اور طویل آرزوئیں اور امیدیں۔"

اس کے بعد فرماتے ہیں:

"فَأَمَّا اتِّبَاعُ الْهَوَىٰ فَيَصُدُّ عَنِ الْحَقِّ، وَأَمَّا طُولُ الْأَمَلِ فَيُنْسِي الْآخِرَةَ."

"ہوائے (نفس) کی پیروی انسان کو جادہ حق سے دور کر دیتی ہے اور لمبی امیدیں اور آرزوئیں آخرت کو فراموش کرنے کا سبب بن جاتی ہیں۔"

یہ مختصر سا جملہ ان بہت سے اہم اور تقدیر ساز جملوں میں سے ہے کہ جو رسالت مآبؐ سے بھی منقول ہے اور امیر المومنینؑ سے بھی، اس خطبے میں اور اٹھائیسویں خطبے کے آخر میں بیان ہوا ہے۔ [1]

اس بات پر توجہ رہے کہ ہوائے نفس یا نفسِ امارہ کی دنیاوی لذات کی طلب بے حساب اور کسی قید و بند کے بغیر ہوتی ہے۔ اس سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ یہ ہوائے نفس کی پیروی کس طرح انسان کو حق پرستی سے روک دیتی ہے۔ کیونکہ نفس پرستی انسان کی عقل پر ایسا پردہ ڈال دیتی ہے کہ وہ حق کے مشاہدے سے محروم ہو جاتا ہے اور باطل جو اس کے ہوا و ہوس کے راستے پر ہر لحہ موجود رہتا ہے اسے اس طرح ورغلاتا ہے کہ ہر قابل قبول حق سے دور ہو جاتا ہے اور ہر وہ صحیح اور حق عمل جو خواہشات نفس امارہ کے خلاف ہو اس طرح مسخ کر کے دکھاتا ہے کہ ہر باطل عمل سے بھی زیادہ خراب نظر آتا ہے۔

ہم روزمرہ زندگی میں اور گزشتہ اقوام کی تاریخ کے مطالعے کے دوران مشاہدہ کرتے ہیں کہ کس طرح نفس پرست افراد اپنی باطل توجیہات اور بے بنیاد اور گمراہ کن دلیلوں سے حق و باطل کو دگرگوں کر دیتے ہیں۔

طویل آرزوئیں اس وجہ سے آخرت فراموشی کا سبب بنتی ہیں کہ یہ انسان کی تمام صلاحیتوں کو اپنی طرف مبذول کر لیتی ہیں اور ظاہر ہے کہ انسان بہرحال محدود صلاحیتوں کا حامل ہوتا ہے اور جب یہ تمام صلاحیتیں لامحدود خواہشات کو پورا کرنے میں صرف ہو جاتی ہیں تو آخرت کے لیے کوئی ذخیرہ فراہم کرنے کے لیے کچھ باقی نہیں رہتا، خاص طور پر اس وجہ سے بھی کہ آرزوؤں کا دامن بہت دراز ہوتا ہے اور ان کی فطرت ہوتی ہے کہ جیسے ہی انسان کی ایک خواہش پوری ہوتی ہے، اس کے دل میں دوسری خواہش کروٹیں لینے لگتی ہے اور انسان کی صلاحیتیں اسے پورا کرنے میں صرف ہونے لگتی ہیں، بلکہ کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ ایک خواہش کی تکمیل کے ساتھ بہت سی دوسری خواہشات بھی منسلک ہو جاتی ہیں اور چونکہ عموماً آرزوئیں

---

[1] بحار الانوار، جلد ۸۴، ص ۱۸۸ (کچھ فرق سے) اور بحار الانوار، جلد ۸۰، ص ۸۰، ص ۹۰، ۹۱ کچھ فرق کے ساتھ) اور امیر المومنین علیؑ نے اس خطبے میں اور ۲۸ ویں خطبے میں بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔

www.shiabookspdf.com

اور خواہشات ایک دوسرے سے مربوط ہوتی ہیں تو حقیقت یہ ہے کہ نہ تو کوئی انسان ان سب کو پورا کرسکتا ہے اور نہ ان کے حصول کی جدوجہد کے بعد اس کے پاس کوئی صلاحیت باقی رہتی ہے اور نہ امکان، بلکہ حوصلہ و ہمت بھی ختم ہو جاتی ہے کہ وہ آخرت کے لیے کوئی عمل کر سکے، مگر جب فرشتۂ اجل اس کے کانوں میں کوسِ رحلت بجاتا ہے تو وہ اپنے خواب غفلت سے بیدار ہوتا ہے اور احساس جاگتا ہے کہ سرمایۂ زیست اور فرصتِ عمل کو بے وقعت اور لایعنی کاموں میں ضائع کر دیا اور آخرت کے لیے کچھ ذخیرہ نہ کیا، انجام یہ کہ نہ ہی دنیا حاصل ہو سکی اور نہ ہی آخرت بلکہ بقول شاعر!

سرمایہ زکف دادہ تجارت نہ نمودہ　　　جز حسرت و اندوہ متاعی نخریدہ

"میں نے اپنی تمام عمر کا سرمایہ ہاتھ سے گنوا دیا اور تجارت میں گھاٹا اٹھایا، بازارِ دنیا سے سوائے حسرت و غم واندوہ کے کچھ نہ خرید سکا۔

یا عرب کا معروف شاعر "ابوالعتاہیہ" جسے ہارون الرشید نے محل کے افتتاح کے موقع پر قصیدہ پڑھنے کے لیے بلایا تھا:

عِشْ مَا بَدَا لَكَ سَالِماً فِيْ ظَلِّ شَاهِقَةِ الْقُصُوْرِ!
يَهْدِيْ اِلَيْكَ بِمَا اشْتَهَيْتَ لَدَى الرَّوَاحِ وَفِي الْبُكُوْرِ!
حَتّٰى إِذَا تَزَعْزَعَتِ النُّفُوْسُ وَ دَحْرَجَتْ!
فَهُنَاكَ تَعْلَمُ مُوْقِناً مَا كُنْتَ إِلَّا فِيْ غُرُوْرٍ [1]

"جب تک چاہے اس قصر کے سائے میں جس کی بلندی آسمان کو چھو رہی ہے، عیش کی زندگی گزار اور جو کچھ تیری دسترس میں ہے وہ تجھے صبح و شام پیش کیا جاتا رہے گا، لیکن یہ سب اس وقت تک ہے جب تیرے نفس میں زلزلہ آ جائے گا اور موت کا لرزہ تیرے بدن پر طاری ہو جائے گا، اس وقت تجھے یقین آ جائے گا کہ تیری ساری عمر صرف غرور اور غفلت کی نیند میں گزری ہے۔"

ہارون کے درباری، جن کے خیال میں ایسے اشعار اس خوشی کی محفل میں سنانے کے لیے مناسب نہیں تھے، بہت ناراض ہوئے، لیکن خود ہارون نے اس کی بہت تعریف و ستائش کی۔

بعض شارحین نہج البلاغہ کہتے ہیں:

"دور دراز اور طویل آرزوئیں قیامت کو فراموش کر دیتی ہیں۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ دنیا پرست افراد جو دنیا کی

[1] انوار نعمانیہ، جلد ۳، ص ۱۴، کچھ تفاوت کے ساتھ۔

www.shiabookspdf.com

ظاہری رنگینیوں اور دلفریبیوں پر عاشق ہوتے ہیں، کوشش کرتے ہیں کہ موت کو جو انہیں ان کے معشوق (دنیا) سے جدا کر دے گی، کو بھول جائیں اور موت کو بھلانے کے سبب وہ قیامت کو بھی بھلا دیتے ہیں۔"

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ "امل" (آرزو) کے کچھ مثبت پہلو بھی ہوتے ہیں جنہیں "رجا" اور امید سے تعبیر اور موسوم کیا جاتا ہے خصوصاً جبکہ ان کی اساس توکل الٰہی پر ہو تو انسان زندگی پر بہت بہتر اثرات مرتب کرتی ہے لیکن برائی کا پہلو وہاں شروع ہوتا ہے جب یہ آرزوئیں حد سے گزر جائیں اور انسان ان کے حصول اور جستجو میں اس طرح مشغول ہو جائے کہ اپنے مبداء اور معاد کو فراموش کر دے۔

یہ واضح اور روشن حقیقت ہے کہ نفس پرستی اور لمبی امیدوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ نفس پرستی لمبی امیدوں کا سر چشمہ ہوتی ہے اور پھر نفس پرستی کو جنم دیتی ہے اور نتیجتاً طویل امیدیں اور آرزوئیں خدا اور عاقبت کو فراموش کر دیتی ہیں۔

دوسرا حصہ

اَلَا وَاِنَّ الدُّنْيَا قَدْ وَلَّتْ حَذَّاءَ فَلَمْ يَبْقَ مِنْهَا إِلَّا صُبَابَةٌ كَصُبَابَةِ الْإِنَاءِ اصْطَبَّهَا صَابُّهَا أَلَا وَاِنَّ الْآخِرَةَ قَدْ أَقْبَلَتْ وَلِكُلٍّ مِنْهُمَا بَنُونَ فَكُونُوا مِنْ أَبْنَاءِ الْآخِرَةِ وَلَا تَكُونُوا مِنْ أَبْنَاءِ الدُّنْيَا فَإِنَّ كُلَّ وَلَدٍ سَيُلْحَقُ بِأَبِيهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَاِنَّ الْيَوْمَ عَمَلٌ وَلَا حِسَابَ وَغَداً حِسَابٌ وَلَا عَمَلَ.

"آگاہ ہو جاؤ! کہ دنیا نے اپنی پشت پھیر لی ہے (اور بہت تیزی سے گزر رہی ہے) اور اس میں سے وہ چیز جو باقی رہ گئی ہے وہ صرف اتنی سی ہے جتنا پانی کے وہ قطرے جو کسی ظرف میں پانی بھر کر اسے الٹ دینے کے بعد اس ظرف کی تہہ اور کناروں میں لگے رہ جاتے ہیں۔ باقی کچھ نہیں بچتا اور آگاہ ہو جاؤ کہ موت تمہاری طرف تیزی سے آ رہی ہے اور ہر شخص کا دنیا اور آخرت سے فرزندی کا رشتہ ہے۔ تمہیں چاہیے کہ فرزندانِ آخرت بنو، نہ کہ فرزندانِ دنیا، اس لیے کہ قیامت کے دن ہر شخص اپنے باپ سے ملحق ہوگا، آج عمل کا دن ہے حساب کا نہیں۔ کل حساب کا دن ہوگا، عمل نہیں کیا جا سکے گا۔

شرح وتفسیر

انسانیت کے اس عظیم ترین معلّم نے اپنی گفتگو کے دوران نفس پرستی اور لمبی آرزوؤں اور فریب دینے والی امیدوں کی جڑوں کو قطع کرنے کے لیے بہت پُر معنی اور اثر انگیز جملے ارشاد کیے ہیں، کیوں کہ یہی دونوں چیزیں راہ خدا اور سعادتِ ابدی کے حصول میں سب سے بڑی رکاوٹ ہوتی ہیں۔ فرماتے ہیں:

www.shiabookspdf.com

"أَلَا وَإِنَّ الدُّنْيَا قَدْ وَلَّتْ حَذَّاءَ[1]. فَلَمْ يَبْقَ مِنْهَا إِلَّا صُبَابَةٌ كَصُبَابَةِ الْإِنَاءِ اِصْطَبَّهَا صَابُّهَا."

"آگاہ ہو جاؤ! کہ دنیا نے اپنی پشت پھیر لی ہے اور بہت تیزی سے گزر رہی ہے اور اس میں جو چیز باقی رہ گئی ہے وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں جتنا کسی برتن میں پانی بھر کر اسے الٹ دینے کے بعد اس کے پیندے میں اور کناروں میں لگے رہ جانے والے قطرے ہوتے ہیں۔"

اس جگہ امامؑ نے دنیا کو ایک ایسے موجود سے تشبیہ دی ہے جو اپنے محورِ گردش پر بڑی تیزی سے حرکت کر رہا ہے۔ در حقیقت یہ زمانے کی تیز گردش اور انسانی زندگی کے تیزی سے ختم ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ ایک ایسی حرکت جو انسان کے اختیار سے بالاتر ہے اور اس حد تک کہ ایک لحہ کے لیے بھی یہ حرکت رکتی نہیں ہے سوائے ذات پروردگار کے کائنات کی ہر شے اس حرکت کے تابع ہے اور اُس میں شامل ہے۔ ستارے اور کہکشائیں، زمین و آسمان، انسان اور حیوان سب اس عظیم جاذب حرکت میں شریک ہیں اور فنا اور نابودی کی سمت مسلسل پیش قدمی کر رہے ہیں وہ فنا جو عالم بقا میں لے جانے والا دریچہ یا راستہ ہے۔

بچے تیزی سے جوان ہو رہے ہیں، جوان بوڑھے ہو رہے ہیں اور بوڑھے اور بزرگ حضرات ہمارے درمیان سے رخصت ہو رہے ہیں۔ یہ بھی اُس صورت میں ہے کہ بے وقت اجل انسان کے دامن گیر نہ ہو جائے اور عالم طفلی یا جوانی میں زندگی کا اختتام نہ کر دے۔

امامؑ اس گفتگو میں فرماتے ہیں: "دنیا کی باقی عمر بہت کم ہے بالکل اسی طرح جس طرح وہ قطرات جو کسی برتن کو الٹنے کے بعد اس کی تہہ اور دیواروں سے چپکے رہ جاتے ہیں۔"

یا ایک دوسری تعبیر یہ ہو سکتی ہے کہ انسان کسی مائع سے بھرے برتن کو الٹا دے پھر سیدھا کرے تو تھوڑا سا مائع برتن کی تہہ میں جمع ہو جاتا ہے جسے "صُبَابَةٌ"[2] کہتے ہیں۔

جملہ "اِصْطَبَّهَا صَابُّهَا" میں اس کی طرف اشارہ ہو سکتا ہے یا اس کے معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ جس وقت انسان اس طرف متوجہ ہوتا ہے کہ ابھی برتن میں کچھ پانی باقی ہے تو اسے سیدھا کر کے تھوڑا سا پانی بچا لے (یہ اس صورت میں ہے کہ

---

[1] "حَذَّاء" جس طرح سید رضیؒ کی اور مفسران نہج البلاغہ کی تفسیر میں آیا ہے "سریع" کے معنی میں ہے اور در اصل "حذّ" (بروزن خط) قطع کے معنی میں یا قطع سریع (تیزی سے گزرنے) سے لیا گیا ہے، اس کے بعد ہر حرکتِ سریع پر اطلاق ہوتا ہے۔ حذا، احذ ا کی مونث ہے۔

[2] لفظ صبابہ سے متعلق وضاحت بیان کی جا چکی ہے، جو اہم بات یہاں بتانا مقصود ہے وہ یہ ہے کہ "اِصْطَبَّهَا" اور "صَابُّهَا" کی ضمیریں "صبابة" جانب لوٹتی ہیں، کیوں کہ لفظ اناء مذکر ہے اور مونث کی ضمیر اس کی طرف نہیں لوٹ سکتی۔

www.shiabookspdf.com

اصطب اور صب ہم معنی ہوں)

اور یہ مفہوم بھی ہوسکتا ہے کہ انسان باقی بچے ہوئے پانی کی حفاظت کرے تا کہ تشنگی کے عالم میں حلق تر کیا جا سکے (اور یہ مفہوم اس صورت میں ہوسکتا ہے جب "اصطبّ" کا مفہوم "صبّ" سے مختلف ہو [1])

بہر حال صبابہ کے معنی کسی ظرف میں باقی رہ جانے والی پانی کی قلیل مقدار ہے چاہے اسے بھی پھینک دیا جائے یا حلق تر کرلیا جائے۔

بعض افراد نے "اصطبّ" کے دوسرے معنی بھی ذکر کیے ہیں۔ جو بچے ہوئے پانی کو پینے کے ہیں۔ بہر حال یہ جملہ خواہ برتن میں بچی ہوئی پانی کی انتہائی قلیل مقدار ہو یا پانی پینے کے معنی میں ہو، دنیا کی قلیل العمری اور کم مدتی کی طرف اشارہ ہے کہ کوئی بھی فرد اس میں سے کوئی قابل ذکر اور قابل توجہ حصہ حاصل نہیں کرسکتا۔ اس کا دورانیہ انتہائی مختصر اور اس کی نعمتیں زوال پذیر، جلد ختم ہوجانے والی اور بہت کم دوام رکھنے والی ہیں۔

کسی ظرف کی تہہ میں بچا ہوا پانی جبکہ اس کی کثیر تعداد ظرف سے گرادی گئی ہو، نہ تو کسی پیاسے کو سیراب کرسکتا ہے نہ پھول اگا سکتا ہے نہ درخت کو پروان چڑھا سکتا ہے اور نہ باغ یا کھیت کو اس سے سینچا جا سکتا ہے۔ یہی مثال اور حال حیاتِ انسانی اور تیزی سے گزر جانے والی دنیا کا ہے اور "صبابہ" کی تشبیہ اسی واقعیت کو بیان کرتی ہے اور یہ بات کہ دنیا کو ایک ایسے ظرف سے تشبیہ دی گئی ہے جو پانی سے بھرا ہوا تھا اور اس میں سے بیشتر گرادیا گیا اور صرف چند قطرے اس کی تہہ میں باقی رہ گئے ہیں یہ اس وجہ سے ہے کہ روایات اسلامی میں یہ واضح اشارہ ملتا ہے کہ ہم دنیا کے آخری دور میں زندگی بسر کررہے ہیں اور دنیا کی عمر کا بیشتر حصہ گزر چکا ہے اسی وجہ سے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پیغمبر آخرالزّماں بھی کہا جاتا ہے۔

اس کے بعد آگے ارشاد فرماتے ہیں:

أَلَا وَإِنَّ الْآخِرَةَ قَدْ أَقْبَلَتْ۔

"آگاہ ہوجاؤ! کہ آخرت (ہماری طرف) تیزی سے بڑھتی آرہی ہے۔"

کیوں کہ جیسے جیسے دنیا کی عمر کم ہورہی ہے آخرت نزدیک آتی جارہی ہے۔ ہم زمانے کی ایسی سواری پر ہیں جو بہت تیزی سے آخرت کی طرف پیش قدمی کررہی ہے۔ لمحے منٹ، گھنٹے، دن، ہفتے، ماہ و سال اس جہان انسانیت کی طویل قطار کے تیزی سے رواں دواں ہونے کے گواہ ہیں۔ اس کے بعد عظیم معلّمِ انسانیت اس دنیا میں افراد کی ذمہ داری اور تکلیف شرعی پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں:

---

[1] لغت کی کتب سے رجوع کرنے کے بعد یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اصطبّ کا لفظ دونوں معنی کے لیے آیا ہے۔

www.shiabookspdf.com

"وَلِكُلٍّ مِنْهُمَا بَنُونَ، فَكُونُوا مِنْ أَبْنَاءِ الْآخِرَةِ وَلَا تَكُونُوا مِنْ أَبْنَاءِ الدُّنْيَا۔"

"ان دونوں (دنیا اور آخرت) میں سے ہر ایک کے فرزند ہیں (یعنی ان کے دلدادہ ہیں) لیکن تمہیں چاہیے کہ آخرت کے فرزند بنو نہ کہ فرزند دنیا۔"

"فَإِنَّ كُلَّ وَلَدٍ سَيُلْحَقُ بِأَبِيهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ۔"

"کیونکہ ہر فرزند قیامت کے دن اپنے والد سے ملحق ہوگا۔"

جی ہاں! اس جگہ دو واضح اور ایک دوسرے سے بالکل متضاد راستے وجود رکھتے ہیں۔ دنیا پرستوں کا راستہ اور دوسرا راستہ آخرت میں سر بلندی کے خواہشمندوں کا راستہ ہوتا ہے۔ اگرچہ ایک ایسا مختصر گروہ بھی موجود ہے جو ان دونوں راستوں کے درمیان سرگرداں ہے۔

دنیا پرستوں کے گروہ کا واحد مقصدِ حیات عیش و عشرت، کام و دہن کے چٹخارے اور شہوانی و نفسانی خواہشات کی تسکین کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا۔ دنیاوی زندگی سے ان کی وابستگی اتنی شدید ہوتی ہے کہ یہ کبھی ایک لحظہ کے لیے بھی یہ سوچنے کے لیے تیار نہیں ہوتے کہ ہم کہاں سے آئے ہیں کہاں ہیں اور کس سمت جا رہے ہیں وہ اس آیت الٰہی کے مصداق ہیں:

"يَعْلَمُونَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ عَنِ الْآخِرَةِ هُمْ غَافِلُونَ ۝"[1]

"یہ لوگ دنیا میں اس طرح زندگی بسر کرتے ہیں جیسے انہیں عمر جاودانی حاصل ہو اور اپنے مال و دولت پر اس طرح زعم رکھتے ہیں جیسے اس پر کبھی زوال نہیں آئے گا اور کبھی فنا نہیں ہوگا۔"

جیسے کہ قرآن مجید فرماتا ہے:

"يَحْسَبُ أَنَّ مَالَهُ أَخْلَدَهُ ۝"۔[2]

"یہ سمجھتا ہے کہ اس کا مال و متاع ہمیشہ باقی رہنے والا ہے۔"

اس دنیاوی مال و دولت کی تلاش اور حصول میں اس قدر کوشش اور محنت کرتا ہے اور ان کے ذخائر اکٹھا کرنے کی حرص میں اس طرح مبتلا رہتا ہے کہ اگر اس سے کہا جائے کہ تجھے ابدی اور جاودانی حیات حاصل ہے تو بھی اس سے زیادہ کوشش نہیں کر سکے گا۔

لیکن وہ لوگ جو آخرت کے حصول اور اس جگہ کسی مقامِ شرف کے متلاشی ہوتے ہیں وہ اپنی دور اندیشی کی وجہ سے

---

[1] سورۂ روم، آیت ۷
[2]

www.shiabookspdf.com

زندگی کے ہلاک کر دینے والے گڑھوں اور گہرائیوں کو دیکھتے ہیں تو انہیں خشک اور تباہ کن پاتے ہیں۔ بالکل اس سراب کی طرح جو کسی خشک اور بے آب ریگستان میں نظر آتا ہے۔ یا وہ خوشنما اور دلفریب رنگوں والا سانپ جس کے اندر ہلاک کر دینے والا زہر پوشیدہ ہوتا ہے جو اس کے دھوکے میں آ کر اسے حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

یہی سبب تھا کہ امیر المومنین علیہ السلام نے اس دنیا کو اس کی تمام پر کشش اور دلفریب رنگینیوں اور اس میں موجود عیش و عشرت کے باوجود طلاق دے دی تھی اور وہ بھی طلاق بائن جس کے بعد رجوع کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

یہ فرزندان آخرت قرآن کی رہنمائی اور ہدایت کی وجہ سے بخوبی جانتے ہیں:

"وَ الْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ تَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَ تَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ۔"[1]

"تمام انسان خسارے میں ہیں سوائے ان مومنوں کے جو عمل صالح بجالاتے ہیں اور حق وصداقت وصبر کی تلقین کرتے ہیں۔"

دنیا پرستوں کو فرزندانِ دنیا اور مومنین کو فرزندانِ آخرت سے تشبیہ دینے کی وجہ یہ نظر آتی ہے کہ ہر فرزند عمل اور موروثی اعتبار سے اپنے ماں باپ سے بہت مشابہت رکھتا ہے اور اسی مشابہت کی بنا پر ان سے محبت کرتا ہے اور پیوستہ رہنا چاہتا ہے۔ اس لیے یہ کہنا صحیح ہے کہ دنیا پرست فرزندان دنیا ہیں۔ اسی بنا پر دنیا پرستی کا عشق و جنون ان کے تمام وجود و افکار و خیالات پر چھایا رہتا ہے۔

اس طرح جیسے "مَا هِیَ اِلَّا حَیٰوتُنَا الدُّنْیَا نَمُوْتُ وَ نَحْیٰی"[2]"ان کی ہر چیز صرف دنیا ہے اور دنیا کے علاوہ کوئی چیز ان کے نزدیک وجود نہیں رکھتی اور ان کے عمل اس آیہ کریمہ کے مصداق ہوتے ہیں۔"

اگرچہ عقیدے کے لحاظ سے یہ بظاہر مسلمان ہوتے ہیں لیکن انہی مذکورہ وجوہات کی بنا پر تمام زندگی مختلف اوہام و خیالات میں گم ہو کر گزار دیتے ہیں۔

ان کے برعکس آخرت کے متمنی اور دلدادہ افراد کا تمام وجود عشق خدا میں ڈوبا ہوتا ہے۔ وہ مختلف مادی ذرائع جو اس مادی دنیا میں انہیں حاصل ہوتے ہیں، آخرت اور ابدی زندگی کے بہتر سے بہتر حصول کے لیے استعمال کرتے ہیں نہ کہ انہیں مقصد حیات بنالیں۔

---

[1] سورہ عصر

[2] سورۂ جاثیہ، آیت ۲۴

www.shiabookspdf.com

نہج البلاغہ کے بعض شارحین کہتے ہیں:

"یہ تشبیہ دراصل اس طرف اشارہ ہے کہ مومنینِ صالح قیامت میں اس فرزند کی مثل ہوں گے جو اپنے باپ کی آغوش میں مطمئن اور پرسکون ہو جبکہ دنیا پرست ان بچوں کی طرح ہوں گے جو یتیم، بے سہارا اور ہر چیز سے محروم ہوں۔"

لیکن یہ تفسیر امام علیہ السلام کے جملہ "اِنَّ كُلَّ وَلَدٍ سَيُلْحَقُ بِأَبِيْهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ" "قیامت کے دن ہر فرزند اپنے باپ سے ملحق ہوگا"، سے مربوط نہیں، بلکہ یہ تعبیر نظر آتی ہے کہ دنیاوی زندگی اگر ایمان وتقویٰ سے مبرا اور عاری تھی تو وہ قیامت میں دوزخ کی شکل میں مجسم ہو جائے گی اور دنیا پرست اس کی آغوش میں چلے جائیں گے جیسا کہ قرآن مجید فرماتا ہے:

"وَأُمُّهُ هَاوِيَةٌ"[1]

"ان کا ٹھکانہ اور پناہ گاہ دوزخ ہے۔"

لیکن اگر زندگی اور ایمان وتقویٰ شانہ بہ شانہ ساتھ ساتھ رہے ہوں اور حکم الٰہی کی اطاعت اور احکامات کو اپنے اوپر لازم قرار دیا ہو تو یہ آخرت میں بہشت کی شکل میں مجسم ہو جائیں گے اور مومنین اس کی آغوش میں پناہ حاصل کریں گے۔

امیر المومنین علیہ السلام نے اس خطبے کے اختتام پر آخری نتیجے کے طور پر دنیا اور آخرت میں اہم ترین فرق کی طرف اشارہ کیا ہے فرماتے ہیں:

"وَإِنَّ الْيَوْمَ عَمَلٌ وَلَا حِسَابَ وَغَدًا حِسَابٌ وَلَا عَمَلَ"

"آج عمل کا دن ہے کوئی حساب نہیں ہو رہا، کل حساب کا دن ہوگا۔ کوئی عمل نہیں کیا جا سکے گا۔"

یہ جملہ ایک طرف تو اس حقیقت کو بیان کرتا ہے کہ جب تک فرصتِ عمل باقی ہے اپنے اعمال صالحہ میں جس قدر اضافہ ہو سکتا ہے کر لیا جائے اور اگر نظر اس بات پر پڑتی ہے کہ اس دنیا میں نیکوکار اور بدکار، پاک باز اور گناہ گار، اولیاء اللہ اور اشقیاء، حزب اللہ اور حزب شیطان ساتھ ساتھ زندگی گزار رہے ہیں اور بدکار اور ظالم بظاہر عنایات الٰہی سے بہرہ مند ہو رہے ہیں جبکہ نیک اور صالح افراد اپنی نیکیوں اور تقویٰ کی پاداش میں شدائد میں مبتلا ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ دنیا دارِ عمل ہے یہاں حساب اور سزا وجزا نہیں ہیں۔

اور دوسری طرف خبردار کرتا ہے کہ عمر اور زندگی کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور اعمال کا دفتر ہمیشہ کے لیے بند کر دیتا ہے اور راہ عمل کی طرف واپسی کی کوئی صورت باقی نہیں رہتی اور اس وقت پشیمان ہونے کا ذرہ برابر فائدہ نہیں ہوتا۔

یہی بات امیر المومنین علیہ السلام ایک دوسرے خطبے میں فرماتے ہیں:

---

[1] سورہ قارعہ، آیت ۹

www.shiabookspdf.com

"لَا عَنْ قَبِيحٍ يَسْتَطِيعُونَ انْتِقَالًا وَلَا فِي حَسَنٍ يَسْتَطِيعُونَ ازْدِيَادًا"۔[۱]

"موت کے بعد نہ تو اپنے کسی برے عمل سے کنارہ کش ہوا جا سکتا ہے نہ اپنی نیکیوں میں اضافہ کیا جا سکتا ہے۔"

رَبِّ ارْجِعُونِ لَعَلِّي أَعْمَلُ صَالِحًا۔[۲]

"خداوند متعال مجھے ایک بار پھر دنیا میں بھیج دے تا کہ عمل صالح بجالاؤں۔"

نہ تو اپنی اس التجا کے ذریعے کوئی مثبت جواب حاصل کر سکتا ہے اور نہ یہ آرزو کام آسکتی ہے

"فَلَوْ أَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَكُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ"۔[۳]

"اے کاش! میں دنیا میں ایک بار پھر واپس چلا جاتا تا کہ مومن ہو سکتا۔"

نکتہ

جی ہاں نامۂ اعمال موت کے ساتھ بند ہو جاتا ہے

جو کچھ اس خطبے میں اس سلسلے میں ارشاد ہوا ہے، وہ وہی بات ہے جو متعدد آیات قرآن میں بھی ملتی ہے۔ یہاں تک کہ آیات قرآنی سے یہ بھی استفادہ ہوتا ہے کہ جب عذاب الٰہی نازل ہوتا ہے (جیسا کہ پچھلی مفسد اور بد کردار قوموں پر ماضی میں نازل ہوا ہے) تو توبہ کا دروازہ بند کر دیا جاتا ہے اور ماضی کے گناہوں کی تلافی کا کوئی راستہ باقی نہیں رہتا۔ کیوں کہ انسان اس دنیا سے مکمل انتقال اور عالم برزخ میں پہنچنے کے بعد ایسی قیود و شرائط کا پابند ہو جاتا ہے جہاں توبہ اور انابت کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ ہم گزشتہ قوموں کی داستانوں میں پڑھتے ہیں:

"فَلَمَّا رَأَوْا بَأْسَنَا قَالُوا آمَنَّا بِاللَّهِ وَحْدَهُ وَكَفَرْنَا بِمَا كُنَّا بِهِ مُشْرِكِينَ ﴿۸۴﴾ فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ إِيمَانُهُمْ لَمَّا رَأَوْا بَأْسَنَا سُنَّتَ اللَّهِ الَّتِي قَدْ خَلَتْ فِي عِبَادِهِ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْكَافِرُونَ ﴿۸۵﴾"۔[۴]

"جب انہوں نے ہمارا عذاب دیکھا تو کہنے لگے ہم اب خدائے واحد پر ایمان لاتے ہیں اور جن معبودوں کو ہم اُس کا شریک قرار دیتے تھے ان سے بیزاری اختیار کرتے ہیں لیکن ان کا ایمان اس حالت میں کہ وہ ہمارے عذاب کا مشاہدہ

[۱] نہج البلاغہ، خطبہ ۱۸۸

[۲] سورۂ مومنون، آیات ۹۹، ۱۰۰

[۳] سورۂ شعراء، آیت ۱۰۲

[۴] سورۂ مومن، آیات ۸۴ اور ۸۵

www.shiabookspdf.com

کر چکے تھے ان کو کوئی نفع نہیں پہنچا سکتا۔ یہ خدا کی سنت ہے جو اس نے اپنے بندوں میں رائج کر دی ہے اور کافر تو خسارے ہی میں ہیں۔"[۱]

اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ جب فرعون دریائے نیل کی موجوں میں غرق ہونے لگا اور موت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تو کہنے لگا، "میں موسیٰ اور ہارون کے رب پر ایمان لاتا ہوں۔" اور شاید یہ حقیقت بھی تھی لیکن چونکہ توبہ کا دروازہ بند ہو چکا تھا اس لیے جواب ملا، "آٰلْـٰٔنَ وَ قَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَ كُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ" "اب ایمان لا رہا ہے جبکہ اس سے پہلے تو گناہ کرتا رہا ہے اور مفسدوں میں شامل تھا۔"[۲]

ان آیات مبارکہ اور ان کے مشابہ روایات سے جو اس خطبۂ بالا میں بیان ہوئیں، ہم بخوبی یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ یہ ایک ایسی سنّت الٰہی ہے جو کبھی تبدیل نہیں ہو سکتی کہ موت کے ساتھ یا اُس وقت جب انسان حتمی طور پر موت کے دہانے پر پہنچ جائے تو اس کا نامہ اعمال بند کر دیا جاتا ہے جس کے بعد توبہ یا گناہوں کی تلافی نہیں ہو سکتی۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بہت سی روایات میں یہ آیا ہے کہ انسان کے نیک و برے افعال کے آثار (اثرات) اس کے مرنے کے بعد بھی اس تک پہنچتے ہیں اور اس طرح اس کا نامۂ اعمال نیکیوں یا برائیوں کے اعتبار سے بہتر یا سنگین تر ہو جاتا ہے، ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث میں پڑھتے ہیں:

"سَبْعَةُ اَسْبَابٍ يُكْتَبُ لِلْعَبْدِ ثَوَابُهَا بَعْدَ وَفَاتِهٖ رَجُلٌ غَرَسَ نَخْلًا اَوْ حَفَرَ بِئْرًا اَوْ اَجْرٰى نَهْرًا اَوْ بَنٰى مَسْجِدًا اَوْ كَتَبَ مُصْحَفًا اَوْ وَرَّثَ عِلْمًا اَوْ خَلَّفَ وَلَدًا صَالِحًا يَسْتَغْفِرُ لَهٗ بَعْدَ وَفَاتِهٖ"

"سات اعمال (اعمال خیر میں سے) ایسے ہیں جن کا ثواب انسان کے مرنے کے بعد بھی اس کے نامۂ اعمال میں لکھا جاتا ہے۔ کوئی شخص درخت لگائے یا کنواں بنوائے یا نہر کھدوائے یا مسجد تعمیر کرے یا قرآن (یا کوئی اور دینی کتاب) تحریر کرے یا کوئی اپنی علمی یادگار باقی چھوڑے یا ایسا فرزند صالح چھوڑے جو اس کے مرنے کے بعد اس کی مغفرت کے لیے استغفار کرے۔"[۳]

ظاہر ہے کہ جو کچھ اس حدیث مبارکہ میں ارشاد ہوا ہے وہ اعمال صالحہ میں سے صرف ایک نمونہ ہے ورنہ تمام نیک اعمال اور احسن سنتیں جو کسی انسان کی یادگار کے طور پر باقی رہ جاتی ہیں ان کے اثرات یہی اثر رکھتے ہیں، تو کیا یہ بات اس

---

[۱] سورہ مؤمن، آیات ۸۴و۸۵

[۲] سورہ یونس، آیت ۹۱

[۳] تنبیہ الخواطر (نقل میزان الحکمۃ، جلد ۳، ص ۲۳، ۲۴، مادۂ عمل کے ذیل میں ملاحظہ کریں)

www.shiabookspdf.com

تمام گفتگو کے منافی نہیں ہے جو ہم نے اوپر کی ہے؟

اس سوال کا جواب واضح ہے۔ ظاہر ہے کہ انسان موت کے بعد کوئی تازہ عمل نہیں انجام دے سکتا جو اس کے نامۂ اعمال میں درج ہو سکے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس کے گزشتہ اعمال کے اثرات بھی اس تک نہ پہنچ سکیں۔ صحیح ہے کہ اس کا نامۂ اعمال کسی جدید عمل کی حد تک بند ہو جاتا ہے لیکن یہ نامۂ اعمال ان اعمال کے اثرات کے لیے کھلا رہتا ہے جو وہ مرنے سے پہلے بجالایا تھا۔ انسان اپنے اعمال صالح کے درختوں کے پھلوں سے برزخ وقیامت میں فائدہ اٹھاتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر کسی کا فرزند کوئی عمل صالح انجام دیتا ہے تو چونکہ یہ اس صحیح تربیت کا نتیجہ ہوتا ہے جو وہ شخص اپنی زندگی میں اپنے فرزند کو دیتا رہا ہے، اس لیے اس کے اثرات بھی اس تک پہنچتے ہیں۔ یہ فطری ہے کہ انسان ان درختوں کے پھل سے فائدہ اٹھاتا ہے جو وہ اُگاتا ہے۔

www.shiabookspdf.com

www.shiabookspdf.com

تینتالیسواں خطبہ

من کلام لہ علیہ السلام [1]

وَ قَدْ أَشَارَ عَلَيْهِ أَصْحَابُهُ بِالِاسْتِعْدَادِ لِحَرْبِ أَهْلِ الشَّامِ بَعْدَ إِرْسَالِهِ جَرِيرِ بْنِ عَبْدِاللهِ الْبَجَلِيِّ إِلَى مُعَاوِيَةَ وَلَمْ يَنْزِلْ مُعَاوِيَةُ عَلَى بَيْعَتِهِ.

جس وقت امیر المومنین علیہ السلام نے "جریر بن عبداللہ بجلیؓ" کو اپنے نمائندے کی حیثیت سے امیر شام سے گفتگو کرنے کے لیے شام بھیجا اور امیر شام بیعت کے لیے حاضر نہیں ہوا تو آپؑ کے اصحاب نے استدعا کی کہ شامیوں سے جنگ کی تیاری کی جائے۔ (امامؑ نے اس مشورے کو قبول نہیں کیا اور اس کے لیے واضح اور روشن دلیل بیان کی)

خطبہ، ایک نگاہ میں

یہ خطبہ درحقیقت دو حصوں پر مشتمل ہے، جن میں سے ہر ایک علیحدہ اور مخصوص کیفیت اور حال کا حامل ہے اور بظاہر نظر یہ آتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک حصہ علیحدہ اپنا مخصوص عنوان اور مقام رکھتا ہے لیکن سیّد رضیؒ نے ان کی مناسبت کی وجہ سے انہیں یکجا کر دیا ہے۔

پہلا حصہ جریر بن عبداللہؓ کے واقعے سے متعلق ہے وہ دورِ عثمانی میں ہمدان کے گورنر تھے۔ امیر المومنینؑ سے لوگوں

[1] سند خطبہ: یہ خطبہ نہج البلاغہ کے علاوہ نہج البلاغہ سے پہلے دو کتابوں میں تھا۔ پہلا۔ کتاب "صفین" نصر ابن مزاحم کی۔ دوسرا کتاب "الامامۃ والسیاسۃ" مختصر تفاوت کے ساتھ۔ اس خطبے کے دوسرے حصے کو "ابن عبدربہ" نے کتاب "عقد الفرید" میں بھی نقل کیا ہے۔ (مصادر نہج البلاغہ، جلد ۱، ص ۴۴۶)

www.shiabookspdf.com

کی بیعت اور جنگ جمل کے ختم ہونے کے بعد، جب امامؑ کوفہ تشریف لائے تو آپ نے تمام گورنروں کو خطوط بھیجے اور ایسا ہی ایک خط جریرؓ کو بھی بھیجا اور اس سے بیعت طلب کی، جریرؓ نے امامؑ کے خط کا غیر معمولی احترام کیا اور لوگوں کو بڑے زور و شور سے امامؑ کی بیعت کی دعوت دی، جسے لوگوں نے قبول کر لیا۔ اس کے علاوہ جریرؓ نے ایک خط آذربائیجان کے گورنر اشعث کے نام بھی لکھا اور اسے تاکید کی کہ وہ بھی لوگوں سے امیر المومنینؑ کے لیے بیعت لے، پھر جریرؓ امامؑ کے دیدار کے لیے کوفہ آ گئے۔

جریرؓ نے امامؑ سے درخواست کی کہ چونکہ اہل شام اس کے قریبی واقف اور ہم شہری ہیں، اس لیے غالباً وہ اس کی بات زیادہ بہتر طریقے سے سنیں گے لہٰذا اُسے امیر شام کو پیغام پہنچانے کا فریضہ سونپ دیا جائے۔ حضرتؑ نے خط لکھا اور انہیں شام روانہ کر دیا۔ انہوں نے شام پہنچ کر امیر شام کو بیعتِ امامؑ کی دعوت دی اور اس کے ہر عذر اور بہانے کا معقول جواب دیا لیکن امیر شام نے کسی طور پذیرائی نہیں کی اور ٹال مٹول کرتا رہا، اُس نے جریرؓ کی وساطت سے امامؑ کو خط لکھا اور اپنے لیے مصر و شام کی حکومت طلب کی اور اس سلسلے میں لوگوں کو امامؑ کے خلاف بھڑکانا شروع کر دیا۔ حضرتؑ نے جریرؓ کو امیر شام کے مکر و فریب سے آگاہ کیا نتیجتاً جریرؓ مایوس ہو کر کوفہ واپس آ گئے۔ عراق کے لوگوں نے جریر پر عاقبت نااندیش اور امیر شام کا حامی ہونے کا الزام لگانا شروع کر دیا جس سے جریرؓ کو شدید اذیت ہوئی اور وہ کوفہ چھوڑ کر جزیرہ قرقیا (نہر فرات اور نہر خابود کے درمیان ایک چھوٹا شہر) منتقل ہو گئے جہاں ان کے کچھ دیگر عزیز و اقارب بھی آ گئے اور وہیں انہوں نے وفات پائی۔ [1]

بہر حال اس دوران جب جریرؓ شام میں تھے اور ان کا قیام وہاں کئی مہینوں تک طول کھینچ گیا تو امامؑ کے بعض اصحاب نے مشورہ دیا کہ حضرتؑ اہل شام سے جنگ کی تیاری کا فرمان صادر کریں مگر امامؑ نے فرمایا کہ "یہ صحیح عمل نہیں ہے کیونکہ یہ جریر کو شام بھیجنے کے مقصد کے منافی ہے۔ یہ اس وقت مناسب ہوگا جب وہ مدت ختم ہو جائے گی جو میں نے جریر کو اس مسئلے کے حل کے لیے دی ہے اور اس میں کوئی نتیجہ نہ نکل سکے۔"

اس خطبے کا دوسرا حصہ امامؑ کی شامیوں سے جنگ پر اصرار کی نشاندہی کرتا ہے "نصر بن مزاحم" نے اپنی کتاب "صفین" میں یہ واقعہ درج کیا ہے کہ جنگ صفین کے دوران لشکر شام سے کچھ افراد لشکر سے باہر آئے اور امیر المومنینؑ سے ملاقات کا مطالبہ کیا۔ امامؑ نے میدان جنگ کے درمیان ان سے ملاقات کی، انہوں نے تجویز دی کہ جنگ بند کر دی جائے اور عراق لشکر عراق واپس چلا جائے اور شامی لشکر شام واپس ہو جائے (جس کا مطلب یہ تھا کہ امامؑ عراق کی حکومت پر قانع رہیں اور امیر شام کو شام کا حاکم رہنے دیں) لیکن امامؑ نے انہیں مثبت جواب دے کر خاموش کر دیا اور ان کے مطالبے کو مکمل طور پر رد کر دیا اور انتہائی واضح اور منطقی دلائل اور وجوہ بیان کیے کہ آپ کیوں امیر شام سے برسرِ پیکار ہیں۔

[1] شرح نہج البلاغہ، ابن ابی الحدید۔ جلد ۳، ص ۷۰ تا ۱۱۸، خلاصے کے ساتھ۔

www.shiabookspdf.com

یہ دونوں مختلف انداز واضح طور پر اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ امیر المومنینؑ جہاں صلح و آشتی اور تحمل کی ضرورت ہوتی تھی، وہاں ایک حلیم الطبع اور صلح پسند انسان ہوتے تھے اور جہاں دینی تقاضے اور انسانی مصلحت جنگ پر مجبور کر دیتی تھی، وہاں آپ سے بڑھ کر کوئی جنگ جو اور مرد میدان نہیں ہوتا تھا۔

پہلا حصہ

إِنَّ اسْتِعْدَادِي لِحَرْبِ أَهْلِ الشَّامِ وَ جَرِيرٌ عِنْدَهُمْ إِغْلَاقٌ لِلشَّامِ وَ صَرْفٌ لِأَهْلِهِ عَنْ خَيْرٍ إِنْ أَرَادُوهُ وَلَكِنْ قَدْ وَقَّتُّ لِجَرِيرٍ وَقْتاً لَا يُقِيمُ بَعْدَهُ إِلَّا مَخْدُوعاً أَوْ عَاصِياً وَ الرَّأْيُ عِنْدِي مَعَ الْأَنَاةِ فَأَرْوِدُوا وَلَا أَكْرَهُ لَكُمُ الْإِعْدَادَ

"شامیوں سے جنگ کی تیاری سے جو چیز مجھے روک رہی ہے وہ "جریر" کی وہاں موجودگی ہے۔ اس تیاری کا مقصد یہ ہوگا کہ میں شامیوں پر صلح کا دروازہ بند کر دوں اور اگر وہ نیکی کا ارادہ کر رہے ہوں (اشارہ امامؑ کی بیعت تسلیم کرنے کی طرف ہے) تو اسے بدلنے پر مجبور ہو جائیں۔ لیکن میں نے "جریر" کے لیے ایک مقررہ وقت کا تعین کر دیا ہے۔ اگر وہ اس وقت تک واپس نہیں آیا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ یا تو وہ فریب کھا گیا یا عمداً میرے حکم کی خلاف ورزی پر آمادہ ہے۔ اس لیے میری نظر میں اس وقت "صبر و توقف" ہی مناسب ہے۔ تم بھی اسے قبول کرو البتہ میں اس بات میں کوئی حرج نہیں سمجھتا کہ تم لوگ اس وقفے کے دوران جنگ کی خاموشی سے تیاری کرتے رہو" (لیکن میں کسی شخص کو واضح حکم نہیں دے رہا)

شرح و تفسیر

صلح و جنگ

جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا، یہ خطبہ جریر ابن عبداللہؓ کے سلسلے میں دیا گیا ہے، جو ابتدا میں ہمدان کا گورنر تھا۔ بعد میں وہ کوفہ آیا اور امامؑ کے نمائندے کی حیثیت سے امیر شام سے امامؑ کی بیعت طلب کرنے شام گیا لیکن اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ اس کام میں جریر کی کامیابی کے امکانات نہ ہونے کے برابر تھے، امامؑ کے کچھ اصحاب نے مشورہ دیا کہ امامؑ اہلِ شام کے خلاف اعلان جنگ کر دیں۔

امامؑ نے ان کے جواب میں فرمایا:

www.shiabookspdf.com

"إِنَّ اسْتِعْدَادِي لِحَرْبِ أَهْلِ الشَّامِ وَ جَرِيرٌ عِنْدَهُمْ, إِغْلَاقٌ لِلشَّامِ وَ صَرْفٌ لِأَهْلِهِ عَنْ خَيْرٍ إِنْ أَرَادُوهُ"

"شامیوں کے ساتھ جنگ کی تیاری کرنا جبکہ جریر میرے نمائندے کے طور پر وہاں موجود ہے، ان پر صلح کی راہ بند کر دینے کا سبب بنے گا اور اگر وہ نیک عمل کا ارادہ کر رہے ہوں (اشارہ امامؑ کی بیعت تسلیم کرنے کی طرف ہے) تو اس سے رک جائیں۔"

امامؑ کا یہ ارشاد واضح طور پر اس حقیقت کا مظہر ہے کہ آپ ایک بلند مرتبہ اسلامی پیشوا کی حیثیت سے صرف جنگی اختلافات دور کرنے کا واحد حل نہیں سمجھتے بلکہ اپنے مخالفوں پر آخری وقت تک صلح کی راہ کھلی رکھتے تھے تاکہ ان پر اتمامِ حجت کیا جا سکے، البتہ جب صلح کی تمام کوششیں ناکام ہو جائیں اور تمام راہیں بند ہو جائیں تو پھر آخری علاج کے طور پر یا بالفاظِ دیگر اجتماعی بہتری کے لیے ایک عمل جراحی کے طور پر مجبوراً جنگ پر آمادہ ہوتے تھے۔

قابل توجہ امر یہ ہے کہ امامؑ امیر شام کے عقیدے پر بھروسا نہیں کر رہے بلکہ اہلِ شام کی عمومی فکر کے بارے میں غور و فکر کر رہے ہیں اس لیے فرماتے ہیں:

"إِغْلَاقٌ[1] لِلشَّامِ"

"یہ شام پر صلح کا راستہ بند کرنا ہے۔"

اور آگے چل کر ارشاد فرماتے ہیں:

"وَ صَرْفٌ لِأَهْلِهِ عَنْ خَيْرٍ إِنْ أَرَادُوهُ"

"اور ان شامیوں کو عمل خیر (بیعت) سے روک دینا ہے، اگر ان کا ایسا ارادہ ہو تو۔"

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اہل شام کو بغیر کسی دلیل اور واضح توجیہہ کے جنگ میں نہیں جھونکنا چاہیے اور انہیں نیک نیتی اور عمل صالح کی طرف لوٹنے سے باز نہیں رکھنا چاہیے۔

اگر چہ یہ خیالات اور نظریات گرم جوش اور تند و تیز فطرت افراد کے لیے آسانی سے قابل قبول نہیں ہوتے، لیکن ایک زیرک اور بیدار مغز رہنما، ایسے مسائل میں گرم مزاجی اور تند و تیز جذبات سے مغلوب نہیں ہوتا، بلکہ خود پر قابو رکھتا ہے اور اپنے نفس کو اس راہ پر چلنے پر مجبور کرتا ہے، جو خدا کو پسند ہو اور عقل اور منطق اس کی نشان دہی کرتے ہوں۔

اس کے بعد اس خیال سے کہ کہیں آپ کے اصحاب یہ تصور نہ کر لیں کہ شامیوں کو دی گئی یہ مہلت غیر معینہ حد تک

[1] ۔اغلاق۔ باب افعال کا مصدر ہے جس کے معنی ہیں بند کرنا اور عام طور پر کسی کام کو بند کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

www.shiabookspdf.com

دی گئی ہے، مزید فرماتے ہیں

"وَلٰكِنْ قَدْ وَقَّتُّ لِجَرِيْرٍ وَقْتًا لَا يُقِيْمُ بَعْدَهٗ إِلَّا مَخْدُوْعًا أَوْ عَاصِيًا"۔

"میں نے جریر کے لیے ایک مدت متعین کردی ہے اگر اس وقت تک وہ کوئی جواب لے کر واپس نہیں آیا تو یا تو وہ امیر شام کے فریب میں آ گیا ہے یا میرے حکم سے باغی ہو گیا ہے۔"

درحقیقت امامؑ نے دوراندیشی اور مصالح مسلمین کو مدنظر رکھتے ہوئے اور اس وجہ سے کہ کہیں یہ فرصت ہاتھ سے نہ نکل جائے جریر کے لیے اپنا کام مکمل کرنے کے لیے ایک وقت معین کر دیا تھا کیوں کہ آپ کا خیال تھا کہ ممکن ہے امیر شام جریر کو مختلف حیلوں اور بہانوں سے زیادہ عرصے روکے رکھے اور دفع الوقتی کرتا رہے تاکہ اپنے لیے زیادہ سے زیادہ سامان جنگ مہیا کر سکے اور اس کے بعد بیعت امامؑ سے انکار کر دے جبکہ اس کی وجہ سے اصحاب امامؑ کے ہاتھ جنگ کی تیاری کی مہلت ختم ہو جائے۔

لیکن یہاں سوال یہ اٹھتا ہے کہ امامؑ نے یہ کیوں فرمایا کہ "اگر "جریر" میرے مقرر کردہ وقت سے زیادہ رکتا ہے تو یا تو وہ امیر شام کے فریب میں آ گیا ہے یا پھر میرے خلاف پرچم بغاوت بلند کر رہا ہے" کیوں کہ یہ بھی ممکن ہو سکتا تھا کہ یہ اضافی قیام کسی دوسرے عذر مثلاً بیماری وغیرہ کی وجہ سے ہو جو اسے اچانک لاحق ہو گئی ہو۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ یہ تمام احتمالات مندرجہ بالا دونوں احتمالات کے مقابلے میں بہت کمزور اور ضعیف ہیں اور ناقابل قبول ہیں اور اس مسئلے میں علمائے اصول ایسے موقعوں پر حاکم کی سلامتی سے تعبیر کرتے ہیں باقی تمام وجوہات کی کوئی اہمیت نہیں۔ اس کے بعد اپنے اصحاب کو تسلی اور تشفی دینے اور ان کے جذبات کو قابو میں رکھنے کے لیے ارشاد فرماتے ہیں:

"وَالرَّأْيُ عِنْدِيْ مَعَ الْأَنَاةِ[1] فَأَرْوِدُوْا[2]"۔

"میری نظر میں اس وقت صبر کرنا بہتر ہے۔ تم بھی میری رائے سے اتفاق کرو اور اس پر عمل کرو۔"

لیکن دوسری طرف اس بات کے پیش نظر کہ کہیں آپ کے اصحاب ان حساس اور فیصلہ کن لمحات میں غافل نہ ہو جائیں اور صلح کا دروازہ بند ہو جانے کی صورت میں جنگ کے لیے ان کا عزم راسخ کمزور نہ پڑ جائے اور دشمنان خدا کے خلاف ان کا غم و غصہ ضرورت پڑنے کے وقت ٹھنڈا نہ پڑ جائے۔

---

[1] اناۃ: صبر کرنا اور خود پر قابو رکھنا۔

[2] أَرْوِدُوْا: اصل مادہ "رود" بروزن "طور" بہ معنی کسی چیز کی صبر کے ساتھ طلب و قبول ہے۔ ارادہ کا لفظ بھی اسی سے مشتق ہے۔

www.shiabookspdf.com

مزید فرماتے ہیں:

"وَلَا أَكْرَهُ لَكُمُ الْإِعْدَادَ"

"لیکن میں اس بات سے ناخوش نہیں ہوں گا کہ تم اس دوران جنگ کی تیاری کرتے رہو (البتہ میں کسی شخص کو ایسا کرنے کا حکم بھی نہیں دے رہا)"

یہ اس بات کا اشارہ ہے کہ میں اعلان جنگ اس لیے نہیں کر رہا کہ یہ عمل میرے صلح کے لیے بھیجے گئے پیغام کے منافی ہوگا۔ لیکن یہ کسی بھی طریقے سے اس بات کے مانع نہیں ہے کہ تم اس دوران جنگ کی تیاری کرتے رہو۔ یہ درحقیقت انتہائی عاقلانہ اور منطقی طرز عمل ہے، جو ان حالات میں اختیار کیا جا سکتا ہے۔ یعنی نہ تو صلح و آشتی کا در بند کر دیا جائے، عاقبت نااندیش افراد اپنی تنگ نظری اور غصے کی بنا پر کوئی منافقانہ اور متضاد عمل بروئے کار نہ لائیں اور نہ فرصت عمل کو ضائع اور رائیگاں کریں۔

نکتہ

اصل ہدف صلح و بیعت کی دعوت دینا تھا

ان چند، تاریخ سے ناواقف اور آگاہی نہ رکھنے والے افراد کے خیالات کے برعکس (جو وہ امامؑ اور امیر شام کی جنگ کے بارے میں رکھتے ہیں) امامؑ نے امیر شام سے ہرگز اس وقت تک جنگ شروع نہیں کی جب تک ہر ممکن طریقہ سے اس پر حجت تمام نہیں کر لی اور یہ جنگ بھی امیر شام اور شامیوں کی مسلمانوں کے درمیان تفرقہ ڈالنے کی کوششوں کے آخری علاج اور حل کے لیے کی گئی تھی۔

مندرجہ بالا خطبہ بخوبی اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ امامؑ نے اپنے اصحاب کے اس مشورے کو کہ شامیوں کے خلاف اعلان جنگ کر دیا جائے کبھی تسلیم نہیں کیا اور اس وقت تک سکوت اختیار کیا جب تک امید تھی کہ مصالحت اور مسالمت کے لیے کیے جانے والے اقدامات کا کوئی مثبت نتیجہ برآمد ہو سکتا ہے۔

وہ خط جو امامؑ نے جریرؓ کے ہمراہ شام بھیجا تھا اور وہ پہلا خط جو آپ کے ابتدائی خطوط میں شمار کیا جاتا ہے، اس مدعا پر واضح گواہ ہے۔ یہ خط، جو نہج البلاغہ کے اس حصے میں، جہاں آپ کے مختلف مکتوبات درج کیے گئے ہیں، چھٹے مکتوب کے طور پر درج کیا گیا ہے، اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ امامؑ نے واضح دلیل اور منطق کے ساتھ کہ جس کو رد کرنے کا کم از کم امیر

www.shiabookspdf.com

شام کے پاس کوئی جواز نہیں تھا، اسے نصیحت کی اور فرمایا: انہی لوگوں کے گروہ نے جنہوں نے خلیفۂ اوّل، خلیفۂ ثانی اور خلیفۂ ثالث کی بیعت کی تھی اب میری بیعت اختیار کی ہے اس لیے نہ ان لوگوں کو جو موجود تھے اس بیعت کو توڑنے کا اختیار ہے نہ ان لوگوں کو جو موجود نہیں تھے اسے رد کرنے کی اجازت ہے۔ اگر تو یہ مانتا ہے کہ خلیفہ کا انتخاب شوریٰ کے ذریعے ہو جیسا کہ پہلے ہوا ہے تو اس کا بھی یہی نتیجہ نکلتا ہے۔ مہاجرین و انصار تم سے مشاورت کے لیے بیٹھیں اور کسی شخص کو خلافت کے لیے منتخب کر لیں تو پھر کسی شخص کو اس کی مخالفت کا حق حاصل نہیں ہے اس لیے اگر تو عقل سے کام لے تو میری بات قبول کر اور تو بخوبی آگاہ ہے کہ میں خلیفۂ ثالث کے قتل سے مکمل طور پر بری ہوں، اس لیے خلیفۂ ثالث کے خون کا انتقام لینے کا بہانہ، بیعت کرنے سے اجتناب کی کوئی عقلی دلیل نہیں ہے۔ [1]

امیر شام کے پاس درحقیقت امامؑ کی بیعت سے انکار کرنے کے صرف یہی دو بہانے تھے:- پہلا یہ کہ جب لوگ امامؑ کی بیعت کر رہے تھے، اس وقت وہ موجود نہیں تھا، دوسرے یہ کہ امامؑ پر خلیفۂ ثالث کے قتل میں شامل ہونے کا الزام تھا۔ اس لیے وہ بیعت کے لیے تیار نہیں۔ لیکن امامؑ نے ان دونوں بہانوں کو اس منطقی دلائل کے ذریعے رد کر دیا، لیکن امیر شام نے جس کے دماغ میں کچھ اور چل رہا تھا اور اس کے پاس انحرافِ بیعت کے لیے صرف یہی دو بہانے تھے ان دلائل کو قبول نہیں کیا۔

بہرحال جس طرح کہ پہلے بیان کیا گیا جریرؓ نے، جو کہ دورِ عثمانی میں "ہمدان" کا گورنر تھا، امام علیہ السلام کا مکتوب ملنے پر خود بھی امامؑ کی بیعت کی اور دوسرے لوگوں کو بھی امامؑ کی بیعت کرنے پر آمادہ کیا۔ اس کے بعد وہ امامؑ کی خدمت میں کوفہ حاضر ہوا اور خواہش کی کہ اسے امیر شام کو بیعت کی دعوت دینے کے لیے امامؑ کا نمائندہ مامور کیا جائے، کیوں کہ شام میں اس کی قوم اور ہم وطنوں کی کافی تعداد موجود تھی اور اس کا خیال تھا کہ وہ اس سلسلے میں زیادہ موثر ثابت ہو سکتا ہے۔

مالک اشترؓ نے اس بات کی مخالفت کی اور امامؑ کی خدمت میں عرض کی کہ جریرؓ قابلِ اعتماد شخص نہیں۔ اگرچہ اس کی فکر ہماری فکر سے مطابقت رکھتی ہے لیکن اس کا میلان امیر شام کی طرف ہے۔ امامؑ نے اس تعریف کو جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جریرؓ کے لیے کی تھی مدنظر رکھتے ہوئے اور اس وجہ سے کہ ابھی تک جریر سے کوئی مخالفت ظہور میں نہیں آئی تھی، جریر کو اس عہدے پر مامور کر دیا۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی رہی ہو کہ اس وقت اس کام کے لیے جریر سے بہتر کوئی شخص دسترس میں نہیں تھا۔ امامؑ نے اسے خط دیا اور فرمایا: "میرا یہ خط امیر شام تک پہنچاؤ اور اس سے اتمام حجت کرو"۔

جریرؓ شام پہنچا اور تمام اہل مکہ و مدینہ و مصر و حجاز و یمن اور تمام دیگر افراد و اقوام کی امامؑ سے بیعت کی تفصیل بیان کی

---

[1] نہج البلاغہ چھٹے خط سے اقتباس۔

www.shiabookspdf.com

اور کہا" میں اس لیے آیا ہوں کہ تجھے امامؑ کی بیعت کی دعوت دوں اور یہ امامؑ کا مکتوب ہے جو میں تیرے لیے لایا ہوں۔"

امیر شام جو حکومت و امارت کا شدید خواہش مند تھا، اس دعوتِ حق کو تسلیم کرنے پر کسی طرح رضامند نہ ہوا۔ لوگوں کو ورغلانے کے لیے ایک تحریک شروع کر دی اور خود کو خلیفۂ ثالث کے خون کا دعویدار ظاہر کرنا شروع کر دیا اور شام کے لوگوں سے اس بات پر بیعت لینے لگا کہ وہ قتلِ خلیفہ کے قصاص کے لیے اٹھ کھڑے ہوں اور اس مقصد کے لیے جو بھی کرنا پڑے کر گزریں۔

جریرؓ نے اسے پھر نصیحت کی کہ وہ اس تفرقہ اندوزی اور نفاق سے ہاتھ اٹھائے اور امامؑ کی بیعت کر لے لیکن امیر شام نے جواب دیا کہ یہ اتنا آسان مسئلہ نہیں ہے بلکہ اس میں بہت سے پیچیدگیاں ہیں جن کے بارے میں مجھے بہت سے اندیشے ہیں۔

امیر شام کے بھائی نے اسے مشورہ دیا کہ وہ اس معاملے میں عمرو بن عاص اور اس قبیل کے دیگر لوگوں کو دعوت دے اور ان سے مشاورت کرے۔ عمرو بن عاص نے امیر شام سے یہ عہد لینے کے بعد کہ اس معاملے میں امیر شام کا ساتھ دینے کے بدلے میں مصر کی حکومت اسے دے دی جائے گی، اسے مشورہ دیا کہ وہ حکومت حاصل کرنے کے لیے قیام کرے اور اس سلسلے میں ہر مدد کا وعدہ کیا۔

اسی دوران "شرحبیل" نے جو یمن کا سردار اور رئیس تھا، اہم کردار ادا کیا۔ اس نے جریرؓ سے کافی بحث کی، لیکن جریر نے اسے قائل کر لیا اور اس بحث و گفتگو کے نتیجے میں "شرحبیل" اس بات پر تیار ہو گیا کہ امامؑ کی بیعت کرے اور امیر شام کو چھوڑ دے۔ لیکن امیر شام نے ایک بڑا گروہ تیار کیا، جو اس کے پاس جائے اور اس کی انتہائی تعظیم و تکریم کرے اور امامؑ کے خلیفۂ ثالث کے قتل میں شامل ہونے کی گواہی دے اور بہت سے لوگوں کی طرف سے اسے خط بھی لکھوائے کہ اسے خلیفۂ ثالث کے قتل کے قصاص میں مدد کرنی چاہیے۔

"شرحبیل" اس سازش کا شکار ہو گیا اور خلیفۂ ثالث کے قصاص کی حمایت پر آمادہ ہو گیا، امیر شام نے اسے شام کے مختلف شہروں میں لوگوں کو اس تحریک کی حمایت پر آمادہ کرنے کے لیے روانہ کیا اور بہت کثیر تعداد نے اس کے مطالبے کا مثبت جواب دیا۔ جریرؓ اس تمام واقعے کو ملاحظہ کر کے امیر شام کی طرف سے مایوس ہو گیا۔ اسی دوران امیر شام نے جریر سے کہا کہ اگر علیؑ شام اور مصر کا خراج وصول کرنے کا اختیار اور ان دونوں علاقوں کی حکومت مجھے دے دیں اور اپنی وفات کے بعد مجھے کسی کی بیعت کا پابند نہ کریں، تو میں ان کی بیعت کر لوں گا۔

جریر نے اس سے کہا: "تو جو کچھ چاہتا ہے وہ خط میں لکھ کر امیر المومنینؑ کو بھیج دے اور میں بھی ایک خط اس کے

www.shiabookspdf.com

ساتھ بھیج دیتا ہوں۔" جب یہ خطوط امیر المومنینؑ کو ملے تو آپ نے جریر کو خط بھیجا کہ "امیر شام اس سارے عمل اور مطالبات کو پیش کر کے تمہیں فریب دے رہا ہے اور اس کی کوشش یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ تاخیر کی جائے تا کہ شامیوں کو جنگ کے لیے تیار کیا جا سکے۔ اس سے پہلے امیر شام کو شام کی حکومت دینے کا مشورہ مدینے میں مجھے "مغیرہ بن شعبہ" نے بھی دیا تھا لیکن میں اس کے لیے تیار نہیں ہوا تھا۔

"لَمْ يَكُنِ اللهُ لِيَرَانِيْ أَتَّخِذُ الْمُضِلِّيْنَ عَضُدًا"

"خدا نہ کرے کہ میں گمراہوں کو اپنا دست و بازو قرار دوں۔" اگر امیر شام بیعت کرتا ہے تو ٹھیک ہے اگر وہ انکار کر دے تو عراق واپس آ جاؤ۔

جریر نے اس کے باوجود بھی واپسی میں تاخیر کی (اس بے معنی امید پر کہ شاید امیر شام اپنی روش تبدیل کر دے) اور یہی سبب ہوا کہ عراقیوں نے اس پر امیر شام کے ساتھ سازش کرنے کی تہمت عائد کی۔ [1] اس طرح جریرؓ کی نامہ رسانی کی مہم مکمل طور پر ناکام ہو گئی۔

دوسرا حصہ

وَلَقَدْ ضَرَبْتُ أَنْفَ هٰذَا الْأَمْرِ وَعَيْنَهُ وَقَلَّبْتُ ظَهْرَهُ وَبَطْنَهُ فَلَمْ أَرَ لِيْ فِيْهِ إِلَّا الْقِتَالَ أَوِ الْكُفْرَ بِمَا جَاءَ مُحَمَّدٌ ﷺ إِنَّهُ قَدْ كَانَ عَلَى الْأُمَّةِ وَالٍ أَحْدَثَ أَحْدَاثًا وَأَوْجَدَ النَّاسَ مَقَالًا فَقَالُوا ثُمَّ نَقَمُوا فَغَيَّرُوا

"میں نے اس معاملے پر کئی مرتبہ غور کیا اور ہر پہلو سے اس کا مطالعہ کیا ہے اور بالآخر یہی نظر آیا کہ ان بے عقل و شعور، خودسر شامیوں سے جنگ یا ان سب چیزوں سے انکار جو رسالت مآبؐ لے کر آئے تھے، اس کے علاوہ میرے لیے کوئی اور راستہ نہیں ہے جس شخص نے مجھ سے قبل ان لوگوں پر حکومت کی ہے (اشارہ خلیفہ ثالث کی طرف ہے) اس نے ایسی بدعات ایجاد کیں اور ایسے حوادث کی راہ ہموار کی جس کی بنا پر لوگوں نے اس کے خلاف شدید صدائے احتجاج بلند کرنی شروع کر دی۔ اعتراضات اٹھنے لگے اور آخر کار اسے انتقاماً قتل کر دیا اور حالات کو متغیر کر دیا۔"

[1] شرح نہج البلاغہ، ابن ابی الحدید، جلد ۳، ص ۷۰ تا ۱۱۹ بہت سے خلاصوں کے ساتھ۔

www.shiabookspdf.com

شرح وتفسیر

اعلان جنگ

خطبے کا یہ حصّہ جو یہاں موضوع بحث ہے، مکمل طور پر حصّۂ اوّل کے برعکس ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس حصّے میں جنگ کا اعلان کیا جا رہا ہے۔

پہلے حصّے میں امامؑ بار بار اپنے اصحاب کو خود پر قابو رکھنے، سخت طرزِ عمل سے اجتناب، اور دلائل و منطق اور صبر و تحمل سے کام لینے کی تاکید فرماتے ہیں جبکہ اس حصے میں امامؑ انتہائی فیصلہ کن انداز میں طاقت کے استعمال اور جنگ کو آخری حل سمجھتے ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ امامؑ نے ایک طویل مدت تک مصالحت اور مفاہمت کی ہر ممکن راہ اختیار کی لیکن آپ کی یہ تمام کوششیں بے سود ثابت ہوئیں اور ثابت یہی ہوا کہ امیر شام کسی عقل و دلیل اور منطق کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ اس کا واحد مقصد اپنی حکومت اور اقتدار کا حصول ہے اور اس ہدف تک رسائی کے لیے وہ کوئی بھی قربانی دے سکتا ہے اور ہر قسم کا مکر و فریب استعمال کر سکتا ہے۔

یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ ایسے شخص کے مقابلے کے لیے صرف دو ہی راستے نظر آتے ہیں۔ ان کے علاوہ کسی تیسرے راستہ کا کوئی وجود نہیں، ایک یہ کہ اس کے مقابلے میں شکست تسلیم کر لی جائے اور اسلامی سلطنت اور اس کے امور ایک ایسے شخص کے سپرد کر دیے جائیں جو انتہائی خودغرض، خود پرست اور انتہائی سفاک ہے یا پھر تلوار اٹھائی جائے اور معاشرے کو اس کے وجود سے پاک کر دیا جائے۔

اس دلیل کی بنا پر امامؑ ارشاد فرماتے ہیں:

"وَ لَقَدْ ضَرَبْتُ أَنْفَ هٰذَا الْاَمْرِ وَ عَيْنَهُ وَ قَلَّبْتُ ظَهْرَهُ وَ بَطْنَهُ فَلَمْ أَرَ لِيْ إِلَّا الْقِتَالَ أَوِ الْكُفْرَ بِمَا جَاءَ مُحَمَّدٌ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ."

"میں نے اس مسئلے پر مسلسل غور کیا ہے اور ہر پہلو سے اسے پرکھا ہے اور آخر اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ میرے پاس سوائے ان بے عقل اور خودسر و خودرائے شامیوں سے جنگ کرنے یا ہر اس حکم سے روگردانی کرنے کے جو پیغمبرِ اسلام نے دیا ہے اور کوئی تیسرا راستہ نہیں ہے۔"

امامؑ کے اس جملے "ضَرَبْتُ أَنْفَ هٰذَا الْاَمْرِ وَ عَيْنَهُ" "میں نے اس معاملہ اپنی چشم و بینی کو پوری طرح

www.shiabookspdf.com

استعمال کیا۔"، میں یہ کنایہ ہے کسی اہم فیصلے پر انتہائی غور وخوض کرنے کے بعد عمل کیا جانا چاہیے اور "ضربت" سے مراد حصول ہدف ہے اور " انف" اور "عین" (آنکھ اور ناک) کسی مطلب کے حساس ترین نکتے کے معنی میں ہیں جیسا کہ انسان کے جسم میں حساس ترین حصہ اس کا سر ہوتا ہے اور سر میں یہی دو عضو یعنی آنکھ اور ناک ہوتے ہیں کیونکہ آنکھ سے انسان ہر چیز کا مشاہدہ کرتا ہے اور ناک سے سانس لیتا ہے جو اس کی زندگی کی بقا کا ضامن ہے۔ بہر حال یہ جملہ عربی ادب میں ایک ضرب المثل بن چکا ہے جو گہری تحقیق اور فکر کے اظہار کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

دوسرے جملے "وَ قَلَّبْتُ ظَهْرَهُ وَ بَطْنَهُ" کا بھی یہی مفہوم اور مطلب ہے یعنی کسی چیز یا مطلب کے حصول کے لیے ہر ممکن غور وفکر اور ہر قسم کے اشکال کا عمیق مشاہدہ کیونکہ جب کوئی شخص کوئی شے خریدتا ہے تو اس کے ہر پہلو کو غور سے جانچتا ہے تا کہ اس کا ہر رخ واضح اور روشن ہو جائے۔

اب رہی یہ بات کہ امام علیہ السلام فرماتے ہیں کہ "میرے سامنے دو میں سے ایک راہ اختیار کرنے کے علاوہ کوئی تیسرا راستہ نہیں ہے یا اس گروہ منحرف ومفسد سے جنگ کروں یا آئین رسالت سے انکار کردوں۔" تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر اس مرحلے پر امامؑ سکوت اختیار کر لیتے اور لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیتے تو یہ لوگوں کے دین سے منحرف ہونے کا اور ایک جاہل اموی اور سفیانی حکومت کے قیام اور عصر جاہلیت کی اقدار کے احیاء کا سبب بن جاتا اور اس کا مطلب یہ ہوتا کہ ان تمام دینی اور اخلاقی اقدار کو ٹھکرا دیا جائے جن کی خاطر پیغمبر اسلام نے تیئیس (۲۳) سال سخت ترین مصائب اور اذیتیں برداشت کیں اور امیر المومنین پچیس (۲۵) سال خانہ نشینی اختیار کیے رہے اس لیے اسلام کے اس فرزند رشید علیؑ ابن ابی طالبؑ کے لیے سوائے جنگ کے کوئی راہ باقی نہیں رہی تھی اور یہی اس کا جواب ہے ان تمام افراد کے لیے جو امیر شام سے جنگ کے لیے امامؑ کو ذمہ دار قرار دیتے ہیں۔

اس کے بعد خلیفۂ ثالث کے قتل، جو امیر شام اور اس کے حامی افراد کے لیے ایک بہانہ تھا تا کہ اپنے مفسدانہ اہداف اور ہوس ناک خواہشات کو پورا کر سکیں، کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"إِنَّهُ قَدْ كَانَ عَلَى الْأُمَّةِ وَالٍ أَحْدَثَ إِحْدَاثًا، وَ أَوْجَدَ النَّاسَ مَقَالًا، فَقَالُوا ثُمَّ نَقَمُوا فَغَيَّرُوا"

"وہ شخص جو مجھ سے پہلے ان لوگوں پر حکومت کر رہا تھا اس نے ایسی بدعات ایجاد کیں اور ایسے حوادث کی راہ ہموار کی کہ لوگوں نے اس کے خلاف آواز بلند کی، پھر شدید احتجاج کیا اور پھر اس سے انتقام لیا اور بدل دیا۔"

اس بات سے امامؑ کا مقصد یہ ہے کہ خلیفۂ ثالث کے قتل کا اصل عامل اور محرک خود اس کی ذات تھی، کیوں کہ اس نے ایسے اعمال انجام دیے جو سراسر عدالتِ اسلامی اور سنّت پیغمبرؐ کے خلاف تھے اور یہی عام مسلمانوں کے اس کے خلاف غم و غصے

www.shiabookspdf.com

کا سبب بنے اور اس کے بعد ایک عمومی ناراضی اور اعتراض کے اظہار کے طور پر اس کے قتل کا سبب بن گئے اور غالباً اسی وجہ کی بناء پر تمام اصحاب رسولؐ اس تمام معاملے پر خاموش تماشائی بنے رہے اور اپنی خاموش رضامندی سے خلیفۂ ثالث کے مخالفین کے قیام کی حمایت کرتے رہے۔ یہاں کہ خلیفۂ ثالث کے قتل کے بعد تین دن تک ان کا بدن زمین پر پڑا رہا اور کسی نے دفن نہیں کیا۔ یہ خود اس حقیقت کی نشاندہی کرتا ہے کہ صحابہ اور دوسرے افراد ان سے کس حد تک ناراض اور برگشتہ ہو چکے تھے۔ [۱]

اس بنا پر خلیفۂ ثالث کا قتل کوئی ایسی چیز نہیں تھی جس کا بہانہ بنا کر امیر المومنینؑ کی بیعت سے انحراف اور ان کے خلاف قیام کیا جا سکتا۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ بہانہ ساز خود اس حقیقت سے بخوبی آشنا تھے لیکن شام کے جاہل اور حقیقت نا آشنا لوگوں کو امیر المومنینؑ کے خلاف ورغلانے کے لیے ان کے پاس اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں تھا۔

نکتہ

خلیفۂ ثالث کے وہ کام جو لوگوں کی عمومی ناراضی کا سبب بنے

شارحین نہج البلاغہ کی اکثریت نے اس خطبے کے ضمن میں ایسے بہت سے کاموں کا ذکر کیا ہے جو خلیفۂ ثالث نے اپنے دور حکومت میں انجام دیے تھے جن کی وجہ سے عوام میں اعتراضات پیدا ہونے لگے اور لوگوں کے دلوں میں ان کے خلاف ایک مسلح جدوجہد کا ارادہ جڑ پکڑ گیا۔ وہ اہم ترین عوامل جو اس کی طرف اشارہ کرتے ہیں، درج ذیل امور تھے:۔

۱۔ خلیفۂ ثالث نے ایسے حساس ترین اسلامی علاقوں میں جو نہایت اہم تھے اپنے ایسے رشتے داروں اور ہوا خواہوں کو حاکم مقرر کر دیا جو انتہائی نالائق، مفسد اور تعلیمات اسلامی سے بہت دور تھے۔ منجملہ ان میں سے ایک ولید تھا جو فاسق اور شراب خور تھا جسے کوفے کا گورنر مقرر کر دیا۔ وہ کوفہ جو اسلام کا ایک انتہائی اہم مرکز تھا۔ [۲]

اسی طرح حکم بن ابی العاص جو ان کا چچا تھا وہ بارگاہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دھتکارا ہوا تھا اور جسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ بدر کر دیا تھا، اس کا انتہائی گرمجوشی سے استقبال کیا انتہائی قیمتی پوشاک پہنائی اور بنی قضاعہ کے

---

[۱] کامل ابن اثیر، جلد ۳، ص ۱۸۰

[۲] بہت سے شیعہ اور اہل سنت مفسرین قرآن کے درمیان اس پر اتفاق ہے کہ آیہ "ان جاءکم فاسق بنبأ فتبینوا" (جب کوئی فاسق شخص تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو اس کی پوری طرح تحقیق کر لو) سورۂ حجرات، آیت ۶ ولید کے بارے میں نازل ہوئی ہے بلکہ علامہ امینی نے اس پر اجماع مفسرین کا دعویٰ کیا ہے۔ (الغدیر جلد ۸، ص ۲۷۶)

www.shiabookspdf.com

قبیلے کی زکوٰۃ جمع کرنے کا اختیار اسے دے دیا اور جب اس زکوٰۃ کی رقم تیس لاکھ درہم کے قریب ہوگئی تو سب اسے بخش دی۔

"ابن قتیبہ" اور ابن عبدربہ" اور "ذھبی" جو سب کے سب معروف مورخین اہل سنت ہیں، لکھتے ہیں: "وہ عوامل جو لوگوں کی خلیفۂ ثالث سے ناراضی کا سبب بنے، ان میں سے ایک یہ تھا کہ انہوں نے حکم بن ابی العاص کو حکم رسولؐ کے خلاف مدینہ بلا لیا جبکہ خلیفۂ اوّل اور خلیفۂ ثانی اس کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ [۱] دوسرے یہ کہ مروان بن حکم کو جو اس کا بیٹا اور خلیفۂ ثالث کا چچازاد بھائی اور داماد تھا اپنے مشیر اور معاون کے طور پر منتخب کرلیا اور افریقہ کے خمس وغنائم جو پانچ لاکھ دینار تھے اسے بخش دیے۔

۲۔ ان کے بالمقابل انتہائی محترم و بزرگ صحابی رسولؐ ابوذرؓ کو شدید اذیتیں دیں اور مختلف آزار پہنچائے، یہاں تک کہ مدینہ سے نکال کر "ربذہ" میں رہنے کا پابند کردیا جہاں کی آب و ہوا انتہائی خراب تھی ابوذرؓ باقی تمام عمر وہیں مقیم رہے اور اسی جگہ ان کا انتقال ہوا اور ان کا گناہ صرف یہ تھا کہ وہ خلیفۂ ثالث کے شرع وسنت کے منافی احکامات کی گرفت کرتے تھے اور "امر بالمعروف ونہی عن المنکر" کا شرعی وظیفہ انجام دیتے تھے۔ [۲]

اسی طرح کا سلوک "عمار یاسر" جو سابقین اسلام سے تھے اور رسولؐ کے انتہائی مقرب تھے، ان کے ساتھ کیا۔ انہیں اس بری طرح لاتوں اور عصا سے زدوکوب کیا گیا کہ وہ "فتق" کی بیماری میں مبتلا ہوگئے ان کا قصور یہ تھا کہ صحابہ کے ایک گروہ نے خلیفۂ ثالث کے خلاف اپنے اعتراضات ایک مکتوب کی شکل میں اس مطالبے کے ساتھ کہ خلیفۂ ثالث آئندہ ایسی بد اعمالیوں سے باز رہے، خلیفۂ ثالث کے پاس بھیجے، عمارؓ یہ خط لے کر خلیفۂ ثالث کے پاس گئے اور یہ خط انہیں پڑھ کر سنایا۔ اسے سن کر خلیفۂ ثالث شدید طیش میں آگیا اور اپنے غلاموں کو حکم دیا کہ عمارؓ کے ہاتھ پیر مضبوطی سے جکڑ لیں، اس کے بعد خود خلیفۂ ثالث نے انہیں اتنا مارا کہ وہ بیہوش ہوگئے۔ [۳]

اور یہی طرز عمل انہوں نے "عبداللہ بن مسعودؓ" کے ساتھ اختیار کیا۔ اپنے ایک جلاد کو بھیجا تاکہ وہ انہیں مسجد لے کر آئے، اس کے بعد انہیں زمین پر گرا کر اتنا مارا کہ ان کا ایک دانت بھی ٹوٹ گیا اور ان کا گناہ یہ تھا کہ انہوں نے خلیفۂ ثالث پر اعتراض کیا تھا کہ وہ کیوں بیت المال کی دولت بنی امیہ کے بدکاروں میں تقسیم کررہے ہیں۔ [۴]

زید بن ارقم سے سوال کیا گیا جو مشہور صحابی تھے کہ تم کس دلیل کی بنیاد پر خلیفۂ ثالث کی تکفیر کرتے ہو؟ انہوں نے

---

[۱] اس مطلب کی اسناد مرحوم علامہ امینی نے "الغدیر" کی جلد ۸، صفحہ ۲۴۱ اور اس کے بعد ذکر کی ہیں۔

[۲] الغدیر کی وہی اسناد صفحہ ۲۹۲ کے بعد۔

[۳] یہ واقعہ بہت سے مورخین نے نقل کیا ہے ان میں سے "بلاذری" نے انساب الاشراف" جلد ۵، ص ۴۹ اور ابن قتیبہ نے "الامامۃ والسیاسۃ" جلد ۱، ص ۳۵ پر درج کیا ہے۔

[۴] شرح نہج البلاغۃ: ابن ابی الحدید، جلد ۳، صفحہ ۴۳ اور "تاریخ یعقوبی" جلد ۲، صفحہ ۱۷۰

www.shiabookspdf.com

جواب دیا:

" تین دلیلوں کی بنیاد پر، ایک یہ کہ اموال بیت المال کو دولت مندوں میں تقسیم کیا جا رہا ہے۔ دوسری یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھی مہاجرین کو دشمنان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جیسا قرار دیا جا رہا ہے اور کتاب الٰہی کے خلاف عمل ہو رہا ہے۔ [1]

تیسری یہ کہ اموال بیت المال کو بغیر کسی حساب کتاب کے اپنے ہم قوموں اور عزیزوں میں تقسیم کرتے رہے جبکہ مستند صاحبانِ ایمان فقر و فاقہ کی آگ میں جلتے رہے۔ [2] جن میں سے کچھ بطور نمونہ اوپر بیان کیے گئے۔

مورخین اور محدثین نے اوپر بیان کردہ ضعیف نکات کی بحث میں طویل تشریحات کی ہیں جنہیں اگر جمع کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب تیار ہو جائے گی۔ حقیقت یہی ہے کہ مندرجہ بالا امور اور ایسے بہت سے دیگر اسباب تھے جن کی وجہ سے مدینے کے تمام لوگ بشمول مہاجرین و انصار اور اصحاب پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خلیفۂ ثالث کے مخالف ہو گئے، وہ اسے مقام خلافت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اہل نہیں سمجھتے تھے۔ اسی دوران مصر، بصرہ اور کوفے کے ناراض اور مشتعل افراد مدینہ پہنچ گئے اور اعتراضات پیش کرنے شروع کر دیے اور جب ان کے اعتراضات پر کوئی توجہ نہیں دی گئی اور ان کا کوئی حل نہیں پیش کیا گیا تو خلیفۂ ثالث کو قتل کر دیا گیا جبکہ مدینہ کا کوئی مسلمان ان کی حمایت کے لیے کھڑا نہیں ہوا۔ اس سے ثابت ہے کہ مدینہ کے عام مسلمان بھی ان سے شدید ناراض تھے اس تمام صورتحال میں کہ امیر شام ان تمام عوامل سے کلی طور پر آگاہ تھا، جن کی وجہ سے عوام خلیفۂ ثالث کے خلاف کھڑے ہوئے مگر اس کے باوجود شام کے جاہل لوگوں کو امامؑ کے خلاف بھڑکانے کے لیے وہ خلیفۂ ثالث کے قتل کا قصاص لینے کے بہانے امامؑ کے مقابلے پر کھڑا ہو گیا۔

---

[1] شرح نہج البلاغہ، ابن ابی الحدید، طبق نقل "نہج الحق" صفحہ ۲۹۷

[2] اس مطلب کی شرح "پیام امام" جلد اول خطبہ شقشقیہ کے ذیل میں دی گئی ہے۔

www.shiabookspdf.com

چوالیسواں خطبہ

ومن کلام لہ علیہ السلام [1]

"لَمَّا هَرَبَ مَصْقَلَةُ بْنُ هُبَيْرَةَ الشَّيْبَانِيُّ إِلَى مُعَاوِيَةَ، وَ كَانَ قَدِ ابْتَاعَ سَبْيَ بَنِي نَاجِيَةَ مِنْ عَامِلِ أَمِيرِ الْمُؤْمِنِينَ (علیہ السلام) وَ أَعْتَقَهُمْ، فَلَمَّا طَالَبَهُ بِالْمَالِ خَاسَ بِهِ وَ هَرَبَ إِلَى الشَّامِ."

یہ جملے امامؑ نے اس وقت ارشاد فرمائے جب آپ کا مقرر کردہ نمائندہ مصقلۃ بن ہبیرہ شیبانی آپ سے منحرف ہوکر امیر شام کے ساتھ مل گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس نے "بنی ناجیہ" کے کچھ قیدیوں کو امیر المومنینؑ کے کارکنوں سے خریدا تھا اور وعدہ کیا تھا کہ وہ ان کی قیمت بعد میں ادا کردے گا پھر اس نے ان اسیروں کو رہا کر دیا۔ جب امیر المومنینؑ نے اس سے وعدے کے مطابق رقم طلب کی تاکہ بیت المال میں جمع کروائی جاسکے تو وہ ادائیگی سے مکر گیا اور شام کی طرف فرار ہوگیا۔

شانِ ورود

جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا یہ سلسلۂ سخن قبیلہ "بنی ناجیہ" کے واقعے سے مربوط ہے وہ واقعہ اس طرح ہے کہ "خریت بن راشد" جو رؤسائے بنی ناجیہ میں سے تھا، حکمین کے مسئلے کے بعد اپنے قبیلے کے تیس افراد کے ساتھ امامؑ کے پاس آیا اور بڑے واضح انداز میں کہنے لگا:

"خدا کی قسم نہ تو میں تمہاری اطاعت کروں گا نہ تمہارے پیچھے نماز پڑھوں گا اور کل میں تم سے علیحدہ ہوجاؤں گا" امامؑ

[1] سند خطبہ: مورخین کے ایک گروہ نے جو سید رضیؒ سے پہلے گزرے ہیں بنی ناجیہ کے واقعے اور امیر المومنینؑ کا یہ کلام اپنی کتابوں میں نقل کیا ان میں سے طبری نے اپنی مشہور کتاب میں ۳۸ھ کے واقعات میں اور ابراہیم ہلال ثقفی نے اپنی کتاب "الغارات" اور بلاذری نے "انساب الاشراف" اور مسعودی نے کتاب "مروج الذھب" میں درج کیا ہے۔ (مصادر نہج البلاغہ، جلد ا، صفحہ ۴۵۱)

www.shiabookspdf.com

نے فرمایا:

"تیری ماں تیرے سوگ میں بیٹھے اگر تو نے یہ عمل کیا تو اپنا عہد اور بیعت توڑنے کا مرتکب ہو گا اور حکم خدا کی نافرمانی کرے گا اور صرف اپنی ذات کو نقصان پہنچائے گا۔ کھل کر بات کرتا کہ میں بھی دیکھوں کہ تو کس وجہ سے اس راہ پر چل رہا ہے۔"

اس نے جواب دیا:

"اس وجہ سے کہ آپ نے حکمیت کا فیصلہ قبول کر لیا اور حق کے اجرا میں کمزوری دکھائی اور ایک ایسے گروہ پر اعتماد کر لیا جنہوں نے خود اپنے آپ پر بھی ظلم کیا۔"

امامؑ نے فرمایا:

"تجھ پروائے ہو، اب آ کر بیٹھ تا کہ تجھ سے بحث و گفتگو کروں اور جو حقائق میں جانتا ہوں تجھ سے بیان کروں تا کہ شاید تو راہ حق کو پہچان لے اور اس طرف پلٹ آئے۔"

خریت نے کہا:

"میں کل آؤں گا۔"

امامؑ نے فرمایا:

"جا لیکن ہوشیار رہ کہیں شیطان تجھے دھوکا نہ دے جائے اور نادان افراد تیری فکر پر اثر انداز ہو جائیں۔ خدا کی قسم! اگر تو نے میری بات غور سے سنی تو تجھے راہ راست کی طرف ہدایت کر دوں گا۔"

خریت خدمت امامؑ سے نکل کر اپنے قبیلے کی طرف روانہ ہو گیا۔ امامؑ نے اس خیال سے کہ کہیں وہ کوئی فساد برپا نہ کرے، ایک شخص کو اس کے پیچھے بھیجا اور حکم دیا کہ خریت کو "دیر ابوموسیٰ" کے مقام پر روکے۔ اس کے بعد ایک دوسرا نمائندہ "معقل بن قیس" خریت کے تعاقب میں روانہ کیا۔ خریت نے ان سے جنگ کی اور مارا گیا۔ اس کے ساتھی اسیر کر لیے گئے۔ ان اسیروں میں جو مسلمان تھے، انہیں رہا کر دیا گیا اور جو غیر مسلم تھے انہیں اسیر رکھا گیا۔ جب ان اسیروں کو کوفہ لایا جا رہا تھا تو "مصقلہ بن ہبیرہ" نے جو امیر المومنینؑ کی طرف سے راستہ میں پڑنے والے شہر کا حاکم تھا، ان اسیروں کو معقل نے پانچ لاکھ درہم میں خرید کر آزاد کر دیا۔ امامؑ نے اس کے اس عمل کی توصیف کی۔ مصقلہ نے دو لاکھ درہم ادا کیے اور باقی رقم کی ادائیگی کا بندوبست نہ کر سکا اور سزا کے خیال سے خوفزدہ ہو کر شام کی طرف فرار کر گیا۔ امامؑ نے اس موقع پر یہ جملے کہے جس پر ہم گفتگو کر

www.shiabookspdf.com

رہے ہیں جو ایسے افراد پر امام علیہ السلام کے لطف و کرم کی ایک روشن دلیل ہے۔[1]

قَبَّحَ اللهُ مَصْقَلَةَ فَعَلَ فِعْلَ السَّادَةِ وَ فَرَّ فِرَارَ الْعَبِيدِ فَمَا أَنْطَقَ مَادِحَهُ حَتَّى أَسْكَتَهُ وَ لَا صَدَّقَ وَاصِفَهُ حَتَّى بَكَّتَهُ وَلَوْ أَقَامَ لَأَخَذْنَا مَيْسُورَهُ وَ انْتَظَرْنَا بِمَالِهِ وُفُورَهُ۔

"خداوند متعال مصقلہ کو رسوا کرے، اس نے سرداروں والا کام کیا مگر غلاموں کی طرح فرار ہو گیا، ابھی مدح کرنے والوں کی زبانیں اس کی مدح میں کھلی نہیں تھیں کہ اس نے انہیں ساکت کر دیا اور ابھی تعریف کرنے والوں کی بات کی عمل کے ذریعے تصدیق نہیں کی تھی کہ اپنی حرکت سے انہیں خاموش کر دیا۔ اگر وہ مجبور ہو گیا تھا تو ہم جو کچھ اس کی طاقت میں ہوتا اس سے قبول کر لیتے اور باقی کے لیے اسے مہلت دے دیتے۔" (یعنی جو ادائیگی وہ کر سکتا ہم قبول کر لیتے باقی ادائیگی کے لیے مہلت دیتے)

شرح وتفسیر

فراری بزرگوار

امامؑ نے مصقلہ (جو فارس کے ایک اہم شہر اردشیر خرہ کا حاکم تھا) کے شام کی طرف فرار ہونے کی خبر سن کر فرمایا

"قَبَّحَ اللهُ مَصْقَلَةَ! فَعَلَ فِعْلَ السَّادَةِ وَفَرَّ فِرَارَ الْعَبِيدِ"

"خدا مصقلہ کو روسیاہ کرے۔ اس نے پہلے سرداروں والا کام کیا مگر پھر غلاموں کی طرح بھاگ گیا۔"

اس نے بنی ناجیہ کے اسیروں کو خرید کر آزاد کر کے ایک اہم انسانی کام انجام دیا تھا کیونکہ اس نے انسانوں کو اسیری سے رہائی دلوائی تھی تا کہ وہ آزادانہ زندگی بسر کر سکیں، لیکن اس کے بعد بجائے اس کے کہ بیت المال کی اس کے ذمہ باقی رہ جانے والی رقم کی ادائیگی کے لیے امامؑ سے مہلت طلب کرتا یا پھر معافی اور بخشش کا طلب گار ہوتا اس نے غلط فیصلہ کیا اور حق سے مفرور ہو کر باطل کی پناہ میں چلا گیا اور وہ بھی ایک ایسے انسان کی جو انسانوں کو فریب دینے اور انہیں اپنی خواہشات اور لالچ کا اسیر اور غلام بنا دینے کا عادی ہے۔

یہ صحیح ہے کہ بظاہر مسئلہ یہ تھا کہ مصقلہ اپنے بیت المال کے مقروض ہونے اور نادہندگی کی سزا کے خوف سے شام کی طرف مفرور ہو گیا، لیکن یہ بھی نظر آتا ہے کہ اس میں یہ اضافہ ہو سکتا ہے کہ مصقلہ کی فرار پر آمادگی کے لیے اس خیانت سے

[1] شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید جلد ۳ ص ۱۲۸

www.shiabookspdf.com

پہلے بھی کچھ عوامل رہے ہوں، شاید اس نے ایسے پوشیدہ کام کیے ہوں جو اگر آشکار ہو جاتے تو اسے گرفتار کیا جا سکتا۔ شاید امیر المومنینؑ کا عدل اس کی برداشت سے باہر ہوتا، کیونکہ امامؑ ہمیشہ بیت المال کے اموال کے سلسلے میں انتہائی سختی سے کام لیتے تھے جو اس پر گراں ہوتا جس طرح اور بہت سے افراد کے لیے گراں تھا۔

اس کا ثبوت یہ ہے کہ اس نے اپنے ایک دوست "ذہل بن حارث" سے کہا تھا:

"اگر مجھ سے مطالبہ کرنے والا خلیفۂ ثالث یا امیر شام ہوتا تو مجھے کوئی پریشانی نہ ہوتی کیونکہ میں جانتا ہوں کہ وہ با آسانی حقِ بیت المال مجھے بخش دیتے جس طرح انہوں نے دوسروں کو لاکھوں کی رقم بخش دی ہے، لیکن میں حضرت علی علیہ السلام سے خوفزدہ ہوں کیوں کہ وہ حقِ بیت المال کے سلسلے میں بہت سخت گیر ہیں۔"

لیکن بہر حال مصقلہ کا عمل قابلِ توجیہ نہیں ہے۔ خاص طور پر اس لیے کہ اس میں واضح تضاد نظر آتا ہے۔ ایک طرف تو انسانیت کا کام کرتا ہے اور سخاوت کرتا ہے اور دوسری طرف خیانت کرتا ہے اور بزدلوں کی طرح فرار ہو جاتا ہے۔

اسی لیے امامؑ اس خطبے کے دوران فرماتے ہیں:

"فَمَا أَنْطَقَ مَادِحَهُ حَتَّى أَسْكَتَهُ، وَلَا صَدَّقَ وَاصِفَهُ حَتَّى بَكَّتَهُ." [1]

"ابھی اس کی مدح وثنا کرنے والوں نے اس کی مدح میں لب ہلائے بھی نہیں تھے کہ اس نے انہیں ساکت کر دیا اور ستائش کرنے والوں کی باتوں کی عملی تصدیق نہیں ہوئی تھی کہ انہیں خاموش ہونا پڑا۔"

اس نے آغاز میں ایسا کام انجام دیا کہ جس نے بھی سنا اس کی تعریف کی، لیکن ابھی اسیرانِ بنی ناجیہ کی اس کی ہمت اور سخاوت کی وجہ سے آزادی کی خبر پوری طرح لوگوں کے درمیان عام نہیں ہوئی تھی کہ اس کے شام کی طرف فرار کی خبر ہر جگہ پھیل گئی اور ہر شخص متعجب ہو گیا کہ کس طرح یقین کیا جائے کہ جس انسان نے اتنا بڑا کام کیا ہو وہ حاکم شام جیسے بدکار کے پاس پناہ لے اور امامؑ کا ساتھ دینے پر اس ظالم اور بیدادگر کے ساتھ کو ترجیح دے! جی ہاں عدل کا برداشت کرنا ہر کسی کے لیے آسان نہیں ہوتا۔

اس گفتگو کے آخر میں ارشاد فرمایا:

"وَلَوْ أَقَامَ لَأَخَذْنَا مَيْسُورَهُ، وَانْتَظَرْنَا بِمَالِهِ وُفُورَهُ"

(اس نے دھوکا کھایا) "اگر وہ مجبور تھا تو جو اس کی استطاعت میں تھا اس سے لے لیا جاتا اور جو باقی رہ جاتا اس کے

[1] بکّتهُ: بکت (بروزن بخت) بمعنی عصا یا اس قسم کی چیز سے مارنا ہے اس کے علاوہ اس کے معنی کسی کو ڈانٹنا اور سرزنش کرنا اور استدلال کے ذریعہ غلبہ حاصل کرنا ہے۔

www.shiabookspdf.com

لیے اسے اتنی مہلت دے دی جاتی کہ وہ ادائیگی کے قابل ہو جائے۔"

یہ ارشاد قرآن کے اس حکم کے تحت ہے جہاں ارشاد رب العزت ہوتا ہے:

"وَاِنۡ كَانَ ذُوۡ عُسۡرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيۡسَرَةٍ"[1]

"اگر قرض دار پریشانی اور تنگدستی میں ہو تو اسے اتنی مہلت دو کہ وہ ادائیگی کے قابل ہو جائے۔"

کوئی شخص یہ گمان بھی نہیں کرسکتا کہ امامؑ قرآن کے دستور کے خلاف اس معاملے میں کوئی قدم اٹھائیں گے اس لیے وہ یہ بہانہ بھی پیش نہیں کرسکتا کہ قرض کی باقی رقم کے سلسلے میں وہ امامؑ سے خوفزدہ تھا۔

اس موقع پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس انسانی فلاحی کام کی وجہ سے امامؑ نے مصقلہ کو قرض کی باقی رقم معاف کیوں نہیں کر دی اور یہ کیوں کہا کہ ہم اس کا انتظار کرتے کہ وہ باقی رقم ادا کرنے کے قابل ہو جائے۔ یہ تو واضح ہے کہ مصقلہ نے یہ قرض کا بوجھ اپنے ذاتی فائدہ کے لیے نہیں اُٹھایا تھا بلکہ ایک نیک انسانی خدمت کے لیے اٹھایا تھا۔

اس سوال کا جواب ایک نکتے پر توجہ دینے سے واضح ہو جاتا ہے۔ وہ یہ کہ اگر امامؑ اس وقت یہ عمل کرتے تو آئندہ کے لیے یہ ایک سنّت بن جاتی اور ہر حاکم اور لشکر کا سالار اپنی صوابدید پر اسیروں کو رہا کرنا شروع کر دیتا اور یہ چیز مادی امور سے قطع نظر دوسرے بہت سے ایسے امور کا موجب بنتی جو اسلامی معاشرے اور حکومت کے لیے خطرناک ثابت ہوتے۔ بالفاظ دیگر اس کی تو تعریف و ستائش ہوتی اور حکومت اسلامی کے لیے خطرہ پیدا ہو جاتا۔

مزید برآں اس قسم کی بخششیں اور عطا و سخاوت جو بیت المال سے ہوتی، بیت المال کی بنیادیں ہلا دیتی اور دورِ خلیفۂ ثالث کے خطرات دوبارہ وجود میں آ جاتے جبکہ امامؑ نے لوگوں سے وعدہ کیا تھا کہ خلیفۂ ثالث کے دور میں جو کچھ لوگوں کو ناحق بخشا گیا ہے، ان سے واپس لے لیا جائے گا۔

نکتہ

ا۔ تاریخ اسیرانِ بنی ناجیہ

ان بہت سے سوالات میں سے جو خطبہ کے سلسلے میں اکثر اٹھتے ہیں، ایک سوال یہ بھی ہے کہ کیا اسیران بنی ناجیہ مسلمان نہیں تھے؟ اگر مسلمان تھے تو پھر انہیں اسیر کیوں کیا گیا اور کیوں فدیہ لے کر رہا کیے گئے؟

---

[1] سورۂ بقرہ: آیت ۲۸۰

www.shiabookspdf.com

اس سوال کے جواب میں بنی ناجیہ کے تمام اسیروں کا واقعہ بیان کیا جارہا ہے۔ تفصیل اس طرح ہے کہ ایک شخص جس کا نام "خریت بن راشد" تھا، امیر المومنینؑ کے خلاف کھڑا ہوا اور اس نے اپنے اردگرد ایک گروہ اکٹھا کر لیا اور فتنہ وفساد پھیلانا شروع کر دیا۔ جب امامؑ کو اطلاع پہنچی تو آپ نے اپنے ایک وفادار ساتھی "معقل بن قیس" کو ایک لشکر کے ساتھ اس کے مقابلے میں روانہ کیا۔ کئی شدید جھڑپوں کے بعد خریت قتل ہو گیا اور اس کے لشکر کے بیشتر افراد بھی مارے گئے اور اس کے باقی لشکریوں کو گرفتار کر لیا گیا جن میں مسلمان بھی تھے اور غیر مسلم بھی۔ معقل نے مسلمانوں سے توبہ کروائی اور انہیں رہا کر دیا لیکن غیر مسلموں کو جنہوں نے خریت کی حمایت کی تھی اور اسلامی معاشرے میں شورش پھیلانے کا سبب بنے تھے انہیں رہا نہیں کیا۔ جس وقت یہ غیر مسلم اسیر کوفہ جاتے ہوئے "اردشیر خرہ" پہنچے جہاں "مصقلہ" امامؑ کی طرف سے حاکم تھا تو ان اسیروں نے مصقلہ کا دامن تھام لیا تھا اور اس سے اپنی رہائی کی درخواست کی۔ مصقلہ نے معقل سے ان اسیروں کو پانچ لاکھ درہم بطور فدیہ ادا کرنے کے وعدے پر خرید کر آزاد کر دیا۔

مصقلہ اس فدیے کی ادائیگی میں جس کا تعلق بیت المال سے تھا، مسلسل ٹال مٹول کرتا رہا امامؑ نے ایک شخص کو بھیج کر اسے طلب کیا وہ کوفہ پہنچا اور دو لاکھ درہم بیت المال میں جمع کروائے اور باقی ادائیگی کے لیے عذر پیش کر دیا کہ اس کے پاس اتنے وسائل نہیں کہ اتنی بڑی رقم ادا کر سکے اور انتظار میں رہا کہ امامؑ باقی رقم اسے بخش دیں گے یا معاف کر دیں گے۔

امامؑ نے اس کی اس قسم کی حمایت سے انکار کر دیا کیونکہ اگر اس موقع پر کوئی کمزوری دکھائی جاتی تو یہ دوسروں کے لیے ایک مستقل بدعت بن جاتی کہ وہ اسیروں کو رسماً خرید کر آزاد کر دیتے اور پھر بیت المال کا حق ادا نہ کرتے اور دوسرے یہ کہ خلیفہ ثالث کی بیت المال سے غلط بخششیں لوگوں کے ذہن میں جنم لینے لگتیں اور امیر المومنین علیہ السلام کی حکومت کا اصلی رخ یعنی بیت المال کے حقوق کا دفاع مسخ ہو جاتا۔

عجیب امر یہ ہے کہ "مصقلہ" کے ایک دوست نے اسے یہ پیشکش کی کہ میں تیرے قرضے کی رقم لوگوں سے جمع کر کے امامؑ کو ادا کر دیتا ہوں لیکن اس نے منع کر دیا اور کہنے لگا: "اگر خلیفہ ثالث یا امیر شام اس پیسے کے طلبگار ہوتے تو وہ سارا قرضہ مجھے بخش دیتے جیسا کہ انہوں نے دوسروں کو اس سے کہیں زیادہ رقوم بخش دی ہیں۔"

اس سے اس بات کی نشاندہی ہوتی ہے کہ شاید وہ شروع سے ہی اس تاوان کی ادائیگی کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا اور جیسا کہ نہج البلاغہ میں درج امامؑ کے ۴۳ ویں مکتوب سے مکمل طور پر واضح ہو جاتا ہے کہ وہ عملاً مکتب خلیفہ ثالث کا پیروکار تھا، اسی وجہ سے بیت المال کی رقوم لوگوں اور خاص طور پر اپنے اقارب میں تقسیم کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتا تھا۔ مختصراً ایک جملے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ فکری سوچ اور عملی نظریات کی بنا پر امیر شام کے قبیل سے تھا اور کسی طرح بھی صحبت امیر المومنینؑ

www.shiabookspdf.com

کے لائق نہیں تھا۔ ممکن ہے کہ بلند مرتبہ پر پہنچنے سے پہلے وہ کوئی باکردار شخص رہا ہو لیکن بیشتر کم ظرف افراد کی طرح بلند عہدہ پا کر اس نے اپنی روش تبدیل کر لی اور دنیا پرستی اس پر غالب آگئی۔ اسی بنا پر عدلِ امامؑ اس سے برداشت نہ ہوسکا اور بالآخر اس نے اپنے ہم فکر و ہم خیال افراد یعنی امیر شام وغیرہ سے گٹھ جوڑ کر لیا اور ان سے جا ملا۔ امامؑ نے اس کے بارے میں فرمایا: "اگر وہ رک جاتا تو ہم اسے مہلت دیتے اور بیت المال کا حق اس سے اس کی استطاعت اور قدرت کے حساب سے لیتے۔"

جو کچھ بیان ہوا اس سے مکمل وضاحت ہو جاتی ہے کہ مذکورہ اسیران مسلمان نہیں تھے۔

۲۔اتنی سخت گیری کیوں؟

دوسرا سوال جو یہاں اٹھتا ہے وہ یہ ہے کہ امامؑ نے اس موقع پر اتنا سخت موقف کیوں اختیار کیا؟

اس سوال کا جواب بھی جو کچھ اوپر بیان کیا، اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ ابتداً امامؑ نے کوئی سختی نہیں کی تھی بلکہ فرمایا: "اسے مہلت دی جا رہی ہے تاکہ اس بیت المال کے قرض کی ادائیگی کی استطاعت حاصل کر سکے۔" دوسری اہم بات یہ کہ یہ امامؑ کا ذاتی قرض نہیں تھا کہ آپ اسے معاف کر دیتے یا بخش دیتے بلکہ یہ مسلمانوں کے بیت المال کا قرض تھا جس کے معاملے میں امامؑ کسی طور رعایت سے کام نہیں لے سکتے تھے اس کے باوجود آپ نے انصاف اور رحم کا پہلو فراموش نہیں کیا۔ جب آپ کے بعض رفقاء نے یہ خیال ظاہر کیا کہ کیونکہ فدیہ کی رقم کی ادائیگی نہیں ہوئی لہٰذا جن اسیروں کو رہا کیا گیا ہے انہیں دوبارہ قید کر لیا جائے تو آپ نے فرمایا۔ "یہ عمل کسی طرح بھی منصفانہ نہیں ہے۔ ان اسیروں کو مصقلہ نے خرید کر آزاد کیا ہے۔ اب تاوان کی ادائیگی کا ذمے دار مصقلہ ہے نہ کہ یہ لوگ۔ ان کا کوئی قصور نہیں کہ پھر گرفتار کر لیے جائیں۔ [1]

---

[1] وہی مدرک مذکور۔

www.shiabookspdf.com

www.shiabookspdf.com

پینتالیسواں خطبہ

وَهُوَ بَعْضُ خُطْبَةٍ طَوِيْلَةٍ خَطَبَهَا يَوْمَ الْفِطْرِ وَفِيْهَا يَحْمَدُ اللهَ وَيَذُمُّ الدُّنْيَا [1]

یہ ایک طویل خطبے کا حصہ ہے جو امامؑ نے عید الفطر کے دن لوگوں کے درمیان بیان کیا اس میں خداوند عالم کی حمد و ثنا کی ہے اور دنیا پرستی کی مذمت بیان کی۔

خطبہ، ایک نگاہ میں

یہ خطبہ درحقیقت دو حصوں پر مشتمل ہے ایک حصے میں خداوند متعال کی حمد و ثنا بیان کی گئی ہے اور دوسرے حصے میں دنیا کی مذمت کی گئی ہے۔ لوگوں کو خبردار کیا گیا ہے کہ آخرت کے لیے زادِ راہ اور توشہ جمع کرلیں اور نظر یہ آتا ہے کہ اس طویل خطبے کا کافی قابلِ ذکر حصہ سیّد رضیؒ نے ذکر نہیں کیا جس کی وجہ سے ان دونوں حصوں میں واضح ربط نظر نہیں آتا لیکن اس علیحدگی کے باوجود دونوں حصوں میں سے ہر ایک وسیع معنی اور مفہوم کا حامل ہے اور انسان کو بیدار کرنے والا ہے۔

پہلا حصہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ غَيْرَ مَقْنُوطٍ مِنْ رَحْمَتِهِ وَ لَا مَخْلُوٍّ مِنْ نِعْمَتِهِ وَ لَا مَأْيُوسٍ مِنْ مَغْفِرَتِهِ وَ لَا

---

[1] سندِ خطبہ۔ بہت سے شارحین اور مفسرین نہج البلاغہ نے کہا ہے کہ یہ خطبہ اور خطبہ ۲۸ دونوں ایک ہی خطبے کے حصے ہیں جس میں سے سیّد رضیؒ مرحوم نے کچھ حصہ خطبہ ۲۸ میں درج کیا اور کچھ یہاں بیان کیا ہے اور باقی کا ذکر نہیں کیا۔ اس سے ایک بار پھر یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ سیّد رضیؒ مرحوم کا منشا و مقصد تمام خطبات امیر المومنینؑ کو جمع کرنا نہیں تھا بلکہ ان میں سے کچھ حصے جو ان کی نظر میں زیادہ جامعیت اور جاذبیت رکھتے تھے چن کر ایک جگہ اکٹھا کر دینا تھا۔ بہرحال سیّد رضیؒ سے پہلے مرحوم شیخ صدوقؒ نے یہ خطبہ کاملاً اپنی لافانی تصنیف "من لا یحضرہ الفقیہ" میں درج کیا ہے اور ان کے بعد مرحوم شیخ طوسیؒ نے (علامہ سیّد رضیؒ کے بعد) اپنی کتاب "مصباح المتہجد" میں درج کیا ہے۔ (مصادر نہج البلاغہ جلد ۲ صفحہ ۱۰۔۱۱)

www.shiabookspdf.com

مُسْتَنْكَفٍ عَنْ عِبَادَتِهِ الَّذِي لَا تَبْرَحُ مِنْهُ رَحْمَةٌ وَلَا تُفْقَدُ لَهُ نِعْمَةٌ۔

"تمام تعریف اس اللہ کے لیے ہے، جس کی رحمت سے ناامیدی نہیں اور جس کی نعمتوں سے کسی کا دامن خالی نہیں۔ نہ اس کی مغفرت سے کوئی مایوس ہے، نہ اس کی عبادت سے کسی کو عار ہو سکتا ہے، اور نہ اس کی رحمتوں کا سلسلہ ٹوٹتا ہے، اور نہ اس کی نعمتوں کا فیضان کبھی رکتا ہے۔"

شرح وتفسیر

خدا کی بے پایاں رحمت

امامؑ اس خطبہ کے پہلے حصے کا آغاز حمد و ثنائے الٰہی سے فرما رہے ہیں جو انتہائی پُر معنی اور وسیع مطالب کا حامل ہے۔ اس میں خداوند متعال کی چھ صفتوں کو بیان کیا گیا ہے جن میں سے ہر ایک اس کی ایسی نعمتوں کو بیان کرتی ہے جو حمد و ثنا اور اس کی پرستش کا متقاضی ہے۔ سب سے پہلے فرماتے ہیں:

"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ غَيْرَ مَقْنُوطٍ [1] مِنْ رَحْمَتِهِ"

"حمد و ثنا مخصوص ہے خداوند عالم کے لیے جس کی رحمت سے کسی کو مایوس اور ناامید نہیں ہونا چاہیے۔"

کیسے ممکن ہے کہ کوئی شخص اُس کی رحمت سے مایوس ہو جائے جبکہ وہ خود فرماتا ہے:

"وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ [2]"

"میری رحمت ہر شے پر محیط ہے۔"

اور دوسرے مقام پر پیغمبر خدا حضرت یعقوب علیہ السلام کی زبان سے بیان کرتا ہے:

"لَا يَيْأَسُ مِنْ رَوْحِ اللّٰهِ إِلَّا الْقَوْمُ الْكَافِرُونَ" [3]

"اللہ کی رحمت سے کبھی مایوس اور ناامید نہ ہونا کیونکہ صرف کافر ہی اللہ کی رحمت سے مایوس ہوتے ہیں۔"

اور عظیم پیغمبر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبان سے ارشاد ہوتا ہے:

[1] مقنوط: قنوط (بروزن قنوت) کے مادّے سے ہے۔ کتاب مفردات میں راغب کے حوالے سے اس کے معنی خیر و رحمت سے مایوس ہو جانا ہے مقنوط، بروزن ہلوط صیغہ مبالغہ ہے یعنی انتہائی ناامیدی۔

[2] سورۂ اعراف: آیت ۱۵۶

[3] سورۂ یوسف، آیت ۸۷

www.shiabookspdf.com

"وَمَنْ يَّقْنَطُ مِنْ رَّحْمَةِ رَبِّهٖٓ اِلَّا الضَّاۗلُّوْنَ [1]"۔

"سوائے گمراہوں کے کون ایسا ہے جو اُس کی رحمت سے مایوس ہو سکے۔"

اس لیے لازم ہے کہ کوئی بھی حالت ہو اور انسان کتنا ہی گناہ گار کیوں نہ ہوا سے خداوند عالم کی بارگاہ میں حاضر ہو جانا چاہیے اور کسی بھی حالت میں اس کی رحمت سے مایوس نہیں ہونا چاہیے کیونکہ یہ مایوسی کفر اور ضلالت کی طرف لے جاتی ہے اور عظیم ترین گناہ ہے۔

اس کے بعد دوسرے جملے میں فرماتے ہیں:

"وَلَا تُخْلُوْ مِنْ نِعْمَتِهٖ"

"اور کوئی جگہ اور کوئی شخص اُس کی نعمتوں سے خالی نہیں ہے۔"

جس طرح کلام مجید میں بیان ہوا:

"اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً [2]"۔

"کیا تم نہیں دیکھتے کہ خداوند جلیل نے جو کچھ آسمانوں اور زمینوں میں ہے تمہارے لیے مسخر کر دیا ہے اور اپنی ظاہری اور باطنی نعمتیں تم پر پوری کر دیں۔"

اور اس بات کو مکمل کرنے کے لیے تیسرے جملے میں مزید اضافہ کرتے ہیں: **ولا مأيوس حسن مغفرته** "اور اس کی رحمت اور مغفرت سے کوئی مایوس نہیں پلٹتا۔" کیونکہ وہ خود فرماتا ہے:

"قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ [3]"۔

"اے رسول ﷺ میرے ان بندوں سے جنہوں نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا ہے (گناہ کیے ہیں) کہہ دیجیے کہ اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہوں۔ اللہ تمہارے تمام گناہوں کی مغفرت کر دے گا وہ بہت غفور و رحیم ہے۔"

یہ قلب و ضمیر کو بیدار کر دینے والے جملے جو رحمت الٰہی کا دامن اتنا وسیع کر دیتے ہیں کہ ہر شخص خواہ کتنا ہی گناہ گار

---

[1] سورۂ حجر، آیت ۵۶

[2] سورۂ لقمان، آیت ۲۰

[3] سورۂ زمر، آیت ۵۳

www.shiabookspdf.com

کیوں نہ ہو، اس کے سائے میں پناہ حاصل کر سکتا ہے۔ یہاں تک کہ حدیثِ ختمی مرتبتؐ میں ارشاد ہوتا ہے:

"لَيَغْفِرُ اللهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مَغْفِرَةً مَا خَطَرَتْ قَطُّ عَلٰى قَلْبِ أَحَدٍ حَتّٰى إِبْلِيْسَ يَتَطَاوَلُ إِلَيْهَا"۔[1]

"خداوند کریم قیامت کے دن اپنا سایہ رحمت و مغفرت اس طرح پھیلائے گا کہ کوئی شخص اس سے باہر نہیں رہے گا یہاں تک کہ ابلیس بھی اس کی طمع کرنے لگے گا۔"

اور ایک دوسری حدیث میں سرکارِ رسالت مآبؐ فرماتے ہیں:

"خداوند رحمان و رحیم کی رحمت کے سو (۱۰۰) حصے ہیں جن سے اس نے صرف ایک حصہ اس دنیا پر نازل کیا ہے اور اپنی مخلوقات میں تقسیم کیا ہے اور انسانوں میں جو الفت و محبت اور خوبیاں موجود ہیں وہ اس ایک حصے کے اثر کی وجہ سے ہیں۔ باقی ننانوے (۹۹) حصے اس نے قیامت کے دن تقسیم کرنے کے لیے روک رکھے ہیں۔"[2]

اس کے بعد اس بنا پر کہ کہیں یہ رحمت و مغفرت کی نوید لوگوں کو اللہ کی عبادت سے غافل نہ کر دے، چوتھے جملے میں فرماتے ہیں:

"وَلَا مُسْتَنْكِفٍ[3] عَنْ عِبَادَتِهٖ"

"اس کی عبادت سے کبھی غفلت اور سرکشی نہیں کرنی چاہیے"

کیونکہ اپنی عظیم رحمت و مغفرت کی یقین دہانی کے باوجود خداوندِ عظیم کی عبادت سے غفلت اور انحراف کا انجام سوائے عذاب اور ذلت کے کچھ نہیں ہوتا جیسا کہ قرآن مجید میں ارشادِ ربّ العزت ہے:

"وَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْتَنْكَفُوْا وَاسْتَكْبَرُوْا فَيُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ وَّلَا يَجِدُوْنَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿۱۷۳﴾"[4]

"اور جو لوگ اس کا بندہ ہونے میں عار سمجھتے اور تکبر میں مبتلا تھے تو اللہ انہیں دردناک عذاب میں مبتلا کرے گا اور وہ اپنے لیے اللہ کے سوا نہ کوئی سرپرست پائیں گے نہ حمایتی ملے گا۔"

اس کے بعد پانچویں اور چھٹے جملے میں اللہ کی نعمتوں اور عنایتوں کے متعلق فرماتے ہیں:

---

[1] فی ظلال نہج البلاغہ، جلد ۱، صفحہ ۴۴۹

[2] مجمع البیان: سورۂ حمد کی ابتدا میں بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ کی تفسیر کے ذیل میں۔

[3] استنکاف، کا مادہ نکف ہے، بروزن فظم، اس کے معنی دور کرنا یا آنکھوں سے آنسوؤں کو ہاتھ سے پونچھنا یا ایک جگہ سے دوسری جگہ چلے جانا۔

[4] سورۂ نساء، آیت ۱۷۳

www.shiabookspdf.com

"اَلَّذِیْ لَاتَبْرَحُ مِنْهُ رَحْمَةٌ، وَلَا تُفْقَدُ لَهُ نِعْمَةٌ۔"

"ہر زمانے میں اس کی تازہ نعمت کا نزول ہوتا رہتا ہے۔"

یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ پچھلے جملوں میں بھی "نعمت" اور "رحمت الٰہی" کا تذکرہ ہے اور اس جملے میں بھی اسی کی تکرار ہے۔ اس پر غور کرنے سے یہ تعبیر ملتی ہے کہ پہلے رحمت و نعمت الٰہی کا ذکر کیا گیا پھر ان کی بقا اور دوام کا، تو اس سے اشارہ یہ ہے کہ یہ دونوں الگ الگ نعمتیں ہیں۔ نعمت و رحمت کا نزول ایک نعمت الٰہی ہے اور ان کا دوام اور لازوال ہونا دوسری نعمت ہے۔ نعمت اور رحمت عطائے خداوندی ہے اور ان کی ہمیشگی بھی اُس کی عنایات میں سے ہے، جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

"وَإِنْ تَعُدُّوا نِعْمَةَ اللهِ لَا تُحْصُوهَا۔"[1]

"اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہو تو یہ تمہارے لیے ممکن نہیں ہو سکتا۔"

قابلِ توجہ امر یہ ہے کہ ان دو اوصاف کا تذکرہ انسانوں کو اللہ کی عبادت سے منحرف ہونے سے روکنے کی دلیل کے طور پر کیا گیا ہے۔ یہ وہی چیز ہے جسے علم کلام میں "منعم کا شکر ادا کرنا معرفت الٰہی کا محرک بنتا ہے" کے عنوان سے بیان کیا گیا ہے۔ یہ کلمات یعنی رحمت، نعمت اور مغفرت اگرچہ ایک دوسرے سے بہت مربوط ہیں، لیکن اس کے باوجود ان میں سے ہر ایک کا اپنا مخصوص مفہوم بھی موجود ہے۔

رحمت کا معنی بہت وسیع ہے یعنی اس میں خداوند عالم کی کامل محبت جو اسے اپنے بندوں سے ہے، شامل ہے۔ خواہ وہ نعمتوں کی بخشش کے ضمن میں ہو یا گناہوں سے عفو و درگزر کی شکل میں ہو یا بالفاظ دیگر رحمت کا باقی دونوں صفات یعنی نعمت و مغفرت سے ایک خصوصی ربط اور عمومی تعلق ہے لیکن نعمت اور مغفرت اس سے جداگانہ مفہوم بھی رکھتے ہیں۔ نعمت ان مادّی اور دوسرے وسائل کے وجود سے متعلق ہے جو انسان کو صراطِ مستقیم پر کمال حاصل کرنے میں مدد دیتے ہیں اور اس سے وہ فیضیاب ہوتا ہے جبکہ مغفرت گناہوں کے اثرات کو مٹانے اور صراطِ مستقیم میں آنے والی رکاوٹوں کا دور کرنا ہے۔

دوسرا حصہ

وَ الدُّنْيَا دَارٌ مُنِيَ لَهَا الْفَنَاءُ وَ لِأَهْلِهَا مِنْهَا الْجَلَاءُ وَ هِيَ حُلْوَةٌ خَضْرَاءُ وَ قَدْ عَجِلَتْ لِلطَّالِبِ وَ الْتَبَسَتْ بِقَلْبِ النَّاظِرِ فَارْتَحِلُوا مِنْهَا بِأَحْسَنِ مَا بِحَضْرَتِكُمْ مِنَ الزَّادِ وَ لَا تَسْأَلُوا فِيهَا فَوْقَ

[1] سورہ نحل، آیت ۱۸

www.shiabookspdf.com

الْكَفَافِ وَلَا تَطْلُبُوا مِنْهَا اَكْثَرَ مِنَ الْبَلَاغِ۔

"دنیا ایک ایسی سرائے ہے جس کی پیشانی پر فنا ہونے کی تقدیر لکھ دی گئی ہے اور اس میں رہنے والوں کے لیے جلا وطن ہونا مقدر کر دیا گیا ہے۔ دنیا بظاہر سر سبز و شیریں (دل لبھانے اور جذبات ابھارنے والی) نظر آتی ہے لیکن یہ بہت تیزی کے ساتھ اپنے چاہنے والوں کی فطرت میں نفوذ کر جاتی ہے اور جو بھی اس کی طرف رغبت کی نظر ڈالے اس کے دل و دماغ اور روح تک میں گھل مل جاتی ہے۔ اس لیے ہر ممکن کوشش کرو کہ جو بہترین زادِ سفر اور توشۂ آخرت تمھیں یہاں سے حاصل ہو سکتا ہے اور فرصت عمل کی بنا پر تمہارے اختیار میں ہے، اسے حاصل کر کے یہاں سے کوچ کرو اور اس فانی دنیا کی خاطر اس کم سے کم حصے سے زیادہ طلب نہ کرو جو تمہارے لیے کفایت کر سکے اور جو تمہاری ضروریات اور حاجات سے زیادہ ہو اس کی طلب نہ کرو۔"

شرح و تفسیر

دنیا آرزوؤں کی آماجگاہ

جیسا کہ ہر صاحب بصیرت پر واضح ہے کہ دنیا کی محبت ہمیشہ انسان کے لیے راہِ سعادت پر چلنے میں سب سے بڑی رکاوٹ رہی ہے اور اس کی خیرہ چشم رنگینیاں ہر قسم کے گناہوں کا سرچشمہ ہوتی ہیں۔ امامؑ نے اس خطبے کے اس حصۂ دوّم میں دنیا کی مذمت بیان فرمائی ہے اور چھے پہلوؤں سے اس کی وضاحت کی ہے۔

پہلے فرماتے ہیں:

وَالدُّنْيَا دَارٌ مُنِيَ [1] لَهَا الْفَنَاءُ۔

"دنیا ایک سرائے ہے جس کی پیشانی پر فنا ہونے کی تقدیر لکھ دی گئی ہے۔"

جی ہاں! فنا اور زوال کے آثار دنیا کے ہر گوشہ سے جھلک رہے ہیں۔ وہ درخت جو موسم بہار میں پھولوں سے لدے ہوتے ہیں اور ان کی شاخیں برگ و بار سے آراستہ ہوتی ہیں، صرف چند ماہ بعد خزاں کا شکار ہو جاتے ہیں نہ پھول پتے ہوتے ہیں اور نہ برگ و بار۔ سب کچھ تیز ہوا کے جھونکوں سے منتشر ہو جاتے ہیں گویا کبھی ان کا وجود ہی نہیں تھا اور نہ ان پر کبھی بہار آئی تھی۔ قوی ہیکل جوان جو کل آرزوؤں اور امنگوں سے بھرپور جوانی کا لطف لے رہے تھے، آج کمزور اور ناتواں بوڑھے بن

[1] مُنِيَ: کا مادّہ مَنْی ہے بر وزن نفی، اس کا معنی منصوبہ کرنا ہے۔

www.shiabookspdf.com

چکے ہیں اور آج کے بوڑھے کل بوسیدہ ہڈیوں کی شکل میں کل آغوشِ لحد میں ہوں گے۔

حیرت انگیز امر یہ ہے کہ یہ کہنگی و فرسودگی کا عمل و قانون تمام کائنات پر محیط ہے اور صاحبان دانش اسے انتھروپی (Anthropy) سے تعبیر کرتے ہیں۔ تمام موجودات کے ایٹم بتدریج ختم ہو رہے ہیں، ان کی انرجی ختم ہو رہی ہے اور کہکشائیں اور ستارے اور ماہ و نجوم اپنے حتمی اختتام کی طرف گامزن ہیں۔

اس کے بعد امامؑ اس کا ایک دوسرا نکتہ بیان فرماتے ہیں:

"وَلِاَهْلِهَا مِنْهَا الْجَلَاءُ[1]"۔

"اس کے رہنے والوں کے مقدر میں جلاوطنی لکھی ہے۔"

دنیا کے ہر انسان کو جلد یا بدیر اس سرائے فانی کو الوداع کہنا ہے اور ایک دوسری ابدی اور جاودانی قیام گاہ کی طرف پیش قدمی کرنا ہے۔ یہ ایک ایسا حتمی امر و حکم الٰہی ہے جو مقدر کر دیا گیا ہے اور جس سے انکار کا راستہ کسی کے پاس نہیں ہے۔ اسی دلیل کی بنیاد پر قرآن میں موت کے متعلق جو آیات ملتی ہیں ان میں موت کو "یقین" کا نام بھی دیا گیا ہے کیونکہ موت پر ہر فرد کو یقین ہے چاہے وہ قیامت اور معاد کا منکر ہی کیوں نہ ہو۔

تیسری اور چوتھی صفت میں امامؑ اشارہ فرماتے ہیں:

دنیا کی پُرفریب رنگینیوں اور دل و دماغ کو بھٹکا دینے والی دلآویزیوں کی طرف جو انسانوں کی اکثریت کو اپنی طرف مائل کر لیتی ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:

"وَهِیَ حُلْوَةٌ خَضْرَآءُ"۔

یہ دنیا (بظاہر) شیریں اور سرسبز (اور دلآویز و جذبات انگیز) ہے۔

شیرینی اور مٹھاس کا تعلق ذائقے کی حس سے ہے، جب کہ سرسبزی سے لطف اندوزی کا تعلق، حسِ باصرہ اور بینائی سے ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ دنیا کی نگاہوں کو چکا چوند کر دینے والی رنگینیاں اور لذائذ عاقبت فراموش انسانوں کو اپنی طرف اس طرح کھینچ لیتے ہیں جس طرح مقناطیس لوہے کے ٹکڑوں کو اور یہی کشش انسان کو آلودہ کر دیتی ہے، لیکن یہ بھی واضح ہے کہ صرف یہی دو حسّیات انسان کو دنیا کی فریب کاریوں سے مربوط نہیں کرتیں بلکہ مختلف طریقوں سے انسان کے تمام حواس کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہیں۔ حقیقتاً ان دو گوشوں (حلوۃ خضراء) سے کنایہ ہے تمام ان جہتوں کی سمت جو انسان کے حواس خمسہ کو اپنی سمت کھینچ لیتے ہیں۔

[1]- جَلَاء- اس کے معنی ظاہر ہونے کے ہیں، شہر اور وطن سے جب لوگ باہر نکلتے ہیں تو میدان میں ظاہر ہو جاتے ہیں۔ جلاء کا ایک معنی ترکِ وطن بھی ہے۔

www.shiabookspdf.com

پانچویں اور چھٹی صفت کے بارے میں فرماتے ہیں:

"وَ قَدْ عَجِلَتْ لِلطَّالِبِ وَ الْتَبَسَتْ[1] بِقَلْبِ النَّاظِرِ".

"دنیا اپنے خواہش مندوں کی طرف بڑی تیزی سے بڑھتی ہے (اور ان میں نفوذ کر جاتی ہے) اور جو شخص اس کی طرف ملتفت ہوتا ہے اس کے قلب وروح میں سرایت کر جاتی ہے۔"

دنیا کی خاصیت یہ ہے کہ ظاہراً دور رس مفاد اور فوری منفعت کا جلوہ دکھاتی ہے اور جب انسان ان کی تلاش میں اس کی طرف آتا ہے تو یہ اس کی روح اور جان کو مسخر کر لیتی ہے اور کیونکہ اس میں بظاہر نظر فریب سرسبزی وشادابی اور دل موہ لینے والی وقتی شیرینی ہوتی ہے اس لیے انسان اس پر اس طرح فریفتہ ہوتا ہے کہ پھر اس کے عشق کے جال سے نکلنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہو جاتا ہے۔

جی ہاں جو چیز نظر فریب ہوتی ہے وہ دل فریب بھی بن جاتی ہے اور دل اس کے حصول کی خاطر تڑپتا رہتا ہے۔ یہاں کہ انسان اس دیدہ ودل کی پیدا کردہ آزمائشوں سے تنگ آ کر اس کا خواہش مند ہو جاتا ہے کہ ان دونوں سے چھٹکارہ حاصل کرے اور ایک فولادی خنجر سے آنکھوں کو ضائع کر دے تا کہ دل بھی آزاد ہو جائے (نہ کچھ دکھائی دے نہ اس کی دل میں چاہت ہو)

لوگوں کے سامنے مندرجہ بالا چھے پہلوؤں کی وضاحت کرنے اور ان کے دلوں کو اطاعت وفرمان الٰہی قبول کرنے پر آمادہ کرنے کے بعد امام علیہ السلام فرماتے ہیں:

"فَارْتَحِلُوْا مِنْهَا بِأَحْسَنِ مَا بِحَضْرَتِكُمْ مِنَ الزَّادِ وَ لَا تَسْأَلُوْا فِيهَا فَوْقَ الْكَفَافِ، وَ لَا تَطْلُبُوْا مِنْهَا أَكْثَرَ مِنَ الْبَلَاغِ[2]".

"(ان تمام وجوہات کی بنا پر تمہارے لیے بہترین راہ عمل یہ ہے کہ کوشش کرو کہ) یہاں سے جو بہترین زادراہ اور توشۂ آخرت اکٹھا کر سکتے ہو اس کے ساتھ یہاں سے کوچ کرو اور دنیا سے کم سے کم کفایت کرنے والی چیز سے زیادہ خواہش نہ کرو اور اپنی ضروری حاجات سے زیادہ اس سے طلب نہ کرو۔"

یہ مت بھولو کہ تم وہ مسافر ہو جو صرف ایک قلیل مدت کے لیے یہاں قیام پذیر ہو اور ہوشیار اور سمجھدار مسافر ایسی

---

[1] "التباس" اگر باء متعدی کے وسیلے سے ہو تو اس کے معنی کسی سے ملحق ہونا اور اُس میں گھل جانا ہوتے ہیں اور اگر "علیٰ" کے ذریعے ہو تو اس کے معنی مشتبہ ہونے کے ہوتے ہیں اور واضح یہ ہے کہ مندرجہ بالا جملے میں التباس سے اشتباہ کے معنی مراد لینا صحیح نظر نہیں آتا۔

[2] "بلاغ" دراصل کسی چیز تک پہنچنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور بلوغ کو بلوغ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ انسان عمر کے ایک مخصوص حصے تک پہنچ جاتا ہے۔

www.shiabookspdf.com

منزلوں سے آگے کے سفر کے لیے زادِ سفر اور توشہ ذخیرہ کرتے ہیں اور ان کی حتی کوشش یہ ہوتی ہے کہ صرف بہترین اور مفید ترین اشیاء اکٹھی کی جائیں اور کسی قیمت پر بھی بیکار اور غیر ضروری اشیاء کا بوجھ شامل نہیں کرتے، کیونکہ انہیں خوف ہوتا ہے کہ کہیں یہ فاضل بوجھ ان کے سفر میں دشواریاں نہ پیدا کردے۔

یہ اُس فرمان الٰہی کے مطابق ہے جس میں ارشاد ربانی ہوتا ہے:

"تَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى وَاتَّقُوْنِ يَاُولِي الْاَلْبَابِ[1]"۔

"(سفر آخرت کے لیے) زاد و توشے کا بندوبست کرو کہ بہترین زاد و توشہ تقویٰ ہے اور مجھ سے (میری نافرمانی سے) ڈرو اے صاحبانِ خرد۔"

نکتہ

کفاف اور عفاف ہر چیز سے افضل ہے

اس خطبے میں اس دنیوی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی طرف مختصر لیکن جامع جملوں، میں اشارہ کیا گیا ہے۔

پہلے یہ کہ اس دنیا کی فطرت میں فنا پزیری شامل ہے اور تمام انسانوں کو خواستہ ناخواستہ یہاں سے چلے جانا ہے اور فنا کے گھاٹ اُتر جانا ہے۔

دوسرے یہ کہ دنیا ظاہری طور پر بہت دلفریب اور پرکشش ہے اور اس میں بلا کی جاذبیت و مٹھاس ہے اسی لیے کوتاہ بین و کم عقل افراد اس کے جال میں بہ آسانی پھنس جاتے ہیں جبکہ خردمند اور ہوش مند افراد اس کے جال سے بچ نکلتے ہیں۔ اس کے علاوہ دنیا کی محبت اس طرح بتدریج انسان کے دل و دماغ کو اپنی گرفت میں لیتی ہے کہ اس کی روح اور پورے وجود کا حصہ بن جاتی ہے اس لیے ایسے افراد کے لیے اس دنیا سے رخصت ہونے کا خیال ہی وحشت ناک اور روح فرسا ہوتا ہے۔

امامؑ نے اس مقام پر حُبِّ دنیا سے نجات اور یہاں موجود نظر نہ آنے والے خطرات جو انسان کی عاقبت برباد کر سکتے ہیں ان سے محفوظ رہنے کے لیے ایک موثر لائحہ عمل عطا کیا ہے اور وہ کفاف و عفاف پر قناعت کرنا ہے۔

---

[1] سورۂ بقرہ: آیت ۱۹۷

www.shiabookspdf.com

کفاف[1] اور عفاف سے مراد یہ کہ انسان اپنی حیاتِ دنیوی میں کم سے کم چیز پر، جو زندگی بسر کرنے کے لیے کافی ہو قناعت کرے، زیادہ کی ہوس نہ کرے اور حرام و ناجائز اموال سے دامن بچائے، کیونکہ صرف اسی طرح اس کی زندگی بھی سکون سے گزرے گی اور سفرِ آخرت بھی آرام و سکون سے طے ہوگا۔ کیونکہ انسان حرص و لالچ اور اپنے حق سے زیادہ طلب گار ہونے کی وجہ سے اکثر بدبختیوں کا شکار رہتا ہے۔

البتہ یہ بھی ذہن نشین رہے کہ اگر انسان اضافی مادّی وسائل کا خواہش مند اس غرض سے ہو کہ ان کے ذریعے ایسے افراد کی مدد اور اعانت کر سکے جو مستحق بھی ہیں اور ان وسائل سے محروم بھی، تو یہ نہ صرف کفاف اور عفاف کے منافی نہیں ہے بلکہ ان کو تقویت دینے کا ایک وسیلہ بھی ہے۔

قرآن مجید بھی اس سلسلے میں تمام انسانیت کے لیے فرمان جاری کرتا ہے، ارشادِ ربّ العزت ہوتا ہے:

"یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَیِّبٰتِ مَاۤ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ۝" [2]

"اے صاحبانِ ایمان! اللہ نے جو پاک و پاکیزہ چیزیں تمہارے لیے حلال کی ہیں انہیں خود پر حرام نہ کرو اور حد سے تجاوز نہ کرو بے شک اللہ تجاوز کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔"

یہی مطلب بہت سی اسلامی احادیث میں بھی وسیع تر معنوں میں بیان کیا گیا ہے۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے یہ مختصر لیکن انتہائی جامع دُعا آنحضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کی ہے، آنحضرتؐ دعا فرماتے ہیں:

"اَللّٰهُمَّ ارْزُقْ مُحَمَّدًا وَآلَ مُحَمَّدٍ وَمَنْ أَحَبَّ مُحَمَّدًا وَآلَ مُحَمَّدٍ الْعِفَافَ وَالْكَفَافَ" [3]

"خداوند تعالیٰ! محمدؐ و آلِ محمد علیہم السلام کو اور ان لوگوں کو جو محمدؐ و آلِ محمد علیہم السلام سے محبت کرتے ہیں عفاف و کفاف مرحمت فرما۔"

ایک دوسری حدیث میں امیر المومنین علیہ السلام سے روایت ہے:

"قَلِیْلٌ یَکْفِیْ خَیْرٌ مِّنْ کَثِیْرٍ یُرْدِیْ"

"وہ قلیل مال جو تمہاری زندگی کے لیے کفایت کر سکے بہتر ہے مال کی زیادتی سے کہ یہ انسان کو ہلاکت کی راہ پر

---

[1] کفاف: سے مراد کسی چیز کو ہاتھ کی ہتھیلی سے دور کرنا اور بمعنی دیگر منع کرنا ہے اسی لیے نابینا افراد کو "مکفوف" کہا جاتا ہے کیونکہ اس سے بصارت دور ہو جاتی ہے۔ کفافہ ایسے افراد کے گروہ کو بھی کہا جاتا ہے جن کے پاس زندگی گزارنے کے لائق آذوقہ ہو اور وہ لوگوں سے بے نیاز ہو جائیں۔

[2] سورۂ مائدہ، آیت ۸۷

[3] اصول کافی: ج ۲، ص ۱۴۰

www.shiabookspdf.com

گامزن کر سکتا ہے۔"[1]

اصولی طور پر اگر کوئی شخص زندگی میں ضرورت کی حد تک قناعت کرے تو وہ پرہیزگاری، عفت اور بہرہ ور ہو جاتا ہے۔ بصورتِ دیگر میں وہ غالباً گناہوں سے آلودہ ہو سکتا ہے۔ امیر المومنینؑ فرماتے ہیں:

"مَنِ اقْتَنَعَ بِالْكَفَافِ اَدَّاهُ اِلَى الْعِفَافِ۔"[2]

"جو مقدار کفایت پر قانع ہو گیا وہ راہ عفت و پاکیزگی کی طرف ہدایت پا گیا۔"

مزید یہ کہ زندگی کے لیے ضرورت کی حد تک اموال پر قناعت کرنا اپنے معنوی اور اخلاقی گوشوں کے علاوہ انسان کی زندگی میں آسانی اور راحت کا سبب بھی ہوتا ہے جو اسے اسی دنیا میں حاصل ہو جاتا ہے۔ نہج البلاغہ کے کلمات قصار میں مولاؑ فرماتے ہیں:

"وَمَنِ اقْتَصَرَ عَلَى بُلْغَةِ الْكَفَافِ فَقَدِ انْتَظَمَ الرَّاحَةَ وَتَبَوَّأَ خَفْضَ الدَّعَةِ۔"[3]

"جس شخص نے مقدار قلیل پر اکتفا کیا اس نے راحت و آسائش حاصل کر لی اور آرام و سکون سے زندگی بسر کر لی۔"

مثال کے طور پر جو افراد بہت پرخور ہوتے ہیں وہ بہت زیادہ فربہی کا شکار ہو جاتے ہیں، کیونکہ وہ ہر موقع اور جگہ پر دوسروں سے بہت زیادہ کھاتے ہیں جس کے نتیجے میں ان کے جسم پر گوشت کی تہہ چڑھتی جاتی ہے جس کا اضافی بوجھ انہیں اٹھانا پڑتا ہے یہاں تک کہ ان میں چلنے پھرنے کی قوت بھی باقی نہیں رہتی اور چند قدم چل کر ہی ان کی سانس قابو سے باہر ہو جاتی ہے نتیجتاً صحت و سلامتی رہتی ہے نہ کوئی آرام و آسائش۔

اس گفتگو کو ہم حضرت امام زین العابدین علیہ السلام سے روایت شدہ ایک حدیث پر ختم کرتے ہیں۔ امامؑ فرماتے ہیں:

"رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک مرتبہ ایک صحرا سے گزر رہے تھے کہ ایک ساربان نظر آیا جو اپنے اونٹ چرا رہا تھا، اس کی اونٹنیوں کے تھن دودھ سے بھرے ہوئے تھے، اس کے پاس دودھ سے بھرا ہوا ایک برتن بھی تھا، حضورؐ نے اس سے کچھ دودھ مانگا، اس ساربان نے صاف انکار کر دیا اور کہنے لگا، یہ دودھ جو میرے برتن میں ہے میرے خاندان والوں کے لیے دن کی غذا ہے اور جو دودھ اونٹنیوں کے تھنوں میں ہے وہ رات کے لیے ہے۔"

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

---

[1] غرر الحکم، حدیث نمبر: ۲۳۴

[2] غرر الحکم، حدیث نمبر: ۲۸۶

[3] نہج البلاغہ، کلمات قصار، حکمت ۳۷۱

www.shiabookspdf.com

"اے خدا اس کے مویشیوں اور اولاد میں ترقی عطا فرما۔"

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کچھ آگے گئے تو ایک چرواہا نظر آیا جو اپنی بکریاں چرا رہا تھا، اس کے پاس بھی ایک برتن میں دودھ تھا، حضورؐ نے اس سے بھی وہی فرمائش کی، اس نے نہ صرف برتن کا دودھ، بلکہ دوسرے برتن میں مزید دودھ بکریوں سے دوہ کر پیش کیا، اس کے ساتھ ہی ایک بھیڑ بھی حضور کو نذر کی اور کہنے لگا:

"یہ میری طرف سے ہدیہ ہے، حضورؐ فرمائیں تو میں اس میں اضافہ کردوں۔"

حضورؐ نے دعا کی:

"خداوندا! اسے بہ قدر کفایت روزی عطا کر۔"

اصحاب میں سے کسی نے حیرت سے پوچھا:

یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جس شخص نے آپ کا سوال رد کر دیا اور کنجوسی دکھائی اسے تو آپ نے ایسی دعا دی، جو ہم سب کو بھی بہت عزیز ہے اور ہم بھی اپنے اموال اور اولاد میں اضافہ چاہتے ہیں، لیکن جس شخص نے سخاوت کا مظاہرہ کیا اور آپ کی طلب سے زیادہ پیش کیا اسے آپ نے ایسی دعا دی جو ہمیں بھی پسند نہیں آسکتی اور جس سے ہمیں کراہیت ہے۔"

اس کے جواب میں سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک انتہائی جامع جملہ ارشاد فرمایا:

"إِنَّ مَا قَلَّ وَ كَفٰى خَيْرٌ مِمَّا كَثُرَ وَ أَلْهٰى; اَللّٰهُمَّ ارْزُقْ مُحَمَّدًا وَ آلَ مُحَمَّدٍ الْكَفَافَ۔

"وہ کم مقدار جو انسان کی زندگی کے لیے کافی ہو بہتر ہے، اس مال کی کثرت سے جو انسان کو خدا سے غافل کر دے۔ خداوندا! محمدؐ و آل محمد علیہم السلام کو بہ قدر کفایت روزی عطا فرما۔"[1]

[1] شرح نہج البلاغہ: علامہ خوئی، ج۴، ص۳۴۹

www.shiabookspdf.com

چھیالیسواں خطبہ

ومن کلام له علیه السّلام [1]

عِنْدَ عِزْمِهِ عَلَی الْمَسِيْرِ إِلَی الشَّامِ وَهُوَ دُعَاءٌ دَعَا بِهِ رَبَّهُ عِنْدَ وَضْعِ رِجْلِهِ فِي الرِّكَابِ

امامؑ نے یہ دعا اس وقت مانگی جب آپ (امیر شام اور اہل شام کے فتنے کو دور کرنے کے لیے) شام کا سفر شروع کر رہے تھے آپ نے گھوڑے کی رکاب میں پیر رکھ کر یہ دعا تلاوت کی۔

خطبہ، ایک نگاہ میں

یہ خطبہ بہتر ہے کہ اسے دعا کہا جائے، جو باوجود انتہائی مختصر ہونے کے انتہائی پرکشش اور گہرے مطالب کی حامل ہے۔ سب سے پہلے امامؑ نے ان تمام مشکلات کو جو اس سفر میں درپیش ہوسکتی ہیں، تین عنوانات کے تحت بیان کیے ہیں اور ان سے خدا کی پناہ مانگی ہے۔

پھر خداوند عالم کی، سفر کے ساتھی اور اپنے پیچھے رہ جانے والے افراد خانہ کے نگہبان کے عنوان کے تحت توصیف کی ہے، جو دلیل ہے دعا کے حصہ اوّل پر کہ جو ایک ایسی توصیفِ الٰہی پر مبنی دعا ہے، جو سوائے ربّ العزّت کے کسی اور کے لیے

---

[1] خطبے کی سند: اس کلام کو بعض ایسے لوگوں نے نقل کیا ہے جو کہ سید رضیؒ سے پہلے زندگی کرتے تھے۔ منجملہ نصر بن معاویہ کے ساتھ جنگ کرنے کے لیے کوفہ سے شام روانہ رہے تھے اس وقت آپؑ نے یہ دعا پڑھی۔

جس طرح سید رضیؒ نے اس کلام کے ذیل میں فرمایا ہے، اس کا پہلا حصہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے اور امیر المومنین حضرت علیؑ نے دیگر جامع جملوں کے ذریعے اس کی تکمیل کی ہے۔ اعثم کوفی نے اپنی کتاب "الفتوح" میں ذکر کیا ہے اور قاضی نعمان مصری نے اس دعا کو بعض اضافات اور اختلاف کے ساتھ کتاب دعائم الاسلام میں نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ امامؑ جب بھی کسی سفر پر جاتے تھے تو اس دعا کی تلاوت کرتے تھے۔ (نہج البلاغہ ج ۲ صفحہ ۱۲)

www.shiabookspdf.com

تصور بھی نہیں کی جاسکتی ۔صرف ذاتِ پروردگار ہے کہ جو پوری کائنات کو احاطہ کیے ہوئے ہے۔

"اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ مِنْ وَعْثَاءِ السَّفَرِ وَ کَاٰبَةِ الْمُنْقَلَبِ وَسُوْٓءِ الْمَنْظَرِ فِی الْاَھْلِ وَ الْمَالِ وَ الْوَلَدِ اَللّٰھُمَّ اَنْتَ الصَّاحِبُ فِی السَّفَرِ وَ اَنْتَ الْخَلِیْفَةُ فِی الْاَھْلِ وَلَا یَجْمَعُھُمَا غَیْرُکَ لِاَنَّ الْمُسْتَخْلَفَ لَا یَکُوْنُ مُسْتَصْحَبًا وَ الْمُسْتَصْحَبُ لَا یَکُوْنُ مُسْتَخْلَفًا"

"بار الہا میں اس سفر میں پیش آنے والے مصائب اور تکالیف سے، غم زدہ واپسی سے اور اپنے اہل وعیال اور اموال میں کوئی تکلیف دہ امر مشاہدہ کرنے سے تیری پناہ مانگتا ہوں ۔خداوندا! تو سفر میں ہمارا رفیق اور ساتھی ہے اور ہمارے پیچھے رہ جانے والے خاندان اور اموال کا سرپرست اور نگہبان ہے اور میں تیری عظیم ذات کے علاوہ کوئی اور ذات نہیں جانتا جو بیک وقت ان دونوں امور پر قادر ہو کیونکہ جو سفر کا ساتھی ہوتا ہے وہ افراد خانہ کی نگہبانی اور سرپرستی نہیں کرسکتا اور جو گھر کا سرپرست اور نگہبان ہو وہ سفر کا ساتھی نہیں بن سکتا (صرف تُو ہی وہ تنہا ذات ہے جو ان دونوں امور پر قادر ہے)"

شرح وتفسیر

خداوندا! میں سفر کی تکالیف سے تیری پناہ مانگتا ہوں

بے شک اولیاء اللہ اور مردانِ راہ خدا ہر حال میں خدا سے لو لگائے رہتے ہیں لیکن جب انہیں کوئی مشکل درپیش آتی ہے یا کسی مہم کا سامنا ہوتا ہے تو وہ بہت زیادہ صمیم قلب اور ارتکاز ذہنی کے ساتھ اُس سے رجوع کرتے ہیں اور اپنے امور کو اس سے دعا اور توسّل سے شروع کرتے ہیں، تاکہ وہ اپنی رحمت سے ان کے لیے راہیں ہموار کردے اور دل کو قوت، روح کو تسکین اور نفس کو اعتماد کی دولت عطا کرے۔

امام علیہ السلام اُس عظیم لشکر کے پیشوا تھے، جو صفین کے میدان کی طرف رخ کرنے والا تھا، جب سواری کی رکاب میں قدم مبارک رکھا، تو خدا کی بارگاہ میں اس طرح التجا کی:

"أَللّٰھُمَّ إِنِّیْ أَعُوْذُبِکَ مِنْ وَعْثَاءِ[1] السَّفَرِ وَ کَاٰبَةِ[2] الْمُنْقَلَبِ[3] وَ سُوْءِ الْمَنْظَرِ فِی الْاَھْلِ وَ

[1] وعثاء، کا مادہ وعث ہے بروزن درس، اس کے معنی وہ نرم ریت ہے جس میں جب انسان یا کوئی حیوان چلتا ہے تو پاؤں ریت میں دھنس جاتا ہے اور اس کے لیے چلنے میں دشواری پیش آتی ہے۔

[2] کآبۃ، غم وغصہ اور بدحالی وشکستہ حالی کے معنی دیتا ہے۔

[3] منقلب، کا مادہ قلب ہے، یہاں معنی واپس پلٹنے کے ہیں اور اسم مصدر کا معنی مناسب ہے۔

www.shiabookspdf.com

الْمَالِ وَ الْوَلَدِ"

"بارالہا میں اس سفر کے رنج ومشقت اور غم آلود واپسی اور اپنے اہل وعیال اموال اور اولاد میں کوئی ناخوشگوار منظر دیکھنے سے تیری پناہ چاہتا ہوں۔"

درحقیقت جو فکر کسی مسافر کے ذہن کو سب سے زیادہ پریشان کرتی ہیں وہ تین قسم کی ہیں، جن میں سے ہر ایک کی طرف امامؑ نے اس خطبہ میں اشارہ کیا ہے:

پہلا مسئلہ سفر میں پیش آنے والی مشکلات ہیں، جن کی طرف امام علیہ السلام نے "وَعَثَاءِ السَّفَرِ" کی تعبیر سے اشارہ کیا ہے۔

دوسرا کٹھن مرحلہ سفر سے واپسی کا ہوتا ہے۔ "کَآبَةِ الْمُنْقَلَبِ" یعنی یہ فکر کہ کیا سفر سے کامیاب واپسی ہوگی اور انسان خوش حال اور اموال کے ساتھ واپس آئے گا یا ناکامی مقدر ہوگی اور انسان دل شکستہ اور خالی ہاتھ لوٹ کر آئے گا۔

اور تیسرا اہم مسئلہ: خاندان، گھر اور مال واسباب کی نگرانی سے متعلق "سُوءِ الْمَنْظَرِ فِي الْأَهْلِ وَ الْمَالِ وَ الْوَلَدِ" کی تعبیر سے اشارہ کیا ہے۔ امامؑ ان تمام امور اور مشکلات سے خدا کی پناہ طلب کرتے ہیں اور ان سب کو حل کرنے کی درخواست کرتے ہیں۔

اس کے بعد ایک ایسا خوبصورت اور دلآویز جملہ ارشاد فرماتے ہیں، جو خداوند عالم کی بارگاہ میں تمام دستِ دعا بلند کرنے والوں اور متوسلین بارگاہ رب العزت کے قلوب واذہان کو خود میں جذب کر لیتا ہے، عرض کرتے ہیں:

"أَللّٰهُمَّ أَنْتَ الصَّاحِبُ فِي السَّفَرِ، وَأَنْتَ الْخَلِيفَةُ فِي الْأَهْلِ، وَلَا يَجْمَعُهُمَا غَيْرُكَ"

"خداوند عالم تو ایک جانب ہمارا محافظ و ہم سفر ہے اور دوسری جانب ہمارے ان افراد کا بھی جنہیں ہم وطن میں پیچھے چھوڑ رہے ہیں سرپرست ونگہبان ہے اور میں تیرے علاوہ کسی اور ذات کو نہیں جانتا، جو ان دونوں امور کو بہ یک وقت انجام دے سکے۔"

جی ہاں صرف خداوند عالم کی ذاتِ پاک ہے جو زمان ومکان کی قیود سے بالاتر ہے اور ہر حال میں تمام مکان و زمان کا احاطہ کیے ہوئے ہے، اس کے لیے کوئی جگہ کسی دوسری جگہ کی نسبت قریب یا دور نہیں ہے۔ اسی سبب سے وہ سفر کے دوران ہمارا ہم سفر بھی ہوتا ہے اور اسی دوران وابستگان اور اہل وعیال واموال کے ساتھ بھی ہوتا ہے۔ کس قدر بہتر اور مفید عمل ہے کہ ہم اپنی زندگی کی باگ ڈور کسی ایسی ہستی کے سپرد کر دیں جو ہماری زندگی کے ہر پہلو اور گوشے کا احاطہ کیے ہوئے ہے اور ہر جگہ اور ہر لحہ ہمارے اور ہمارے متعلقین کے ساتھ ہے۔ اس دعا کے آخری جملے میں اس موضوع کی دلیل میں کہ سوائے

www.shiabookspdf.com

خداوندعالم کے کوئی دوسری ذات ایسی نہیں جوان دونوں حالتوں میں حاضراور موجود ہو، فرماتے ہیں:

"لِاَنَّ الْمُسْتَخْلَفَ لَا یَكُوْنُ مُسْتَصْحَباً، وَالْمُسْتَصْحَبَ لَا یَكُوْنُ مُسْتَخْلَفاً"

کیونکہ کوئی شخص جو ہمارے گھر والوں اور اموال کی نگہداشت میں ہمارا جانشین ہو ہمارا ہم سفر نہیں بن سکتا اور جو شخص ہمارا ہم سفر بن جائے وہ ہمارے گھر اور گھر والوں کی حفاظت اور نگہبانی نہیں کرسکتا۔"

جی ہاں! مادّی مخلوق (چونکہ جسم رکھتی ہے) کے لیے کوئی نہ کوئی جگہ ہے، یہی وجہ ہے کہ ایک ہی وقت میں ایک سے زیادہ مقامات پر موجودگی ممکن نہیں، کیونکہ اس کا وجود بذاتِ خود محدود ہوتا ہے۔صرف وجودِ باری تعالیٰ ہی لامحدود ہے؛ جس کے لیے نہ کوئی مکان ہے نہ سمت؛ نہ اس کے لیے ماضی ہے نہ حال اور نہ مستقبل؛ زمین وآسمان، تحت الثریٰ اور عرش العلیٰ اس کے لیے یکساں ہیں، جیسا کہ خود فرماتا ہے:

"وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنْتُمْ"[1]

"تم کہیں بھی ہو اللہ تمہارے ساتھ ہے۔"

اور دوسرے مقام پر ارشادِ ربانی ہوتا ہے:

"فَأَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللهِ"[2]

"تم جدھر بھی رخ کروگے تمہارا رخ اسی کی طرف ہوگا۔"

مرحوم سیدرضیؒ اس کلام کے آخر میں کہتے ہیں: "اس کلام کا ایک جملہ حدیث رسالت مآبؐ سے منقول ہے جسے امیر المومنین علیہ السلام نے انتہائی فصیح وبلیغ جملوں کے ساتھ مکمل کیا ہے اور وہ جملہ "لَا یَجْمَعُهُمَا غَیْرُكَ" سے آخر کلام تک ہے۔

نکتہ

فلسفۂ دعا

ہر وہ شخص جو تعلیمات اسلامی سے آگاہی رکھتا ہے، اس حقیقت سے بخوبی روشناس ہے کہ تعلیمات اسلامی میں دعا اور بارگاہ ایزدی میں تضرع وزاری سے التجا بہت بڑا مقام اور درجہ رکھتی ہیں، یہاں تک کہ بہترین عبادات الٰہی کا ایک بڑا

[1] سورۂ حدید: آیت ۴

[2] سورۂ بقرہ: آیت ۱۱۵

www.shiabookspdf.com

حصہ دعا اور تضرع وزاری سے کی جانے والی التجاؤں پر مشتمل ہے جیسا کہ دعا کو روح عبادت شمار کیا گیا ہے، حدیث نبویؐ میں ہم پڑھتے ہیں:

"اِفْزَعُوْا اِلَى اللهِ عَزَّوَجَلَّ فِيْ حَوائِجِكُمْ، وَ الْجَئُوْا اِلَيْهِ فِيْ مُلِمَّاتِكُمْ، وَ تَضَرَّعُوْا اِلَيْهِ، فَإِنَّ الدُّعَاءَ مُخُّ الْعِبَادَةِ"[1]

"اپنی حاجات کی برآوری اور مشکلات کے حل کے لیے خدا سے مدد طلب کرو، شدائد اور مصیبتوں میں اُس سے پناہ مانگو اور اُس کی بارگاہ میں تضرع وزاری کرو، کیونکہ دعا عبادت کی روح ہے۔"

دوسری حدیث میں حضور ختمی مرتبتؐ نے دعا کا تعارف، مومن کے اسلحے، دین کے ستون اور آسمانوں اور زمین کے نور کے طور پر کرایا ہے:

"قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: اَلدُّعَاءُ سِلَاحُ الْمُؤْمِنِ، وَ عَمُوْدُ الدِّيْنِ، وَ نُوْرُ السَّمٰوَاتِ وَ الْاَرْضِ"[2]

"رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ دُعا مومن کا اسلحہ، دین کا ستون اور آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔"

اور امیر المومنینؑ فرماتے ہیں:

"اَلدُّعَاءُ مَفَاتِيْحُ النَّجَاحِ، وَ مَقَالِيْدُ الْفَلَاحِ"[3]

"دعا فتح مندی کی کلید اور مقاصد کے حصول کا وسیلہ ہے۔"

یہ مسئلہ اس قدر اہم اور سنگین ہے کہ قرآن مجید میں واضح طور پر کہا گیا:

"قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّيْ لَوْلَا دُعَآؤُكُمْ"[4]

"اے رسولؐ! ان سے کہہ دیجیے کہ اگر تمہاری دعائیں نہ ہوتیں تو میرا رب تمہاری پروا بھی نہ کرتا۔"

لیکن اس تمام صورتحال کے باوجود کچھ افراد جو فلسفۂ دعا اور اِلتجا بہ درگاہ ربّ العزّت سے ناآشنا ہیں اور نکتہ چینی کرتے ہیں، ان کے اعتراضات یہ ہیں:۔

۱۔ کبھی وہ کہتے ہیں کہ دُعا تسلیم و رضا کی روح سے معارض ہے اور ارادۂ خدا سے متصادم ہے، ہمیں لازم ہے کہ ہم اس کی مشیّت کے آگے سر تسلیم خم کریں اور جو وہ ہمارے لیے پسند کرے ہم بھی پسند کریں۔

---

[1] بحار الانوار، ج ۹۰، ص ۳۰۲

[2] اصول کافی، جلد ۲ ص ۴۶۸

[3] بحار الانوار، ج ۹۰، ص ۳۴۱

[4] سورۂ فرقان، آیت ۷۷

www.shiabookspdf.com

۲۔ کبھی کہتے ہیں کہ دعا انسان کی جد وجہد اور سعی ومحنت کو زوال پذیر کر دینے والے عوامل میں سے اہم عامل ہے کیوں کہ انسان اس کی وجہ سے محنت اور جد وجہد ترک کر کے صرف دعا مانگنے پر انحصار کرنے لگتا ہے۔

۳۔ مزید یہ کہ کیسے ممکن ہے کہ ہم دعا کے ذریعے مقدرات الٰہی کو بدل سکیں۔ اگر خدا کے علم میں ہمارے لیے کوئی امر مقدر ہو چکا ہے تو وہ ہماری دعا سے بدل نہیں سکتا اور کوئی امر مقدر نہیں ہوا، تو وہ ہماری دعا سے ظہور پذیر نہیں ہوگا۔ باالفاظ دیگر ان کا خیال ہے کہ دعا ایک فضول اور بے سود امر ہے، جس سے خداوند عالم کی مشیت میں تبدیلی نہیں ہوتی وہ خود جو مناسب سمجھتا ہے، انجام دیتا ہے اور ہماری دعاؤں سے بے نیاز ہے۔

لیکن اگر بارگاہ ایزدی میں دعا، تضرع اور نیاز مندی کا حقیقی مفہوم انسان کے ذہن میں واضح اور روشن ہو، تو اس قسم کی گفتگو کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہتی۔

دعا کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ ہم اپنی بھرپور صلاحیتوں اور کوششوں کو بروئے کار لائیں اور اس کے بعد جو چیز ہماری طاقت اور استطاعت سے باہر ہے وہ خدا کے لطف وکرم کے سپرد کر دیں اور اپنی مشکلات کے حل کے لیے اس کے سامنے دست طلب پھیلائیں۔ یہی مفہوم ہے اس آیہ کریمہ کا

"أَمَّنْ يُجِيبُ الْمُضْطَرَّ إِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوءَ"۔[1]

"بھلا وہ کون ہے کہ جب مضطر اُسے پکارے تو دُعا قبول کرتا ہے اور مصیبت کو دور کرتا ہے۔"

جب شدید پریشانیاں گھیر لیں اور انسان اپنی تمام کوششوں اور جد وجہد کے باوجود کوئی جائے مفر نہ پائے تو پھر چارہ سازی کے لیے بارگاہِ ربّ العزّت کے در پر آئے اور دستِ دعا بلند کرے۔ یہی بات تصریحی طور پر اسلامی روایات میں بیان کی گئی ہے اور واضح طور پر کہا گیا ہے کہ سست و بے عمل اور ناکارہ افراد محروم رہیں گے اور ان کی دعائیں مقبول نہیں ہوں گی۔ ایک سست اور کام سے جی چرانے والے شخص کی وسعت رزق کی دعا مستجاب نہیں ہوسکتی، اسی طرح اگر کوئی شخص بغیر کسی تحریر اور گواہی کے اپنا مال کسی کو قرض دے اور مقروض انکار کر دے تو قرض خواہ کی دعا اس سلسلے میں قبول نہیں ہوگی۔ خلاصہ یہ کہ بے عملی اور سستی اور بے عقلی کا علاج دعا سے نہیں ہوسکتا۔

اس نکتے پر غور کرنے سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ دعا نہ صرف یہ کہ سستی اور بے عملی کا سبب نہیں بنتی بلکہ درحقیقت آخری حد اور لمحے تک جد وجہد کا سبق دیتی ہے۔ (غور فرمائیے)

اس کے علاوہ یہ جو کہا جاتا ہے کہ دعا سے مقدرات الٰہی نہیں بدلتے تو اس کا جواب واضح اور روشن ہے، دعا انسان کی

[1] سورۂ نمل، آیت ۶۲

www.shiabookspdf.com

صلاحیتوں اور قابلیت میں اضافے کا سبب ہوتی ہے کیوں کہ جب وہ بارگاہِ ربّ العزّت میں حاضر ہوتا ہے تو انوارِ معرفت اُس کے قلب و ذہن اور روح کو جلا بخشتے ہیں۔ وہ اپنے گناہوں پر ندامت کا اظہار کر کے ان سے توبہ کرتا ہے کیوں کہ توبہ قبولیت دعا کی اوّلین شرط ہے اور اس طرح لطف پروردگار حاصل کرنے کی صلاحیت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اور نتیجتاً خداوند عالم کی تازہ عنایات اس کے شامل حال ہو جاتی ہیں۔

بہ الفاظ دیگر خداوند متعال کے پاس بے شمار نعمتیں اور برکتیں ہیں جو بندگان الٰہی کے شامل حال ہو سکتی ہیں لیکن اس کی شرط یہ ہے کہ بندہ بارگاہ خداوندی میں حاضر ہو اور اس کے آگے دست دعا پھیلائے، اپنی روح کو دنیاوی تعلقات سے آزاد کر کے اس کی قربت اختیار کرے۔ اس طرح دعا کے پرتو میں انسان وہ تمام شرائط پوری کر دیتا ہے جو رحمت الٰہی کے حصول کی ضامن ہوتی ہیں اور نتیجتاً اس پر باران رحمت کا نزول ہونے لگتا ہے۔

جو کچھ اوپر کہا گیا وہ اس بات کا جواب ہے کہ دُعا تسلیم و رضا کی روح کے منافی ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی واضح رہے کہ دعا بجائے خود تسلیم و رضا کی تاکید کرتی ہے کیونکہ خود خداوند عالم اس کا خواہش مند ہے، کہ اس کے بندے دعا کے وسیلے سے اُس کا تقرب حاصل کریں تا کہ اُس کی رحمت و برکت سے زیادہ سے زیادہ مستفیض ہو سکیں۔ اسی وجہ سے آیات الٰہی اور روایات میں بار بار دعا کی تاکید کی گئی ہے بلکہ شرائط دعا کی پابندی پر قبولیت کا وعدہ بھی کیا گیا ہے۔

مختصراً یہ کہ دعا انسان کی تربیت کے لیے بہترین اثرات رکھتی ہے۔ اس کی روح و جان کی نگہداشت کرتی ہے اور مادی دنیا کی کثافتوں کو اس سے دور کرتی ہے۔ اسے نیکی، پاکیزگی اور بہترین صفات انسانی کے ساتھ خدا سے نزدیک کر دیتی ہے۔

دعا اور التجا کی روح انسان کی پرورش اور بہتری کی تاثیر ہمارے اس عصر جدید میں ایک تازہ قوت کے ساتھ سامنے آئی ہے۔ یہاں تک کہ عہد جدید کے طبیب و ماہرین نفسیات بھی اس کی اہمیت کے زیادہ قائل ہوتے جا رہے ہیں اور اسے انسانی مشکلات کے حل کا ایک اہم وسیلہ سمجھنے لگے ہیں۔ ایک مثال کے بیان کے ساتھ ہم اس گفتگو کو اختتام تک پہنچاتے ہیں۔

مشہور فرانسیسی مفکر اور دانشور "الیکس کارل" اپنی مشہور کتاب "عبادت" میں اس طرح رقم طراز ہوتا ہے: "دعا اور عبادت جہاں ایک طرف آرام و سکون قلب و جسم کا سبب بنتی ہے، وہیں دوسری طرف انسان کی ذہنی فعالیت میں ایک اہم شگفتگی اور باطنی انبساط پیدا کرتی ہے اور کبھی کبھی انسان میں شجاعت اور دلاوری کے جذبات ابھارتی ہے۔ دعا اور عبادت اپنے خصائل اور اثرات کا بہت ہی واضح طور پر افراد کے ذریعے اظہار کرتے ہیں، مثال کے طور پر قلب و نظر کی جلا، راہِ اعتدال کا اختیار کرنا، اندرونی تازگی و فرحت، پر یقین چہرہ، ہدایت کی استعداد اور حوادث کا ثابت قدمی سے سامنا کرنا، یہ وہ

www.shiabookspdf.com

خصائص ہیں جو اپنے وجود سے ہماری روح کی گہرائیوں میں ایک پوشیدہ خزانہ بن جاتے ہیں اور اس کی بدولت پسماندہ اور کم استعداد کے حامل افراد بھی اس قابل ہو جاتے ہیں کہ اپنی عقل اور اخلاق کو بہتر طور پر استعمال کر سکیں اور ان سے بہرہ ور ہو سکیں لیکن صد افسوس کہ ہماری دنیا میں ایسے افراد جو دعا کا حقیقی چہرہ شناخت کر سکیں، بہت کم ہیں۔"[1]

بہر حال دعا اور عبادت اگرچہ ہر زمانے اور ہر وقت بہت بہتر ہے لیکن اُس وقت جبکہ انسان کو کسی بڑی مہم کو انجام دینا ہو اور اسے انسانی توانائی، طاقت اور مدد کی ضرورت ہو تو اس کی اہمیت فزوں تر ہو جاتی ہے۔

اسی دلیل کی بنیاد پر اولیاء اللہ اہم مہمات کو انجام دینے کی راہ ہموار کرنے کے لیے درگاہِ ربّ العزّت میں ہاتھ پھیلاتے ہیں اور اُس کی بارگاہ میں دعا و تضرع وزاری اور اُس کی یاد سے تقویت حاصل کرتے ہیں، اُس کی ذات پاک پر توکل کر کے سکون و اطمینان پاتے ہیں اور عظیم ترین مشکلات سے خوف کھائے بغیر اور بغیر کسی وسوسے کے ان مشکلات سے نبرد آزمائی کے لیے نکل کھڑے ہوتے ہیں کیوں کہ ارادۂ حق کے مقابلے میں ہر مشکل کو آسان سمجھتے ہیں۔

بالخصوص کسی مشکل اور کٹھن سفر پر روانگی کے وقت اپنے اور اپنے اہل عیال کے حق میں دعا مانگنا ان کے سفر کا رہنما اور پشت پناہ بنتا ہے اور جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ امام امیر المومنین علیہ السلام نے صفین کی طرف سفر شروع کرنے سے پہلے خداوند عالم کی بارگاہ میں مندرجہ بالا دعا کے لیے دست مبارک بلند کیے اور خدا سے پناہ طلب کی تو آپؑ نے درحقیقت سنت رسولؐ اور سیرتِ انبیائے ماسبق پر عمل کیا تھا۔

جس وقت حضرت نوح علیہ السلام اُس ہولناک طوفان کے موقع پر کشتی پر سوار ہوئے تو رب العزت نے ایسے مواقع کے لیے ایک دائمی اور ابدی دستور دیا کہ درگاہِ خداوندی میں دست دعا بلند کرو اور اپنی نجات کے لیے اُس سے کمک اور اعانت طلب کرو:

فَاِذَا اسْتَوَيْتَ اَنْتَ وَمَنْ مَّعَكَ عَلَى الْفُلْكِ فَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ نَجّٰىنَا مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۸﴾ وَقُلْ رَّبِّ اَنْزِلْنِيْ مُنْزَلًا مُّبٰرَكًا وَّاَنْتَ خَيْرُ الْمُنْزِلِيْنَ ﴿۲۹﴾[2]

"جب تم اور تمہارے ساتھی کشتی میں سوار ہوں تو کہو، تمام حمد وستائش اس ذات واجب کے لیے ہے جس نے ہمیں ان ظالموں سے نجات دی اور کہو اے ہمارے ربّ! ہمیں ہماری منزل پر اپنی برکت کے ساتھ پہنچا دے اور تو بہترین پہنچانے والا ہے۔"

[1] کتاب: "عبادت"
[2] سورۂ مومنون، آیت ۲۸، ۲۹

www.shiabookspdf.com

اور جب حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کے خوف سے مصر سے نکلے اور مدائن کا قصد کیا تو کہا:

"وَلَمَّا تَوَجَّهَ تِلْقَآءَ مَدْيَنَ قَالَ عَسٰى رَبِّيْٓ اَنْ يَّهْدِيَنِيْ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ﴿۲۲﴾"۔[۱]

"جب حضرت موسیٰؑ فرعون کے کارندوں کے خوف سے مصر سے نکل رہے تھے اور مدائن کی طرف روانہ ہو رہے تھے تو فرمایا: "مجھے امید ہے کہ میرا پروردگار مجھے راہِ راست کی طرف ہدایت فرمائے گا۔"

اور جب مدائن کے دروازے پر پہنچے اور دختران شعیب کی مدد کی، ان کے گوسفندوں کو پانی پلا چکے، تو ایک سایہ دار جگہ میں بیٹھ گئے اور بارگاہ الٰہی میں عرض کی:

"رَبِّ اِنِّيْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَيَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيْرٌ"۔[۲]

"خداوندا! تیری جانب سے مجھ پر جو بھی نیکی اور خیر نازل ہو، میں اس کا محتاج ہوں۔"

اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کے تاریخی سفر کے لیے نکلے جو انتہائی پر خطر اور ہولناک تھا اور آپ اپنے وطن، مکہ اور خانہ خدا سے مفارقت کے سبب سے انتہائی غمگین اور رنجیدہ بھی تھے اور دل میں اس جگہ واپس آنے کی آرزو کر رہے تھے کہ وحی ربانی سے اس کی بشارت ملی اور یہ آیہ کریمہ نازل ہوئی:

"اِنَّ الَّذِيْ فَرَضَ عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّكَ اِلٰى مَعَادٍ"۔[۳]

"وہ ذات کہ جس نے قرآن تجھ پر فرض کیا ہے، تجھے تیرے مقام پر واپس لوٹا دے گا۔"

یہ الفاظ خود اس کی نشاندہی کر رہے ہیں کہ آنحضرتؐ اس موقع پر دعا کے لیے ہاتھ اٹھا رہے تھے یا حالت دعا میں تھے، جس کی قبولیت کی سند اللہ سبحانہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کی گئی۔ اسلامی روایات میں بھی سفر کے موقع پر دعا مانگنے کا حکم دیا گیا ہے۔[۴]

یہ کلمات امیر المومنینؑ کی اس دعا کا حصہ ہیں جو آپ نے کوفے سے شام کی طرف روانگی کے موقع پر کی تھی۔ بعض روایات کے مطابق جب آپ نے رکاب فرس میں قدم رکھا تو فرمایا: "بسم اللہ"، جب پشت فرس پر سوار ہوئے تو قرآن کی اس آیت کی تلاوت کی:

---

[۱] سورۂ قصص، آیت ۲۲

[۲] سورۂ قصص، آیت ۲۴

[۳] سورۂ قصص، آیت ۸۵

[۴] کتاب وسائل، جلد ۸، ص ۲۷۵، ۲۸۱

www.shiabookspdf.com

"سُبْحٰنَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِیْنَ ﴿۱۳﴾ وَ اِنَّاۤ اِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ ﴿۱۴﴾" [1]

"پاک و پاکیزہ ہے وہ ذات جس نے اس سواری کو ہمارے لیے مسخر کیا ورنہ ہم اس کو مطیع کرنے کی طاقت نہیں رکھتے تھے اور ہم اپنے رب کی طرف لوٹنے والے ہیں۔"

اس کے بعد حضرتؑ نے مندرجہ بالا دعا پڑھی۔

---

[1] سورۂ زخرف، آیت ۱۳

www.shiabookspdf.com

سینتالیسواں خطبہ

من کلام لہ علیہ السّلام [1]

فِيْ ذِكْرِ الْكُوْفَةِ

كَأَنِّيْ بِكِ يَا كُوْفَةُ تُمَدِّيْنَ مَدَّ الْأَدِيْمِ الْعُكَاظِيِّ تُعْرَكِيْنَ بِالنَّوَازِلِ وَ تُرْكَبِيْنَ بِالزَّلَازِلِ وَإِنِّيْ لَأَعْلَمُ أَنَّهُ مَا أَرَادَ بِكِ جَبَّارٌ سُوْءًا إِلَّا ابْتَلَاهُ اللهُ بِشَاغِلٍ وَرَمَاهُ بِقَاتِلٍ

”اے کوفہ! گویا میں تجھے دیکھ رہا ہوں کہ بازار عکاظ میں کھینچی ہوئی کھالوں کی مانند ہو گیا ہے۔ حوادث کے زیر قدم ٹھوکریں کھاتا ہوا اور پامال و درماندہ۔ اذیّت ناک حادثات تجھے اپنی گرفت میں لینے والے ہیں اور مجھے بخوبی علم ہے کہ ہر اس ظالم اور ستمگر کو جو تیرے بارے میں برا ارادہ کرے گا، خداوند عالم اسے اپنی گرفت میں لے لے گا اور اسے خود اس کی مصیبتوں میں گرفتار کر دے گا اور دست قاتل کے حوالے کر دے گا۔“

خطبہ، ایک نگاہ میں

اس کلام میں امامؑ نے دو پیش گوئیاں کوفے کے بارے میں یا کوفے اور بصرہ کے بارے میں بیان کی ہیں۔ پہلے ان بہت سے ناگوار اور تکلیف دہ حوادث کی طرف اشارہ کیا ہے جو اہل کوفہ کو بے رحم حکمرانوں اور ان کے عمال کے ہاتھوں پیش آئے تھے اور دوسرے حصے میں ان متکبر اور جبارین کا اپنے اعمالِ بد کے نتائج اور ان کے عواقب کا شکار ہونے اور بدترین

---

[1] سیّد رضیؒ سے پہلے لوگوں نے یہ خطبہ اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے۔ ان میں سے ایک ابن الفقیہ نے کتاب البلدان، میں امیر المومنینؑ کا بصرہ و کوفہ میں یہ خطاب روایت کے آخر میں ذکر کیا ہے لیکن کچھ حصے کے علاوہ باقی اصل مطلب کے ساتھ ملتا ہے۔ سید رضیؒ کے بعد زمخشری نے ربیع الابرار، باب البلاد و الدّیار، میں لکھا ہے۔ (مصادر نہج البلاغہ، جلد ۲، ص ۱۵)

www.shiabookspdf.com

انجام سے دوچار ہونے کے بارے میں اظہار کیا ہے۔

شرح وتفسیر

کوفے کے مستقبل کی پیش گوئی

جیسا کہ بیان کیا گیا امامؑ نے یہ خطبہ کوفہ یا بروایت دیگر کوفہ وبصرہ دونوں کے بارے میں بیان کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

"كَأَنِّي بِكِ يَا كُوفَةُ تُمَدِّينَ مَدَّ الْأَدِيمِ [1] الْعُكَاظِيِّ [2]"۔

عکاظ ایک بازار کا نام تھا جو مکہ کے نزدیک اور بعض مورخین کے مطابق مکہ اور طائف کے درمیان واقع تھا۔ ہرسال لوگ ایک مہینے یا بروایت دیگر بیس دنوں کے لیے یہاں جمع ہوتے تھے اور اپنا سامان تجارت خریداروں کو فروخت کرتے تھے اس کے ساتھ کثرت سے اشعار بھی پڑھے جاتے تھے اور اس طریقے سے عرب کے تمام قبائل اپنے کارناموں پر اظہار تفخر اور تبلیغ کرتے تھے۔ یہ بازار بیشتر مفاسد کی آماجگاہ رہتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ طلوع اسلام کے بعد یہ بازار اجڑ گیا۔

اب سوال یہ ہے کہ ان کلمات سے امامؑ کی مراد کیا ہے۔ آیا امامؑ نے دردناک حوادث جو اہل کوفہ کو پیش آنے والے تھے، ان کی طرف اشارہ کیا ہے یا کوفہ کی توسیع اور فروانی کی طرف اشارہ ہے؟ اس سلسلے میں دو تفسیریں ملتی ہیں۔ پہلی تفسیر بیشتر مفسرین نہج البلاغہ کے نزدیک قابل قبول ہے جبکہ تفسیر دوّم بہت کم مفسرین نے کی ہے لیکن یہ تفسیر زیادہ صحیح نظر آتی ہے کیوں کہ بازار عکاظ کی کشیدہ کھالوں سے یہ کنایہ مراد لینا کہ اس سے تلخ اور دردناک حادثات کی طرف اشارہ ہے، بادی النظر میں مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ البتہ اس سے کوفے کے غیر معمولی پھیلاؤ اور وسعت کی طرف اشارہ زیادہ مناسب محسوس ہوتا ہے۔

قابل توجہ امر یہ ہے کہ بازار عکاظ میں بیچی جانے والی کھالیں پھیلی ہوئی بھی ہوتی تھیں اور بہت خوبصورت اور

---

[1] ادیم: اصل معنی کھال اور ہر چیز کا ظاہری حصہ۔ عموماً اس کا اطلاق کھال پر کیا جاتا ہے اور زمین کا نظر آنے والا حصہ "ادمة الارض" کہلاتا ہے۔ حضرت آدمؑ کو آدم اس لیے کہا گیا کہ زمین کے اوپری خاکی حصہ کی مٹی سے تخلیق کیے گئے تھے اور "ادام" اس چیز کو کہتے ہیں جسے روٹی کے اوپر ملا جاتا ہے اور کھایا جاتا ہے۔

[2] عکاظ: جیسا کہ متن میں بیان ہوا، ایک مشہور بازار کا نام تھا جو دور جاہلیت میں مکہ کے قریب لگتا تھا اور ہر سال وہاں ہزاروں کا مجمع اکٹھا ہوتا تھا۔ یہ لفظ "عکظ" کے مادّے (بروزن عکس) سے ماخوذ ہے اور اس کے معنی کوٹنا، پامال کرنا اور اظہار تفخر کرنے کے ہیں۔

www.shiabookspdf.com

دلکش بھی اور اہل عرب کے درمیان بہت مرغوب اور مطلوب ہوتی تھیں۔ اس بنا پر ہم سمجھتے ہیں کہ اس جملے سے حضرت کی مراد کوفے کی بہت بڑھ جانے والی آبادی اور آپ کے بعد آنے والے زمانے میں کوفہ کی رونق اور زیبائش کی طرف ہے۔

بعض مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ اس جملے کا اشارہ اس طرف بھی ہوسکتا ہے کہ مستقبل میں کوفہ بہت سے حصوں اور قطعات میں تقسیم ہوجائے گا جس طرح عکاظ کی کھالیں ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے لیے پھیلائی جاتی تھیں۔

بہرحال امامؑ مزید فرماتے ہیں:

"تُعْرَكِينَ[1] بِالنَّوَازِلِ[2] وَتُرْكَبِينَ بِالزَّلَازِلِ"

"اے کوفہ تو حوادث کے زیر قدم بری طرح کچلا جائے گا اور پامال ہوگا اور تجھے شدید نقصان پہنچانے والے تجھ پر حاکم ہوجائیں گے۔"

بعینہ ایسے جملے خطبہ ۱۰۸ میں بھی ذکر ہوئے ہیں، اُس جگہ فرمایا:

"تَعْرُكُكُمْ عَرْكَ الْأَدِيمِ"

"یعنی بنی امیہ تمہیں ٹکڑے ٹکڑے کردیں گے اور تمہارے جسموں سے کھال کھینچ کر اُتار لیں گے۔"

اور دوسری پیش بینی (غالباً تیسری) میں فرماتے ہیں:

"وَإِنِّي لَأَعْلَمُ أَنَّهُ مَا أَرَادَ بِكِ جَبَّارٌ سُوءاً إِلَّا ابْتَلَاهُ اللهُ بِشَاغِلٍ وَرَمَاهُ بِقَاتِلٍ"

"میں بخوبی جانتا ہوں ہر اس ظالم اور ستمگر کو جو تیرے بارے میں ارادہ بد رکھتا ہے خداوند تعالیٰ اپنی گرفت میں لے لے گا اور اسے اپنی پریشانیوں میں مبتلا کردے گا اور دست قاتل کے حوالے کردے گا۔"

"اِبْتَلَاهُ اللهُ بِشَاغِلٍ" سے غالباً امام کا اشارہ کسی سخت اور شدید بیماری کی طرف ہے جو ظالموں کو اندرونی طور پر اتنا کمزور اور پریشان کردے کہ وہ کسی دوسرے کو نقصان پہنچانے اور پریشان کرنے کے متعلق سوچ بھی نہ سکے اس طرح "وَرَمَاهُ بِقَاتِلٍ" ایسے حوادث کی طرف اشارہ ہے جو انسان کو بیرونی اطراف سے پیش آتے ہیں اور اسے اپنا ہدف بنا لیتے ہیں اور کبھی کبھی اسے قاتلوں کے حوالے کردیتے ہیں۔

جو کچھ امیر المومنین علیہ السلام نے اس خطبے میں کوفے کے بارے میں پیش بینی کی تھی، وہ لفظ بہ لفظ پوری ہوئی اور کوفہ دور امامؑ کے بعد کافی وسیع بھی ہوا اور ہمیشہ فتنہ وفساد اور حوادثِ شدید کا شکار اور مرکز رہا بہت سے خونی جابر اور سفاک افراد

---

[1] تُعْرَكِينَ: عرک کے مادہ سے ہے (بروزن ورک) معنی پامال کردینا۔

[2] نوازل: جمع "نازلہ" عربی زبان میں شدید حادثے کو کہتے ہیں جو کسی قوم یا ملت کو پیش آئے۔

www.shiabookspdf.com

کوفے کو تسخیر کرنے اور اسے تاراج و پامال کرنے کے لیے کھڑے ہوئے لیکن خدا نے ان میں سے ہر ایک کو کسی نہ کسی بلا میں گرفتار کر دیا اور کوفہ اور اہل کوفہ کو ان کے شر سے نجات دی اور شاید یہ اس وجہ سے ہو کہ کوفہ ہمیشہ سے مومنین اور امیر المومنینؑ کے مخلص اور جاں نثار اصحاب کے ایک گروہ کا مرکز رہا ہے اگر چہ منافقین کی تعداد بھی کم نہیں رہی۔ اور اسی دلیل کی بنا پر کوفے کی فضیلت و شرف کے بارے میں متعدد روایات میں اشارہ کیا گیا ہے۔ [1]

ان تمام افراد میں سے جنہوں نے امیر المومنینؑ کے تھوڑے عرصے کے بعد کوفہ کی تخریب و تاراجی شروع کی، سب سے پہلا زیاد بن ابیہ تھا۔ کچھ روایات سے پتا چلتا ہے کہ جب وہ منبر پر بیٹھا اور خطبہ شروع کیا تو اہل کوفہ نے اس پر پتھراؤ شروع کر دیا۔ اس نے غضبناک ہو کر اسی افراد کے ہاتھ قطع کروا دیے اور یہ پختہ ارادہ کر لیا کہ ان لوگوں کے گھروں اور نخلستانوں کو آگ لگوا دے گا۔ اس نے لوگوں کو مسجد میں جمع ہونے کا حکم دیا اور انہیں امیر المومنینؑ پر تبرا کرنے کا حکم دیا، جب اسے پتا چلا کہ لوگ اس کے حکم پر عمل کرنے کے لیے تیار نہیں تو اس نے اسی انکار کو ان کے گھروں کو جلانے، لوگوں کو قتل کرنے اور شہر کو ویران اور برباد کر دینے کا بہانہ بنا لیا، لیکن اس سے پہلے کہ وہ یہ حکم جاری کرتا اس کی جانب سے ایک قاصد مسجد پہنچا اور اس نے لوگوں کو زیاد کا پیغام دیا کہ آج میں بیمار ہوں، اس لیے آپ لوگ گھروں کو لوٹ جائیں اور یہ اس وجہ سے تھا کہ وہ طاعون کی بیماری میں مبتلا ہو گیا تھا۔ وہ بری طرح تڑپ تڑپ کر چلاتا تھا کہ میرے آدھے بدن کو آگ جلا رہی ہے اور یہی تکرار کرتے کرتے وہ ہلاک ہو گیا۔

اس کی ہلاکت کے بعد جن لوگوں نے کوفے کو اپنے حملوں کا ہدف قرار دیا، ان میں اس کا بیٹا عبید اللہ بن زیاد اور حجاج بن یوسف تھے، جن میں ہر ایک اپنے سیاہ کرتوتوں اور خباثتوں کی پاداش میں بدترین انجام سے دوچار ہوئے۔ مشہور یہ ہے کہ ابن زیاد اپنی ماں کا غیر شرعی بیٹا تھا اور اس کی ماں مرجانہ ایک بدکار اور عصمت فروش عورت تھی، اسی لیے اسے ابن مرجانہ پکارا جاتا تھا۔ وہ سن ۲۸ یا ۲۹ ہجری میں پیدا ہوا اور ۳۲ سال کی عمر میں بنی امیہ کی طرف سے بصرہ اور کوفے کا گورنر بنا۔ کربلا کے خونچکاں واقعہ کے بعد اس نے اہل کوفہ پر ظلم کے پہاڑ توڑ دیے، لیکن زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ قیام امیر مختارؒ کے بعد ابراہیم بن مالک اشترؒ کے ہاتھوں ۳۹ سال کی عمر میں واصل جہنم ہوا اور مختارؒ نے اس کا سر نجس کاٹ کر امام زین العابدین علیہ السلام کی خدمت میں بھجوایا۔ جس وقت یہ سر امامؑ کے پاس پہنچا تو معصومؑ کھانا تناول فرما رہے تھے، امامؑ نے سر کو دیکھ کر سجدۂ شکر کیا اور فرمایا:

"جب ہم اس ملعون کے دربار میں پہنچے تو یہ کھانا کھا رہا تھا، اس حالت میں کہ میرے بابا کا سر اس کے سامنے رکھا

---

[1] شرح نہج البلاغہ، ابن ابی الحدید، ج ۳، ص ۱۹۹

www.shiabookspdf.com

تھا، میں نے اس وقت خدا سے دعا کی تھی کہ میں اس وقت تک دنیا سے نہ جاؤں، جب تک خود کھانا کھاتے ہوئے اس کا سر اپنے سامنے نہ دیکھ لوں۔"

تیسرا ظالم وجابر جو کوفے پر مسلط ہوا اور اہل کوفہ پر بدترین اور لرزہ خیز مظالم کیے اور انجام کار دردناک عذاب میں مبتلا ہوا اور انتہائی عبرتناک اور شدید اذیت آمیز موت کا شکار ہوا، وہ حجاج بن یوسف ثقفی تھا جو عبدالملک بن مروان کی طرف سے کوفے کا گورنر بنا۔ انسانوں پر جس ظلم و بربریت کا مظاہرہ اس نے کیا ہے، تاریخ بشریت میں اس کی مثال نہ پہلے ملتی ہے اور نہ اس کے بعد۔ اس کے مظالم کی تفصیل اور تذکرہ پڑھ کر ہر انسان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، چہ جائیکہ انہیں دیکھنا اور برداشت کرنا، یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ خداوند عالم کی طرف سے ان افراد کی اس بے وفائی اور دغابازی کا جواب تھا جو انہوں نے امیر المومنین علیہ السلام اور آپ کے فرزندوں امام حسن علیہ السلام اور امام حسین علیہ السلام سے کی تھی جس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔

لیکن کوئی بات بھی اس کے سنگین جرائم اور وحشت و بربریت کا جواز نہیں بن سکی اور اسے پرسش وعذاب الٰہی سے نہیں روک سکی اسی وجہ سے انتہائی دردناک اور عبرت آموز طریقے سے چون (۵۴) سال کی عمر میں دنیا سے چلا گیا اور اس کی حیات زشت ورسوا کا انجام اس کے قبیل کے افراد کے لیے درس عبرت اور مولائے متقیانؑ کے ارشاد کی صداقت کا ثبوت بن گیا جیسا کہ مندرجہ بالا خطبے میں کہا گیا تھا۔

اس کے اپنے قول کے مطابق، اسے خون بہانے میں لذت محسوس ہوتی تھی اور اسی کے باعث وہ تمام ظلم وستم اور بربریت کے مظاہرے جن کی مثال نہیں ملتی، اس سے وقوع میں آئے۔ اپنی ذلیل اور رسوا زندگی کے دوران اس نے ایک لاکھ بیس ہزار افراد کو انتہائی ظالمانہ طریقے سے قتل کیا اور اس کی موت کے وقت پچاس ہزار مرد اور تیس ہزار عورتیں بدترین حالت میں قید خانوں میں زندگی اور موت کی کشمکش میں گرفتار تھے۔ انجام کار وہ "آکلہ" نامی بیماری کا شکار ہوا جو جذام کی ایک قسم ہے جس میں معدے کا گوشت سڑنے لگتا ہے۔ اس کی یہ بیماری اس قدر شدید تھی کہ طبیبوں نے جواب دے دیا۔ اس کے ساتھ ہی شدید جاڑا اور لرزہ بھی اس پر مسلط ہو گیا، اسے اس قدر شدید سردی لگتی تھی کہ اس کے چاروں طرف دہکتی ہوئی انگیٹھیاں اس کے جسم سے اس قدر نزدیک رکھی جاتی تھیں کہ خوف محسوس ہوتا تھا کہ کہیں کھال نہ جھلس جائے مگر اس پر بھی وہ سردی لگنے کی شکایت کرتا تھا۔

کہا جاتا ہے کہ اس نوبت پر پہنچنے پر اس نے "حسن بصری" سے شکایت کی اور اس سے دعا کی درخواست کی حسن بصری نے اس سے کہا، "میں نے تجھ سے کہا تھا کہ تو نیک اور صالح بندوں کو اذیت دینے سے باز آجا، لیکن تو نے میری ایک نہ سنی (اور یہ تیرے ان اعمال کا نتیجہ ہے) حجاج نے کہا، "میں تم سے یہ نہیں کہہ رہا کہ تم خدا سے میرے شفایاب ہونے کی دعا

www.shiabookspdf.com

مانگو، بلکہ خدا سے دعا کرو کہ جلد از جلد مجھے موت دے دے تا کہ میں اس ہولناک عذاب سے نجات پا جاؤں۔"[1]

دیدی کہ خون ناحق پروانہ شمع را　　　چند ان امان نداد کہ شب راسحر کند!

کوفے کے بارے میں دو مختلف نظریات

کوفہ اور وہاں کے باشندوں کے بارے میں نہج البلاغہ کے خطبات میں مختلف تعبیرات نظر آتی ہیں، بعض مواقع پر جیسا کہ اس خطبے میں ارشاد ہوا، کوفے کو ایک مقدس جگہ کے عنوان سے متعارف کرایا گیا جو حوادث شدید اور سیلاب مظالم کا شکار رہی، لیکن خداوند عزّوجل نے اس مقدس مرکز کو زمانے کے جباروں اور ستم گروں کے قہر سے محفوظ کر دیا، جبکہ دوسری طرف نہج البلاغہ کے بعض دوسرے خطبات میں کوفے کی واضح طور پر مذمت کی گئی ہے، مثال کے طور پر خطبہ ۲۵ جس میں امیرالمومنینؑ کوفے کے متعلق اس طرح ارشاد فرماتے ہیں:

"اِنْ لَّمْ تَكُوْنِيْ اِلَّا اَنْتِ تَهُبُّ اَعَاصِيْرُكِ فَقَبَّحَكِ اللّٰهُ"

"(اے کوفہ) اگر تیرا یہی حال رہا اور تجھ میں اسی طرح آندھیاں چلتی رہی تو خدا تجھے غارت کرے۔"

بہت سی روایات کوفہ کی مدح میں ملتی ہیں جیسے کہ ایک موقع پر امیرالمومنین علیہ السلام ہی اس کے متعلق فرماتے ہیں:

"هٰذِهٖ مَدِيْنَتُنَا وَ مَحَلَّتُنَا وَ مَقَرُّ شِيْعَتِنَا"

"یہ ہمارا شہر، ہمارا محلہ اور ہمارے شیعوں کا مرکز ہے۔"[2]

اور ایک دوسری حدیث میں ہم امام حضرت جعفر صادق علیہ السلام سے سنتے ہیں جو کوفہ کے بارے میں ہے، جس میں معصومؑ دعا فرماتے ہیں:

"اَللّٰهُمَّ ارْمِ مَنْ رَمَاهَا وَ عَادِ مَنْ عَادَاهَا"

"خداوندا! جو کوفے کو اپنے تیرِ ظلم کا نشانہ بنائے تو اسے اپنے تیر کا نشانہ قرار دے اور جو اس سے دشمنی کرے تو اس کو اپنا دشمن قرار دے۔"

ان دونوں روایات کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ کوفہ بجائے خود مقدس مرکز تھا، جہاں اہل بیتؑ

---

[1] مروج الذهب، ج ۳، ص ۱۳۲، اور دائرۃ المعارف الشیعۃ العامہ، ج ۷، ص ۵۱۴

[2] شرح نہج البلاغہ، ابن ابی الحدید، ج ۳، ص ۱۹۸

www.shiabookspdf.com

کے خالص شیعہ اور حقیقی وفادار سکونت پذیر تھے، جو صاحبان ایمان وتقویٰ تھے، لیکن بنی امیہ کے تسلط اور غلبے کے زیر اثر اور ان کے بھیجے ہوئے جاسوسوں، بلند مناصب پر فائز ہونے والے ناپاک فطرت وظالم نمائندوں کے اقتدار میں آجانے، تمام امور کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لینے اور نااہل افراد کو بیت المال کی غیر منصفانہ تقسیم کی وجہ سے کوفے کی فضا مسموم وآلودہ ہوگئی تھی اور بہت سے افراد نے کوفے کو دین وآئین اسلامی سے منحرف کردیا تھا۔ اس لیے جہاں اور جن مواقع پر کوفے کی مدح کی گئی ہے وہ ان مومنین کے ذاتی تقدس اور نجابت کی بنا پر ہے، جو وہاں رہائش پذیر تھے اور جہاں مذمت کی گئی ہے تو وہ اس آلودگی اور کثافت کی بنیاد پر ہے جو بنی امیہ کی حکومت کے اثر سے وہاں پیدا ہوگئی تھی جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا۔

ہم اس سلسلے میں مناسب موقع پر اس کا مزید جائزہ لیں گے، اس سے پہلے خطبہ ۲۵ کی تشریح میں بھی اس مسئلے پر گفتگو کی جاچکی ہے۔

www.shiabookspdf.com

www.shiabookspdf.com

اڑتالیسواں خطبہ

عِنْدَ الْمَسِیْرِ اِلَی الشَّامِ. قِیْلَ: اِنَّہٗ خَطَبَ بِهَا وَ هُوَ بِالنُّخَیْلَةِ خَارِجًا مِّنَ الْكُوْفَةِ اِلٰی صِفِّیْنَ [1]

کہا گیا ہے کہ یہ خطبہ امامؑ نے اس موقع پر دیا جب آپ "نخیلہ" (کوفہ کے قریب لشکر کی قیام گاہ) میں صفین کی طرف روانگی کے لیے قیام پذیر ہوئے۔

خطبہ، ایک نگاہ میں

اس خطبے کے درحقیقت دو حصے ہیں، پہلے حصے میں امامؑ نے اپنے بیشتر خطبوں کی ابتدا کی طرح ستائش وحمد پروردگار بیان کی ہے اور اُس کی نہ ختم ہونے والی نعمتوں کا تذکرہ کیا ہے، جو اس نے اپنے بندوں پر بے حدوحساب نازل کی ہیں اور امامؑ نے انتہائی خوبصورت اور دلآویز انداز میں ان نعمتوں پر اس کی حمدوستائش کی ہے۔

دوسرے حصے میں اپنے لشکریوں کو اس مہم سے جو درپیش تھی، آگاہ کیا ہے اور انہیں اس راہ کی طرف نشاندہی کی ہے جس سے گزر کر انہیں اس مقدمہ لشکر سے ملحق ہونا تھا جو پہلے روانہ کیا جاچکا تھا۔

اس کے بعد ان قبائل کا بیان ہے جو دجلہ کے اطراف سکونت پذیر تھے اور امامؑ کی ہمراہی میں دشمن کی طرف پیش

[1] سندِ خطبہ: جس طرح کہ اوپر اشارہ کیا گیا، یہ خطبہ ایک سلسلہ ہے ان فرامین جنگ کا جو امامؑ نے اپنے لشکر کو جاری کیے تھے۔ یہ اس وقت دیے گئے جب آپ کوفہ سے باہر نخیلہ کے مقام پر صفین کی طرف روانگی کی تیاری کر رہے تھے۔ کتاب مصادر نہج البلاغہ میں بیان کیا گیا ہے کہ حضرت نے یہ خطبہ ۲۵ شوال سن ۳۷ ہجری میں صفین کی طرف عازم ہونے کے موقع پر دیا۔ اس کے بعد مزید اضافہ کیا مورخین اور ارباب سیر میں سے ایک گروہ (طبق نقل ابن ابی الحدید) نے اسے اپنی کتب میں درج کیا ہے۔ جنگ صفین کے واقعات درج کرنے والوں میں سے ایک "نصر بن مزاحم" نے اسے اپنی کتاب "صفین" میں معمولی سے اختلاف سے درج کیا ہے۔ (مصادر نہج البلاغہ، جلد ۲، ص ۱۴)

www.shiabookspdf.com

قدمی کے لیے تیار تھے۔ غالباً امامؑ یہ چاہتے تھے کہ اپنے ان ساتھیوں کو جو نخیلہ میں موجود تھے اور زیادہ تعداد میں نہیں تھے، یہ یاد دلانا چاہتے تھے کہ تم صفین کے میدان کی طرف پیش رفت کرنے والے تنہا گروہ نہیں ہو بلکہ ایک بڑا گروہ راہ میں ہے جن کے متعلق میں چاہتا ہوں کہ تم سے ملحق ہو جائیں اور تمہاری افرادی و فوجی قوت کا حصہ بن جائیں۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ امیر المومنین علیہ السلام نے اپنا مقدمہ لشکر ساحل فرات کے ایک مخصوص مقام پر بھیج دیا تھا اور اسے حکم دیا تھا کہ اس جگہ بقیہ لشکر کا انتظار کرے اس کے بعد فرات عبور کر کے دجلہ کے اطراف کے قبائل کو لشکر شام سے جنگ کے لیے آمادہ کریں اور اس طرح تینوں گروہ لشکر شام کی طرف پیش قدمی کریں۔

پہلا حصہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ كُلَّمَا وَقَبَ لَيْلٌ وَ غَسَقَ وَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ كُلَّمَا لَاحَ نَجْمٌ وَ خَفَقَ وَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ غَيْرَ مَفْقُودِ الْإِنْعَامِ وَلَا مُكَافَإِ الْإِفْضَالِ

”تمام حمد و ستائش اس پروردگار کے لیے ہے جب رات نمودار ہو اور پردۂ ظلمت پھیل جائے اور حمد و ستائش ہے اللہ کی جب بھی ستارہ نکلے اور ڈوبے اور اس پروردگار کی ثنا ہے جس کے انعامات کبھی ختم نہیں ہوتے اور جس کے احسانات کا بدلہ نہیں اتارا جا سکتا۔“

شرح و تفسیر

صرف خدا ہی ستائش کا سزاوار ہے

اس خطبے میں امیر المومنین علیہ السلام انتہائی جامع اور نئی تعبیرات کے ذریعے خدائے عزوجل کی حمد و ثنا کرتے ہیں اور اس سلسلے میں کچھ جدید مفاہیم بیان کرتے ہیں اور ان نکات کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو عام انسان کی نظر سے پوشیدہ رہتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:

www.shiabookspdf.com

"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ كُلَّمَا وَقَبَ [۱] لَيْلٌ وَغَسَقَ [۲]، وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ كُلَّمَا لَاحَ [۳] نَجْمٌ وَخَفَقَ" [۴]

"حمد وثنا مخصوص ہے خداوند اعلیٰ کے لیے جب چہرۂ شب سامنے آجائے اور پردۂ ظلمت تمام عالم پر چھا جائے اور تعریف وستائش ہے اسی خدا کے لیے جب ستارہ طلوع اور غروب ہوجائے۔"

یہ بیان دو نکات کی طرف اشارہ کرتا ہے:

پہلا نکتہ: یہ کہ ہماری حمد وثنائے رب العزت دائمی اور ابدی ہے، جس طرح کہ رات کا نمودار ہونا اور اس کی تاریکی کا پھیل جانا، ترتیب وار ہمیشہ اس وقت تک ہوتا رہے گا، جب تک دنیا کا وجود باقی ہے، ہماری حمد وثنا اس طرح جاودانی رہے گی اور جس طرح ستاروں کے طلوع اور غروب ہونے کو بقا حاصل ہے، اسی طرح ہماری حمد وثنا پروردگار کو بھی بقا حاصل ہے۔

دوسرا نکتہ: اس میں یہ ہے کہ تاریکی شب اور ستاروں کا طلوع اور غروب خالق کائنات کی ایک عظیم نعمت ہے، کیونکہ یہ انسانوں کو دن بھر کی محنت اور مشقت کے بعد آرام واستراحت بخشتے ہیں۔ صرف اس بنا پر نہیں کہ رات کی تاریکی کام میں مشغول رہنے میں رکاوٹ پیدا کرتی ہے بلکہ اس حقیقت کی بنیاد پر کہ تاریکی بجائے خود آرام وسکون کا باعث اور خواب آور ہے اسی لیے گہری اور پرسکون نیند میں لینے کا بہترین وقت رات کا ہوتا ہے جب چراغ بجھا دیے جاتے ہیں اسی کی طرف قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

"قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيْكُمُ النَّهَارَ سَرْمَدًا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِلَيْلٍ تَسْكُنُوْنَ فِيْهِ ؕ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ" [۵]۔

"اے رسولؐ! ان سے کہہ دیں کہ مجھے بتاؤ اگر میرا خدا دن کی روشنی کو تمہارے اوپر قیامت تک باقی رکھے تو کون سا

---

[۱] وَقَبَ: مادّہ وَقْب سے زمین یا پہاڑ میں گودی اور گڑھے کو کہتے ہیں، اور جب کوئی چیز گڑھے میں چلی جائے یا تاریکی میں گر جائے تو اُسے "وقب" کہا جاتا ہے اسی لیے خطبے میں رات کا وقت داخل ہونے کے لیے استعمال ہوا ہے۔

[۲] غَسَقَ: سخت تاریکی کے معنی میں ہے، چونکہ رات جتنی زیادہ نصف شب سے نزدیک ہوتی جاتی ہے اتنی ہی اس کی تاریکی میں اضافہ ہوتا جاتا ہے غسق کنایہ کے طور پر آدھی شب کے معنوں میں بھی آتا ہے۔ اسی لیے مفسرین کہتے ہیں "اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ" نماز ظہر، عصر، مغرب اور عشاء کی طرف اشارہ ہے۔ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ، یہ نماز صبح کی طرف اشارہ ہے (سورۃ الاسراء آیت: ۷۸)

[۳] لاحَ: مادّۂ لوح سے آشکار ہونا اور چمکنا کے معنوں میں ہے اور ہر چمکنے والی چیز کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ "لوح" کڑی یا دھات سے بنی ہوئی سفید تختی کو بھی کہا جاتا ہے۔

[۴] خفق: خفق اور خفوق کے مادّے سے تزلزل اور تحرک کے معنی رکھتا ہے۔ اسی لیے جب سورج، چاند یا ستارے غروب کر جاتے ہیں تو ان کے متعلق یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔

[۵] سورۂ قصص: آیت ۷۲

www.shiabookspdf.com

دوسرا معبود ہے جو تمہارے لیے رات نمودار کر سکے تا کہ تم اس میں آرام کر سکو، کیا تم نہیں دیکھتے۔"

اور اس کے بعد کی آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

"وَمِنْ رَّحْمَتِهٖ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ۝" [۱]

"اس نے اپنی رحمت سے تمہارے لیے دن اور رات مقرر کیا تا کہ تم سکون حاصل کر سکو اور خدا کی فضل و کرم تک پہنچ سکو تا کہ تم شکر گزار بن جاؤ۔"

یہی معنی قرآن مجید کی اور بہت سی آیات میں بھی موجود ہیں اور علمی تحقیقات نے بھی ثابت کر دیا ہے کہ رات کی بیداری اور دن کے وقت سونا انسان کی صحت اور سلامتی کے لیے شدید نقصان کا باعث ہوتا ہے خصوصاً بینائی کے زائل ہونے کا سبب بن سکتا ہے۔

اسی طرح ستاروں کے طلوع اور غروب ہونے کے فوائد کسی سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ اس لیے ان کی مدد سے رات کے وقت اوقات منظم کیے جا سکتے ہیں اور دریاؤں اور صحراؤں میں سفر کرتے ہوئے راہ کا تعین کیا جا سکتا ہے اور رہنمائی حاصل کی جا سکتی ہے، اسی لیے قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

"وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ النُّجُوْمَ لِتَهْتَدُوْا بِهَا فِيْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ" [۲]۔

"اسی نے تمہارے لیے ستارے مقرر کیے ہیں تا کہ تم خشکی و دریا کی تاریکیوں میں ہدایت حاصل کر سکو۔"

اور دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:

"وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُوْنَ" [۳]۔

"ستاروں کے ذریعے سے ان کی ہدایت کی گئی ہے۔"

جی ہاں! جس زمانے میں راستوں اور سمت کی نشاندہی کے موجودہ وسائل ایجاد نہیں ہوئے تھے تو انسانوں کے لیے بے نشان صحراؤں اور دریاؤں کو عبور کرنے کا وسیلہ دن کے وقت آفتاب کا غروب ہونا اور رات کے وقت ستاروں سے رہنمائی حاصل کرنا ہوتا تھا اسی لیے اس زمانے میں سفر کرنے والے قافلے والے اپنے ساتھ ایسے فرد یا افراد کو رکھتے تھے جو

---

[۱] سورۂ قصص: آیت ۷۳

[۲] سورۂ انعام: آیت ۹۷

[۳] سورۂ نحل: آیت ۱۶

www.shiabookspdf.com

ستاروں کے متعلق آگاہی رکھتے تھے تاکہ صحراؤں اور دریاؤں میں راستہ نہ بھٹک جائیں اور شاید اسی وجہ سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اہل بیت عصمت علیہم السلام کو "نجوم" سے تشبیہ دی تھی کہ لوگ ان کی برکت سے صراط مستقیم کو تلاش کرسکیں اور گمراہی اور بے راہ روی سے اپنا دامن محفوظ رکھ سکیں۔

تمام دیگر نعمت ہائے الٰہی میں سے امامؑ کا تاریکی شب اور ستاروں کے طلوع و غروب کا تذکرہ کرنا اس وجہ سے بھی ممکن ہے کہ امامؑ اپنے اصحاب کو یہ پیغام دے رہے ہوں کہ امامؑ کی حکومت کے خلاف شامیوں کے قیام اور اس ظلمت عقل کے دور میں جو مسلمانوں پر پھیلائی جارہی تھی روشنی کا واحد ستارہ درخشندہ و تاباں وجود ولایت تھا۔

اس کے بعد امامؑ اس حمد خدا کے دوسرے حصے میں فرماتے ہیں:

"وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ غَيْرَ مَفْقُوْدِ الْاِنْعَامِ، وَلَا مُكَافَإِ الْاِفْضَالِ۔

"حمد مخصوص ہے اس ذات واجب سے کہ جس کی نعمتوں کا کوئی اختتام نہیں اور جس کے احسانات کا کوئی بدلہ نہیں ادا کیا جاسکتا۔"

جملۂ اوّل میں امامؑ درحقیقت اس نکتے کی طرف اشارہ کررہے ہیں کہ ربّ العالمین کی نعمتیں کسی ایک یا چند نعمتوں تک محدود نہیں بلکہ ہماری زندگی کی ہر ساعت اور ہر گوشے پر محیط ہیں۔

دوسرا جملہ اس حقیقت کا شاہد ہے کہ بندگان خدا میں سے کوئی بھی حتیٰ کہ انبیائے کرام اور اولوالعزم رسول بھی اس کی نعمتوں کے شکر بجالانے کا حق ادا نہیں کرسکتے کیونکہ اوّل تو وہ اس سے مستغنی و بے نیاز ہے کہ کوئی اس کی نعمتوں کا شکر ادا کرے دوسرے اس کی ستائش و ثنا خوانی اور اظہار تشکر کی صلاحیت اور اس کی طاقت بھی خداوند عالم کی اپنے بندے پر ایک مزید نعمت اور عطا ہے جس کا پھر شکر ادا کرنا واجب ہے کیونکہ شکر خدا سے مزید نعمتیں نازل ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت امام زین العابدین علیہ السلام کی مشہور مناجات میں معصومؑ اس طرح بارگاہِ ربّ العزّت میں التجا کرتے ہیں:

"فَكَيْفَ لِي بِتَحْصِيلِ الشُّكْرِ؟ وَ شُكْرِي إِيَّاكَ يَفْتَقِرُ إِلَى شُكْرٍ! فَكُلَّمَا قُلْتُ لَكَ الْحَمْدُ، وَجَبَ عَلَيَّ لِذٰلِكَ اَنْ اَقُوْلَ لَكَ الْحَمْدُ۔ [1]

"بارالہا! میں کس طرح تیرا شکر ادا کرسکتا ہوں، کیوں کہ شکر ادا کرنے کی توفیق اور طاقت بھی تیری ہی عطا کردہ نعمت اور احسان ہے، جو کہ مزید ایک اور شکر کا متقاضی ہے، اس لیے جب بھی میں کہوں "تعریف تیرے لیے ہے" تو میرے اوپر واجب ہے کہ اس حمد کی ادائیگی کی نعمت پر پھر دوبارہ کہوں کہ "حمد تیرے لیے مخصوص ہے" (اور اس طرح ہر شکر کی ادائیگی پر

[1] مناجات شاکرین۔ پندرہویں مناجات، بحارالانوار، جلد ۹۱، ص ۱۴۶

www.shiabookspdf.com

ایک اور شکر واجب ہوگا، کیوں کہ ہر شکر کے ساتھ تیری مزید نعمتیں مجھ پر نازل ہوں گی) اس لیے اظہارِ تشکر کا آخری درجہ اور انتہائے حمد و ستائش پروردگار یہ ہے کہ بندہ اس کے حضور یہ اعتراف اور اپنے اس عجز کا اقرار کرلے۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے ایک حدیث روایت کی گئی کہ خداوند عالم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وحی کی کہ اے موسیٰ! میرا شکر ادا کرنے کا حق ادا کرو۔ جناب موسیٰؑ نے عرض کی، پالنے والے تیرا حقِ شکر ادا کیسے ادا کر پاؤں گا، کیوں کہ جب بھی تیرا شکر ادا کروں گا تیری ہی عطا کردہ نعمت کے باعث اور توفیق اور مدد سے ہوگا، جس کی وجہ سے ایک اور شکر مجھ پر واجب ہوجائے گا۔

جواب آیا اے موسیٰ! اب تم نے میری نعمتوں کا شکر ادا کیا ہے جب یہ اقرار کرلیا کہ شکر ادا کرنے کی توفیق بھی میری ہی مدد سے ممکن ہے۔[1]

بندہ همان بہ کہ زتقصیر خویش　　عذر بہ درگاہ خدا آورد
ورنہ سزاوار خداوندیش　　کس نتواند کہ بجا آورد

"بندگانِ الٰہی میں وہی افضل و برتر ہے جو حمدِ الٰہی کا حق ادا نہ کرسکنے پر اپنے پروردگار سے معذرت طلب کرے ورنہ کوئی ہستی ایسی نہیں جو ایسی حمد کرسکے۔"

دوسرا حصہ

اَمَّا بَعْدُ فَقَدْ بَعَثْتُ مُقَدِّمَتِي وَ اَمَرْتُهُمْ بِلُزُومِ هٰذَا الْمِلْطَاطِ حَتّٰى يَأْتِيَهُمْ اَمْرِي وَ قَدْ رَاَيْتُ اَنْ اَقْطَعَ هٰذِهِ النُّطْفَةَ اِلٰى شِرْذِمَةٍ مِنْكُمْ مُوَطِّنِينَ اَكْنَافَ دِجْلَةَ فَاُنْهِضَهُمْ مَعَكُمْ اِلٰى عَدُوِّكُمْ وَ اَجْعَلَهُمْ مِنْ اَمْدَادِ الْقُوَّةِ لَكُمْ

"امابعد، میں نے مقدمہ لشکر کو آگے روانہ کردیا ہے اور اسے حکم دیا ہے کہ نہر فرات کے کنارے قیام کریں اور میرا ارادہ ہے کہ اس دریا کو عبور کرکے اس گروہ تک پہنچ جاؤں جو اطراف دجلہ میں موجود ہے اور اسے بھی تمہارے ساتھ دشمنوں کے مقابلے کے لیے تیار کروں اور انہیں تمہاری کمک کا ذخیرہ بناؤں۔"

[1] بحار الانوار، جلد ۱۳، ص ۳۵۱، حدیث ۴۱

www.shiabookspdf.com

شرح وتفسیر

جنگ کے لیے فوج کو روانہ کرنا

اس حصے میں امامؑ جنگ کے لیے ایک لائحہ عمل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"أَمَّا بَعْدُ فَقَدْ بَعَثْتُ مُقَدِّمَتِي [۱] وَ أَمَرْتُهُمْ بِلُزُومِ هٰذَا الْمِلْطَاطِ [۲] حَتّٰى يَأْتِيَهُمْ أَمْرِي"

"امابعد، میں نے ہراول دستہ آگے روانہ کر دیا ہے اور اسے حکم دیا ہے کہ دریائے فرات کے کنارے قیام کریں اور جب تک میرا حکم ان تک نہ پہنچے وہاں سے آگے نہ بڑھیں۔"

اس جملے کی توضیح یہ ہے کہ دریائے فرات دجلہ کے مغرب میں واقع ہے اس طرح دجلہ فرات کے مشرق میں ہے۔ اس بنا پر امامؑ کے لشکر کا ہراول دستہ کوفے سے جو فرات کے کنارے واقع ہے، شمال کی سمت فرات کے مغربی کنارے کی طرف روانہ ہوا اور امامؑ نے اسے حکم دیا کہ اسی راہ سے پیش قدمی کرے لیکن خود آپ نے فرات کو شرقی کنارے کی طرف سے عبور کیا اور مزید لشکر فراہم کرنے کے لیے مدائن کی طرف رخ کیا جس طرح کہ آپ نے اگلے جملے میں ارشاد فرمایا:

"وَ قَدْ رَأَيْتُ أَنْ أَقْطَعَ هٰذِهِ النُّطْفَةَ [۳] إِلٰى شِرْذِمَةٍ [۴] مِنْكُمْ مُوَطِّنِينَ أَكْنَافَ [۵] دِجْلَةَ، فَأُنْهِضَهُمْ مَعَكُمْ إِلٰى عَدُوِّكُمْ وَ أَجْعَلَهُمْ مِنْ أَمْدَادِ الْقُوَّةِ لَكُمْ"

---

[۱] مقدمہ: دال کے نیچے زیر ہو تو اس کا مطلب ہے پیش کرنے والا اور آگے جانے والا۔ دال پر زبر ہو تو اس کے معنی ہیں پیش کیا گیا یا آگے چلا گیا دونوں صورتوں میں اس سے مراد لشکر کا وہ حصہ ہے جو سب کے آگے چلتا ہے تاکہ لشکر کو راستے کی رکاوٹوں اور مشکلات سے آگاہ کر سکے۔

[۲] جس طرح اوپر کہا گیا "ملطاط" بعض شارحین کے مطابق "لط" (لطط) کے مادے سے ماخوذ ہے اور اس کا "م" اضافی ہے اور اس کے معنی نزدیک ہونا اور ساتھ رہنا ہیں۔ اسی لیے گلوبند کو "لط" کہتے ہیں اسی طرح دریا کو "ملطاط" کہتے ہیں لیکن کچھ لوگوں کے خیال کے مطابق "ملط" کے مادے سے ہے جس کے معنی اوپر درج کیے گئے معنی سے مختلف نہیں ہیں اگرچہ لفظاً الگ ہیں۔

[۳] نطفة: صاف پانی کو کہتے ہیں خواہ کم ہو یا زیادہ۔ تیز آب جاری اور ہر قسم کے سیال مادے پر بھی اطلاق ہوا ہے۔ اور منی کو نطفہ اس لیے کہا جاتا ہے کیونکہ وہ ایک خالص اور ہر قسم کی ملاوٹ سے پاک چیز ہے اور حقیقت میں انسانی وجود کا نچوڑ ہے۔

[۴] شرذمة: دراصل یہ ایک قلیل تعداد پر مبنی گروہ اور کسی چیز کے بقایاجات کو کہا جاتا ہے۔ پھل سے جس ٹکڑے کو الگ کیا جائے اُسے بھی شرذمۃ کہا جاتا ہے۔

[۵] اکناف: کنف کی جمع (ہدف کے وزن پر) کسی چیز کے کنارے اور اطراف کے معنی میں ہے۔ چونکہ چیزوں کے کنارے اس کے اندرون کو پوشیدہ رکھنے کا سبب بنتے ہیں اس لیے کنیف چاردیواری پر اطلاق ہوتا ہے جس میں انسان نظروں سے پوشیدہ رہتا ہے۔ اسی طرح سپر پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے جو انسان کو دشمن کے وار سے محفوظ رکھتا ہے۔

www.shiabookspdf.com

"میں نے اپنے لیے یہ ارادہ کیا ہے کہ فرات کو عبور کروں اور ان لوگوں کو جو تم ہی میں سے ہیں اور اطراف دجلہ میں سکونت پذیر ہیں ان سے مل کر انہیں ترغیب دوں کہ وہ بھی تمہارے ساتھ شامل ہو کر دشمن کی طرف پیش قدمی کریں اور ان کی مدد سے تمہارے لیے مزید قوت اور کمک فراہم کروں۔"

اس ترتیب سے امامؑ خود شرقِ عراق اور مدائن کی طرف عازم سفر ہوئے اور آپ کا ہراول دستہ فرات کے مغربی کنارے کی جانب روانہ ہوا، لیکن اثنائے راہ میں اس مختصر ہراول دستے کے سالار کو یہ اطلاع ملی کہ امیر شام ایک بڑے لشکر کے ساتھ ان کی طرف پیش قدمی کر رہا ہے، لہٰذا اس خطرے کے پیش نظر کہ وہ اپنی ناکافی تعداد کے باعث مبادا اس بڑے لشکر کے نرغے میں آ جائیں، سالارِ مقدمہ لشکر نے تیزی سے دریائے فرات عبور کیا اور مشرق کی سمت امیر المومنین علیہ السلام کے لشکر سے جاملا۔ امامؑ کو جب اس کی اطلاع ملی تو آپ نے اظہار پسندیدگی کیا اور تمام سپاہ کو یکجا کر کے دشمن کی طرف روانہ ہوئے۔

اس موقع پر یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ "ملطاط" کا کلمہ "ملط" یا "لطّ" کے مادّے سے مشتق ہے اور امامؑ نے اس جگہ اس سے ساحلِ فرات مراد لیا ہے۔ اس طرح امامؑ نے لشکر کی رہنمائی کرتے ہوئے انہیں حکم دیا کہ وہ ساحل فرات کے ساتھ ساتھ پیش قدمی کریں کیوں کہ شام عراق کے شمال میں واقع ہے اور دریائے فرات بھی شمال سے جنوب کی طرف بہتا ہے، اس طرح وہ ایک طرف تو قلت آب کا شکار نہیں ہوں گے اور دوسری طرف درختوں کا سایہ انہیں موسم کی تمازت سے محفوظ رکھے گا اور وہ راہ گم کرنے کے خطرے سے بھی محفوظ رہیں گے اور عقب میں آنے والے لشکر کے لیے ان سے ملحق ہونے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی، ان تمام وجوہ کی بنا پر یہ راستہ انتہائی مناسب تھا۔

دوسرے آبِ فرات کو "نطفہ" سے موسوم کرنا بقول سید رضیؒ ایک نادر اور اچھوتی تشبیہ ہے۔ اس کلمہ یعنی "نطفہ" کے معنی اربابِ لغت کے ایک گروہ کے مطابق صاف پانی کے ہیں اور دوسرے گروہ کے خیال کے مطابق آب جاری کے ہیں۔ دونوں صورتوں میں امامؑ کا اشارہ آب فرات کے پینے کے قابل ہونے اور کھارا نہ ہونے کی طرف ہے۔ اگرچہ بظاہر اس میں کچھ کثافت کبھی کبھی نظر آتی ہے لیکن فوراً ہی یہ پانی مکمل شفاف اور گوارا ہو جاتا ہے۔

اس جگہ سیّد رضیؒ نے کچھ جملے کہے ہیں جو مندرجہ بالا بحث سے تعلق رکھتے ہیں، وہ کہتے ہیں:

"يَعْنِيْ - عَلَيْهِ السَّلَامُ - بِالْمِلْطَاطِ هَاهُنَا - اَلسَّمْتَ الَّذِيْ أَمَرَهُمْ بِلُزُوْمِهٖ وَهُوَ شَاطِئُ الْفُرَاتِ وَ يُقَالُ ذٰلِكَ أَيْضاً لِشَاطِئِ الْبَحْرِ وَ أَصْلُهٗ مَا اسْتَوٰى مِنَ الْأَرْضِ وَ يَعْنِيْ بِالنُّطْفَةِ مَاءَ الْفُرَاتِ وَهُوَ مِنْ غَرِيْبِ الْعِبَارَاتِ وَ عَجِيْبِهَا"

"ملطاط" سے امامؑ کی مراد وہ سمت ہے جس کی طرف امامؑ نے سفر کا حکم دیا تھا اور فرمایا تھا کہ اس سے علیحدگی نہ

www.shiabookspdf.com

اختیار کی جائے اور وہ ساحل فرات تھا، کیونکہ دریا کے کنارے اور ساحل کو بھی "مِلْطَاطْ" کہا جاتا ہے۔ درحقیقت اس کے معنی ہیں صاف زمین جو دریا کے ساتھ واقع ہو اور نطفہ سے اس جگہ امامؑ کی مراد آب فرات ہے اور یہ ایک نہایت خوبصورت اور دلآویز تشبیہ ہے۔

چند دلچسپ تاریخی نکات

بعض شارحین نہج البلاغہ نے اس خطبے کے ذیل میں کچھ تاریخی واقعات کو تشریحی طور پر بیان کیا ہے، جن میں سے کچھ کا تذکرہ ہم ذیل میں کر رہے ہیں۔ [1]

۱۔ کسریٰ کے محل میں

امامؑ اپنے مدائن کے سفر کے دوران ایوانِ مدائن میں اور کسریٰ کے محل میں پہنچے اور آپؑ کے صحابی نے اس محل کی ویرانی دیکھنے کے بعد یہ مشہور شعر پڑھا:

جَرَتِ الرِّیَاحُ عَلٰی مَحَلِّ دِیَارِهِمْ　　فَکَاَنَّمَا کَانُوْا عَلٰی مِیْعَادِ

"ہوا اس محل کے کھنڈرات میں اس طرح چل رہی تھی گویا زبان حال سے کہہ رہی ہو کہ یہاں کے باسیوں کے لیے ایک وعدہ گاہ مقرر تھی جس کی جانب وہ روانہ ہو چکے۔"

امامؑ نے فرمایا: "تم نے ان آیات کی تلاوت کیوں نہیں کی (جو اس شعر سے زیادہ حقیقت بیان کر رہی ہیں):

"کَمْ تَرَکُوْا مِنْ جَنّٰتٍ وَّ عُیُوْنٍ....." [2]

"وہ لوگ (خدا جانے) کتنے باغ اور چشمے اور کھیتیاں اور نفیس مکانات اور آرام کی چیزیں جن میں وہ عیش اور چین کیا کرتے تھے چھوڑ گئے، یوں ہی ہوا اور ان چیزوں کا دوسرے لوگوں کو مالک بنایا تو ان لوگوں پر نہ آسمان رویا اور نہ زمین اور نہ ہی انہیں مہلت دی گئی۔"

۲۔ کربلا کی زمین پر امامؑ کا ورود

[1] یہ تاریخی نکات شرح نہج البلاغہ، ابن ابی الحدید ج ۳ میں اس خطبے اور خطبہ ۴۶ کے ذیل میں بیان کیے گئے ہیں۔
[2] سورۂ دخان: آیت ۲۵-۲۹

www.shiabookspdf.com

امامؑ اپنے اس سفر کے دوران سرزمینِ کربلا سے گزرے، یہاں آپؑ نے تھوڑی دیر قیام کیا اور اس خاموش سرزمین کی طرف نظر کی، آنے والے حوادث آپؑ کی نگاہوں میں پھر گئے۔ آپؑ نے اپنے اصحاب کے ساتھ اس جگہ نماز ادا کی، نماز کے سلام کے بعد آپ نے وہاں کی خاک اٹھا کر سونگھی اور فرمایا:

هَاهُنَا مَوْضِعُ رِحَالِهِمْ وَمُنَاخُ رِكَابِهِمْ ثُمَّ أَوْمَىَٔ بِيَدِهِ إِلَى مَكَانٍ آخَرَ ثُمَّ قَالَ هَاهُنَا مُرَاقُ دِمَائِهِمْ

"آہ اے خاک کربلا! روزِ حشر کتنے لوگ تیری خاک سے اٹھیں گے۔ جو بغیر کسی حساب کتاب کے جنت میں داخل کیے جائیں گے۔" اس کے بعد آپ نے شہیدانِ کربلا کی قتل گاہوں اور ان کے خیموں کے نصب ہونے کے مقامات کی طرف اشاروں سے نشاندہی کی۔ اس جگہ وہ اتریں گے اور ان کا قیام ہوگا۔ پھر دوسری جگہوں کی طرف اشارہ کیا اور فرمایا: "یہاں ان کا خون بہایا جائے گا۔"

۳۔ امامؑ سرزمین انبار پر

جس وقت امامؑ انبار (شمالی عراق کا ایک شہر) پہنچے تو استقبال کے لیے آنے والے اپنی سواریوں سے اتر گئے اور امامؑ کے مرکب کے ساتھ بطور عزت واحترام پیدل دوڑنا شروع کر دیا۔ امامؑ نے ان سے دریافت کیا کہ یہ کیا کر رہے ہو۔ انہوں نے جواب دیا کہ یہ ہمارا دستور اور رواج ہے کہ جب ہمارا حاکم یہاں آتا ہے تو اس کی اس طرح تعظیم کرتے ہیں۔ امامؑ نے فرمایا "تمہارے حکمران کو اس سے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا اور تم بے مقصد اس زحمت اور مشکل کا شکار بنتے ہو، آئندہ اس قسم کا فضول کام نہ کرنا۔"

اسی داستان کے ذیل میں یہ بھی ملتا ہے کہ انبار کے باشندوں نے چوپایوں اور غذائی اجناس کی شکل میں کافی اشیاء بطور ہدیہ امامؑ کی خدمت میں پیش کیں، امامؑ نے فرمایا "ان چیزوں میں سے جانور قبول کر لیتا ہوں اور یہ تمہارے خراج میں محسوب کر لیے جائیں گے لیکن جو کھانے کی چیزیں تم نے دی ہیں وہ میں بغیر قیمت ادا کیے قبول نہیں کر سکتا۔" اگرچہ اہل انبار نے ازحد اصرار کیا کہ حضرتؑ ان چیزوں کو ہماری جانب سے بطور ہدیہ قبول کر لیں، مگر امامؑ نے کسی طرح انہیں قبول نہیں کیا (یہ اس حال میں تھا کہ اس وقت کے دنیاوی حکمران اپنے لشکر کے تمام اخراجات راہ میں پڑنے والے شہروں سے وصول کرتے تھے)

www.shiabookspdf.com

۴۔امامؑ، راہب کے گرجا گھر کے قریب

دورانِ سفر امامؑ اور آپؑ کے لشکر کا گزر ایک ایسی جگہ سے ہوا جہاں پانی موجود نہیں تھا۔لشکر کے پاس موجود پانی کا ذخیرہ ختم ہو چکا تھا اور تمام لشکری سخت پیاسے تھے۔امامؑ نے اس بیابان کا ایک دورہ کیا اور ایک بڑی چٹان کے قریب رک گئے اور فرمایا:

"اس پتھر کو یہاں سے ہٹاؤ۔"

جس وقت اس پتھر کو وہاں سے ہٹایا گیا تو اس کے نیچے سے پانی کا چشمہ ابل پڑا تمام لشکر نے اپنی پیاس بجھائی اور مشکیں بھر لی گئیں۔

اس کے بعد امامؑ نے حکم دیا:

"پتھر کو اس کی جگہ واپس رکھ دو!"

حکم کی تعمیل ہوئی لشکر تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ امامؑ نے اپنے ساتھیوں سے پوچھا:

"کیا تم میں سے کوئی شخص اس چشمہ کی جگہ تک دوبارہ پہنچ سکتا ہے؟"

جواب ملا:

"جی ہاں یا امیر المومنینؑ۔"

امامؑ کی اجازت سے سوار اور پیادوں کا ایک گروہ اس چشمے کی جگہ کی تلاش میں واپس ہوا لیکن اس کا کوئی نشان و سراغ نہیں ملا۔اسی اثناء میں ایک راہب جس کا صومعہ (عبادت کی جگہ) قریب ہی تھا ان کے قریب آیا ان لوگوں نے اس سے دریافت کیا:

"تیرے اس صومعہ کے قریب جو چشمہ ہے وہ کس جگہ ہے؟"

اس نے جواب دیا:

"یہاں کوئی چشمہ نہ تھا اور نہ ہے۔"

اصحاب امامؑ نے کہا:

"ہم نے ابھی تھوڑی ہی دیر پہلے اس سے پانی پیا ہے۔"

راہب نے حیرت سے پوچھا:

"کیا واقعی تم نے یہاں کوئی چشمہ دیکھا ہے اور اس کا پانی پیا ہے؟"

www.shiabookspdf.com

لشکریوں نے جواب دیا:

"ہاں ہم سچ کہہ رہے ہیں۔"

راہب نے کہا:

"خدا کی قسم! میں نے یہ عبادت گاہ اس ویرانے میں صرف اس چشمے کو تلاش کرنے کے لیے بنائی تھی، مگر سوائے کسی نبی یا وصی نبی کے کوئی اسے تلاش نہیں کر سکتا۔"

گویا اس طرح امامؑ نے اپنے معجزے کے ذریعے اپنے اصحاب کی تقویت قلب کا بندوبست کیا تاکہ دشمن کے مقابلہ میں انہیں قوت اور استحکام اور فتح یابی حاصل ہو سکے۔

مرحوم علامہ مجلسیؒ اس حدیث کا تذکرہ کرنے کے بعد اس میں مزید اضافہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"راہب اس تمام گفتگو کے بعد خدمت امامؑ میں حاضر ہوا اور شہادتین کا اقرار کر کے مسلمان ہو گیا اور لشکر امامؑ میں شمولیت اختیار کر لی اور صفین کی جنگ میں لیلۃ الھریر کے معرکے میں مرتبۂ شہادت پر فائز ہوا۔ صبح امامؑ نے اس کی نماز جنازہ ادا کی اور اپنے ہاتھوں سے اسے سپرد خاک کیا، پھر فرمایا: "خدا کی قسم! گویا میں اسے دیکھ رہا ہوں اور بہشت میں اس کی جگہ مشاہدہ کر رہا ہوں۔" [1]

۵۔ امامؑ شہر رَقّہ میں

جس وقت امیر المومنین علیہ السلام شہر رَقہ (شمال مغربی عراق کا ایک شہر) پہنچے تو آپ نے وہاں کے باشندوں کو حکم دیا کہ دریائے فرات پر پل بنایا جائے تاکہ امامؑ کا لشکر دریا عبور کر سکے اور شام کی طرف پیش قدمی کر سکے۔ انہوں نے ہچکچاہٹ اور پس و پیش کا مظاہرہ کیا اور نہ خود اس کام کے لیے پیش ہوئے اور نہ پل بنانے کے لیے کشتیاں فراہم کرنے کی کوشش کی، امامؑ نے اس جگہ سے سفر کا ارادہ کیا تاکہ کسی دوسرے مقام سے دریا عبور کیا جا سکے اور مالک اشترؒ کو اہل رقہ سے گفت و شنید پر مامور کیا۔ مالکؒ نے انہیں دھمکی دی، خدا کی قسم! اگر تم نے اس شہر کے کنارے فرات پر پل نہیں بنایا جس سے امیر المومنین کا لشکر دریا عبور کر سکے تو میں تم لوگوں کو سخت سزا دوں گا۔ اہلِ رَقہ جنہیں علم تھا کہ مالکؒ جو زبان سے کہتے ہیں اس پر عمل بھی کرتے ہیں، خوفزدہ ہو گئے اور کہنے لگے، ہم پل بنانے کے لیے تیار ہیں۔ مالکؒ نے امامؑ کی خدمت میں قاصد بھیجا کہ اہلِ رَقہ پل بنانے پر رضامند ہو گئے ہیں۔ امامؑ لشکر کے ساتھ واپس آئے اور اس نوساختہ پل سے دریا عبور کیا۔

---

[1] بحار الانوار: ج ۴۱، ص ۲۶۵

www.shiabookspdf.com

انچاسواں خطبہ

ومن کلام له علیه السّلام [1]

وَفِيهِ جُمْلَةٌ مِّنْ صِفَاتِ الرُّبُوْبِيَّةِ وَالْعِلْمِ الْإِلٰهِي

اس خطبے میں امیر المومنین علیہ السلام نے خداوند جلیل کی صفات علیا میں سے کچھ صفتوں کا اور اس کے علم بے پایاں کا بیان کیا ہے۔

خطبہ، ایک نگاہ میں

یہ خطبہ جیسا کہ اوپر کے عنوان میں اشارہ کیا گیا، علم الٰہی اور صفات پروردگار سے متعلق ہے۔ اس کی صفات جلالیہ کے مختلف حصوں کی طرف جامع اشارات موجود ہیں، اس کی پاک ذات کو منکرین الٰہی اور اسے دوسری چیزوں سے تشبیہ دینے والوں کی بے بنیاد باتوں (افراط وتفریط سے کام لینے والوں) سے پاک وپاکیزہ شمار کیا ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ بَطَنَ خَفِيَّاتِ الْاُمُوْرِ وَدَلَّتْ عَلَيْهِ اَعْلَامُ الظُّهُوْرِ وَامْتَنَعَ عَلٰى عَيْنِ الْبَصِيْرِ فَلَا عَيْنُ مَنْ لَمْ يَرَهُ تُنْكِرُهُ وَلَا قَلْبُ مَنْ اَثْبَتَهُ يُبْصِرُهُ سَبَقَ فِي الْعُلُوِّ فَلَا شَيْءَ اَعْلٰى مِنْهُ وَقَرُبَ فِي الدُّنُوِّ فَلَا شَيْءَ اَقْرَبُ مِنْهُ فَلَا اسْتِعْلَاؤُهُ بَاعَدَهُ عَنْ شَيْءٍ مِنْ خَلْقِهِ وَلَا قُرْبُهُ سَاوَاهُمْ فِي الْمَكَانِ بِهِ لَمْ يُطْلِعِ الْعُقُوْلَ عَلٰى تَحْدِيْدِ صِفَتِهِ وَلَمْ يَحْجُبْهَا عَنْ وَاجِبِ مَعْرِفَتِهِ فَهُوَ الَّذِيْ تَشْهَدُ لَهُ اَعْلَامُ

[1] سند خطبہ: یہ خطبہ بعض ایسے، خطبات امیر المومنین کو مرتب کرنے والوں نے بھی امامؑ سے نقل کیا ہے جو سید رضیؒ مرحوم کے بعد تک زندہ رہے۔ ان میں سے مرحوم علامہ مجلسی نے "روضۃ البحار" میں اور علی بن محمد بن شاکر واسطی نے جو سید رضیؒ کے ہم عصر تھے کتاب "عیون الحکم والمواعظ" میں یہ خطبہ نقل کیا ہے۔ (مصادر نہج البلاغہ، جلد ۲، صفحہ ۱۸)

www.shiabookspdf.com

الْوُجُوْدِ عَلٰی اِقْرَارِ قَلْبِ ذِی الْجُحُوْدِ تَعَالَی اللّٰهُ عَمَّا یَقُوْلُهُ الْمُشَبِّهُوْنَ بِهٖ وَ الْجَاحِدُوْنَ لَهٗ عُلُوًّا کَبِیْرًا۔

"تمام حمد و ستائش مخصوص ہے خداوندِ علی و اعلیٰ کے لیے کہ جس کی پاک و منزہ ذات ہر شے سے زیادہ پوشیدہ اور چھپی ہوئی ہے، لیکن اس کی واضح اور روشن نشانیاں اس کی موجودگی اور ہستی کی ناقابل تردید گواہی دیتی ہیں۔ ظاہری نگاہیں اس کے دیکھنے کی قدرت نہیں رکھتیں لیکن اس بنا پر نہ اس کے مشاہدے سے قاصر آنکھ اس کا انکار کر سکتی ہے اور نہ قلب معرفت اس کے مشاہدے کی طاقت رکھتا ہے۔ وہ اپنے مقام کی بلندی میں سب سے افضل و برتر ہے اور کوئی مخلوق اس کی ہم سر نہیں ہے۔ وہ اس طرح مخلوق کے نزدیک ہے کہ کوئی چیز اس سے نزدیک تر نہیں ہے نہ اس کی عظمت اور بلندی اسے مخلوقات سے دور رکھتی ہے اور نہ اُس کا قرب اُسے کسی کا ہم رتبہ بنا دیتا ہے۔ اس نے عقول انسانی کو اپنی پوشیدہ صفات سے آگاہ نہیں کیا، لیکن اس کے ساتھ ہی انہیں اپنی معرفت کے حصول اور کم سے کم لازمی شناخت کی صلاحیت سے محروم بھی نہیں رکھا۔ پس وہ ایک ایسی ذات ہے جس کا وجود پر عالم موجودات میں واضح نشانیں گواہ ہیں، اس طرح کہ (زبان سے) اس کے وجود کے منکر بھی دلوں کی گہرائیوں میں اس کے وجود کا اقرار کرتے ہیں۔ ذات واجب اس سے کہیں بلند و برتر ہے کہ موجودات میں کسی کو اس سے تشبیہ دی جا سکے یا اُس ذات کا انکار کیا جا سکے۔"

شرح و تفسیر

اے خیال و قیاس و وہم و گمان سے برتر ذات

جیسا کہ درج بالا عبارات میں ارشارہ کیا گیا یہ تمام خطبہ صفاتِ جمال و جلالِ ربّ العزّت کے بارے میں ارشاد کیا گیا ہے اور امامؑ نے انتہائی مختصر لیکن وسیع معنی و مفاہیم پر مشتمل اظہار خیال کیا ہے اور ذاتِ واجب کے بہت سے اسمائے حسنیٰ کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ پہلے حصے میں اس کے پانچ اوصاف کے بارے میں ذکر ہے جو ایک دوسرے کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ بَطَنَ [1] خَفِیَّاتِ الْاُمُوْرِ وَ دَلَّتْ عَلَیْهِ اَعْلَامُ الظُّهُوْرِ"

"حمد و ثنا مخصوص ہے ربّ العالمین کے لیے کہ جس کی ذات پاک ہر چیز سے زیادہ پوشیدہ اور مخفی ہے لیکن انتہائی واضح اور روشن نشانیاں اُس کی ذاتِ واجب کے وجود کی گواہی دیتی ہیں۔"

---

[1] بَطَنَ: بطن کے مادّے سے ہے (بروزن ثمن) یعنی شکم میں چھپا ہوا، یہ کلمہ ہر اس چیز کے لیے استعمال ہوتا ہے جو پوشیدہ ہو۔

www.shiabookspdf.com

"وَ امۡتَنَعَ عَلٰی عَیۡنِ الۡبَصِیۡرِ"

"دیکھنے والی ظاہری چشم بینا اس کے مشاہدے پر قادر نہیں ہے۔"

لیکن اس دلیل کی بنیاد پر: "فَلَا عَیۡنُ مَنۡ لَمۡ یَرَهُ تُنۡکِرُهُ وَلَا قَلۡبُ مَنۡ أَثۡبَتَهُ یُبۡصِرُهُ"

"کسی آنکھ نے اسے دیکھا نہیں، اس کے وجود کا انکار نہیں کیا جا سکتا اور نہ اُس کی معرفت رکھنے والا دل اُس کا مشاہدہ کر سکتا ہے۔"

اس جملے "اَلَّذِیۡ بَطَنَ خَفِیَّاتِ الۡأُمُوۡرِ" کی تفسیر میں مفسرینِ نہج البلاغہ نے کئی امکانات کا اظہار کیا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ بَطَنَ اس جگہ علم کے معنی میں آیا ہے یعنی وہ خدا جو پوشیدہ اسرار سے آگاہ ہے۔ اور کہیں کہا گیا کہ بَطَنَ مخفی کرنے اور پوشیدہ کرنے کے معنی میں ہے یعنی وہ خدا جس کی وجہ سے کائنات کے اسرار پوشیدہ ہیں۔

لیکن وہ تفسیر جس کا تذکرہ ہم شروع میں کر چکے ہیں کہ بطن اس جگہ پوشیدہ اور چھپی ہوئی چیز کے معنوں میں استعمال ہوا ہے اور یہاں اس کا مفہوم یہ ہے کہ خداوند متعال ایسے پوشیدہ اور مخفی اسراروں میں پنہاں ہے، جو عقول انسانی کی پہنچ، دسترس اور گرفت سے بالاتر ہیں اور دوسری تعبیر کے مطابق اُس کی حقیقت ذات پنہاں سے زیادہ پنہاں ہے اور یہ تعبیر بعد کے جملوں سے زیادہ مطابقت رکھتی ہے اور اسی دلیل کی بنیاد پر ہم اس تفسیر کو دیگر تفاسیر پر فوقیت دیتے ہیں۔ درحقیقت اس جملے کا مفہوم معروف فلسفی کے اس شعر کے مضمون سے ظاہر ہوتا ہے:

وُجُوۡدُهُ مِنۡ أَظۡهَرِ الۡأَشۡیَاءِ   وَ کُنۡهُهُ فِیۡ غَایَةِ الۡخِفَاءِ

"اُس کا وجود مقدس و بابرکت ہر ظاہر سے زیادہ نمایاں ہے اور اس کا غیب ذاتی ہر غیب سے زیادہ پر اسرار ہے۔"

جملہ "دَلَّتۡ عَلَیۡهِ أَعۡلَامُ الظُّهُوۡرِ" اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ اس کی نشانیاں کائنات میں ہر جگہ واضح اور روشن ہیں۔ جی ہاں! آسمانوں، ستاروں، کہکشاؤں، صحراؤں، دریاؤں، درختوں کے پتوں، میووں اور تمام موجودات عالم کے ماتھے پر اور جس قدر علم و دانش انسانی وجود میں ترقی کے منازل طے کرتا جا رہا ہو اور کائنات کے اسرار آشکار ہوتے جا رہے ہیں، ذاتِ پروردگار کی حکمت و قدرت پر دلائل میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

تیسرا جملہ "وَ امۡتَنَعَ عَلٰی عَیۡنِ الۡبَصِیۡرِ" اس حقیقت کا اظہار کرتا ہے کہ تیز ترین نگاہ بھی اُس کے مشاہدے سے قاصر ہے، کیوں کہ مشاہدہ حسّی جسم و جسمانیات سے مخصوص ہے اور سمت اور مکان ثانوی حیثیت کی حامل ہے۔ حالاں کہ اُس کی بے مثال ذات جسم و جسمانیات اور زمان و مکان سے مبرّا ہے۔ اس کی ذات بے عیب ہے اور ان عوارض و نقائص سے پاک ہے۔ جیسا کہ سورہ مبارکہ انعام میں ارشاد ہوتا ہے:

www.shiabookspdf.com

"لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ"[1]

"نگاہیں اس کو دیکھ نہیں سکتیں لیکن وہ تمام نگاہوں کو دیکھ سکتا ہے اور وہ بخش دینے والا اور باخبر ہے۔"

اور اُس وقت کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کی جانب سے درخواست کی:

"رَبِّ اَرِنِيْٓ اَنْظُرْ اِلَيْكَ"[2]

"خداوندا" مجھے اپنا جلوہ دکھا تا کہ میں تجھ دیکھ سکوں۔"

یہ درخواست ظاہری آنکھوں کے ذریعے مشاہدے کے لیے تھی، جس کا جواب "لَنْ تَرَانِىْ تم مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکتے، کے الفاظ سے دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک عظیم تجلّی گرج چمک کے ساتھ نمودار ہوئی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام غش کھا کر گر پڑے اور ان کے ساتھی جاں بحق ہو گئے۔ جب حضرت موسیٰؑ کو ہوش آیا تو بارگاہ ربّ العزّت میں عرض کی:

"سُبْحَانَكَ تُبْتُ اِلَيْكَ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ"

"خداوندا تو پاک و پاکیزہ ہے (اس سے کہ تجھے دیکھا جا سکے) میں تیری بارگاہ میں توبہ کرتا ہوں اور سب سے پہلے ایمان لانے والوں میں سے ہوں۔" (اس بات پر کہ جب تیرے پرتو کی ایک ہلکی سی جھلک دیکھنے کی طاقت بھی مخلوقاتِ عالم میں نہیں تو پھر تیری ذات کے مشاہدے کی طاقت کس میں ہو سکتی ہے؟)

اور اس کے بعد والے جملے "فَلَا عَيْنُ مَنْ لَمْ يَرَهُ" سے ایک واضح اور روشن حقیقت کی طرف انگشت نمائی کی گئی ہے، اس معنی میں کہ کوئی خردمند اور منصف مزاج انسان ان تمام براہین و دلائل کی روشنی میں کسی طرح بھی اس کی ذات واجب کے وجود سے منکر نہیں ہو سکتا۔ اگرچہ حسّی و نظری مشاہدہ خارج از امکان ہے اور وہ صاحب ایمان جو قلب کی گہرائیوں سے اس واجب الوجود کا یقین رکھتا ہے اس کے ظاہری اور حسّی مشاہدے کا منتظر نہیں رہتا اور یہ حقیقت بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ اگرچہ دیدۂ دل سے اس کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے اور کلامِ مولاؑ کے مطابق:

"لَا تُدْرِكُهُ الْعُيُوْنُ بِمُشَاهَدَةِ الْعِيَانِ وَلٰكِنْ تُدْرِكُهُ الْقُلُوْبُ بِحَقَائِقِ الْاِيْمَانِ"[3]

"آنکھیں اس کو دیکھ نہیں سکتیں، لیکن دل ایمان کی حقیقت کی روشنی میں اسے درک کر سکتا ہے۔"

لیکن یہ ادراک اور مشاہدہ بھی صرف اُس کے اسمائے حسنیٰ اور صفاتِ علیا کی حد تک محدود ہے نہ کہ اُس کی حقیقت

---

[1] سورۂ انعام، آیت ۱۰۳

[2] سورۂ اعراف: آیت ۱۴۳

[3] خطبہ نمبر ۱۷۹

www.shiabookspdf.com

ِ ذات کا مشاہدہ اور اس مرحلے پر نہ صرف عام انسان بلکہ افضل ترین مخلوقات عالم اس طرح اس کی بارگاہ میں مدح سرا ہوتی ہے:

"مَاعَرَفْنَاكَ حَقَّ مَعْرِفَتِكَ"

"بارالہا! ہم تیری معرفت اس طرح حاصل نہ کر سکے جس طرح معرفت حاصل کرنے کا حق تھا۔"

اس کے بعد امامؑ خداوند عالم کی چوتھی صفت کے بیان میں ایک اور اہم موضوع کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

"سَبَقَ فِي الْعُلُوِّ فَلَا شَيْءَ أَعْلَى مِنْهُ وَقَرُبَ فِي الدُّنُوِّ فَلَا شَيْءَ أَقْرَبُ مِنْهُ"

"مقام و مرتبے کی بلندی میں کوئی اُس کا ہم سر نہیں اور کوئی ہستی اُس سے برتر نہیں، اس کے باوجود وہ اپنی مخلوق سے اتنا نزدیک ہے کہ کوئی اس سے زیادہ نزدیک تر نہیں ہے۔"

اور اس بیان سے نتیجہ اخذ کرتے ہوئے اس طرح مزید اضافہ کرتے ہیں:

"فَلَا اسْتِعْلَاؤُهُ[1] بَاعَدَهُ عَنْ شَيْءٍ مِنْ خَلْقِهِ وَلَا قُرْبُهُ سَاوَاهُمْ فِي الْمَكَانِ بِهِ"

"نہ اس کا بلند مرتبہ اسے اس کی مخلوقات سے دور کرتا ہے اور نہ مخلوقات سے نزدیکی اسے ان کا ہم رتبہ بناتی ہے۔"

ممکن ہے کہ سطحی نظر سے دیکھنے پر یہ تصور پیدا ہو کہ یہ توصیفات الٰہی ایک دوسرے سے باہم متناقض اور متضاد ہیں کیسے ممکن ہے کہ کوئی چیز بیک وقت ہر چیز سے دور اور بالاتر بھی ہو اور نزدیک ترین بھی۔ کیسے ممکن ہے کہ کوئی چیز نزدیکی کی حالت میں دور بھی ہو اور دور ہوتے ہوئے نزدیک بھی، بلکہ نزدیک ترین بھی ہو۔

جی ہاں اگر بالفرض مخلوقات سے، جن سے ہمارا دائمی رشتہ اور تعلق ہے اور جو سب کے سب محدود اور متناہی وجود کے حامل ہوتے ہیں، اس حقیقت کو پرکھنے کی کوشش کی جائے تو یقیناً یہ تضاد اور نقائص نظر آتے ہیں لیکن ایک دقیق نکتے پر غور و فکر سے یہ مسئلہ بخوبی واضح ہو جاتا ہے اور ان صفات خداوندی کی حقیقت کا ادراک ہو جاتا ہے اور وہ نکتہ یہ ہے کہ ذات واجب ہر لحاظ سے متناہی، بے نیاز اور غنی مطلق ہے۔ اس کی ذات بابرکت زمان و مکان و علم و قدرت کے لحاظ سے لامحدود ہے، بلکہ صحیح تر یہ ہے کہ وہ زمان و مکان کی قیود سے بے نیاز اور برتر ہے، ہر جگہ اور ہر زمانے میں موجود ہے، لیکن اس کے ساتھ لامکان و لازمان بھی ہے۔

ایسا ماورائے فکر و عقل وجود ہر شے سے نزدیک بھی ہے اور ساتھ ہی چونکہ اس سے مشابہ بھی نہیں ہے اس لیے ہر

[1] استعلاء، کبھی برتر ہونے کے معنی میں آتا ہے اور کبھی برتری طلب کرنے کے معنی میں آتا ہے۔ یہاں پہلے والے معنی میں آیا ہے۔

www.shiabookspdf.com

شے سے دور بھی ہے، ہر چیز سے زیادہ واضح اور آشکار بھی ہے، کیونکہ ہر شے اس کے وجود کی نشانی ہے اور ہر شے سے زیادہ پنہاں و پوشیدہ بھی، کیونکہ وہ ان مخلوقات سے جن سے ہم آشنا ہیں مشابہت نہیں رکھتا۔

اس تمام گفتگو سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ علو اور رفعتِ ربّ العزّت سے مراد اس کے وجود و ہستی کی بلندی ہے نہ کہ مکانی برتری اور اسی طرح قرب و نزدیکی سے مراد احاطہ وجود کی نزدیکی ہے نہ کہ قرب مکانی۔

یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ ان صفات کی تفہیم و ادراک ہمارے جیسے افراد کے لیے جو ہمیشہ ان صفات سے تعلق رکھتے ہیں جو ممکنات کی حدود میں ہوتی ہیں، بہت مشکل ہے لیکن مثالوں سے استفادہ کرنے سے، خواہ یہ امثال ناقص ہی کیوں نہ ہوں، اذہان کسی نہ کسی حد تک اس حقیقت کے نزدیک تر ہو جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر ہم کس طرح اس حقیقت کو سمجھ سکتے ہیں کہ اُس کا وجود ہمیشہ اور ہر زمانے میں رہا ہے، جبکہ وہ خود زمان و مکان سے بے نیاز ہے۔ اسے ہم ایک ناقص اور نامکمل مثال مثلاً ریاضی کے بعض اصولوں کی مدد سے کسی حد تک سمجھ سکتے ہیں مثلاً ریاضی کے بعض اصولوں کی مدد سے کسی حد تک سمجھ سکتے ہیں مثلاً ہر شخص جانتا ہے کہ "دو جمع دو چار کے برابر ہوتے ہیں"۔ یہ اصول کائنات میں ہر جگہ اور ہر زمانے میں برقرار تھا اور رہے گا نہ کہ صرف ہمارے دور اور زمانے میں، حالانکہ اس کا نہ کوئی زمان ہے نہ مکان۔

اور جیسا کہ حضرتؑ نے ارشاد فرمایا: "اُس کی رفعت اور عظمتِ ذات اسے مخلوقات سے دور نہیں کرتی اور اس کی یہ نزدیکی اسے ان مخلوقات کا شبیہ یا مثل نہیں بنا دیتی ہے۔ اس کا واضح ثبوت وہ حقیقت ہے جسے ذکر کیا گیا۔

بعض شارحین نہج البلاغہ نے ایک ناقص مگر کسی حد تک مناسب مثال سے اس پر اس طرح گفتگو کی ہے کہ جس طرح روشنی کی لہریں کسی شیشے کے اندر نفوذ کر جاتی ہیں اور اسے بھی روشن کر دیتی ہیں اور اس حالت میں وہ ہر چیز سے زیادہ شیشے سے نزدیک تر ہوتی ہے پھر بھی اس کی مثل قرار نہیں دی جاسکتی، بلکہ اس سے کہیں برتر و بالاتر اور لطیف ہوتی ہے۔ شاید قرآن مجید میں جو ذاتِ الٰہی کو نور سے تشبیہ دی گئی ہے وہ اسی معنی میں ہے۔ "اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ [1]"۔

پانچویں توصیف الٰہی میں ایک اور اہم حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"لَمْ يُطْلِعِ الْعُقُوْلَ عَلٰى تَحْدِيْدِ صِفَتِهٖ وَلَمْ يَحْجُبْهَا عَنْ وَاجِبِ مَعْرِفَتِهٖ"

"نہ اُس نے اپنی حقیقتِ ذات سے عقولِ بشری کو آگاہ کیا ہے اور نہ ضرورت کی حد تک اپنی معرفت سے روکا ہے۔"

نہ اس کی حقیقتِ ذات کسی پر روشن ہو سکتی ہے اور نہ حقیقت صفات، کیوں کہ اس کی ذات بھی لامتناہی ہے اور صفات بھی، پھر کس طرح ممکن ہے کہ عقل و خرد انسانی جو انتہائی محدود و متناہی ہے اس ذات لامتناہی کا ادراک کر سکے؟ لیکن اسی

---

[1] سورۂ نور، آیت ۳۵

www.shiabookspdf.com

کے ساتھ اس کے وجود بابرکت کے اتنے آثار تمام موجودات عالم کی جبیں پر نمایاں ہیں کہ ہر شخص اجمالی طور پر اس کی ہستی اور صفات سے آگاہ ہوسکتا ہے۔[۱]

ہم پھر ایک ناقص مثال کے ذریعے اس کی کچھ مزید وضاحت کرنا چاہیں گے۔ ہم میں سے ہر شخص جانتا ہے کہ روح کا وجود ہے اور زمان ایک حقیقت ہے، لیکن روح و زمان کی حقیقت کا ادراک سہل نہیں۔ ہر شخص جانتا ہے کہ ایک زندہ کا وجود، ایک مردے کے وجود سے مختلف ہوتا ہے، لیکن حیات کی حقیقت کیا ہے؟ اس کا سمجھنا انتہائی دشوار امر ہے، بالفاظ دیگر ہم ان امور کا اجمالی علم رکھتے ہیں، نہ کہ تفصیل۔ اس کے بعد ایک گہرا اور دقیق نتیجہ بتاتے ہوئے فرماتے ہیں:

"فَهُوَ الَّذِي تَشْهَدُ لَهُ أَعْلَامُ الْوُجُودِ عَلَى إِقْرَارِ قَلْبِ ذِي الْجُحُودِ[۲]"۔

"پس وہ ایسی ذات ہے کہ جہانِ ہستی میں ذرّے ذرّے سے ظاہر ہونے والی نشانیاں جو اس کے وجود رحمت کی دلیل ہیں کہ اس کا انکار کرنے والوں کے دل بھی اس کا اقرار کرتے ہیں۔"

درحقیقت منکرینِ ذات الٰہی صرف زبان سے اس کا انکار کرتے ہیں، لیکن دلی طور پر اس کے بابرکت آثار کے مشاہدے کی بنا پر اس کے وجود کا اقرار کرتے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ خود کو منکرین کی صف میں شمار کرتے ہوں، جبکہ اُس کے وجود کا نور ان کے دلوں اور ذہنوں کی گہرائی میں جلوہ نما ہے، جس طرح قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

"وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُولُنَّ اللّٰهُ ۖ فَأَنّٰى يُؤْفَكُونَ ﴿٦١﴾ وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ نَزَّلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ مِنْ بَعْدِ مَوْتِهَا لَيَقُولُنَّ اللّٰهُ ۚ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ ۚ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ ﴿٦٣﴾"۔[۳]

"اگر تم ان سے پوچھو کہ کس نے آسمانوں اور زمینوں کو خلق کیا اور چاند اور سورج کو مسخر کیا تو وہ کہیں گے اللہ نے، پھر کس طرح وہ (اللہ کی عبادت سے) منحرف ہوتے ہیں۔۔۔ اور اگر ان سے دریافت کرو کہ کون ہے جو آسمان سے پانی برسا کر اس کے وسیلے سے مردہ زمینوں کو حیات نو بخشتا ہے وہ کہیں گے اللہ، کہہ دو (اے رسول ﷺ) کہ حمد و ستائش خدا کے لیے مخصوص ہے، لیکن اکثر لوگ یہ نہیں جانتے۔"

یہ بات ماورائے عقل و فہم ہے کہ خدا کا انکار کس طرح کیا جا سکتا ہے، جبکہ کائنات ہستی کا ذرّہ ذرّہ اور ہمارا اپنا سراپا

[۱] مزید وضاحت کتاب پیام امام خطبہ اوّل کے ذیل میں، ج ۱، ص ۸۲ پر ملاحظہ فرمائیں۔
[۲] جحود، و جحد، جاننے سے انکار کرنے کے معنیٰ میں ہے، جحود ہمیشہ حق کے مقابلے میں ایک قسم کا تعصب، دشمنی، لجاجت ہے۔
[۳] سورۂ عنکبوت، آیات ۶۱، ۶۳

www.shiabookspdf.com

وجوداس کی صنعت کا منہ بولتا شاہکار ہے۔ ہمارا اپنا وجود، مثال کے طور پر آنکھ پر غور وفکر ہی اس خلاق عظیم کی صفات جلال و جمال سے آگاہ کرنے کے لیے کافی ہے۔ یہ آنکھ جو سات طبقوں سے تشکیل شدہ ہے جن میں سے ہر ایک اپنی مخصوص بناوٹ کی بنا پر بجائے خود ایک حیرت انگیز اور کامل عضو ہے۔ یہ آنکھ کہ جس کے خلیے تمام دانشمندوں کو حیران کردیتے ہیں اور تمام علمی ترقّی کے باوجود اس پر قادر نہیں ہیں کہ اس کے مختلف النوع وظائف میں سے کوئی معمولی سا وظیفہ بھی انجام دے سکیں۔ اگر کائنات عالم میں وجود خداوندی کی کوئی اور نشانی نہ ہوتی تو بھی صرف یہی ایک عضو انسانی شناخت پروردگار کے لیے کافی تھا ، پھر کس طرح ایک صاحب عقل وخرد اس کے وجود کا انکار کرسکتا ہے، جبکہ جس طرف نگاہ اٹھتی ہے اس کے آثار اور نشانیاں پھیلی ہوئی نظر آتی ہیں۔

یہ تمام ذی حیات مخلوقات جن کی انواع واقسام لاکھوں کی تعداد میں آج کل کے دانشوروں کے مطابق صحراؤں اور جنگلات میں ناشناخت شدہ ہیں اور ان گنت تعداد میں سمندروں کی تہہ میں پوشیدہ ہیں، جن میں سے ہر ایک تنہا اپنی ذات میں ذات واجب کی عظمت وقدرت اور اس کے بیکراں علم کی دلیل ہے، پھر کس طرح ممکن ہے کہ ان حقائق سے چشم پوشی کرتے ہوئے کوئی صاحب فہم وخرد دل کی گہرائیوں سے خدائے واحد کا انکار کرسکے، سوائے اس کے کہ صرف ہوائے نفسانی اور دنیاوی مفادات کی خاطر زبان سے اس کا انکار کردیا جائے۔ بعض مغربی دانشور اور مفکرین کے بقول اگر کوئی شخص چاہے کہ خدا کا انکار کردے تو پھر اسے چاہیے کہ چشم حقیقت بند کرلے اور ان تمام حقائق سے صرف نظر کرلے۔

اسی طرح ایک دوسرے دانشور کے بقول ہر نئی اور تازہ علمی تحقیق اس کائنات کا کوئی پوشیدہ راز دریافت کرتی ہے اور پھر اُس سے پردہ اٹھاتی ہے۔ خداوند عالم تک رسائی کا ایک نیا راستہ دکھاتی ہے اور اس طرح علم ودانش کے فروغ کے ساتھ راہ خداشناسی واضح تر ہوتی جاتی ہے۔

اس خطبے کے اختتام پر امامؑ فرماتے ہیں:

"تَعَالَى اللّٰهُ عَمَّا يَقُوْلُ الْمُشَبِّهُوْنَ بِهٖ وَالْجَاحِدُوْنَ لَهٗ عُلُوًّا كَبِيْرًا۔"

"خداوند عالم اس سے کہیں برتر اور افضل ہے کہ کوئی شخص اس کے لیے تشبیہ قرار دے سکے یا اس کے وجود سے انکار کرسکے۔"

لفظ۔ مُشَبِّهَه، (مشابہت دینے والوں کا گروہ) کے دو مصداق ہیں:۔ ایک وہ لوگ جو اللہ کو بندوں سے تشبیہ دیتے ہیں اور مثلاً اس کے لیے جسم واعضاء اور ہاتھ پیر وغیرہ کے قائل ہیں اور دوسرا گروہ وہ ہے جو دیگر مخلوقات کو اُس سے تشبیہ دیتا ہے اور اس کا شریک وہمتا قرار دیتا ہے، جس طرح بجائے عبادت الٰہی کے بتوں کی پوجا کی جاتی ہے اور خداوند عالم کے

www.shiabookspdf.com

بجائے انہیں سجدہ کیا جاتا ہے۔

مفسرین نہج البلاغہ میں سے کچھ مفسرین نے جملہ بالا کی پہلی تفسیر مراد لی ہے جبکہ دوسرے مفسرین نے اسے تفسیر ثانی کا مصداق لیا ہے۔لیکن جملہ "وَالْمُشَبِّهُونَ بِهِ" پر غور کرنے سے دوسری تعبیر زیادہ قرین قیاس نظر آتی ہے۔ ہر چند یہ دونوں گروہ خود اشتباہ میں گرفتار ہیں، کیوں کہ نہ تو ذات باری صفاتِ مخلوقات کی حامل ہے کہ ایسی صورت میں وہ حوادثات سے مغلوب و مسخر ہو جاتی اور نہ مخلوقات میں کوئی اس کے مرتبہ اور مقام عظمت پر فائز ہو سکتا ہے، اس وجہ سے کہ بندہ اس کی صفات عظمت میں سے ایک صفت کا بھی حامل نہیں ہوتا۔

نکتہ

اس کا وجود آشکار اور حقیقتِ ذات پنہاں ہے

اس مختصر لیکن انتہائی معنی خیز و خیال آفریں خطبے میں اسماء و صفات الٰہی کے ضمن میں کچھ انتہائی اہم فکری نکات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

سب سے پہلے یہ کہ اس کی ذات والا صفات کی حقیقت کا عالم امکانات سے بلند اور پوشیدہ ہونا بہ ایں معنیٰ کہ تمام کائنات میں اس کے ظہور کے جلوے اس طرح بکھرے ہیں کہ کسی کو مجالِ انکار نہیں اور نہ کوئی اس پر قادر ہے کہ اس کی ذات پاک کا احاطہ کر سکے۔

اور یہ اس کے وجود مقدس کے ان گنت آثار میں سے ایک ہے کہ ہم جب بھی اس کی حقیقت ذات کو عقل کی روشنی میں سمجھنے کے لیے ایک قدم آگے بڑھتے ہیں تو اس کی لامتناہی ذات کی شعاعیں ہماری فکر کو پیچھے دھکیل دیتی ہیں اور جب ہمارا طائر فکر اس کی بلندیوں کی تلاش میں محو پرواز ہونے کی سعی کرتا ہے تو اس کے بال و پر اس آفتاب کی تمازت سے خاکستر ہو جاتے ہیں۔ بقول ابن ابی الحدید معتزلی کے:[1]

فِيْكَ يَا أُعْجُوْبَةَ الْكَوْنِ غَدَا الْفِكْرُ كَلِيْلًا
أَنْتَ حَيَّرْتَ ذَوِي اللُّبِّ وَبَلْبَلْتَ الْعُقُوْلَا
كُلَّمَا قَدَّمَ فِكْرِيْ فِيْكَ شِبْرًا فَرَّ مِيْلًا

[1] یہ اشعار "شرح باب حادی عشر" کے حواشی میں صفحہ اول پر ابن ابی الحدید سے نقل کیے گئے ہیں۔

www.shiabookspdf.com

نَاکِصًا یَخْبِطُ فِیْ عَمْیَاءَ لَا یَھْدِی السَّبِیْلَا

۱۔ اے اعجوبہ جہان ہستی تیری ذات (کی جستجو) میں ہماری فکر خستہ ہے۔

۲۔ تو اپنی معرفت کے متلاشیوں کو حیرت میں مبتلا کردیتا ہے اور عقلوں کو تہہ و بالا کر ڈالا۔

۳۔ جب بھی میری فکر تیری سمت ایک قدم بڑھتی ہے تو ساتھ ہی ایک میل دور ہو جاتی ہے۔

۴۔ ہاں یہ واپس پلٹ کر ظلمتوں کا شکار ہو جاتی ہے اور اس سے نجات کی کوئی سبیل بھی نہیں ملتی۔

لیکن اس کے بالمقابل یہ بھی ناقابل تردید ہے کہ صحن ہستی میں موجودات عالم میں خواہ وہ ظاہری ہوں یا باطنی، اس کائنات کا فوق العادہ نظم وضبط، اس کی خلقت میں پوشیدہ اسرار و رموز اور عجائب وغرائب ہر شے سے اس طرح ظاہر اور عیاں ہیں کہ نگاہ عدل سے اس کا مشاہدہ انسانِ عاقل کو بے اختیار اُس عظیم المرتبت اور عدیم المثال دعائے امام حسین علیہ السلام کی یاد دلاتی ہے جو معصومؑ نے روزِ عرفہ بارگاہ احدیت میں پیش کی تھی جہاں آپؑ فرماتے ہیں:

"مَتٰی غِبْتَ حَتّٰی تَحْتَاجَ اِلٰی دَلِیْلٍ یَدُلُّ عَلَیْکَ وَمَتٰی بَعُدْتَ حَتّٰی تَکُوْنَ الْاٰثَارُ ھِیَ الَّتِیْ تُوْصِلُ اِلَیْکَ عَمِیَتْ عَیْنٌ لَا تَرَاکَ عَلَیْھَا رَقِیْبًا"

"بارالہا! تو ہم سے کب پنہاں و پوشیدہ ہے کہ ہم کسی دلیل کے محتاج ہوں جو تیری طرف ہماری رہنمائی کرے اور تو ہم سے کب اور کہاں دور ہے کہ ان آثار کو تلاش کریں جو ہمیں تجھ سے نزدیک کردیں؟ بصارت کھو بیٹھے وہ آنکھ جو تجھے اپنا محافظ اور نگہبان نہ جانے۔"

بہ الفاظ دیگر خداوند متعال کی فکر انسانی سے نزدیکی و دوری یعنی ایک طرف وہ ہم سے خود ہماری ذات سے نزدیک تر ہے اور دوسری طرف اتنا دور اور برتر کہ اس سے بالا کسی چیز کی تصور نہیں کیا جاسکتا ہے۔ یہ اس کی ذات کے لامتناہی اور بے مثال ہونے پر دوسری دلیل ہے، کیوں کہ وہ ہر جگہ ہے۔ کوئی جگہ اس کے وجود سے خالی نہیں ہوسکتی ہے ورنہ محدود ہونا لازم آئے گا، حالاں کہ وہ بہت بلند ہے اس تک کسی رسائی ممکن نہیں ورنہ ہماری سوچ اور فکر میں اس کی محدودیت کے نقوش ثبت ہوجائیں گے۔

گفتگو کا تیسرا محور مخلوقات کو کسی بھی صورت اُس کی پاک ذات سے تشبیہ دینا یا کسی صفت میں برابر ہونے کی نفی میں ہے۔ یہ بھی اُس ذات پاک کی لامتناہی ہونے سے تعلق رکھتے ہیں، کیوں کہ تمام مخلوقات ناقص ہیں۔ ان کا وجود محدود ہے اور ان کی صفات نقصان اور عدم سے مربوط ہیں، جب اسے کسی مخلوق سے تشبیہ دیں یا اپنی فکر میں اسے کسی صفت میں شریک یا شبیہ قرار دیں، مخلوقات کی صفات کو اُس میں دیکھیں، اسے واجب الوجود یا لامتناہی ہونے سے کم تر خیال کریں اور مالی

www.shiabookspdf.com

نقصانات کا حامل قرار دیں۔

آگے آنے والے خطبوں میں اس کے متعلق مزید ان گنت انتہائی پر تفکر اور معنی خیز اشارے ملتے ہیں، جنہیں ہم ان کے مناسب مواقع پر تفصیل سے ذکر کریں گے انشاءاللہ۔

www.shiabookspdf.com

www.shiabookspdf.com

پچاسواں خطبہ

ومن کلام لہ علیہ السّلام [1]

وَفِيْهِ بَيَانٌ لِّمَا يَخْرَبُ الْعَالَمُ بِهٖ مِنَ الْفِتَنِ وَبَيَانُ هٰذِهِ الْفِتَنِ

اس خطبہ میں ان فتنوں کو بیان کیا گیا ہے جو معاشروں کی تباہی کا سبب بنتے ہیں اوران کی تشریح کی گئی ہے۔

خطبہ، ایک نگاہ میں

امامؑ اس خطبے میں انسانی معاشروں میں بگاڑ اور فساد پیدا کرنے والے مختلف عوامل میں سے ایک اہم عامل کی طرف انگشت نمائی کرتے ہیں اوران واضح اورعیاں انحرافات جو بعد ختمی مرتبتؐ اسلامی معاشرے میں نمودار ہو گئے تھے، کی وجوہات پر انتہائی اہم گفتگو کرتے ہوئے اس حقیقت کو بیان کرتے ہیں کہ شیطان اور اس کے پیروکار کس طرح سادہ لوح افراد کو اپنے دام فریب میں جکڑنے کے لیے حق و باطل کو مخلوط کر دیتے ہیں تا کہ اپنے نحس و باطل و مذموم مقاصد کی تکمیل کر سکیں۔

ان کارکنان باطل کو اس حقیقت کا کلّی ادراک ہے کہ اگر حق اپنی خالص اور حقیقی شکل میں سامنے آئے تو ان کے لیے معاشرے اور انسانوں کو گمراہ کرنے اور بہکانے کی کوئی سبیل باقی نہیں رہتی اور اس کے برعکس اگر ابلیسیت اپنی واقعی مکروہ شکل میں نظر آ جائے تو کوئی فرد اس کی راہ پر ایک قدم بھی گامزن نہیں ہو سکتا۔ یہی بنیادی سبب ہے اس بات کا کہ کفر و نفاق

---

[1] سند خطبہ: یہ خطبہ علما کے ایک ایسے گروہ نے جو سیّد رضیؒ سے قبل گزرا ہے، اپنی کتابوں میں درج کیا ہے، منجملہ ان میں سے مرحوم "کلینی" نے "کافی" میں باب البدع والرائی والمقائیس، جلد ۱، ص ۵۴ میں۔ اور تاریخ یعقوبی، جلد ۲، ص ۱۳۴۔ اور ابوحیان توحیدی نے "البصائر والذخائر" میں ص ۳۲ پر اور اسی طرح ایک بڑے گروہ نے علامہ رضیؒ کے بعد اس خطبے کو اپنی کتاب میں درج کیا ہے جس کی تفصیل غیر ضروری ہوگی۔ (مصادر نہج البلاغہ جلد ۲، ص ۱۹)

www.shiabookspdf.com

کے گماشتے ہمیشہ سے حق و باطل کو اس طرح ملا جلا کر پیش کرتے ہیں کہ ظاہری حق نمائی سے سادہ لوح اور سطحی فکر و نظر کے حامل افراد کو فریب دیا جا سکے اور باطنی کفر و خباثت سے اپنے مذموم مقاصد حاصل کیے جا سکیں۔ جی ہاں! یہ ایک ایسا زہر قاتل ہے جس پر شیرینی کی تہہ چڑھا دی گئی ہے تاکہ ناواقف اور عاقبت نا اندیش افراد اس کی جانب راغب ہو جائیں۔ یہ مفسد فریب ساز ہمیشہ باطل کو لباسِ حق میں پیش کرتے ہیں تاکہ اس طریقے سے لوگوں کو حق سے غافل کر سکیں۔

پہلا حصہ

اِنَّمَا بَدْءُ وُقُوعِ الْفِتَنِ اَهْوَاءٌ تُتَّبَعُ وَ اَحْكَامٌ تُبْتَدَعُ يُخَالَفُ فِيهَا كِتَابُ اللهِ وَ يَتَوَلَّى عَلَيْهَا رِجَالٌ رِجَالًا عَلَى غَيْرِ دِينِ اللهِ فَلَوْ اَنَّ الْبَاطِلَ خَلَصَ مِنْ مِزَاجِ الْحَقِّ لَمْ يَخْفَ عَلَى الْمُرْتَادِينَ وَ لَوْ اَنَّ الْحَقَّ خَلَصَ مِنْ لَبْسِ الْبَاطِلِ انْقَطَعَتْ عَنْهُ اَلْسُنُ الْمُعَانِدِينَ وَ لٰكِنْ يُؤْخَذُ مِنْ هٰذَا ضِغْثٌ وَ مِنْ هٰذَا ضِغْثٌ فَيُمْزَجَانِ فَهُنَالِكَ يَسْتَوْلِي الشَّيْطَانُ عَلَى اَوْلِيَائِهِ وَ يَنْجُو الَّذِينَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِنَ اللهِ الْحُسْنٰى.

”فتنوں کی پیدائش کا آغاز ہوا و ہوس کی پیروی اور بدعتوں کی تقلید سے ہوتا ہے جس سے کتاب خدا کی مخالفت ہوتی ہے اور ایک گروہ (کورچشم و نافہم یا حقیقت ناشناس ہوا پرست و گمراہ) ان کی پیروی کرنے کھڑے ہو جاتے ہیں اور دین خدا کے مقابلے میں ان شیطانی اعمال کی حمایت کرتے ہیں۔ اگر اس باطل کو جو حق سے گھلا ملا دیا گیا ہے، علیحدہ کر دیا جائے تو کسی طالب حق سے پوشیدہ نہیں رہ سکتا اور اگر حق باطل کی ملاوٹ سے پاک اور منزّہ ہو تو دشمنان حق کی زبانیں گنگ ہو جائیں گی، لیکن ہوتا یہ ہے کہ کچھ حق لیا جاتا ہے اور کچھ باطل اور پھر ان دونوں کو آپس میں ملا دیا جاتا ہے اور یہ وہ مرحلہ ہوتا ہے جہاں شیطان اپنے دوستوں اور پیروکاروں پر مسلط ہو جاتا ہے اور سوائے اس کے کہ رحمت خدا جس کے شامل حال ہو جائے کوئی اس سے نجات حاصل نہیں کر سکتا۔“

شرح و تفسیر

ہوا و ہوس کی پیروی فتنوں کی ابتدا ہے

یہ خطبہ کس زمانے میں اور کن حالات و شرائط میں ارشاد کیا گیا، دانشمندوں کے درمیان موضوع بحث رہا ہے۔ کچھ

www.shiabookspdf.com

اس بات کے معتقد ہیں کہ امیر المومنینؑ نے ظاہری خلافت کے حصول کے چھ دن بعد یہ خطبہ ارشاد کیا، جب کہ بعض دیگر علما اسے اس زمانے سے مربوط کرتے ہیں جب حکمیت کا فیصلہ سامنے آچکا تھا، البتہ خطبے کے مندرجات دونوں مواقع سے ہم آہنگ نظر آتے ہیں خواہ وہ آغاز خلافت ظاہری کا زمانہ ہو یا اس زشت وشرمناک انجام کا جو مسئلہ حکمیت کا ہوا۔ اب ہم اس خطبے کی تشریح وتفسیر کو سمجھنے کی سعی کرتے ہیں۔

امامؑ اس خطبے کے آغاز میں ان موارد کا تذکرہ کرتے ہیں جو تمام اسلامی معاشروں میں فتنہ وفساد کا سرچشمہ ہوتے ہیں، چاہے وہ دورِ رسالت مآبؐ کی رحلت کے فوراً بعد کا ہو، یا جمل وصفین اور نہروان کا پرآشوب اور سنگین دور ہو اور اس گمراہی اور حق سے روگردانی کے اصل منبع اور سرچشمے کی طرف بلیغ انداز میں اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"إِنَّمَا بَدْءُ وُقُوعِ الْفِتَنِ أَهْوَاءٌ تُتَّبَعُ وَأَحْكَامٌ تُبْتَدَعُ[1] يُخَالَفُ فِيهَا كِتَابُ اللهِ"

"فتنوں کی پیدائش کا آغاز ہوا وہوس اور بدعتوں کی پیروی سے ہوتا ہے جو کتاب خدا کی مخالفت ہے۔"

درست ہے کہ فتنہ وفساد کی حقیقی جڑیں دو ہیں ایک اپنی خواہشات نفس کی پیروی اور دوسرے مفسدین اور منافقین کے خودساختہ جھوٹے احکامات جو کتاب خدا کے صریحاً خلاف ہیں۔ بے شک اگر لوگوں کے درمیان حقیقی احکام الٰہی کا نفاذ ہوتا اور قوانین اسلامی کی اصالت کی حفاظت کی گئی ہوتی اور دین خدا میں ناروا بدعتیں نہ رائج کی گئی ہوتیں اور اسی طرح خالص قوانین اسلام کے نفاذ میں ہوا وہوس کی حاکمیت آڑے نہ آجاتی تو یہ تمام فتنے اور فسادات وجود ہی میں نہ آتے، کیوں کہ حقیقی قوانین اسلامی نفاذِ عدل اور حقوق انسانی کے محافظ اور ضامن ہوتے ہیں اور معاشرے کے مختلف طبقات کی ذمّے داری کی نشاندہی کرتے ہیں۔

فتنہ وفساد اس وقت سامنے آتا ہے جب کچھ دنیا پرست اپنے حق سے زیادہ طلب کرنا چاہتے ہیں اور قوانین الٰہی کو ان کے مفادات کی راہ میں حائل ہونے کی بنا پر تحریف کا شکار بنا دیا جاتا ہے؛ حق وانصاف کو پیروں تلے روند دیا جاتا ہے؛ مفاد پرست افراد کے گروہ اپنے اوپر عائد ہونے والے وظائف الٰہی کو فراموش کر دیتے ہیں اور نت نئی بدعتیں ظاہر ہونے لگتی ہیں۔

درحقیقت جس جگہ بھی یہ فسادی گروہ تحریف اور غلط تفاسیر کی مدد سے اپنے ہوا وہوس کی تکمیل کر سکتا ہے، وہاں پہنچ جاتا ہے اور جب بھی اسے اپنے مکروہ عزائم کی تکمیل کے لیے نئے اور جعلی شرعی اور دینی احکامات کی ضرورت پڑتی ہے، یہ نئی

---

[1] تبتدع: مادّہ بدعة سے نئے کام کے معنی میں ہے اور جب اُسے دینی امور کے متعلق استعمال کیا جائے تو ایسے احکام اور قوانین کے معنی میں ہے جو کتاب خدا اور سنت نبویؐ کے برخلاف ہوں۔

www.shiabookspdf.com

بدعتیں ایجاد کر لیتا ہے۔ اگر چہ یہ بھی حقیقت ہے کہ بدعات بھی ہوا و ہوس کی ہی پیدا کردہ ہوتی ہیں لیکن ہوا و ہوس اور شیطانی میلانات و رجحانات کبھی تو غلط تفاسیر اور احکامات الٰہی کے من مانے نفاذ کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں اور کبھی خود ساختہ بدعتوں اور جعلی احکام کی صورت میں، اسی بنا پر امامؑ کے کلام میں دونوں کا علیحدہ علیحدہ ذکر کیا گیا ہے۔

یہاں ہم مثال کے طور پر بنی امیہ کے فتنے کو جو تاریخ اسلام کا سب سے بڑا اور مہیب فتنہ تھا، پیش کر سکتے ہیں۔ اپنی خود غرض حکومت کے حصول کے لیے خواہشات کی سواری کو استعمال کیا۔ جہاں تک ممکن ہوا احکامات اسلامی کی غلط تفاسیر اور باطل توضیحات و تاویلات کا سہارا لیا اور انہیں اپنے مفادات اور منافع کے لیے استعمال کیا اور جہاں یہ بھی کام نہ آسکیں وہاں نت نئی بدعات ایجاد کر لیں۔

امیر شام نے خلافتِ اسلامی کو دھوکے اور چالبازی سے اپنے قبضے میں لیا اور ایک نئی بدعت کی بنیاد ڈالتے ہوئے اسے اپنی خاندانی میراث قرار دے دیا، زیاد کو اپنا بھائی قرار دیا اپنے بیٹے یزید کے لیے اپنی حیات ہی میں لوگوں سے بیعت لی اور امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہما السلام پر، جو بعد ختمی مرتبتؐ عالم اسلام کی بزرگ ترین ہستی اور علم و آگاہی و تقویٰ کے اعلیٰ ترین مقام پر فائز تھے، سب وشتم نہ صرف خود شروع کیا، بلکہ اپنے بعد آنے والوں کے لیے اپنی سنت مقرر کر دی۔ اس نے اور اس کے ساتھیوں نے خلیفۂ ثالث کے خون میں شرکت کی اور پھر خود ہی قصاص کے دعویدار بھی بن گئے۔ [1] اس کے بعد مزید فرماتے ہیں:

"وَيَتَوَلَّى [2] عَلَيْهَا رِجَالٌ رِجَالًا عَلَى غَيْرِ دِيْنِ اللهِ"

"پھر ایک گروہ جس کی بصارت و سماعت پر بدبختی نے مہر لگا دی تھی، حق سے آگاہ ہونے کے باوجود اپنی خواہشات نفسانی کی بنا پر دین خدا کی مخالفت میں ان کی تمام بدعتوں اور ہوا و ہوس کی حمایت کرنے لگا۔"

اگلے جملے میں امامؑ ان وسیلوں اور ذرائع کی طرف اشارہ کرتے ہیں، جو ایسے افراد اپنے مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ تاریخ انسانیت کے صفحات گواہ ہیں کہ ہر دور اور ہر عہد کے ہوا و ہوس کے ایسے پرستاروں اور فرزندان دنیا نے ہمیشہ اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل کے لیے انہی (ابلیسی) وسائل و ذرائع کا استعمال کیا ہے۔ گویا کہ یہ ان کی ایک مستقل سنتِ جاریہ بن گئی ہے کہ اپنے باطل اور مذموم مقاصد کی تکمیل اور حصول کے لیے ہمیشہ حق کو باطل سے مخلوط کر

---

[1] اس پر تفصیل کے لیے کتاب "الغدیر" جلد ۱۰، کا مطالعہ کریں۔

[2] یتولی: تولی کے مادے سے ماخوذ ہے جس کے معنی پیروی کرنا ہیں اور کبھی کبھی نزدیک ہونے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے لیکن یہاں پہلے معنی زیادہ مناسب نظر آتے ہیں۔

www.shiabookspdf.com

دیتے ہیں۔ یہ افراد باطل کے چہرے پر حق کی نقاب چڑھا کر زہر ہلاہل کی تہہ چڑھا کر پیش کرتے ہیں۔ امامؑ فرماتے ہیں:

"فَلَوْ أَنَّ الْبَاطِلَ خَلَصَ مِنْ مِزَاجِ الْحَقِّ لَمْ يَخْفَ عَلَى الْمُرْتَادِينَ[1]، وَلَوْ أَنَّ الْحَقَّ خَلَصَ مِنْ لَبْسِ الْبَاطِلِ انْقَطَعَتْ عَنْهُ أَلْسُنُ الْمُعَانِدِينَ"

"اگر باطل کو حق سے جدا کر دیا جائے اور یہ اپنی اصل شکل میں ظاہر ہو تو کسی متلاشی حق سے پوشیدہ نہیں رہ سکتا (یعنی کوئی اس کی پیروی نہیں کر سکتا) اور اسی طرح اگر حق باطل کی آمیزش سے پاک اور منزّہ ہو اور اپنی پاکیزہ اور خالص صورت میں سامنے ہو تو دشمنان حق اور پیروان باطل کی زبانیں قطع ہو جائیں۔"

کس قدر جاذبِ فکر تعبیر و گفتگو ہے! باطل اگر حقیقی شکل میں نمایاں ہو تو کوئی بھی اس کا طالب نہ ہو اور حق اگر اپنی حقیقی شکل میں سامنے آئے تو بہانہ سازوں کے تمام بہانوں اور حیلہ و مکر کی چالوں کو قطع کر دے۔ یہی وجہ ہے کہ نہ خالص اور واضح حق ان دنیا پرستوں کی مشکلات حل کر سکتا ہے، کیوں کہ ان کا حقیقی مفاد باطل میں پوشیدہ ہوتا ہے اور نہ واضح اور خالص باطل ان کی مقصد برآوری کے لیے مفید ہو سکتا ہے، کیوں کہ لوگ اس کی حمایت نہیں کریں گے۔ یہی وہ مرحلہ ہے جہاں یہ افراد اپنے اہداف کے حصول کے لیے حق و باطل کو ایک دوسرے میں مدغم کر دیتے ہیں، یہیں سے اس دنیاوی اور تخریب کار سیاست کا نتیجہ اور خلاصہ سمجھ میں آجاتا ہے۔

امامؑ اس سلسلے میں مزید فرماتے ہیں:

"وَلَكِنْ يُؤْخَذُ مِنْ هَذَا ضِغْثٌ[2] وَمِنْ هَذَا ضِغْثٌ فَيُمْزَجَانِ فَهُنَالِكَ يَسْتَوْلِي الشَّيْطَانُ عَلَى أَوْلِيَائِهِ، وَيَنْجُو الَّذِينَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِنَ اللهِ الْحُسْنَى"

"لیکن یہ لوگ کچھ اس میں سے (حق میں سے) لیتے ہیں اور کچھ اُس میں سے (باطل میں سے) اور ان دونوں کو خلط ملط کر دیتے ہیں۔ یہ وہ موقع ہوتا ہے کہ شیطان اپنے دوستوں اور پیروکاروں پر تسلط حاصل کر لیتا ہے اور اس سے صرف وہی بندۂ خدا محفوظ رہتا ہے کہ رحمت پروردگار جس کے شامل حال ہو جائے۔"

اس تعبیر سے اس بات کی بخوبی نشان دہی ہوتی ہے کہ حق و باطل کی باہم آمیزش درحقیقت باطل کی شناخت سے مانع نہیں۔ اگرچہ اس کے لیے شدید جستجو اور تحقیق یا صاحبانِ معرفت و واقفان سرِّ حقیقت سے رہنمائی حاصل کرنی پڑتی ہے، اسی لیے امامؑ فرماتے ہیں:

---

[1] مرتادین، کا مادّہ ارتیاد ہے، جو کہ طلب کرنے کے معنی میں آیا ہے۔
[2] ضغث، بروزن حرص، تنکوں کا دستہ، کبھی پریشان خواب کے لیے بھی استعمال ہوا ہے۔

www.shiabookspdf.com

"حق و باطل کی آمیزش کی اس کشمکش میں شیطان اپنے دوستوں اور پیروکاروں پر غالب آ جاتا ہے اور خداوند عالم طالبان حق کو اس پر خطر راہ پر بھٹک جانے سے محفوظ رکھنے کے لیے ان پر رحمت کا نزول کرتا ہے اور ان کی رہنمائی کرتا ہے۔(انہیں اپنے حفظ وامان میں رکھتا ہے)"

درحقیقت یہ حق و باطل کی آمیزش ایک ایسا سبز باغ ہے، جو ہوا پرستوں کے لیے انتہائی دلآویز اور شیطان کے پرستاروں کے لیے ایک بہترین بہانہ ہے، جس سے خود اپنے قلب وضمیر کو فریب میں مبتلا کرتے ہیں اور دوسروں کے سامنے اپنے اعمالِ باطل اور بدعاتِ قبیحہ کی اس طرح توجیہہ اور توضیح پیش کرتے ہیں کہ ہم اِس دلیل یا اُس دلیل (اشارہ ہوتا ہے حق کی شکل کی طرف جو باطل آمیز ہوتی ہے) کی بنا پر اس راہ پر گامزن ہیں۔

اس بات کا قوی امکان ہے کہ کچھ کم عقل وضعیف الفکر اور سادہ لوح افراد غیر شعوری اور نادانستہ طور پر اس شیطانی جال میں گرفتار ہو جائیں، حالانکہ اگر وہ بھی اپنے لیے کسی صحیح رہنما کا انتخاب کرتے تو اس بدقسمتی اور عاقبت سوزی کا شکار نہ ہوتے۔اس طرح ہم اس حق و باطل کی آمیزش سے دوچار افراد کو تین طبقوں میں تقسیم کر سکتے ہیں:۔

پہلا گروہ وہی ہے، جس کے لیے ارشاد ہوا "اَلَّذِیْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَ اللهِ الْحُسْنٰى [1] اور ایک دوسری تعبیر کے مطابق یہ طالبان حق کا وہ گروہ ہے جو حق شناس اور مخلص ہے اور اپنے پروردگار کے لطف وکرم کی بنا پر ان فتنہ پردازوں کی سازشوں اور ریشہ دوانیوں سے محفوظ رہتا ہے۔

دوسرا گروہ وہ ہے، جو حیلہ جو اور بہانہ ساز ہے اور چاہتا ہے کہ بظاہر راہِ حق پر گامزن رہیں، لیکن حقیقتاً راہِ باطل اختیار کریں۔یہ لوگ درحقیقت نیم آگاہ ہیں اور خود شیطان کے مکروفریب میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔

تیسرا گروہ ان سادہ لوح افراد کا ہے، جن کے لیے اس حق و باطل کی آمیزش میں سے حق کو شناخت کرنا انتہائی دشوار ہوتا ہے اور وہ نادانستہ طور پر شیطان کے پھیلائے ہوئے جال میں گرفتار ہو جاتے ہیں، سوائے ان افراد کے جو کسی حق شناس اور صاحبِ فہم رہبر اور رہنما کی پناہ میں آ جائیں۔

اسی قبیل کی گفتگو ہمیں امامؑ کے ۳۸ ویں خطبے میں بھی ملتی ہے، جہاں امامؑ نے شبہے کی تفسیر بیان کی ہے اور اس سے نجات کی راہ دکھائی ہے۔اس مقام پر آپ نے فرمایا تھا۔"شبہے کو اس لیے شبہ کا نام دیا گیا ہے کہ حق سے مشابہت رکھتا ہے، لیکن اولیاء اللہ اس کے دام میں نہیں پھنستے، کیوں کہ نورِ یقین وایمان ان کی رہنمائی کرتا ہے۔لیکن دشمنانِ خدا اپنی گمراہی کے سبب شبہات کے دام میں گرفتار رہتے ہیں۔"

---

[1] یہ جملہ سورۂ انبیاء، آیت ۱۰۱ (اِنَّ الَّذِیْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰى اُولٰٓئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ) سے لیا گیا ہے۔

www.shiabookspdf.com

نکات

فتنوں کی جڑ

تاریخ اسلام خصوصاً قرن اوّل اور دوم میں انتہائی تعجب خیز اور دردناک فتنہ و حوادثات سے بھری ہوئی ہے، جنھوں نے ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے مخلص ساتھیوں کی تمام زحمتوں، کاوشوں اور محنتوں کو خاک میں ملا دیا اور اگر یہ سازشیں اور فتنے جنم نہ لیتے اور اسلام کو اُس صراطِ مستقیم پر قائم رہنے دیا گیا ہوتا جو ہادی اعظمؐ نے اس کے لیے متعین کی تھی تو آج ہم ایک دوسرے جہان عالم کا مشاہدہ کر رہے ہوتے۔ بالخصوص رحلت سرکار دو عالمؐ کے پچیس سال بعد جو فتنے امت مسلمہ میں پھیلے ان کی کوئی مثال ماقبل نہیں ملتی۔ جس وقت سن ۳۵ ہجری میں امیر المومنین علیہ السلام ظاہری خلافت پر رونق افروز ہوئے تو آپ نے بھرپور جدوجہد کی کہ اسلام کو زمانہ رسولؐ کی راہ پر واپس لا سکیں، لیکن فتنہ و فساد کا دامن اس قدر دراز ہو چکا تھا کہ امامؑ اگر ایک سمت کوئی اصلاح کرتے تو دوسری سمت فتنہ و فساد کی آگ بھڑک اٹھتی۔ خلافت عثمانیہ کے آخری دور میں ہر شعبۂ زندگی فتنوں کی آماجگاہ بن گیا تھا۔ تمام اسلامی اقدار پامالی کی زد پر تھیں اور عہد جاہلیت کی تمام مذموم سنتیں اور مشرکانہ روایات پھر سے زندہ ہو گئیں شرک و نفاق کے زندہ بچ جانے والے ہر گوشہ و کنار میں نمودار ہو گئے اور ہر اہم اور کلیدی حیثیت پر فائز ہو گئے۔ یہی بنیادی وجہ تھی جس نے امامؑ کی حقیقی اسلام کی نشاط ثانیہ کی مسلسل تگ و دو کی راہ میں مشکلات کا کوہ عظیم کھڑا کر دیا۔ یہ صحیح ہے کہ امامؑ کی مسلسل اور جان لیوا جدوجہد نے ان اسلامی روایات اور قوانین کو حیات نو عطا کی، لیکن صد افسوس کہ یہ شعلہ ہائے کفر و نفاق بجھ نہ سکے اور ان شیطان صفت طاغوتوں کی مکارانہ سازشوں سے شہادتِ امامؑ کا المناک واقعہ رونما ہوا۔

اس کے بعد حکومت امیر شام و یزید اور اس شجرۂ خبیثہ کے ملعون حکمرانوں کے ادوار میں ان فتنوں کے اشجار کی آبیاری کی جاتی رہی۔ بے گناہوں کا خون پانی کی طرح بہایا گیا، انواع و اقسام کی بدعتیں دین و مذہب و اسلامی معاشرے میں رائج کر دی گئیں۔ ہوا و ہوس معاشرے پر حاکم ہو گئے۔ بنی عباس کے دور میں یہ تمام مذموم عناصر اپنے عروج پر پہنچ گئے اور حقیقی اسلام ان خود پرست اقتدار و دولت کے بھوکے بھیڑیوں کی درندگی کا شکار ہو گیا۔

مزید برآں جو اعمال ان دونوں شاہی خاندانوں (بنی امیہ اور بنی عباس) کے تاجداروں سے ظاہر ہوئے، ان میں اسلام سے شباہت کا شائبہ بھی نہیں تھا، جبکہ بدقسمتی سے ان میں سے ہر ایک خلیفۂ رسولؐ ہونے کا دعویدار تھا۔

اگر فتنوں کی اصل بنیادوں پر نگاہ ڈالی جائے تو قول معصومؑ کی جو اس خطبے میں ارشاد کیا گیا ہے، حقانیت ثابت ہو جاتی

www.shiabookspdf.com

ہے کہ ان تمام مفاسد اور فتنوں کی بنیادی جڑیں دو ہیں :۔ایک شیطانی ہوا و ہوس کی پیروی اور دوسری دین خدا میں اپنے مذموم مقاصد کے حصول کے لیے خود ساختہ بدعتیں رائج کر دینا۔یہی دو بنیادی ارکان فساد ہیں جو ہر موقع اور ہر محل پر نظر آتے ہیں۔ فتنہ گروں کا ایک گروہ وہ ہے جو رکن فساد کا سہارا لیتا ہے اور دوسرا گروہ دوسرے رکنِ فساد کا سہارا لیتا ہے اور ایک تیسرا ایسا گروہ بھی ہے جو ان دونوں باطل ذرائع کو اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے استعمال کرتا ہے،جس کی شرح کے لیے ایک کتاب کافی نہیں ہو سکتی اور اس نقطۂ نظر سے مطالعہ کے لیے ان ادوار کی تاریخ کا ایک تجدیدی مطالعہ لازمی ہوگا۔

شیطانی سیاستیں

تعجب کی بات یہ ہے کہ پوری تاریخ میں خود غرض سیاستدانوں کا اصولِ سیاست کا انداز یکساں رہا ہے۔ہزاروں سال پہلے فرعون نے بہ الفاظ قرآن "لڑاؤ اور حکومت کرو" کی سیاست شروع کی:

"اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْأَرْضِ وَ جَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا[1]"

آج بھی استعماری دنیا میں یہ اصول اپنی بھرپور طاقت اور توانائی کے ساتھ موجود ہے اور اسی طرح عمل پذیر ہے ۔ہر استعماری حکمران ہر ممکنہ وسیلے اور حربے سے دوسری قوموں اور ملتوں میں اختلاف و انتشار پھیلاتا ہے تاکہ اپنی حکومت کو مضبوط و مستحکم کر سکے۔

حق کو باطل سے مخلوط کر دینا ان اصولوں میں سے ایک ہے جو ان ظالم و فرعون صفت حکمرانوں کی بساط سیاست کا اہم ترین مہرہ ہوتا ہے۔یہ افراد ہمیشہ اپنے مکروہ چہروں پر حق و انصاف اور انسانی حقوق کی محافظت کی نقاب چڑھائے رکھتے ہیں اور اس نقاب کے پس پردہ اپنے تمام طاغوتی افعال زیر عمل لاتے ہیں۔

ظالم اور متشدد حکمرانوں کے حالات کا مطالعہ کرتے ہوئے کبھی کبھی ہم ایسے واقعات بھی پڑھتے ہیں کہ کسی بوڑھی عورت کی فریاد سے حکمران اس قدر بے چین و بے قرار ہو گیا کہ ہر دیکھنے والے کو اس کی انسانیت اور کمزوروں کی دادرسی پر حیرت ہونے لگی کہ یہ حاکم کس قدر باضمیر اور مظلوموں کا ہمدرد ہے کہ اس بوڑھی عورت کی فریاد سے اس قدر متاثر ہو گیا اور پھر یہ داستانیں زبان زد عام ہو جاتی ہیں۔نوشیرواں کی زنجیر عدل اور اس کے محل کے کونے پر بنا ہوا بوڑھی عورت کا گھر اور اسی قبیل کی دوسری داستانیں جو ہم مسلم خلفا اور بادشاہوں کی تاریخ میں پڑھتے ہیں اور غیر مسلم حکمرانوں کے ساتھ بھی اسی قسم کی داستانیں وابستہ ہیں، یہ سب کچھ دراصل ان کے اپنے حقیقی مظالم پر پردہ ڈالنے کی کوشش کے سوا کچھ نہیں تھا۔

---

[1] سورۂ قصص، آیت ۴

www.shiabookspdf.com

یہ (مفسدین) بہت اچھی طرح واقف ہیں کہ باطل اپنی اصل شکل میں کسی معاشرے کے لیے بھی قابل قبول نہیں ہو سکتا، لہٰذا ان کے لیے اس کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں رہتا کہ اپنی باطل فطرت اور اعمال میں کچھ بہتر اور حق نما اعمال کی بھی آمیزش کر لیں۔ یہ شیطانی سیاست کا کاروبار ہمارے عصر میں کچھ اس شدت کے ساتھ فروغ پا رہا ہے کہ مخفی طور پر حق و باطل کی آمیزش تیزی سے پروان چڑھ رہی ہے۔ دنیا کے سرکردہ سیاستدانوں نے اپنے افعال باطلہ کو اس طرح حق کے پردے میں پوشیدہ کر دیا ہے کہ اس کی تشخیص بظاہر ممکن نظر نہیں آتی۔

ان کے تمام نعرے مثلاً حقوق بشر، حقوق حیوانات، مزدوروں کا دن، ماؤں کا دن، بلا معاوضہ طبی سہولت، اقوام عالم کے درمیان عفو و درگزر، فلاحی اداروں کی تشکیل اور فاقہ کشوں، متاثرین جنگ اور محروم افراد کی امداد، لوگوں کو سیاسی پناہ فراہم کرنا غرض اسی قسم کے بے شمار نعرے ہیں، جو سب کے سب درحقیقت ان کے مکر و فریب اور جھوٹ پر پردہ ڈالنے کے لیے بلند کیے جاتے ہیں اور یہ فریبی اور مکار افراد ان نعروں کو اس جوش و خروش اور ظاہری خلوص سے بلند کرتے ہیں کہ بعض اوقات صاحب فہم و خرد اور ہوش مند افراد بھی سچائی اور خلوص سے یہ باور کرنے لگتے ہیں کہ آج کی دنیا انبیاءؑ کے راستے پر چل رہی ہے یا بالفاظ دیگر اہداف انبیاءؑ سے نزدیک تر ہوتی جا رہی ہے۔

اور ان سادہ لوح افراد کی یہ غلط فہمی اس حد تک بڑھی ہوئی ہے کہ انہوں نے اس پر بہت سی کتب تصنیف کر دی ہیں، گویا کہ آج کی دنیا راہ انبیاءؑ اور مرسلینؑ پر گامزن ہے اور جن معاشرتی اور انسانی مسائل کے متعلق ان بزرگ ہستیوں نے نشان دہی کی تھی، اس کے زیادہ تر حصے کو عملی جامہ پہنایا گیا ہے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ یہ تمام دکھاوے کی انسانیت دوستی درحقیقت سرکردگانِ سیاست کے مکروہ چہروں پر نقاب پوشی کی طاغوتی چال ہے۔

اس موقع پر اس خیال کے ابطال کے لیے کہ یہ تمام گفتگو جو کی گئی ہے، متعصبانہ اور معاندانہ نقطہ نظر پیش کرتی ہے، صرف اتنا ہی کافی ہے کہ ایسے حکمرانانِ عالم اور جابر حکومتوں کے صرف چند اعمال کی جھلکیاں دکھا دیں تا کہ ان کی دورخی، بلکہ دوغلی پالیسیوں اور جعلی انسانی محبت کے دعووں کی قلعی کھل سکے اور ان کا حقیقی چہرہ سامنے آ سکے۔

یہ سیاستدانان عالم ایک طرف تو فضائی تحقیقاتی روسی سیارے میں بھیجی جانے والی کتیا کی ہلاکت پر روس سے شدید احتجاج کرتے ہیں اور جانوروں کے حقوق کی آواز بلند کرتے ہیں اور دوسری طرف ویت نام میں، نہ صرف لاکھوں انسانوں کو خزاں رسیدہ پتوں کی طرح خاک میں ملا دیتے ہیں اور انہیں ہلاک کرنے کے لیے انتہائی مہلک اور زہریلے آتشی بم (نیپام) برساتے ہیں، بلکہ اس علاقے کے ایک بہت بڑے سرسبز شاداب جنگل کو اس کے انواع اقسام کے جانوروں بشمول پرندوں اور دیگر جنگلی حیات کے آگ کے بھڑکتے ہوئے شعلوں میں جھونک دیتے ہیں، صرف اس امکان کے پیش نظر کہ کہیں ویتنامی

www.shiabookspdf.com

گوریلے سپاہی اس میں پناہ نہ لے لیں۔

یہ طاغوتی نمائندے ایک جانب تو جمہوریت کا راگ الاپتے ہیں چاہے لوگوں کی آراء غیر شرعی مفادات کے خلاف ہوں۔ ایک چھوٹی سی انتظامی غلطی تمام معاملات درہم برہم کر دیتی ہے، جبکہ درمیان صدی (چھٹی تا پندرھویں) کی چھوٹی حکومتیں جو ان کے مفادات کی محافظ تھیں، ان سے تعلق قائم کرلیا اور دوستی کے معاہدے کیے۔

جی ہاں عالم سیاست کی صورتحال یہ ہے۔ یہی وہ چیز مذکورہ خطبے میں امام علیہ السلام کے کلام سے خوب واضح و روشن ہو جاتی ہے، فرماتے ہیں:

"فتنہ برپا کرنے والے کچھ حق اور کچھ باطل کو ملاتے ہیں اور شیطانی جال کو پھیلاتے ہیں، تاکہ سادہ لوح افراد کو اپنے جال میں پھنسا دیں۔"

www.shiabookspdf.com